فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (آية)

۱۴۳۸ھ میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر ہونے والے

افادات

مُفتیانِ کرام دارالافتاء دارالعُلوم دیوبند

حسب ہدایت

حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مدظلہ

مُلاحظہ

حضرت اقدس مفتی محمد امین صاحب پالن پوری مُدظلہ

ترتیب و تبویب

محمد حسان بیگ قاسمی

مکتبہ دارالعُلوم دیوبند

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ الآية

۱۴۳۸ھ میں دار الافتاء دار العلوم دیوبند سے صادر ہونے والے

منتخب فتاویٰ دار العلوم دیوبند

افادات

مفتیانِ کرام دار الافتاء دار العلوم دیوبند

حسب ہدایت

حضرت اقدس مفتی ابو القاسم نعمانی صاحب مدظلہ

ملاحظہ

حضرت اقدس مفتی محمد امین صاحب پالن پوری مدظلہ

ترتیب وتبویب

محمد حسان بیگ قاسمی

ناشر

مکتبہ دار العلوم دیوبند

نام کتاب : منتخب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

افادات : مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی

مفتی زین الاسلام صاحب قاسمی الٰہ آبادی، مفتی محمود حسن صاحب بلندشہری

مفتی وقار علی صاحب نالندوی، مفتی فخر الاسلام صاحب کشی نگری

مفتی محمد نعمان صاحب سیتاپوری، مفتی اسد اللہ صاحب آسامی، مفتی محمد مصعب صاحب قاسمی

(حضرات مفتیان دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم)

ترتیب وتبویب : محمد حبان بیگ قاسمی علی گڑھی، معاون مرتب فتاوی دارالعلوم دیوبند

ملاحظہ : مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم دیوبند

حسب ہدایت : حضرت مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم، مہتمم دارالعلوم دیوبند

فتاویٰ بابت : ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰۱۶ء

سن اشاعت : جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ مطابق نومبر ۲۰۲۳ء

تعداد صفحات : ۵۶۰

ناشر : مکتبہ دارالعلوم دیوبند، یوپی، انڈیا ۲۴۷۵۵۴

❀❀❀❀❀

فہرست مضامین

قرآن، حدیث، سیرت وتفسیر اور علم وتقلید سے متعلق مسائل

عقائد، شرک وبدعات اور شبہات سے متعلق مسائل

طہارت، نماز اور جنازے سے متعلق مسائل

روزہ، اعتکاف اور زکاۃ وصدقے سے متعلق مسائل

حج اور عمرے سے متعلق مسائل

نکاح، طلاق، رضاعت ونسب اور وراثت وعدت سے متعلق مسائل

بیع، اجارہ، شرکت وملازمت اور کمپنیوں سے متعلق مسائل

کیش بیک اور سبسڈی، نیز مختلف اسکیموں و کمیشن سے متعلق مسائل

قرض، سود، انشورنس اور رشوت سے متعلق مسائل

اوقاف، مساجد و مدارس اور قربانی سے متعلق مسائل

طب، میڈیکل سائنس اور مختلف دواؤں سے متعلق مسائل

لباس، زیب وزینت اور فیشن سے متعلق مسائل

تصویر سازی، ویڈیو گرافی اور پردے سے متعلق مسائل

اکل وشرب، اور دعوت وضیافت سے متعلق مسائل

حظر واباحت اور متفرق مسائل

❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

از: نمونہ اسلاف حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم
(شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم دیوبند)

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الّذین اصطفی أمّا بعد!

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر کیے جانے والے فتاویٰ کسی مزید تائید وتعارف کے محتاج نہیں، بس اُن کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ فتاویٰ؛ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر شدہ ہیں، الحمد للہ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کی یہ امتیازی شان قیام دارالعلوم کی ابتدا سے لے کر آج تک قائم ہے، اورعوام وخواص کا اعتماد اور رجوع دارالعلوم دیوبند کی جانب روزِ اوّل سے یوں ہی جاری وساری ہے، ظاہر ہے کہ یہ جہاں منصبِ افتاء پر فائز شخصیات کے خلوص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے، وہیں اس میں اُن کی علمی گہرائی وگیرائی اور مسلک ومشرب پر تصلب، پختگی اورحزم واحتیاط کا بھی دخل ہے۔

خاص کر دورِ حاضر میں جس طرح جدید مسائل کا ہجوم ہے، اور بے شمار ایسی چیزیں وجود پذیر ہو رہی ہیں، جن کے سلسلے میں شرعی رہنمائی حاصل کرنا؛ ہر دیانت دار شخص کی ضرورت ہے؛ لہٰذا جدید مسائل کے سلسلے میں بھی لوگوں کی تشنگی اُس وقت تک باقی رہتی ہے، جب تک کہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی جانب سے کوئی راہ نمائی نہ آجائے، پھر خواہ وہ جدید فتنے ہوں، یا نئی نئی تعبیرات کے ساتھ پیش آنے والی صورتیں ہوں، ٹکنالوجی سے متعلق مسائل ہوں، یا سائنس ومیڈیکل سائنس سے متعلق سوالات ہوں، بیع واجارے کے نئے نئے طریقے ہوں، یا کمپنیوں اور ملازمتوں کی جدید شکلیں ہوں، یا کوئی اور نئی پیش آمدہ صورت ہو؛ لوگوں کی نگاہیں آج بھی اسی ادارے کی جانب مرکوز ہوجاتی ہیں۔

اللہ عز وجل کا کرم ہے کہ اوّلاً ان جدید اور نامانوس صورتوں کی فقہی تکییف، اور پھر اُن کے حکم شرعی کی تعیین، نیز لوگوں کی اس سلسلے میں صحیح رہنمائی؛ اس ادارے کی جانب سے بر وقت کی

جاتی ہے؛ جس کی وجہ سے عوام وخواص کی نگاہوں میں اس ادارے کی عظمت و وقار اور افادیت واہمیت روز افزوں ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک

اسی طرح کے جدید عصری مسائل سے متعلق ۱۴۳۸ھ کے منتخب فتاویٰ کا یہ مجموعہ بھی ہے، جو افادۂ عام کی غرض سے اشاعت کے لیے تیار ہے، اس سے پہلے جناب مفتی زین الاسلام صاحب کے افادات ''چند اہم عصری مسائل'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوکر قبول عام حاصل کر چکے ہیں؛ جن کی افادیت اور قبولیت کو دیکھتے ہوئے مناسب محسوس ہوا کہ دارالافتاء سے منسوب تمام مفتیانِ کرام کے منتخب فتاویٰ اسی طرز سے منظر عام پر آجائیں، تو فائدہ دوچند ہوجائے؛ لہٰذا اس مجموعے میں جملہ مفتیانِ کرام دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے اہم اور منتخب فتاویٰ کو شامل کیا گیا ہے، جس سے اس مجموعے کی اہمیت اور افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔

عزیز گرامی قدر مفتی محمد حبان بیگ قاسمی صاحب (معاون مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) نے - جو ماشاء اللہ! تحقیق وترتیب کا خاص ذوق رکھتے ہیں، اور علمی کاموں میں منہمک رہتے ہیں - اس مجموعے کی ترتیب وتبویب اور عنوان سازی کا بیڑا اٹھایا، اور شعبے کی مفوضہ ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس کام کو بھی ذوق وشوق اور محنت ولگن کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

فتاویٰ کی کمپوزنگ اور تصحیح کے بعد جملہ مفتیانِ کرام نے اپنے اپنے فتاویٰ پر نظر ثانی فرمائی، اور پھر اخیر میں جناب مفتی محمد امین صاحب پالن پوری (استاذ حدیث وفقہ ومرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) نے بھی پورے مرتب شدہ مجموعے پر نظر ثانی فرما کر؛ اس کے اعتماد میں مزید اضافہ فرمایا ہے، فجزاہم اللہ خیر الجزاء

کام کن مراحل سے گزر کر طباعت کے قابل ہوا، اس کی تفصیل مرتب موصوف کے پیش لفظ میں دیکھی جاسکتی ہے، دعا ہے کہ اللہ عز وجل اس مجموعے کے افادے کو عام فرمائیں، اور اس کے فیض کو جاری فرما کر قبولیت سے ہم کنار فرمائیں۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ
(شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم دیوبند)
۲۱/ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از: حضرت اقدس مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم
(استاذ حدیث وفقہ ومرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند)

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علیٰ عبادہ الّذین اصطفی أمّا بعد!

منتخب فتاویٰ کا یہ مجموعہ دارالعلوم دیوبند کے مفتیانِ کرام کے اہم عصری مسائل کا مجموعہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے اربابِ حل وعقد کی تجویز کے مطابق پہلے ۱۴۳۸ھ میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے صادر ہونے والے اہم عصری مسائل کا انتخاب کیا گیا، پھر حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم (شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم دیوبند) نے ان منتخب فتاویٰ کو مرتب کرنے کی ذمے داری جناب مولوی مفتی محمد حبان بیگ صاحب (معاون مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کو سپرد فرمائی، موصوف نے اس مجموعے کی ترتیب وتبویب اورعنوان سازی کی خدمت بہ حسن وخوبی انجام دی، بعدہٗ جن مفتیانِ کرام کے فتاویٰ اس مجموعے میں ہیں، اُن کی خدمت میں پیش کیا، تمام مفتیانِ کرام نے اپنے اپنے فتاویٰ پر نظر ثانی فرمائی، پھر احقر نے پورے مجموعے کو از اوّل تا آخر دیکھا، میری دانست میں تمام جوابات صحیح ہیں، اور حوالوں سے مزین ہیں۔

اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند اور تمام مراکز اسلامیہ کی شرور وفتن سے حفاظت فرمائیں، اور امتِ مسلمہ کو شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق ارزانی فرمائیں، اور فتاویٰ کے اس مجموعے کو قبولِ عام نصیب فرمائیں۔ آمین یا ربّ العالمین

محمد امین پالن پوری
(خادم حدیث وفقہ ومرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند)
۲۱/ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زیرِ نظر منتخب فتاویٰ کا یہ مجموعہ عوام وخواص کے لیے ایک نیا اور قیمتی تحفہ ہے، جس کا انتساب دارالعلوم دیوبند کے اہم ترین شعبہ جات میں سے ایک؛ دارالافتاء کی جانب ہے، جو اپنے نقطۂ آغاز سے لوگوں کی شرعی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا ہے؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ دارالعلوم دیوبند کے صحیح مسلک ومشرب کا سب سے بڑا محافظ یہی شعبہ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

دارالعلوم دیوبند جن مشکل اور انتہائی مایوس کن حالات میں قائم ہوا، اور پھر جس طرح تاریکیوں کے درمیان سے روشنیاں بکھرتی چلی گئیں، اور اس نور کو پورے عالم نے چمکتا دیکھا؛ یہ صرف اور صرف اس عظیم علمی ادارے سے منسوب؛ شخصیات کے خلوص وللّٰہیت ہی کا نتیجہ ہے؛ یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد ہی سے لوگوں کا رجوع اس کی جانب برابر بڑھتا گیا، اور اطراف واکناف سے فتاوی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا، ابتدا میں تو اکابر اساتذۂ کرام؛ لوگوں کی شرعی رہنمائی فرماتے رہے؛ مگر مسائل کے بڑھتے ہجوم اور اساتذہ کی دیگر علمی وملی مشغولیات کے پیشِ نظر ۱۳۱۰ھ میں باقاعدہ دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا، تفصیل کے لیے دیکھیں: (مختصر تاریخ دارالعلوم، ص: ۲۲۴-۲۲۵، ط: شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند)

یہاں کے بانیان کا خلوص، اور پھر دار الافتاء سے منسوب عظیم شخصیات اور جبالِ علم وعمل حضرات کی برکت اور توجہات کا ثمرہ ہے کہ پورے عالم میں دارالعلوم دیوبند کے فتووں اور فیصلوں کو انتہائی قدر وقیمت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا، اور یہاں سے صادر ہونے والے فتاویٰ کو دنیا ہاتھوں ہاتھ لینے، اور بہ سر وچشم قبول کرنے لگی۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علمائے دیوبند جن کا فتویٰ سکۂ رائج الوقت کی طرح چلتا ہے، اور الحمد للہ ہمیں یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے لے کر سوڈان تک؛ ترکستان تک یہاں کا فتویٰ چلتا ہے، اور مسلمان اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک علمائے دیوبند کا فتویٰ ان کے سامنے نہ آجائے''۔

(دارالعلوم دیوبند کی مرکزیت ایک مسلّمہ حقیقت، ص: ۱۳، ط: مکتبہ الانور، دیوبند)

مذکورہ اقتباس ایک جہاں دیدہ اور عظیم مفکر کا ہے، جو حرف بہ حرف سچا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ دارالافتاء کی خدمات، اور اس کا اعتماد، اور اس کی طرف عوام وخواص کا رجوع شروع ہی سے رہا ہے، اور اس کا شہرہ ملک وبیرونِ ملک پھیلا ہوا ہے، اور الحمدللہ آج تک یہ بھرم قائم اور روز افزوں ہے، اور یہ شعبہ آج بھی اپنے اسی امتیاز کے ساتھ مصروفِ عمل ہے، خداوندِ قدوس اس چمکتے دمکتے سورج کو گہن سے محفوظ فرمائیں۔ آمین یا ربّ العالمین

چوں کہ زمانے کو قرار نہیں، اور مسائل کا شمار نہیں، خاص کر اس ترقی یافتہ دور میں؛ جہاں ہر چیز نے ایک نئی کروٹ لی ہے، اور سائنس اور ٹکنالوجی اپنے عروج پر ہیں؛ روز بہ روز نت نئے مسائل؛ پیش آتے رہتے ہیں، اور ہمیشہ کی طرح آج بھی سبھی نگاہیں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی جانب مرکوز ہوجاتی ہیں، الحمدللہ دارالافتاء لوگوں کی اس امید پر کھرا اترتا ہے، اور نہایت پختگی اور حزم واحتیاط کے ساتھ نئے مسائل کے حکمِ شرعی سے لوگوں کو روشناس کراتا ہے؛ چوں کہ استفتاء اور فتاویٰ کا فائدہ محدود ہے، اور زیادہ سے زیادہ سائل کے اردگرد لوگوں تک ہی اس کی رسائی ہوتی ہے؛ لہٰذا ایسے نئے اور اہم مسائل کے سلسلے میں اربابِ حل وعقد نے یہ مفید تجویز منظور فرمائی کہ ایسے فتاویٰ کا انتخاب کرکے اُنہیں قابلِ اشاعت بنایا جائے؛ تاکہ اُن سے افادہ عام ہو، اور بروقت لوگوں کو صحیح رہنمائی مل سکے۔

استاذِ گرامی قدر حضرت اقدس مفتی زین الاسلام صاحب دامت برکاتہم کے منتخب فتاویٰ ''چند اہم عصری مسائل'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوکر قبولِ عام حاصل کرچکے ہیں، اور عوام وخواص میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جارہے ہیں، اسی نہج پر دارالافتاء سے منسوب تمام مفتیانِ کرام کے منتخب فتاویٰ کی اشاعت کا ارادہ کیا گیا، اور ۱۴۳۸ھ میں صادر کیے جانے والے اہم فتاویٰ کا انتخاب کرکے؛ اُن کی ترتیب وتہذیب اور عنوان سازی کا کام احقر کے سپرد ہوا، بعد میں مفتیانِ کرام کے مشورے سے کچھ اہم فتاویٰ کا اضافہ بھی رجسٹر نقولِ فتاوی سے کیا گیا۔

ان تمام امور میں احقر نے جملہ مفتیانِ کرام سے رجوع کیا، اور اُن کے رائے مشورے سے ہی ہر قدم اٹھایا، تمام مفتیانِ کرام نے اپنے متعلقہ فتاویٰ پر ازخود نظرِ ثانی کرکے بہت سے مواقع پر حذف واضافہ بھی کیا، اور حوالہ جات بھی بڑھائے، کچھ مقامات پر احقر نے بھی مفتیانِ کرام کی تصویب کے بعد حوالہ جات کا اضافہ کیا ہے؛ البتہ اپنی طرف سے اصل فتاوی میں نہ کچھ بڑھایا ہے، اور نہ ہی کچھ گھٹایا ہے۔

چوں کہ کام کئی مرحلوں میں ہوا، اور مفتیانِ عظام کو بھی عدیم الفرصتی کی وجہ سے نظرِ ثانی میں خاصا وقت لگا، پھر مفتیانِ کرام کی رائے ہوئی کہ ہر فتوے کے اخیر میں سلسلہ اور ڈاک بہی نمبر ڈال دیا جائے؛ تا کہ ضرورت کے وقت رجسٹروں سے مراجعت آسان ہو؛ لہٰذا تمام فتاویٰ کو دوبارہ رجسٹروں سے از سرِ نو ملانا پڑا، اس میں بھی خاصا وقت صرف ہوا، غرض یہ کہ

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

امید ہے کہ آئندہ سالوں کے منتخب فتاویٰ کا کام تیزی سے ہوگا، اور نہج کے طے ہوجانے کی وجہ سے تاخیر بھی نہیں ہوگی، اللہ جل شانہٗ اس کام کو قبول فرمائیں، اور اس کا افادہ عام وتام فرمائیں، اور مجھ سیہ کار کو بھی صالحین کی جوتیوں میں جگہ نصیب فرمائیں۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر میں مشفقِ گرامی قدر نمونۂ اسلاف حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم (شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم دیوبند) کا شکریہ نہ ادا کروں کہ ان کی توجہات اور دعاؤں ہی کے طفیل؛ یہ قیمتی تحفہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ زادہ اللّٰہ شرفاً وإقبالاً

نیز نہایت قابلِ احترام استاذِ عالی مقام حضرت اقدس مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (استاذ حدیث وفقہ ومرتبِ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ حضرت والا نے بے پایاں مصروفیات کے باوجود پوری کتاب پر نہایت عرق ریزی کے ساتھ نظرِ ثانی فرمائی، اور مفید اصلاحات فرما کر کتاب کو رونق بخشی۔ فجزاہم اللّٰہ خیراً

اور اُن تمام محبین ومخلصین کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے مفید مشورے دیے، یا کام میں کسی بھی طرح کا کوئی تعاون پیش کیا، بندہ ایسے سچے دوستوں کے احسانات سے ہمیشہ گراں بار رہا ہے، اللہ جل شانہٗ سبھی کو اپنے شایانِ شان اجرِ جزیل عطا فرمائیں۔ آمین یا ربّ العالمین

محمد حبان بیگ قاسمی
شعبہ ترتیب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند
۱۱/۴/۱۴۴۵ھ = ۲۷/۱۰/۲۰۲۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن، حدیث، سیرت وتفسیر اور علم وتقلید سے متعلق مسائل

مکان کی دیوار اور دروازے پر قرآن پاک کی آیات لکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) گھر کی دیواروں یا دروازے یا مین گیٹ پر قران پاک کی آیات لکھنا پینٹ سے، یا پتھر پر کندہ کرانا کیا جائز ہے؟

(۲) کیا کوئی آدمی اپنے نام والی آیت؛ پتھر میں کندہ کروا کر اپنے مین گیٹ کی دیوار میں جس کی اونچائی نصف قد یا تھوڑی سی کم ہو لگا سکتا ہے یا نہیں؟ آیت کی مثال: ﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾ (النمل: ۳۰) مدلل جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: (۱) گھر کی دیواروں یا دروازے یا مین گیٹ پر قرآن پاک کی آیات لکھنے، یا پتھر پر کندہ کرانے میں اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ وہ جگہ ٹوٹ کر گر جائے، اور قرآنی آیات روندی جائیں؛ اس لیے فقہاء نے اس کو خلافِ ادب اور مکروہ لکھا ہے۔

قال في الشّامي: وتكره كتابة القرآن وأسماء اللّٰه تعالىٰ على الدّرهم والمحاريب والجدران وما يفرش. (شامي: ۱/۳۲۳)

(۲) اپنے نام والی آیت پتھر میں کندہ کروا کر اپنے مین گیٹ کی دیوار وغیرہ میں لگانے میں قرآن کو غیرِ ما وضع لہٗ میں استعمال کرنا پایا جائے گا؛ اس لیے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

قال في المغني: ولا يجوز أن يجعل القرآن بدلاً من الكلام؛ لأنّه استعمال في غير ما هو له، فأشبه استعمال المصحف في التّوسد ونحوه. (المغني لابن قدامه: ۳/ ۱۵۰)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۹۶/ل، ۷۸۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

موبائل پر قرآن کریم یا دیگر دینی کتب ڈاؤن لوڈ کرنے کا حکم

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ کیا موبائل پر قرآن کریم کے سافٹ ویئر ڈاؤن لوڈ کرنا، اور دیگر احادیث کی کتب ڈاؤن لوڈ کرنا، اور پھر پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: جی ہاں! موبائل پر قرآن کریم کے سافٹ ویئر ڈاؤن لوڈ کرنا، یا دیگر کتب احادیث کو ڈاؤن لوڈ کرنا، اور پڑھنا درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۰۷۴/ل، ۱۰۳۸/ل، ۱۴۳۸ھ)

موبائل میں قرآن کے سافٹ ویئر سے متعلق بعض صورتوں کا حکم

سوال: آج کل امریکن کمپنی کا ایک موبائل جس کا نام apple ہے، اس موبائل میں کی پیڈ (key pad) نہیں ہوتا؛ بل کہ اس موبائل کی اسکرین کو انگلی سے چھو کر استعمال کیا جاتا ہے؛ کیوں کہ پورا قرآن کریم کمپیوٹر سافٹ ویئر کی صورت میں موجود ہے، تو قرآن کریم کے سافٹ ویئر کو مندرجہ بالا موبائل میں ڈاؤن لوڈ کر دیا جاتا ہے، اور پورا قرآن کریم اس apple موبائل میں موجود ہوتا ہے، یہ موبائل اسکرین کو ہاتھ کی انگلی سے چھو کر استعمال ہوتا ہے؛ لہٰذا جب قرآن کریم کو پڑھنے کے لیے

اسکرین پر لایا جاتا ہے تو ظاہر ہے اسکرین کو ہاتھ لگانا ہوگا، اور اگلے صفحوں کو لانے کے لیے بھی انگلیوں کو استعمال کرنا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ:

(۱) بغیر وضو کے اس طرح استعمال کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا یہ موبائل؛ قرآن پاک کے زمرے میں شامل نہیں ہوگا؟

(۳) اور کیا یہ موبائل؛ قمیص، شلوار یا پتلون کی جیب میں رکھا جاتا ہے، اور شلوار کی جیب رانوں پر شرم گاہ کے قریب ہوتی ہے اور پتلون کی جیب بھی رانوں پر شرم گاہ کے قریب یا پھر کولھوں پر ہوتی ہے، کیا یہ جائز ہے؟

(۴) اور کیوں کہ یہ موبائل جیب میں ہوتا ہے؛ اس لیے جب انسان بیت الخلاء جاتا ہے، تو موبائل بھی اس کی جیب میں ہوتا ہے، تو کیا اس موبائل کو بیت الخلاء لے جانا صحیح ہے؟

(۵) اسی طرح بعض لوگ اس موبائل میں گانے، تصاویر، فلمیں اور دوسری خرافات بھی قرآن کریم کے ساتھ رکھتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: **(۱)** موضعِ مکتوب پر (قرآنی آیات کے کلمات پر) بغیر وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے، اس کے علاوہ خالی اسکرین پر ہاتھ لگانے کی گنجایش ہے۔

المكروه مسُّ المكتوب لا موضع البياض، ذكرهُ التّمرتاشي. (حلبي كبيري، ص: ۵۸، فروع: إن جنبت المرأة، ط: أشرفية، ديوبند)

(۲) نہیں! اُس پر مصحف کا اطلاق نہیں ہوگا۔

(۳) گنجایش ہے۔

إذا كان للرَّجل جوالق، وفيها دراهم مكتوبٌ فيها شيء من القرآن...... فجلس عليها أو نام، فإن كان من قصده الحفظ فلا بأس به، كذا في الذّخيرة. (هندية: ۳۷۳/۵، كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد والقبلة والمصحف، ط: زكريا، ديوبند)

(۴) لاک ہونے اور سُوِچ آف ہونے، اور جیب میں مستور ہونے کی صورت میں اس کو لے کر بیت الخلاء میں جانے کی گنجایش ہے۔

لا بأس بأن یکون مع الرَّجل في خرقة دراهم وهو علی غیر وضوء.

(هندیة: ۵/ ۳۷٤، کتاب الکراهیة، الباب الخامس، ط: زکریا، دیوبند)

(۵) گانوں اورتصاویر ودیگرخرافات کا موبائل میں رکھنا توکسی بھی صورت میں جائزنہیں ہے، اور جب اس موبائل میں قرآن پاک بھی ہو، تو اس میں قباحت اور بھی بڑھ جائے گی؛ لہٰذا اس سے احتراز لازم ہے۔

اختلفُوا في التَّغني المجرَّد: قال بعضُهم: إنَّه حرامٌ والاستماع إلیه معصیةٌ، وهو اختیار شیخ الإسلام. (هندیة: ۵/ ٤۰٦، کتاب الکراهیة، الباب السابع عشر في الغناء إلخ، ط: زکریا، دیوبند) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۷۵ترتمہ/ل، ۱۵۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

مسجد میں مجمع کی کثرت کی صورت میں قرآن کی طرف پشت کرنا یا اس سے اوپر ہونا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ میں جس مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے کے لیے جاتا ہوں، وہاں پر کئی نمازی اگلی صف میں بیٹھے ہوتے ہیں، اور پیچھے والی صف میں بیٹھنے والے قرآنِ مقدس لے کر پڑھتے ہیں، اور آگے والوں کی پیٹھ قرآن مجید کی طرف ہوتی ہے، اور کئی لوگ کرسی پر بھی بیٹھے رہتے ہیں، اورقرآن پاک نیچے ہوتا ہے، تو کیا اس طرح قرآن پڑھنا جائز ہے؟ اوراس مسجد کے امام صاحب بھی کسی کو منع نہیں فرماتے، کئی لوگ تلاوت کر رہے ہیں، اور قرآن کی طرف پیٹھ ہے، ان صورتوں میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کے پڑھنے کے کچھ آداب ہیں، مثلاً: قبلہ رخ ہوکر بیٹھنا، قرآن کریم کو اونچائی پر رکھنا، اس طرح بیٹھنا کہ قرآن کریم کسی کی پشت کے پیچھے نہ ہو وغیرہ، حتی الامکان ان آداب کا لحاظ کرنا چاہیے۔

صورتِ مسئولہ میں مسجد میں مجمع کی زیادتی کی وجہ سے جب بعد میں آنے والوں کو پیچھے جگہ ملتی ہے، تو اگر تلاوت کے وقت پیچھے پڑھنے سے بچنا ممکن ہو تو اسی کو اختیار کر لے؛ ورنہ عذر کی وجہ سے پیچھے بھی تلاوت کرنے کی گنجایش ہے، اسی طرح جو لوگ زمین پر بیٹھنے سے معذور ہیں اگر وہ کرسی پر بیٹھے رہیں تو ان کے ہوتے ہوئے دوسرے لوگوں کا زمین پر بیٹھ کر تلاوت کرنا جائز ہے، عذر کی بنا پر قرآن کے نیچا ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۶/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ – محمد مصعب عفی عنہ

(۴۱۹/د، ۴۹۷/د، ۱۴۳۸ھ)

ٹی وی یا موبائل میں لائیو آیتِ سجدہ سننے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال: کیا اگر کوئی شخص ٹیلی ویژن یا موبائل میں (live) بہ راہِ راست آیت سجدہ سنے، تو کیا اس پر سجدہ واجب ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللّٰہ التوفیق: موبائل یا ٹیلی ویژن میں بہ راہِ راست (لائیو) آیتِ سجدہ سننے سے بعض علماء کے نزدیک سجدۂ تلاوت واجب ہوجاتا ہے؛ لیکن بعض مفتیانِ کرام کی تحقیق یہ ہے کہ ٹیلی ویژن یا موبائل پر لائیو کے نام سے جو پروگرام نشر ہوتے ہیں، وہ کیمرے میں محفوظ ہونے کے بعد نشر ہوتے ہیں؛ لہٰذا ٹیلی ویژن یا موبائل پر بہ راہِ راست نشر ہونے والی آیتِ سجدہ سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا؛ بہ ہر حال! احتیاط یہ ہے کہ سجدہ کرلیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۱۰/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ – زین الاسلام قاسمی

(۱۰۸۵/ص، ۱۱۴۵/ص، ۱۴۳۸ھ)

موبائل پر آیات اور احادیث کا بھیجنا یا ان کو ڈیلیٹ کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظامِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) موبائل پر قرآنی آیات یا احادیثِ مبارکہ کا بھیجنا کیسا ہے؟ جب کہ لوگ اس کو ڈیلیٹ کردیتے ہیں، آیا اس طرح میسج بھیجنا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) اور اس سے قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی جواب مدلل اور واضح الفاظ میں عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: (۱) اگر کسی ضرورت کے پیشِ نظر بھیج دیں؛ مثلاً: کسی کو کچھ سمجھانا مقصود ہو یا عبرت ونصیحت کی نیت سے ہو تو گنجایش ہے، اور مقصد پورا ہوجانے پر ڈیلیٹ کردیا جائے تو اس میں بھی گنجایش ہے، اور اس طرح بھیجنے اور ختم کرنے میں بے حرمتی نہیں ہے؛ البتہ لہو ولعب کے انداز میں بلاضرورت بھیجنا اچھا نہیں ہے، اس میں بے ادبی اور بے احترامی کا اندیشہ ہے۔

(۲) نمبر:۱ کے تحت جواب آگیا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۱۰ھ الموافق: ۲۰۱۷/۲/۸ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۴۵/ھ، ۶۵۱/ھ، ۱۴۳۸ھ)

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کرنا کیسا ہے؟

سوال: ایک ہمارے مشہور عالم دین ہیں مولانا طارق جمیل صاحب (دامت برکاتہم) جن کے بیانات کافی مشہور ہیں؛ لیکن حضرت کی ایک بات بڑی عجیب ہے کہ وہ اکثر اپنے بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ حضرت آدم علیہ السلام تک پورا بیان کرتے ہیں، جب کہ ہم نے مکتب میں معد بن عدنان تک پڑھا تھا، اور یہیں تک علماء سے سنا ہے۔ کیا ان کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب حضرت آدم علیہ السلام تک پورا محفوظ ہے؟ اگر نہیں؛ تو ان کا بیان کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللہ التوفیق: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

عدنان تک سلسلۂ نسب تمام نسب دانوں کے نزدیک مسلم ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے، اس سے آگے کے نسب میں اختلاف ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نسب شریف کو بیان فرماتے تھے تو عدنان سے تجاوز نہ فرماتے، امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں عدنان تک سلسلۂ نسب بیان کیا ہے، اور علامہ سہیلی فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کسی شخص کا اپنے سلسلۂ نسب کو حضرت آدم علیہ السلام تک پہنچانا کیسا ہے؟ تو امام مالک رحمہ اللہ نے ناپسند فرمایا۔ (سیرۃ المصطفیٰ: ۱۱/۱۹)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب عدنان ہی تک بیان کرنا چاہیے، حضرت آدم علیہ السلام تک بیان کرنا احتیاط کے خلاف ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۲ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۸۵۴/ص، ۹۱۷/ص، ۱۴۳۸ھ)

﴿وَالضُّحٰی﴾ کی تفسیر آپؐ کے چہرۂ انور سے اور ﴿وَاللَّیل﴾ کی تفسیر آپؐ کے گیسوئے مبارک سے کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلۂ مندرجہ ذیل میں:

کیا یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم میں ﴿والضُّحٰی﴾ سے مراد چہرۂ انور، اور ﴿واللَّیل﴾ سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ مبارک کے مبارک بال ہیں، جیسا کہ بعض سیرت نگاروں اور شعراء کی طرف سے سامنے آیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: منقول وماثور تفسیر کے خلاف ہے، جس نے مذکورہ معنی بیان کیے ہیں اس کی دلیل کیا ہے؟ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۷/۷ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - وقار علی غفرلہٗ

(۵۰۸/د، ٦١٦/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں ’’اللہ ان پر فریفتہ ہے، اللہ شیدا ہے، اللہ فدا ہے‘‘ وغیرہ کہنا درست ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلۂ مندرجہ ذیل میں:

اکثر نعت گو شعراء اپنے نعتیہ کلام میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف کے طور پر ’’اللہ ان پر فریفتہ ہے، اللہ شیدا ہے، اللہ فدا ہے‘‘ وغیرہ بیان کرتے ہیں، اس سلسلے میں زید کہتا ہے کہ اللہ پاک خالق کائنات بھی ہے، اور مالک کائنات بھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک بھی اُسی کی تخلیق کردہ ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن وجمال کی ساری کیفیات وتمام صفاتِ عالیہ کی شان بھی اُسی کی عطا کردہ ہے، خود اپنی ہی تخلیق وعطا پر فریفتہ ہونا، شیدا ہونا، فدا ہونا اُس کی شانِ الوہیت وربوبیت کے منافی ہے، کیا زید کا یہ کہنا صحیح ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: فریفتہ ہونا، شیدا ہونا؛ انفعالی صفات ہیں، جو بندے کے ساتھ خاص ہیں، جیسے: رحمت اور غضب؛ انفعالی صفات ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف کسی انفعالی صفت کی نسبت کی جائے تو اس کا نتیجہ مراد ہوتا ہے، مثلاً: رحمت کے معنی رقت قلب پیدا ہونا، جو اچھائی کرنے پر آمادہ کرے، اب اللہ تعالیٰ کی طرف جب نسبت ہوگی تو رقتِ قلب مراد نہ ہوگی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے؛ بل کہ صرف اچھائی کرنا مراد ہوگا۔

اشعار میں جہاں اس طرح کے الفاظ آئے ہوں دیکھنا ہوگا کہ بہ اعتبار نتیجے کے اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر نتیجے کی نسبت کی جاسکتی ہے تو وہی مراد ہوگی؛ ورنہ پھر استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، صورتِ مسئولہ میں بہ ظاہر زید کا قول درست ہے، گو کسی جگہ بہ تاویل بولنے کی گنجایش ہو؛ لیکن خلافِ احتیاط ضرور ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - وقار علی غفرلہ

(۵۰۸/د، ۶۱۶/د، ۱۴۳۸ھ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کے بالوں کو لفظِ زلف یا گیسو سے تعبیر کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلۂ مندرجہ ذیل میں:

کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ مبارک کے مبارک بالوں کے لیے لفظِ زلف اور گیسو کا استعمال کیا جانا صحیح ہے، جب کہ یہ الفاظ عام طور پر عورتوں کے بالوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، اور اردو وفارسی غزلوں میں خیالی محبوب کے سر کے بالوں کے لیے بھی ان کا استعمال پایا جاتا ہے۔

للہ نصوصِ صریحہ کی روشنی میں مسئلہ مذکورہ کی حقیقت واضح فرما کر بندے پر احسان فرمائیں، اور عنداللہ ماجور ہوں۔ والسلام مع الاکرام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: زلف اور گیسو محبوب کے بالوں کے لیے بولے جاتے ہیں، عورت کے ساتھ خاص ہونا ضروری نہیں؛ پس محبوبِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال کرنا جائز ہے، شعراء کے علاوہ نثر نگار حضرات بھی زلفِ مبارک اور گیسوئے مبارک استعمال کرتے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　　۷/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- وقار علی غفرلہٗ

(۵۰۸/د، ۶۱۶/د، ۱۴۳۸ھ)

مروجہ گانوں میں ترمیم کر کے ان کو حمد یا نعت بنا کر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: میں جاننا چاہتا ہوں کہ موجودہ مروجہ گانوں کو ترمیم کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عشق میں گانے گائے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ سننا تو حرام ہے؛ لیکن اگر کسی سننے والے سے لکھا کر، اور اس میں ترمیم کر کے اللہ کی محبت میں گایا جائے، تو کوئی مضائقہ تو نہیں، جیسا کہ ماضی بعید میں ہمارے صوفیۂ کرام کا عمل رہا ہے، مثال؛ جیسے:

آ تا نہیں یقین کیا سے کیا ہو گیا ❁ میں کس طرح رب سے بے وفا ہو گیا
انصاف کردو مجھے معاف کردو ❁ بس اتنا ہی کردو کرم
دل دے دیا ہے جاں انھیں (رب کو) دیں گے ہم ❁ الخ ....
آوارگی میں بن گیا بے گانہ ❁ میں نے کس طرح سے رب کو نہیں جانا

یہ ایک گانا ترمیم شدہ ہے اس کے متعلق مفصل روشنی ڈالیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اشعار جو بہ طور گانے کے کہے گئے ہیں، اُن میں عشقِ مجازی اور فسقیہ محبت مدنظر ہوتی ہے، یا کبھی خیالی طور پر پروازِ محبت ہوتی ہے، اس کا مقصد بھی جذباتِ فسق وشہوت کو ابھارنا ہوتا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ شاعر کا ذوق ومزاج مثلِ روح کے؛ اس کے کلام میں سرایت کیے ہوتا ہے؛ پس صیغۂ خطاب، اضافت یا بعض الفاظ کی ترمیم سے؛ اگرچہ محبتِ الٰہی مراد لینے کی گنجایش پیدا ہوجائے، اور اس اعتبار سے کلام دائرۂ جواز میں آجائے؛ لیکن کلام کے موضوع لہ اوّل (جس مقصد سے کلام کہا گیا ہے) سے صرفِ نظر ممکن نہ ہوگا، نیز اس کی طرف ذہنی انتقال اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں کہ اسی کلام سے اب روحانیت حاصل کی جاسکے۔

یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ بچے کا پاخانہ پھینکنے والے برتن کو کتنا ہی مانجھ کر صاف کرلیا جائے؛ لیکن سلیم الطبع انسان اس میں حلوا رکھ کر کھانا گوارا نہیں کرے گا۔

پھر ان گانوں کا چلن محبت فسقیہ کے لیے عام ہے، تو متبادر معنی کے خلاف اسے محبتِ الٰہی کے لیے کیسے انتقال کیا جاسکتا ہے؟ ہمیں تو حمد، نعت اور محبتِ الٰہی کے اشعار بھی فسقیہ گانوں کے طرز وانداز پر پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

صوفیۂ کرام سے مراد کون سی شخصیات ہیں؟ اُن کا عمل کیا رہا ہے؟ کتابوں کے حوالے کے ساتھ مثالوں سے واضح کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ–محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۷/تتمہ/د، ۲۲/۷/د، ۱۴۳۸ھ)

موئے مبارک کی زیارت وغیرہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ شہر چکمگلور کی ایک قدیم مسجد ہے، جس میں وہاں کی کمیٹی کے اقرار کرنے کے مطابق موئے مبارک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اکھتر سالوں سے موجود ہے، ہر سال عید میلا دالنبی کے موقع پر باضابطہ زیارت کروائی جاتی تھی؛ لیکن ۲۰۱۵ء میں عید میلا دالنبی کے موقع پر کمیٹی والوں نے زیارت نہیں کروائی، اور لوگوں میں یہ کہا کہ اس کی کوئی سند اور ثبوت نہیں ہے۔

عرض یہ ہے کہ کیا اکھتر سالوں سے جس موئے مبارک کی عام زیارت کروائی جاتی تھی، عوام وخواص بھی زیارت کرتے اور مانتے تھے، اب سند نہ ہونا کہہ کر یک سر موئے مبارک کو مشکوک سمجھنا، سند تلاش کرنا، اور زیارت سے روک دینا شرعاً درست ہے؟ کیا آثارِ مبارک کو ثابت کرنے کے لیے سند اور ثبوت کی ضرورت ہے؟ شریعت کی روشنی میں مدلل ومفصل جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف آثار وتبرّکات چھوڑے ہیں؛ چناں چہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر احرام سے حلال ہونے کے لیے حلق کرانے کے بعد اپنے موئے مبارک صحابۂ کرام کے درمیان تقسیم فرما دیے تھے، اس طرح نعلین اور زیب تن کیے ہوئے کپڑے بھی چھوڑے ہیں، اگر یہ آثار مستند طریقے پر مل جائیں تو حدِ شرع میں رہتے ہوئے اُن کی تعظیم وتکریم بلاشبہ باعثِ ثواب ہے؛ لیکن ان کی پشت پر اگر کوئی سند نہیں ہے تو اس سے بچ کر ان سے کنارہ کش ہوجانا چاہیے؛ چناں چہ ''مسلک علمائے دیوبند'' میں ہے:

''اگر آثارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم؛ جیسے: موئے مبارک، پیراہن مبارک اور نعلین کا ایک تسمہ بھی مستند طریقے پر مل جائے، تو ہم اسے بادشاہوں کے تاج اور دنیا کی تمام بیش بہا دولت سے کہیں زیادہ بڑھ کر دولت سمجھتے ہیں، غیر مستند ہوں تو بے ادبی سے بچ کر بے سند چیزوں سے کنارہ کش ہوجانا ضروری سمجھتے ہیں''۔ (مسلک علمائے دیوبند، ص: ۳۰-۳۱، مولفہ: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

البتہ مستند ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ نصف یا ایک صدی سے کسی آثار؛ مثلاً: موئے مبارک کی زیارت کی جارہی ہو؛ بل کہ خیر القرون تک اس کا سلسلہ پہنچنا ضروری ہے؛ اس لیے آپ کے شہر چکمگلور میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب جو بال ہے اگر اس کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب کے سلسلے میں اکھتر سال سے اس کی زیارت کے معمول کے علاوہ کوئی سند نہیں ہے، تو محض اتنی مدت سے اس کی زیارت کے معمول کی بنا پر یہ یقین کرنا جائز نہ ہوگا کہ یہ بال واقعۃً اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ہیں، اور نہ اس اعتقاد کے ساتھ اس کی زیارت درست ہے؛ لہٰذا کمیٹی والوں کا عمل بالکل درست اور شریعت کے مطابق ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۲/۲۷ھ، دوشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۷۲/تتمہ/س، ۲۴۱/س، ۱۴۳۸ھ)

گائے کے گوشت کا حکم اور اس سلسلے میں دو متضاد احادیث کے درمیان تطبیق

سوال: السلام علیکم! عنوان: کیا نبی صلی اللہ علیہ نے گائے کا گوشت کھانے سے احتراز کرنے کے لیے کہا ہے؟ یا اس بارے میں کچھ نہیں فرمایا؟

میں نے دو متضاد حدیثیں پڑھیں، ایک حدیث میں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے گائے کا گوشت کھانے سے احتراز کرنے کے لیے کہا ہے؛ لیکن دودھ اور اس کے ڈیری مصنوعات کو پینے سے منع نہیں فرمایا، اور دوسری حدیث میں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم گائے ذبح کرتے تھے، صحیح کیا ہے؟ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کہا ہے تو وہ کیا ہے؟ میں یہاں آپ کو دو حدیثیں پیش کررہا ہوں۔

ایک حدیث میں حضرت ملیکہ بنت عمر سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے گائے کے متعلق فرمایا: ''اس کے دودھ میں شفا ہے، اس کی چربی ایک دوا ہے، اور اس کا گوشت ایک بیماری ہے'' (البغوی) یہ حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''گائے کا دودھ اور اس کی چربی کا استعمال کرو؛ لیکن اس کے گوشت سے پرہیز کرو؛ کیوں کہ اس کا دودھ اور چربی دوا ہے، اور گوشت ایک بیماری ہے'' (مستدرک حاکم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ایک گائے ذبح کی (صحیح مسلم:۱۳۱۹) یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی طرف سے قربانی کی ہے'' (صحیح بخاری:۵۵۵۹)

اور صحیح مسلم (۱۲۱۱) کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''اسلامی قانون میں گائے کا گوشت کھانا پسندیدہ نہیں ہے''۔ فقط والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: گائے کا گوشت کھانا شریعتِ اسلام میں بغیر کسی کراہت کے جائز اور حلال ہے، قرآن وحدیث سے اس کا حلال ہونا ثابت ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں باقاعدہ ایک باب باندھا ہے، اور اس میں یہ حدیث نقل کی ہے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قربانی کے دن ہمارے یہاں گائے کا گوشت لایا گیا، تو میں نے کہا کہ یہ کیسا ہے؟ لانے والے نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات کی طرف سے قربانی فرمائی ہے، اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود گائے کا گوشت تناول فرمایا تھا۔

حدثنا عبد اللّٰہ بن یوسف، أخبرنا مالك، عن یحیی بن سعید، عن عمرة بنت عبد الرَّحمن، قالت: سمعتُ عائشة رضي اللّٰہ عنها تقول: خرجنا مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم، لخمس بقین من ذي القعدة، لانری إلا الحج، فلمَّا دنونا من مكة، أمر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم من لم یکن معه هدي إذا طاف وسعی بین الصّفا والمروة أن یحل، قالت: فدخل علینا یوم النَّحر بلحم بقر، فقلتُ: ماهذا؟ قال: نحر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم عن أزواجه.

(صحیح البخاري، رقم:۱۷۰۹، باب ذبح الرجل البقر عن نسائه من غیر أمرهن)

عن محارب أنه سمع جابر بن عبداللّٰہ، یقول: اشتری منّي رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم بعیرا بوقیتین، ودرهم أو درهمین، قال: فلمَّا قدم صرارا أمر ببقرة، فذبحت، فأکلوا منها، فلمَّا قدم المدینة أمرني أن آتي المسجد، فأصلي رکعتین، ووزن لي ثمن البعیر، فارجع لي. (صحیح المسلم، رقم:۷۱۵، باب بیع البعیر)

آپ نے مستدرک حاکم کی جو روایت ذکر کی ہے، محدثین نے دوسری صحیح احادیث کے پیشِ نظر اس کو ضعیف قرار دیا ہے، اور بعض نے اس کو خاص حالات پر محمول کیا ہے:

قال الزَّركشي: الحديثُ الرّابع حديث في البقر: لحومها داء ولبنها شفاء، رواه الحاكم في المستدرك في كتاب الطِّب الذي قبل باب الرِّقاق، حدثني أبوبكر محمّد بن بالوية، ثنا معاذ بن المثنى العبدي، ثنا سيف بن مكيس، ثنا عبدالرحمن بن عبد اللّٰه بن المسعودي عن أبيه عن الحسن بن سعد عن عبد الرحمن بن عبد اللّٰه بن مسعود، عن أبيه عن النَّبي صلى اللّٰه عليه وسلّم قال: عليكم بألبان البقر وسمنانها، وإيّاكم ولحومها؛ فإنّ ألبانها وسمنانها دواءٌ وشفاءٌ ولحومها داءٌ، وقال: هذا حديث صحيح ولم يخرجاه، قلتُ: بل هو منقطع وفي صحّته نظرٌ؛ فإنّ في الصحيح أنّ النبي صلى اللّٰه عليه وسلّم ضحى عن نسائه بالبقر وهو لايتقرب بالدَّاء، وروى ابن حبان في صحيحه من حديث عبداللّٰه بن مسعود مرفوعا: ما أنزل اللّٰه من داء إلا وأنزل له دواء، فعليكم بألبان البقر فإنّها ترمن كل شجر. (التذكرة في الأحاديث المشتهرة: ۱/۱٤۹) **عليكم بألبان البقر وسمنانها وإياكم ولحومها؛ فإنّ ألبانها وسمنانها دواءٌ وشفاءٌ ولحومها داءٌ، قال ابن حجر: كم في الطّب: حدّثني أبوبكر بن بالوية، ثنا معاذ بن المثنى، ثنا سيف بن مسكين، ثنا عبدالرحمن المسعودي، عن الحسن بن سعيد، عنه، به. وقال: صحيح الإسناد. قلتُ: بل سندٌ ضعيفٌ، والمسعودي اختلط.** (إتحاف المهرة: ۱۰/۳۱۲) **قال السَّخاوي: حديث عليكم بألبان البقر وسمنانها وإيّاكم ولحومها؛ فإن ألبانها وسمنانها دواءٌ وشفاءٌ ولحومها داءٌ، الحاكم من حديث ابن مسعود به مرفوعا، وقدكتبتُ فيه جزء ا، وممّا أوردتُه فيه ما صحّ أنه صلى اللّٰه عليه وسلّم ضحى عن نسائه بالبقرة؛ ولكن قال الحليمي: هذا ليس الحجاز ويبوسة لحم البقر ورطوبة لبنها وسمنها، فكأنه يرى اختصاص ذلك به.** (المقاصد الحسنة: ۱/٤٦٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۲۸۴/ تتمہ/ ص، ۱۲۴۱/ ص، ۱۴۳۸ھ)

چند زبان زد احادیث کی تحقیق

سوال: (۱) عورت خدا کا دیا ہوا ایک نایاب تحفہ ہے۔

(۲) حاملہ عورت کی دو رکعت نماز؛ عام عورت کی ستر رکعات نماز سے بڑھ کر ہے۔

(۳) شوہر پریشان گھر آئے، اور بیوی اسے تسلی دے، تو اسے جہاد کا ثواب ملتا ہے۔

(۴) جو عورت اپنے بچے کے رونے کی وجہ سے سو نہ سکے، اس کو ستر غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔

(۵) شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو محبت کی نظر سے دیکھیں، تو اللہ انھیں محبت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

(۶) جو عورت اپنے شوہر کو اللہ کی راہ میں بھیجے، وہ جنت میں اپنے شوہر سے پانچ سو سال پہلے جائے گی۔

(۷) جو عورت آٹا گوندھتے وقت بسم اللہ پڑھے تو اس کے رزق میں برکت ڈال دی جاتی ہے۔

(۸) جو عورت غیر مرد کو دیکھتی ہے، اللہ اس پر لعنت بھیجتا ہے۔

(۹) جب عورت اپنے شوہر کے بغیر کہے ان کے پیر دباتی ہے، تو اسے ستر تولہ سونا صدقہ کرنے کا ثواب ملتا ہے۔

(۱۰) جو پاک دامن عورت نماز روزے کی پابندی کرے، اور جو شوہر کی خدمت کرے، اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

(۱۱) عورت کے ایک بچہ پیدا کرنے پر پچھتر سال کی نماز کا ثواب، اور ہر ایک درد پر ایک حج کا ثواب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: (۱) بعینہ ان الفاظ سے روایت نہیں ملی؛ البتہ مسلم شریف کی روایت: الدُّنیَا کُلُّھَا مَتَاعٌ، وخَیرُ مَتَاعِ الدُّنیَا المرأَۃُ الصَّالِحَۃ. (صحیح مسلم، رقم: ۱٤٦٧) (ترجمہ: ''دنیا سب کی سب نفع اٹھانے کی چیز ہے، اور اس میں عمدہ نفع کی چیز نیک بیوی ہے'') سے اس قسم کا مفہوم نکلتا ہے۔

(۱۱،۴،۲) یہ تینوں روایات ہمیں ان الفاظ کے ساتھ نہیں ملیں؛ البتہ ان سے ملتی جلتی دوروایات ذکر کی جاتی ہیں:

(الف) أنّ سلامة حاضنة إبراهيم ابن النَّبي عليه السَّلام، قالت: يا رسول اللّٰه! تبشِّر الرجال بكلِّ خير ولا تبشِّر النِّساء، قال: أصحابك دسسنك لهذا؟ قالت: أجل، هنَّ أمَرنني، قال: أ فما ترضى إحداكُنَّ أنّها إذا كانت حاملا من زوجها وهو عنها راض أنّ لها مثل أجر الصَّائم القائم في سبيل اللّٰه عز وجل، وإذا أصابها الطلق لم يعلم أهل السَّماء وأهل الأرض ما أخفي لها من قُرَّة أعين، فإذا وضعت لم يخرج جرعةٌ من لبنها، ولم يمُصَّ مصَّة؛ إلا كان لها بكل جرعة وبكل مصَّة حسنة، فإن أسهرها ليلة كان لها مثل أجر سبعين رقبة تعتقهم في سبيل اللّٰه عز وجل، سلامةُ! أ تدرين لمن أعني بهذا؟ هذا للمتعفِّفات الصَّالحات المطيعات اللواتي لا يكفرن العشير. (المعجم الأوسط للطبراني: ۷/ ۲۰، رقم الحديث: ٦٧٣٣، وقال: تفرّد به هشام ابن عمار، ط: بيروت)

(ترجمہ:) ''سلامہ (جو کہ آپ علیہ السلام کے بیٹے ابراہیم کی پرورش کرنے والی خاتون ہیں وہ) کہتی ہیں کہ: اے اللہ کے رسول! آپ مردوں کو ہر طرح کے خیر کی بشارت سناتے رہتے ہیں، اور عورتوں کو نہیں سناتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا تمھاری سہیلیوں نے اس سلسلے میں سازش رچی ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا: ہاں! سہیلیوں نے ہی مجھ کو اس بابت معلوم کرنے کو کہا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی کو اس بات سے خوشی نہیں ہوتی کہ جب وہ اپنے شوہر سے حاملہ ہوتی ہے (بہ شرطے کہ اس کا شوہر اس سے راضی رہا ہو) اس صورت میں اس کو وہی اجر ملتا ہے، جو اللہ کے لیے روزہ رکھنے والے مجاہد کو ملتا ہے، اور تم میں سے کوئی جب دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہے تو اللہ نے اس کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور باعثِ تسکین؛ جن جن چیزوں کو چھپا رکھا ہے، اس کا علم نہ تو آسمان میں رہنے والوں کو ہے، اور نہ ہی زمین میں رہنے والوں کو، اور جب تم میں سے کوئی بچہ جنتی ہے، تو اس کے دودھ میں سے نکلے ہوئے ہر گھونٹ اور چُسکی پر اس کو اجر ملتا ہے، اور جب وہ رات میں بچے کے لیے بیدار رہتی ہے، تو اس کو اللہ کی راہ میں ستر غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے، اے سلامہ! کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس اجر کی مستحق کون سی عورتیں ہیں؟ اس کی مستحق وہی عورتیں ہیں، جو نیک، پاک دامن اور فرماں بردار ہوں، اور جو اپنے شوہروں کی احسان فراموش نہ ہوں''۔

(ب) إذا حملت المرأة فلها أجر الصّائم القائم القانت المخبت المجاهد في سبيل اللّٰه عز وجل، فإذا ضربها الطلق فلايدري أحدٌ من الخلائق ما لها من الأجر، فإذا وَضَعَت فلها بكل وضعة عتق نسمة. (الكامل لابن عدي: ١٦٦/٣)

(ترجمہ:) ''جب عورت حالتِ حمل میں ہوتی ہے تو اسے وہی اجر ملتا ہے جو روزہ رکھنے والے، قیام کرنے والے، فرماں بردار، متواضع اور راہِ خدا میں جہاد کرنے والے مرد کو ملتا ہے، اور جب وہ دردِ زہ میں مبتلا ہوتی ہے، تو اس کے لیے وہ نیکیاں ہیں جس کا علم کسی مخلوق کو نہیں ہے، اور جب وضعِ حمل ہوجائے، تو ہر وضع پر اس کو ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے''۔

البتہ ان دونوں روایتوں میں ضعف ہے۔

(۳) یہ بات کنز العمال کی ایک حدیث کا خلاصہ ہے: **إنّ رجلا قال: يا رسول اللّٰه! إنّ لي امرأة إذا دخلتُ عليها قالت لي: مرحبا بسيّدي وسيّد أهل بيتي، فإذا رأتني حزينا قالت: ما يحزنك؟ الدنيا؟ وقد كفيت أمر الآخرة! قال النبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم: أخبرها أنّها عاملةٌ من عمّال اللّٰه، ولها نصف أجر المجاهد.** (كنز العمال، رقم الحديث: ٤٥١٥٠)

(ترجمہ: ''ایک صحابی کہتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! میری ایک بیوی ہے، جب میں اس کے پاس جاتا ہوں تو کہتی ہے: میرے اور میرے گھر والوں کے سردار! خوش آمدید! اور جب وہ مجھے غم زدہ دیکھتی ہے، تو کہتی ہے کہ کس چیز نے آپ کو مبتلائے غم کیا؟ کیا دنیا نے؟ حالاں کہ آپ آخرت کے عذاب سے محفوظ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے بتا دو کہ وہ اللہ کے کارندوں میں سے ایک کارندہ ہے، اور اس کے لیے مجاہد کے ثواب کا نصف ہے'') اس روایت میں بھی ضعف ہے۔

(۵) یہ روایت ''**التّدوين في أخبار قزوين**'' (٤٧/٢) میں ان الفاظ سے آئی ہے:

إنّ الرّجل إذا نظر إلى امرأته ونظرت إليه، نظر اللّٰه تعالى إليهما نظر رحمة، وإذا أخذها بكفِّها تساقطت ذنوبهما من خلال أصابعهما. (كنز العمال، رقم:٤٤٤٣٧)

(ترجمہ: ''جب زوجین ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ رحمت ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اور جب شوہر بیوی کو پکڑتا ہے، تو دونوں کے گناہ انگلیوں سے جھڑتے ہیں'')؛ لیکن یہ روایت اسماعیل بن یحییٰ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

(٦) یہ بات یا اس کا مفہوم ہمیں کسی روایت میں نہیں ملا۔

(۷) بسم اللہ پڑھنے کی برکت ہر کام میں ہوتی ہے، من جملہ اُن کے آٹا گوندھنا بھی ہے۔

(۸) یہ بات ان الفاظ سے کسی روایت میں نہیں ملی؛ البتہ غیر مرد کو دیکھنا؛ بالخصوص شہوت کے ساتھ ممنوع ہے، احادیث وقرآن سے یہ مفہوم ثابت ہے۔

(۹) یہ بات بھی کسی روایت میں نہیں ملی؛ البتہ شوہر کی اطاعت، خدمت اور اس کے ساتھ حسن معاشرت دیگر احادیث سے ثابت ہے۔

جهادُ المرأة حسن التّبعل لزوجها. (كنز العمال، رقم: ٤٤٣٠٨) **قالت امرأةٌ: يا رسول اللّٰه! ما جزاء غزو المرأة؟ قال: طاعة الزّوج واعترافٌ بحقِّه.** (المعجم الكبير للطبراني: ٢٩٣/١٠، رقم: ١٠٧٠٢)

(ترجمہ: ''عورت کا جہاد اپنے شوہر کی اچھی بیوی بن کر رہنے میں ہے، ایک عورت نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! غزوے کا عوض (بدل) عورت کے حق میں کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شوہر کی فرماں برداری، اور اس کے احسان کو ماننا'')

(۱۰) المرأة إذاصلَّت خمسها وصامت شهرها وأحصنت فرجها وأطاعت بعلها فلتدخل من أيِّ أبواب الجنَّة شاء ت. (مشكاة، ص: ٢٨١)

(ترجمہ: ''عورت جب پنج وقتہ نمازی ہو، رمضان میں روزے رکھتی ہو، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرتی ہو، اور اپنے شوہر کی سنتی ہو، ایسی عورت جنت کے جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہوجائے) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۲۲ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۳۷/تتمہ/د، ۲۵۲/د، ۱۴۳۸ھ)

حدیثِ مصافحہ ومشابکہ کی تحقیق

سوال: قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم: من صافحني أو صافح من صافحني إلى يوم القيامة دخل الجنة.

ترجمہ: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: جس نے مصافحہ کیا مجھ سے یا کسی ایسے شخص سے جس نے مجھ سے مصافحہ کیا ہو، اسی طرح قیامت تک، تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

قال: رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم: من شابكني أو شابك من شابكني إلى يوم القيامة دخل الجنَّة.

ترجمہ: فرمایا حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے: جس نے پنجہ ملایا مجھ سے یا کسی ایسے شخص سے جس نے مجھ سے پنجہ ملایا ہو، اسی طرح قیامت تک؛ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

محترم حضرت مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند! گزارشِ خدمت ہے کہ اس حدیث کی سند کس کتاب میں ہے؟ تحریر فرما کر مشکور فرمائیں، اور کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ **بینوا توجروا**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰه التوفیق: مذکور فی السوال حدیثِ مصافحہ: **قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: من صافحني أو صافح من صافحني إلى يوم القيامة دخل الجنَّة.** کو اگرچہ کئی اصحابِ مسلسلات نے روایت کیا ہے، مثلاً: کتّانی نے اپنی مسلسلات "**رسالة المسلسلات**" (ص: ۵۵) میں، اور ابن الطیب وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے؛ لیکن اکثر محدثین نے اس کو باطل قرار دیا ہے؛ چناں چہ مولانا عاشق الٰہی صاحب علیہ الرحمہ نے "**الفضل المبين**" کے حاشیے میں، اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے "**ظفر الأماني**" کے حاشیے میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث دو طرق سے مروی ہے: **أبو سعيد الحبشي** اور **معمر المعمر** کے طریق سے، اور ان دونوں نام کے کسی بھی صحابی کا تذکرہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں ملتا، ابن الطیب نے اپنی مسلسلات میں ابوسعید الحبشی والی روایت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

فهي مع الجهل برجالها وعدم معرفة حفاظها، روائح الوضع فائحة من فواتح ألفاظها. یعنی: اس حدیث کے موضوع ہونے کی بو تو اس کے ابتدائی الفاظ سے ہی آرہی ہے۔

اور معمر المعمر والی روایت کا تو سخاوی نے بہت سختی سے رد کیا ہے، یہاں تک کہ جو شخص اس کو روایت کرے، اور اس کے باطل ہونے کو بیان نہ کرے اس پر لعنت کی ہے۔

ابن حجر نے معمر کے بارے میں کہا ہے: **المعمر شخصٌ اختلقه بعض الكذّابين.**

(الإصابة في تمييز الصحابة: ۶/۲۹۱)

سیوطی نے کہا ہے: **معمر كذّابٌ دجالٌ، حديثه باطلٌ لا تحل روايته ولا التّحدث به.**

خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو اپنی مسلسلات "**الفضل المبین في المسلسل من حدیث النبي الأمین**" میں روایت نہیں کیا؛ بل کہ حدیث مسلسل بالمصافحہ کے عنوان سے، حضرت ابو ہرمز کے طریق سے، حضرت انس رضی اللہ عنہ تک؛ فعلِ مصافحہ کا تسلسل اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا:

صافحتُ بکفّي هذه کفَّ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم، فما مسستُ خزا ولا حریرا ألین من کفّه صلی اللّٰه علیه وسلّم.

محدثین نے اگرچہ ابو ہرمز کے طریق سے فعلِ مصافحہ کے تسلسل کا انکار کیا ہے؛ لیکن ثابت بنانی کے طریق سے مروی؛ فعلِ مصافحہ کے تسلسل کو صحیح قرار دیا ہے، ابن الطیب کا کہنا ہے: **جزم بأنّ هذه أصحّ المصافحات.**

اور مذکور فی السوال حدیثِ مصافحہ کو حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے رسالے "**النّوادر من حدیث سیِّد الأوائل والأواخر**" میں دونوں طرق سے نقل کیا ہے؛ لیکن خود شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے مقدمے میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ میں نے ان کی ندرت کی وجہ سے اُنھیں جمع کیا ہے، اُن کی صحت کی وجہ سے نہیں: **جمعتُها في هذه الرِّسالة استغرابًا لها لا تنویهًا بصحّتها.**

مذکور فی السوال دوسری حدیث: حدیثِ مشابکہ کو بھی علامہ کتّانی، ابن الطیب اور صاحبِ "**ظفر الأماني**"، وغیرہ کئی اصحابِ مسلسلات نے اپنی مسلسلات میں روایت کیا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ ایک خواب میں پیش آنے والا واقعہ ہے؛ لہٰذا اس کی حیثیت بھی خواب سے زیادہ نہیں ہے، اور جس طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں کسی فعلِ مباح کو کرتے ہوئے دیکھ کر تبرکًا کرنا جائز ہے، اسی طرح یہ بھی ہے، ظفر الامانی میں اس کے بعد "منح" کے حوالے سے لکھا ہے: **إنّه رؤیا، ولا بأس به للتّبرك.**

خود حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے اس حدیث کو اپنی مسلسلات میں ذکر نہیں کیا؛ بل کہ اپنے دوسرے رسالے "**الدّر الثّمین في مبشّرات النّبي الأمین**" میں روایت کیا ہے، جس میں اُنھوں نے اپنے خواب اور دوسروں کے خوابوں میں ملنے والی بشارتوں کو جمع کیا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/۱۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۷۹/ تتمہ ر د، ۱۰۵۰/ د، ۱۴۳۸ھ)

کھانے کے بعد کی مشہور دعا کے الفاظ کی تحقیق

سوال: کھانے کے بعد کی مشہور دعا میں ”وجعلنا“ کے بعد ”من“ ہے یا نہیں؟ دینیات (ممبئی) کی کتب میں ”وجعلنا مسلمین“ لکھا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: کھانے کے بعد کی مطلوبہ دعا دس سے زائد کتب حدیث میں مذکور ہے، اور ساری جگہوں پر ”**وجعلنا مسلمین**“ ”من“ کے بغیر ہی ذکر ہے، نیز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خصائلِ نبوی (ص:۲۴۹) کے حاشیے میں شمائل ترمذی میں ”من“ کے بغیر واردشدہ حدیث کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:

هكذا في جميع النُّسخ الموجودة من الهندية والمصرية، وفي بعض الحواشي بطريق النُّسخة : ”من المسلمين“؛ اس لیے آپ دعا بغیر ”من“ کے ہی پڑھا کریں۔

حوالۂ کتب مندرجہ ذیل ہیں:

أخرجه أبوداؤد (كتاب الأطعمة، باب ما يقول الرجل إذا طعم، رقم الحديث: ٣٨٥٠) **والتّرمذي** (كتاب الدعوات، باب ما يقول إذا فرغ من الطعام، رقم الحديث: ٣٤٥٧) **وفي شمائله مع جمع الوسائل** (ما جاء في قول رسول الله –صلى الله عليه وسلّم– قبل الطعام: ٢٩٠/١) **والنّسائي في الكبرى** (رقم الحديث: ١٠١٢٠، ١٠١٢١، ١٠١٢٢) **وفي عمل اليوم واللّيلة** (رقم الحديث: ٢٨٨، ٢٨٩، ٢٩٠) **وابن ماجه** (كتاب الأطعمة، باب مايقال إذا فرغ من الطعام، رقم الحديث: ٣٢٨٣) **وابن السّني في عمل اليوم والليلة** (باب ما يقول إذا أكل، رقم الحديث: ٤٦٤) **وابن أبي شيبة مرفوعاً** (الأطعمة، في التّسمية على الطّعام، رقم الحديث: ٢٤٩٩٢) **وموقوفاً** (رقم الحديث: ٢٤٩٩٥)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۷۶/تتمہ ر ل، ۱۷۴/ر ل، ۱۴۳۸ھ)

”اطلُبوا العلم ولو بالصّین“ کی تحقیق اور علم کا صحیح مصداق

سوال: ایک حدیث ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”علم سیکھو! اگر چہ تمھیں چین جانا پڑے“ اس حدیث کے بارے میں ہمارے یہاں کے ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ حدیث شیعہ وغیرہ لوگوں کی بنائی ہوئی ہے، کیوں کوئی علم سیکھنے سعودی جائے گا یا چین جائے گا؟ تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ حدیث صحیح ہے یا بنائی ہوئی ہے؟ اگر صحیح ہے تو اس کا جواب حوالے کے ساتھ دیں، جس سے مجھے اطمینان ہو جائے۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: مذکورہ حدیث کو امام بیہقی، علامہ سیوطی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا، ابن حبان نے باطل، اور ابن جوزی نے موضوع قرار دیا، اور حافظ مزی نے حسن لغیرہ، اور حافظ ذہبی نے اس کی بعض سند کو صالح قرار دیا ہے۔

قال البیهقي: هذا حدیثٌ متنُه مشهورٌ، وإسنادُه ضعیفٌ، وقد روي من أوجه کلُّها ضعیفٌ. (شعب الإیمان: ۱۹۳/۳، رقم: ۱۵۴۳، ط: مکتبة الرشد، ریاض)

وقال الإمام العجلُوني: اطلُبوا العلم ولو بالصِّین؛ فإنّ طلب العلم فریضةٌ علی کلِّ مسلم، رواه البیهقي والخطیب وابن عبد البر والدّیلمي وغیرهم عن أنس وهو ضعیفٌ؛ بل قال ابن حبّان: باطلٌ، وذکره ابن الجوزي في الموضوعات: ونوزع بقول الحافظ المزِّي: له طرقٌ ربما یصل بمجموعها إلی الحسن، ویقول الذَّهبي في تلخیص الواهیات: روي من عدَّة طرق واهیة، وبعضُها صالح. (کشف الخفاء: ۱۵۶/۱، ط: مکتبة عصریة)

واضح رہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بہ شرطِ ثبوت کے اس سے علم دین مراد ہے، تفصیل کے لیے مطالعہ فرمائیں (باقیات فتاوی رشیدیہ، ص:۳۹۸-۴۰۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۳۵/د،۵۴/د، ۱۴۳۸ھ)

علم اور فن میں کیا فرق ہے؟ اور کیا دنیاوی علوم بھی اصطلاح شرع میں علم کہلائیں گے؟

سوال: علم کیا ہے؟ اسلامی نظریے سے علم کسے کہا جائے گا؟ کیا قرآن وحدیث کے علم کے علاوہ دنیاوی علم، جیسے: سیارات کا نظام، بارش کا نظام، زمین کا نظام، انسانی پیدایش اور انسانی اعضاء کا نظام وغیرہ کو علم نہیں کہہ سکتے؟ ہنر اور علم میں کیا فرق ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: لغت کے لحاظ سے تو علم کے مفہوم میں بہت توسع ہے، نظام سیارات وبارش اور پیدایش واعضاء وغیرہ کے جاننے، اور ان کے متعلقات کی معلومات حاصل کرنے پر علم کا اطلاق کیا جاسکتا ہے؛ مگر اصطلاح شرع میں علم سے مراد: قرآن کریم، حدیث شریف اور دینی احکام کا علم ہی ہوتا ہے، الغرض اللہ جل شانہ اور حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا وخوش نودی جن علوم سے حاصل ہوتی ہے، وہ درحقیقت علم ہے، اور جن امور کا تعلق اصالۃً کسبِ معاش کے قبیل سے ہو، ان امور کے حاصل کرنے کو فن اور ہنر سے تعبیر کیا جاتا ہے، شریعتِ مطہرہ نے کسی فن یا ہنر کو سیکھنے اور سکھانے سے ممانعت نہیں فرمائی؛ بل کہ حدودِ شرعیہ میں رہتے ہوئے اُن کو حاصل کرنا مطلوب ہے؛ البتہ بہ قدرِ ضرورت علم دین کا حاصل کرنا فرض عین ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۳/۱۳ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۲/۱۳ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۶۵/ھ، ۹۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مہدیؓ کس مکتبِ فکر کی پیروی کریں گے؟

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی رضی اللہ عنہ چار مکاتبِ فکر میں سے کس مکتبِ فکر پر عمل کریں گے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام کی شان تو بہت اعلیٰ وارفع ہے، حضرت مہدی رضی اللہ عنہ بھی مجتہد مطلق کے درجے پر فائز ہوں گے؛ اس لیے ان حضرات کو چاروں مکاتبِ فکر میں سے کسی مکتبِ فکر کی تقلید کی حاجت نہ ہوگی؛ بل کہ یہ حضرات اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق عمل فرمائیں گے؛ بل کہ احکامات کی تنفیذ فرمائیں گے۔ فتاوی شامی میں ہے:

وإنّما يحكم (نبي اللّٰه عيسىٰ على نبيّنا وعليه الصّلاةُ والسّلام) **بالاجتهاد.... ومايُقال: إنّ الإمام المهدي يُقلِّدُ أباحنيفة، ردَّه ملّاعلي القاري في رسالة المشرب الوردي في مذهب المهدي، وقرَّر فيها أنَّه مجتهدٌ مطلقٌ اهـ.** (۳۹/۱، ط: نعمانیہ، دیوبند)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۱۶ھ الموافق: ۲۰۱۷/۲/۱۴ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۱۵/ھ، ۶۸۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

تقلید کے حرام ہونے کا ابن حزم کا موقف جمہور کے خلاف ہے

سوال: غیر مقلدین امام ابن حزم کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں، امام ابن حزم نے فرمایا: **والتَّقليدُ حرامٌ** اور تقلید حرام ہے۔ (النبذة الكافية في أحكام أصول الدين، ص: ۷۰) اور فرمایا: اور عامی وعالم (دونوں) اس (حرمتِ تقلید میں) برابر ہیں، ہر ایک اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق اجتہاد کرے گا۔ (النبذة الكافية، ص: ۱) برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: تقلید شخصی کے باب میں امام ابن حزم رحمہ اللہ کا قول ائمہ اربعہ، ائمہ مجتہدین اور جمہورِ امت کے خلاف ہے؛ اس لیے کہ جمہور کے نزدیک غیر مجتہد کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید واجب وضروری ہے؛ چناں چہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف وجوہ سے یہ مبرہن کیا ہے کہ تمام مفاسد کا؛ سدِ باب

اور مکمل حزم واحتیاط اسی میں ہے کہ اِن ائمہ میں سے کسی ایک کی تقلید کی جائے، فرماتے ہیں:

واعلم أنّ في الأخذ بهذه المذاهب الأربعة مصلحةٌ عظيمةٌ وفي الإعراض عنها مفسدةٌ كبيرةٌ. (عقد الجيد، ص:١٣، ط: المطبعة السلفية، القاهرة)

جاننا چاہیے کہ اِن چار مذاہب کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے، اور اُن سب سے یک سر روگردانی میں بڑا فساد ہے۔ (چند اہم عصری مسائل: ۱/۱۴۱-۳۴۱، ط: مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں باقیات فتاویٰ رشیدیہ (ص:۴۰۵ تا ۴۰۹، ط: حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ)

اور تقلید کی شرعی حیثیت، از: مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۶۱/د، ۲۰۲/د، ۱۴۳۸ھ)

غیر مقلدین کے تقلید پر کیے جانے والے چند شبہات اور ان کے جوابات

سوال: غیر مقلدین امام ابوداؤد کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں کہ امام ابوداؤد السجستانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے (امام) احمد (بن حنبل) سے پوچھا: کیا (امام) اوزاعی، امام مالک سے زیادہ متبع سنت ہیں؟ انھوں نے فرمایا: اپنے دین میں ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید نہ کر الخ۔ (مسائل ابی داؤد، ص:۲۷۷) برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: غیر مقلدین کا طرزِ استدلال آنکھوں میں دھول جھونکنے والا ہوتا ہے، دعوے کے وقت وہ غیر مقلد ہوتے ہیں، اور دلیل پیش کرتے وقت؛ مقلد بن جاتے ہیں، تقلید کا رد کرنے کے لیے تقلید ہی کو اختیار کرتے ہیں، یہ عجیب استدلال ہے، غیر مقلدین سے پوچھیے کہ تم امام ابوداؤد رحمہ اللہ، امام نخعی رحمہ اللہ، امام بخاری رحمہ اللہ، امام ابن تیمیہ وغیرہم حضرات کی تقلید کرتے ہو تو جائز، اور مقلدین حضرات؛ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (ائمہ اربعہ) میں سے کسی ایک امام کی تقلید کریں تو یہ ناجائز؛ بدعت اور شرک ہو جاتا ہے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ غیر مقلدین سے کہیے کہ تمھیں کسی امام کے قول

سے دلیل پیش کرنے کا کوئی حق نہیں؛ کیوں کہ تمھارے دو ہی اصول ہیں: فرمانِ خدا اور فرمانِ رسول؛ لہٰذا اگر تمھارے پاس ردِتقلید پر قرآن کی صریح آیت یا صحیح غیر متعارض مرفوع حدیث ہے تو اسے پیش کرو؛ ورنہ غیر مقلدیت سے توبہ کرو۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۲/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۲۲۰/تتمہ/م، ۲۲۹/م، ۱۴۳۸ھ)

سوال: غیر مقلدین امام شافعی کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میری ہر بات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے خلاف ہو (چھوڑ دو) بس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سب سے بہتر ہے، اور میری تقلید نہ کرو۔ (آداب الشافعي ومناقبه لابن أبي حاتم، ص: ۵۱، وسنده حسن) برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: غیر مقلدین کا ردِتقلید پر حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے قولِ مذکور سے بھی استدلال تام نہیں ہوتا، اگر امام شافعی رحمہ اللہ کی جانب مذکورہ قول کی نسبت صحیح اور ثابت ہے، تو مطلب واضح ہے کہ صحیح حدیث کے مقابلے میں میری بات کی پیروی نہ کرو، مقلدین حضرات اپنے امام کی تقلید اُنھی مسائل میں کرتے ہیں، جہاں قرآن وحدیث میں صاف حکم مذکور نہیں ہے، قرآن وحدیث میں جو حکم صاف موجود ہے، اس میں نہ کسی امام کی تقلید کی جاتی ہے نہ اس کی ضرورت ہے؛ پس غیر مقلدین کا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول مذکور سے ردِتقلید پر استدلال درست نہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۲/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۲۲۱/تتمہ/م، ۲۳۰/م، ۱۴۳۸ھ)

سوال: سوال یہ اٹھتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں نہ یہ فقہ تھی، نہ ہی مسلک اور نہ ہی یہ تاکید کہ کسی خاص امام یا فرقے کی پیروی کرنی ہے؛ الاّ یہ کہ جو کچھ قرآن وحدیث میں موجود ہے، اس پہ عمل کرنے والا ہی کامیاب ہے، قرآن پاک کے احکامات پہ تو کوئی عجز اٹھ ہی نہیں سکتا؛ البتہ فرق احادیث کی روایات میں ہیں، تو برادرم اگر کوئی شخص

ان تضاد سے مبرا ہو کے جو صحاح ستہ کی احادیث میں بیان ہوا ہے؛ اسے اپنائے، اس شخص کے بارے میں علماء کا کوئی بیان ہے؟ مثال کے طور پہ: میں نے صحاح ستہ کا مطالعہ کیا ہے، وہاں رفع یدین کے بیان میں؛ زیادہ احادیث میں کرنے پہ زور ہے، اور ایک حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ذکر ہے کہ نہیں کرنا، اسی طرح امام کے پیچھے آمین کہنے، نمازِ قصر کے بیان وغیرہ میں مختلف روایات سے مختلف طریقے بیان ہیں، تو اگر ایک شخص صحاح ستہ کو سامنے رکھ کے عبادات کے عمل کرے تو اس کے عذر کا وزن کیا ہوگا؟ اس کے علاوہ مہربانی فرما کے یہ بھی بتا دیجیے گا کہ مختلف احادیث پہ مختلف عمل کرنے پہ کیا اختلاف ہے؟ اور اگر کوئی شخص کسی خاص فرقے کا داعی نہ ہو تو کیا ہوگا؟ اسی طرح دو اشخاص کا حدیث کے معاملے میں اختلاف آ رہا ہو، اور ایک دوسرے کو غلط جانا جائے تو دین میں ان کی کیا حیثیت ہوگی؟ جواب اگر توسط کے ساتھ مل جائے تو بہتر ہے؛ کیوں کہ کسی کو بتانا ہو تو آج کل لوگ ریفرینس کے بغیر قبول کرنے میں ہچکچاتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: عام آدمی مختلف فیہ آحادیث کے مابین یہ فرق نہیں کرسکتا کہ کون سی حدیث ناسخ ہے، اور کون سی منسوخ، کون سی حدیث راجح ہے، اور کون سی مرجوح، اور کون سی حدیث کا کیا درجہ ہے، اور اس کا محل اور مصداق کیا ہے؟ اسی لیے ہر کس و ناکس کو اس کی اجازت نہیں کہ صحاح ستہ کو سامنے رکھ کر- کسی ماہر مستند اہل حق عالم سے پڑھے اور سمجھے بغیر- از خود عمل کرنا شروع کردے، اس سے گم راہی کا اندیشہ ہے، اور نفسانی خواہشات کی پیروی میں پڑ جانے کا خطرہ ہے، جیسے: کوئی نابینا شخص ہو جو راستے کے خطرات اور نشیب وفراز سے ناواقف ہو، اور وہ کسی بینا شخص کا ہاتھ پکڑے بغیر، اور کسی جان کار کی راہ نمائی کے بغیر اس راستے پر چل پڑے، تو امکان اس کا ہے کہ وہ راستہ بھٹک جائے یا راستے کے گڑھے میں گر پڑے؛ اس لیے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ جو حضرات قرآن وحدیث اور دین وشریعت کے ماہرین ہیں، اُن کی تشریحات پر اعتبار کیا جائے، اسلاف میں سے حضرات ائمہ اربعہ کی علمی بصیرت اور اجتہادی شان پر دنیائے اہل علم کا اتفاق ہے، اور اُن کے مذاہب ومسائل کتابوں میں مدوّن ہیں؛ اس لیے ان چار ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک امام کی تقلید لازم وواجب ہے؛ اس لیے کہ فقہائے کرام احادیث کے معانی اور مفاہیم کو سب سے زیادہ جانتے ہیں؛ لہٰذا اپنی ناقص فہم کے مقابلے میں ان مجتہدین کے فہم پر اعتماد کرنا بہ درجہا بہتر ہے۔

تقلید کیوں ضروری ہے؟ اور عدمِ تقلید کی صورت میں کیا نقصان ہے؟ اور ائمہ اربعہ میں سے ہی کسی ایک کی تقلید کیوں لازم ہے وغیرہ وغیرہ؟ ان تمام موضوعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: (اجتہاد وتقلید کا آخری فیصلہ، افادات: حضرت تھانوی رحمہ اللہ، ترتیب: مولانا زید مظاہری صاحب، اور آپ کے مسائل اور ان کا حل، جلد اول، ص: ۲۷-۳۲، مطبوعہ: زکریا، دیوبند، از: مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۷/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۲۴۲/تتمہ/م، ۱۷/۳/م، ۱۴۳۸ھ)

سوال: غیر مقلدین فقہ حنفی کے اس مسئلے پہ اعتراض کرتے ہیں، اور الزام لگاتے ہیں کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے: حدیث مبارکہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا خلیفہ (امام) بنایا وہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، اور وہ ''نابینا'' تھے: (ابوداؤد: ۵۹۵)

فقہ حنفی: **ویکرہ تقدیم العبد والأعمی** نابینا آدمی کی امامت کو مکروہ سمجھا گیا ہے۔ (ھدایہ: ۱/۱۲۴، مکتبہ رحمانیہ) برائے مہربانی اس کا مدلل جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملھم الصواب: نابینا اگر متقی پرہیزگار ہو، اور پاکی صفائی کا پورا خیال رکھنے والا ہو، تو اس کی امامت بلا کراہت درست ہے، حدیثِ مذکور سے نابینا کی امامت کا جواز ثابت ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہدایہ کی عبارت میں اعمی کی امامت کو جو مکروہ لکھا ہے، اس میں کراہت سے مراد: تنزیہی ہے، یعنی: خلافِ اولیٰ ہے، اور جواز اور مکروہ تنزیہی کے مابین مغایرت نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ نابینا کی امامت جائز ہے؛ البتہ اچھا نہیں، اور مکروہ تنزیہی کی وجہ یہ ہے کہ نابینا شخص بالعموم اپنی بصارت سے محروم ہونے کی وجہ سے بدن اور کپڑے کی طہارت ونظافت کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھ پاتا، اور نماز کے دوران قبلے سے بسا اوقات کچھ انحراف بھی ہو جاتا ہے؛ اس لیے بہتر یہ ہے کہ نابینا کو امام نہ بنایا جائے؛ لیکن اگر نابینا ایسا ہو جو دوسروں سے تقویٰ وطہارت میں آگے ہو، تو ایسے شخص کی امامت بلا کراہت درست ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استخلاف سے ثابت ہوتا ہے؛ پس حدیث وفقہ حنفی کے مابین کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

کره إمامة الأعمی؛ لأنّه لایتوقی النّجاسة ولا یهتدي إلی القبلة بنفسه ولا یقدر علی استیعاب الوضوء غالباً إلخ. (تبیین الحقائق للزیلعی: ۱/۱۳٤) **وکره إمامة العبد والأعمی؛ لعدم اهتدائه إلی القبلة وصون ثیابه عن الدَّنس، وإن لم یوجد أفضل منه فلا کراهة.** (مراقي الفلاح، ص: ۱٦٤) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقارعلی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۰/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۳۲۷/م،۳۱۲/م، ۱۴۳۸ھ)

غیرمقلدین کا امام ابوحنیفہؒ کے قول سے عدمِ تقلید پراستدلال اوراس کا جواب

سوال: غیرمقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایک دن قاضی ابویوسف کو فرمایا: اے یعقوب! (ابویوسف!) تیری خرابی ہو، میری ہر بات نہ لکھا کر، میری آج ایک رائے ہوتی ہے، اورکل بدل جاتی ہے،کل دوسری رائے ہوتی ہے، پھر پرسوں وہ بھی بدل جاتی ہے۔ (تاریخ بغداد:۱۳/۴۲۴، تاریخ ابن معین: ۲/۶۰۷، وسندہ صحیح)

برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: تاریخ بغداد کے حوالے سے جو بات نقل کی گئی ہے، اس سے تقلید کا رد نہیں ہوتا ہے؛ بل کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب اپنے اصحاب کو مسائل میں کوئی ایک قول ثابت ومحقق ہونے سے پہلے جلدی لکھ لینے سے احتیاطاً منع کررہے ہیں؛ لہٰذا اس عبارت سے تقلید کا رد کرنا درست نہیں، کما لایخفی علی متدبّر۔

قال الشّیخ زاهد الکوثري رحمه اللّٰه بعد سرد هذه الرِّوایة: انظر کیف کان ینهی أصحابه عن تدوین المسائل إذا تعجَّل أحدهم بکتابتها قبل تمحّصها کما یجب، فإذا أحطت بما سبق علمت صدق مایقوله الموفّق المکي (۱۱۳/۲) **حیث قال: بعد أن ذکر کبار أصحاب أبي حنیفة: وضع أبو حنیفة مذهبه شوری بینهم، لم یستبدّ فیه بنفسه**

دونهم اجتهاداً منه في الدّين ومبالغة في النَّصيحة للّٰه ورسوله والمؤمنين، فكان يلقي المسائل مسألة مسألة ويسمع ما عندهم ويقول ما عنده ويناظرهم شهراً أو أكثر حتى يستقر أحدُ الأقوال فيها، ثم يثبتها أبويوسف رحمه اللّٰه تعالىٰ في الأصول. (مقدمة نصب الراية: ١/٢٣) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　١/٣/١٤٣٨ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(٢٦٠/تتمہ/ل، ١٩١/ل، ١٤٣٨ھ)

غیر مقلدین کا تقلید کے رد میں علامہ عینیؒ کے قول سے استدلال اور اس کا جواب

سوال: غیر مقلدین امام عینی حنفی کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں:

عینی حنفی نے کہا: پس مقلد غلطی کرتا ہے، اور مقلد جہالت کا ارتکاب کرتا ہے، اور ہر چیز کی مصیبت تقلید کی وجہ سے ہے۔ (البنایہ شرح الہدایہ: ١/١٣١٧) برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: علامہ عینی کے اس جملے سے تقلید کا رد مقصود نہیں؛ بل کہ صرف شیخ علاءَ الدین رحمہ اللہ کی ایک غلطی پر تنبیہ مقصود ہے کہ شیخ علاءَ الدین رحمہ اللہ نے محض نقل میں دوسرے کی اتباع کرنے کی وجہ سے غلطی کردی، یعنی: جو روایت دراصل **مُسلم عن أبي هريرة** مروی تھی، محض دوسرے کے نقل پر اعتماد کی وجہ سے **مُسلم عن طلحة** کردی، علامہ عینی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ووهم الشّيخ علاؤ الدّين التّركماني في عزوه هذا الحديث لمُسلم عن طلحة، وإنَّما رواهُ مسلمٌ عن أبي هريرة –رضي اللّٰه عنه– وروى بعضُه عن جابر ولم يخرج مسلم لطلحة في كتابه؛ إلا في خمسة أحاديث ليس هذا منها.

(ترجمہ:) شیخ علاءَ الدین ترکمانی کو وہم ہوا ہے کہ اُنھوں نے اس حدیث کو صحیح مسلم کے حوالے سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی مروی قرار دیا، حالاں کہ صحیح مسلم میں یہ روایت حضرت ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس روایت کے بعض الفاظ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہیں، امام مسلم نے تو اپنی صحیح میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے صرف پانچ احادیث کی تخریج کی ہیں، اُن میں یہ روایت نہیں ہے۔

اس کے بعد علامہ عینی نے بھی صحیح مسلم کی وہی پانچ روایات نقل کیں، اوراس کے بعد مذکورہ بالا جملہ یوں لکھا: **فالمقلّد ذهل والمقلّد جهل، وآفةُ كل شيء من التّقليد.**

(ترجمہ:) بات نقل کرنے والے سے بھول ہوگئی، اور جس شخص سے بات نقل کی ہے اس سے بھی خطا ہوگئی ہے، اور ہر شے کی آفت اسی بلا تحقیق نقل کا نتیجہ ہے۔ (البنایۃ: ۱/۱۷۱ ۳)

پتا چلا کہ علامہ عینی کا مقصد اصطلاحی تقلید کی نفی نہیں ہے، اس کی یہ نظیر بھی ہوسکتی ہے کہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں سورۂ یوسف کی تفسیر کے تحت ایک لفظ کے بارے میں امام بخاری پر ان الفاظ سے علمی گرفت کی ہے:

قلتُ: كأنَّه لم يفحص عن ذلك كما ينبغي وقلّده أبا عبيدة، والآفةُ من التَّقليد.

(ترجمہ:) میں (علامہ عینی) کہتا ہوں کہ امام بخاری نے اس لفظ کی جس طرح تحقیق کرنی چاہیے تھی، تحقیق نہیں کی؛ بل کہ امام ابوعبیدہ کی اتباع کی ہے، اور یہ آفت اسی نقل کی وجہ سے ہے۔

(عمدۃ القاری: ۱۸/۳ ۲۰)

اگر غیر مقلدین کو ان مقامات پر تقلید کا اصطلاحی معنی کرنے پر ہی اصرار ہے، تو کیا **قلّد أبا عُبيدة** کی وجہ سے امام بخاری علیہ الرحمۃ کو امام ابوعبیدہ کا مقلد اور اُن کی تقلید کرنے والا قرار دیں گے؟

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۳/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۲۶/تتمہ/ل، ۲۷۵/ل، ۱۴۳۸ھ)

غیر مقلدین کا تقلید کے رد میں علامہ زیلعیؒ کے قول سے استدلال اور اس کا جواب

سوال: غیر مقلدین امام زیلعی حنفی کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں، زیلعی حنفی نے کہا:

فالمقلّد ذهل والمقلّد جهل. (پس مقلد غلطی کرتا ہے، اور مقلد جہالت کا ارتکاب کرتا ہے) (نصب الرایہ:۱۱۲/۹۱) برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: غیر مقلدین کا؛ امام زیلعی رحمہ اللہ کے اس جملے: فالمقلّد ذهل والمقلّد جهل سے تقلید کا رد کرنا ثابت نہیں؛ کیوں کہ امام زیلعی رحمہ اللہ نے ایک خاص پسِ منظر میں یہ بات کہی ہے، اس جملے میں اُنھوں نے اپنے شیخ کی ایک غلطی پر تنبیہ کی ہے، اور وہ غلطی یہ تھی کہ ان کے شیخ علاؤالدین نے ایک حدیث کو جس کی تخریج امام مسلم نے بہ روایت: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے، دوسرے کی تقلید میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کردی، گویا ان سے دوسرے کی اتباع میں یہ غلطی ہوگئی، پوری عبارت اس طرح ہے:

ووهم الشَّيخ علاؤالدّين التّركماني في عزوه هذا الحديث لمسلم عن طلحة، وإنّما رواهُ مُسلمٌ عن أبي هريرة – رضي اللّٰه عنه – وروى بعضُه عن جابر، ولم يخرج مُسلم لطلحة في كتابه؛ إلا خمسة أحاديث ليس هذا منها.

(ترجمہ:) ہمارے شیخ علاؤ الدین کو وہم ہوا کہ اُنھوں نے کسی دوسرے شخص کی پیروی میں اس حدیث کو صحیح مسلم کے حوالے سے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی مروی قرار دیا، حالاں کہ امام مسلم نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اس روایت کے بعض الفاظ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہیں، امام مسلم نے تو اپنی صحیح میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے صرف پانچ احادیث تخریج کی ہیں، اُن میں یہ روایت نہیں ہے۔ (نصب الرایہ:۱۱۳/۱)

اس کے بعد صحیح مسلم کی وہ پانچ روایات نقل کرنے کے بعد امام زیلعی فرماتے ہیں:

فالمقلِّد ذهل والمقلَّد جهل. یعنی: بات نقل کرنے والے سے بھول ہوگئی، اور جس شخص سے بات نقل کی ہے اس سے بھی خطا ہوگئی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ یہاں تقلید؛ اصطلاحی معنی میں نہیں ہے؛ بل کہ یہاں قلَّد کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ کسی دوسرے کی بات نقل کرنا، جیسا کہ سیاق وسباق سے بالکل واضح ہے، اور تقلیدِ اصطلاحی کا رد امام زیلعی رحمہ اللہ کیسے کرسکتے ہیں، جب کہ وہ خود مقلد ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں غیر مقلدین نے تین خیانتیں کی ہیں:

(۱) تقلید کو اصطلاحی معنی میں استعمال کیا، جب کہ یہاں لغوی معنی میں مستعمل ہے۔

(۲) یہاں پہلا لفظ: **مـقـلِّـد** صیغۂ اسم فاعل، بہ معنی: بات نقل کرنے والا ہے، اور دوسرا لفظ: **مـقـلَّد** صیغۂ اسم مفعول، بہ معنی: وہ شخص جس سے بات نقل کی جائے؛ لیکن غیر مقلدین نے دونوں کو اسم فاعل کا صیغہ بنا دیا۔

(۳) یہاں لفظ: **ذَهـــل** ہے، جس کا معنی: ذہول اور بھول ہونا ہے؛ لیکن غیر مقلدین نے اُس کا معنی: خطا والا کر دیا، یعنی: غلطی کرنا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/۳/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۲۷/تتمہ/ل، ۲۷۳/ل، ۱۴۳۸ھ)

غیر مقلدین کا تقلید کے رد میں امام شعبیؒ کے قول سے استدلال اور اس کا جواب

سوال: غیر مقلدین امام شعبی (عامر بن شراحیل الشعبی، تابعی، متوفی: ۱۰۴ھ) کے اس قول سے تقلید کا رد کرتے ہیں کہ ''یہ لوگ تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بتائیں اُسے (مضبوطی سے) پکڑلو، اور جو بات اپنی رائے سے کہیں اُسے کوڑے کرکٹ میں پھینک دو''۔ (مسند الدارمی، ص: ۲۰۶، سندہ صحیح)

برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: سوال میں امام شعبی رحمہ اللہ کے حوالے سے جو بات نقل کی گئی ہے وہ یہ ہے:

أخبرنا محمَّد بن يوسف حدّثنا مالك هو ابن مغول قال: قال لي الشّعبي: ما حدثوك عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم فخذ به، وما قالوه برأيهم فألقه في الهش.

(ترجمہ:) امام شعبی نے فرمایا: یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بتائیں اُسے (مضبوطی سے) پکڑلو، اور جو بات اپنی طرف سے کہیں اُسے کوڑے کرکٹ میں پھینک دو۔

اس روایت میں یہ ہے کہ جو بات رائے سے کہی جائے وہ ناقابلِ قبول ہے، یہاں یہ سمجھنا چاہیے کہ رائے دوطرح کی ہوتی ہے: (۱) محمود۔ (۲) مذموم۔ جو رائے قرآن وسنت اجماعِ امت اور قیاسِ صحیح کے مطابق ہو وہ رائے محمود ہے، اور اس طرح کی رائے کا ثبوت احادیث سے ثابت ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا منصبِ قضاء سپرد کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! یمن میں جاکر لوگوں کے درمیان فیصلہ کیسے کروگے؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں کتاب اللہ کو سامنے رکھ کر لوگوں کے فیصلے کروں گا، آپ علیہ السلام نے پوچھا: اگر تجھے وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ملے تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں اُس کا حل تلاش کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر دونوں میں نہ ملے تو؟ حضرت معاذ نے فرمایا: أجتهد برأيي ولا آلو. میں اپنی رائے سے حل کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کے سینۂ مبارک پر اپنا دستِ مبارک مارا، اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے اپنے نبی کے قاصد سے وہ بات کہلوائی جس سے تیرا پیغمبر خوش ہوگیا۔

فضَربَ رسُول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم صدره، وقال: الحمد للّٰه الذي وفّق رسول رسول اللّٰه لما يُرضي رسول اللّٰه. (أبوداؤد، ص: ١٤٩، باب اجتهاد الرأي في القضاء)

اسی طرح حضرت ابوبکر وعمر، حضرت عبداللہ بن عباس وحضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی یہی طریقہ مروی ہے کہ وہ اگر کوئی حکم قرآن وسنت میں نہیں پاتے تو پھر قرآن وسنت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تھے۔ (إعلام الموقعين، ص: ٦٢، مستدرك على الصحيحين: ٤/ ٩٤، مسند الدارمي، رقم الحديث: ١٦٧، سنن النسائي: ٢/ ٢٦٠)

تو جو رائے محمود ہے وہ تو محمود پسندیدہ ہے، ہاں! اس کے مقابلے میں ایک رائے مذموم ہے، یعنی: ایسی رائے جو قیاس ونصوص کے مقابلے میں ہو، اور جس سے نصوص کا رد، اور بدعات کی ترویج اور اشاعت لازم آتی ہو، ایسی رائے مذموم وقابل رد ہے۔

فتح المنان جو مسند دارمی کی شرح ہے، اس کے مصنف شیخ ابوعاصم نبیل بن ہاشم الغمر ی نے باب في كراهية أخذ الرأي کی شرح میں لکھا ہے:

وترك ما جاء ت به السُّنة، ووجه ما أورده من الأحاديث والآثار أنّ من أسباب ظهور البدع أخذ النّاس في الرَّأي والهوى، وتركهم للهدي النبوي وماجاء ت به السُّنة.

(فتح المنان: ٣/ ٢٣٨)

(ترجمہ:) یعنی: ایسی رائے اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے، جس سے سنتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چھوڑنا لازم آئے، امام دارمی کے اس باب میں احادیث وآثار لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ بدعات کی ترویج واشاعت کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگ رائے (مذموم) اورخواہشات کے پیچھے پڑجائیں، اور ہدایتِ نبوی اوراُن امور کو چھوڑدیں جو سنت سے ثابت ہوں۔

لہٰذا جن روایات میں رائے کو ترک کرنے کا حکم ہے، وہاں رائے مذموم مراد ہے، رائے محمود کا ثبوت احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۵۷/تتمہ/ل،۱۹۲/ل، ۱۴۳۸ھ)

احناف کے نزدیک اعلم بالسنۃ کے امامت کا زیادہ حق دار ہونے پر غیر مقلدین کا اعتراض اوراس کا جواب

سوال: غیر مقلدین فقہِ حنفی کے اس مسئلے پہ اعتراض کرتے ہیں، اورالزام لگاتے ہیں کہ یہ مسئلہ حدیث کے خلاف ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قوم کی امامت وہ شخص کرائے جوقرآن کو زیادہ جانتا ہو۔ (صحیح مسلم، المساجد، باب من احق بالامامۃ، رقم حدیث: ۱۵۳۰) اورفقہِ حنفی میں ہے: **وأولى النَّاس بالإمامة أعلمُهم بالسُّنة**، حنفی شریعت میں بالکل حکم نبوی کے خلاف؛ امامت کے لائق وہ شخص ہے جوسنت زیادہ جانتا ہو۔ (ہدایہ: ۱/۱۲۴، کتاب الصلاۃ، باب الامامۃ، ط: مکتبہ رحمانیہ) برائے مہربانی اس کا مدلل جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: صحابہ کے دور میں چار صحابہ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور سالم مولی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ قرآن کا علم رکھنے والے تھے؛ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا: **خُذوا القرآن من أربعة: من ابن مسعود وأبي بن كعب ومعاذ بن جبل وسالم مولى أبي حذيفة.** (رواه الترمذي في سننه، رقم الحديث: ۳۸۱۰، وقال: هذا حديث حسن صحيح)

پھر ان چار میں سے سب سے بڑے قاری ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے؛ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **وأقرأهم لكتاب الله أبي بن كعب** (سنن الترمذي، رقم الحديث: ۳۷۹۱، حديث حسن صحيح)

اور ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے بڑے عالم تھے؛ چناں چہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **وكان أبوبكر أعلمنا.** (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۳۴۵۴) یہی بات حضرت ابومعلیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی فرمائی (سنن ترمذی، رقم حدیث: ۳۶۵۹) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امام بنایا، جب کہ وہاں مذکورہ چار صحابہ موجود تھے؛ چناں چہ حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: **مرض النّبي صلى الله عليه وسلّم، فاشتدّ مرضه، فقال: مروا أبا بكر فليصلّ بالنّاس الحديث.** (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۶۸۸) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: جہاں ابوبکر ہوں وہاں ان کے علاوہ کسی کے لیے امامت کرنا مناسب نہیں ہے، **عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلّم: لاينبغي لقوم فيهم أبوبكر أن يؤمّهم غيره.** (سنن الترمذي، رقم الحديث: ۳۶۷۳) ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ''أعلم'' امامت کا زیادہ مستحق ہے ''أقرأ'' کے مقابلے میں، اور یہی احناف کا مسلک ہے۔

نوٹ: آپ ''ہدایہ علماء کی عدالت میں'' بہ جواب ''ہدایہ عوام کی عدالت میں'' کا مطالعہ کریں، اس میں ہدایہ پر کیے گئے تمام اعتراضات کے جوابات موجود ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ۔ محمد مصعب عفی عنہ

(۲۲۳/د، ۲۷۱/د، ۱۴۳۸ھ)
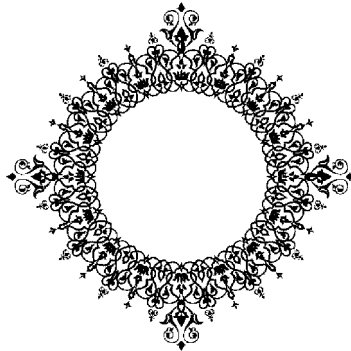
عقائد، شرک وبدعات اور شبہات سے متعلق مسائل

وحدت الوجود کی کیا حقیقت ہے؟

سوال: وحدت الوجود ایک صوفیانہ عقیدہ ہے، جس کی رو سے جو کچھ اس دنیا میں نظر آتا ہے وہ خالقِ حقیقی کی ہی مختلف شکلیں ہیں، اور خالقِ حقیقی کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ اس بارے میں علمائے دیوبند کیا کہتے ہیں؟ کیا علمائے دیوبند اس عقیدے کی یہی تشریح کرتے ہیں؟ نیز کسی اور کو خالق کے وجود کا حصہ ماننا کیا کفر نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: وحدۃ الوجود ایک اصطلاح ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود صرف ذات باری تعالیٰ کا ہے، اس کے سوا ہر وجود بے ثبات، فانی اور نامکمل ہے، ایک تو اس لیے کہ وہ ایک نہ ایک دن فنا ہو جائے گا، دوسرے اس لیے کہ ہر شے اپنے وجود میں ذاتِ باری تعالیٰ کی محتاج ہے؛ لہٰذا جتنی اشیاء ہمیں اس کائنات میں نظر آتی ہیں، اُنھیں اگرچہ وجود حاصل ہے؛ لیکن اللہ کے وجود کے سامنے اس وجود کی کوئی حقیقت نہیں؛ اس لیے وہ کالعدم ہے۔

وحدۃ الوجود کا یہ مطلب صاف، واضح اور صحیح ہے، اس سے آگے اس کی جو تشریحات کی گئی ہیں، وہ خطرناک ہیں، بعض تعبیرات تو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں، سوال میں وحدۃ الوجود کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ بھی اسی قبیل سے ہے، یعنی: ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔

ایک مسلمان کو بس سیدھا سادہ یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ کائنات میں حقیقی اور مکمل وجود اللہ تعالیٰ

کا ہے، باقی ہر وجود نامکمل اور فانی ہے۔ (فتاوی عثمانی: ۶۶/۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۷/۱۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۱۸۳/ص، ۱۲۶۷/ص، ۱۴۳۸ھ)

علم غیب کیا ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم غیب تھا یا نہیں؟

سوال: کل مولانا صغیر صاحب جوکھن پوری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کے بارے میں دہرادون میں تقریر فرمارہے تھے: اللہ نے اپنے نبی کو تمام تر علوم، معلومات اوّل تا آخر عطا فرمائے، اور آپ نے وہ سب کچھ امتِ مسلمہ تک پہنچا دیے، کچھ باقی نہیں رکھا، اور اس کی گواہی صحابہ کرام نے حجۃ الوداع میں دی۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ اس صورتِ حال میں بتائیں کہ غیب کیا ہے؟ کیوں کہ اس پر سبھی مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ نے اپنے حبیب کو تمام جہانوں کا علم عطا فرمایا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملھم الصواب: غیب کے معنی: پوشیدہ چیز، تفسیر ابن کثیر (۴۱/۱) میں ہے: **أما الغيب: فما غاب عن العباد من أمر الجنّة وأمر النّار وما ذكر في القرآن.**

(ترجمہ: غیب وہ ہے جو بندوں سے پوشیدہ ہو، جیسے: جنت اور دوزخ کے حالات، اور جو کچھ قرآن پاک میں بیان کیا گیا ہے)

مغیبات کے جاننے کی مختلف قسمیں ہیں، تمام اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام اور پیغمبرانِ عظام کو وحی والہام کے ذریعے غیب کی بہت سے باتوں سے آگاہ فرمایا ہے؛ مگر کائنات کے ذرّے، ذرّے کا علم کسی کو عطا نہیں فرمایا؛ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام ممکناتِ حاضرہ اور غائبہ کا علم عطا کیا گیا ہے، اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام ما کان وما یکون الی یوم القیامۃ کا علم حاصل تھا، اور ابتدائے آفرینش سے لے کر جنت ونار کے داخلے تک کا کوئی ذرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے باہر نہیں، نیز قرآنِ پاک میں تمام مخلوقات سے عموماً، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصاً علم غیب کی نفی کی گئی ہے؛ اس لیے کسی نبی یا ولی کے لیے علم غیب کلی ثابت کرنا؛ نصوصِ قطعیہ کے خلاف ہے، اس بارے میں مزید تفصیل اور دلائل کے لیے دیکھیے:

(کتاب ''محاضرات علمیہ'' بر موضوع رضاخانیت (تعارف وتعاقب) تیسرا محاضرہ: بہ عنوان ''علم غیب، حاضر وناظر اور نور وبشر کا مسئلہ'' پیش کردہ: حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری، استاذِ حدیث وفقہ ومرتب فتاوی دارالعلوم دیوبند، شائع کردہ: دفتر محاضرات دارالعلوم دیوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۵؍رجب؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام

(۹۳۰؍تتمہ؍م، ۹۷۳؍م، ۱۴۳۸ھ)

کیا حضرت ادریس علیہ السلام زندہ آسمان میں اٹھائے گئے؟ اور انبیاء علیہم السلام میں سے کون کون اب بھی باحیات ہیں؟

سوال: کیا حضرت ادریس علیہ السلام زندہ جنت میں گئے تھے؟ کون کون سے نبی ابھی بھی باحیات ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: حضرت ادریس علیہ السلام کے زندہ آسمان میں اٹھائے جانے کے متعلق جو روایات ہیں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ'' ان روایات کے بارے میں ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ کعب احبار کی اسرائیلی روایات میں سے ہیں، اور اُن میں سے بعض میں نکارت واجنبیت ہے، اور حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم کی آیت: ﴿وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ کا معنی یہ ہے کہ اُن کو نبوت ورسالت اور قربِ الٰہی کا خاص مقام عطا فرمایا گیا، بہ ہرحال! قرآن کریم کے الفاظِ مذکورہ صریح نہیں ہیں کہ یہاں رفعتِ درجہ مراد ہے، یا زندہ آسمان میں اٹھانا مراد ہے؛ اس لیے اُن کا رفع الی السماء قطعی نہیں ہے''۔ (معارف القرآن: ۶؍۴۰) مذکورہ عبارت سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کا زندہ جنت میں جانا قطعی نہیں ہے۔

انبیاء علیہم الصلاۃ السلام میں سے صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام باحیات ہیں، قرآن کریم اس پر شاہد ہے: ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ﴾ (النساء: ۱۵۸) اور آپ علیہ السلام قرب قیامت میں

دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۸/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۹۲/د، ۱۲۱/د، ۱۴۳۸ھ)

حضرت ابو طالب کے اسلام کے سلسلے میں کیا عقیدہ رکھا جائے؟

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ ابوطالب جو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، ان کے ایمان کے بارے میں ہمارا کیا عقیدہ ہونا چاہیے؟ اہل تشیع کے مطابق وہ مسلمان تھے، ہمارا کیا عقیدہ ہے؟ اگر وہ مسلمان تھے، تو بہ راہِ کرم اہل سنت کی معتبر کتب سے بتائیں۔ اگر ابوطالب اسلام نہیں لائے تھے، تو اہل تشیع کی مستند کتب سے حوالہ دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰه التوفیق: اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے کہ جناب ابوطالب اسلام نہیں لائے تھے؛ اس لیے ہم کو یہی عقیدہ رکھنا چاہیے۔

وأبو طالب لم يكن بهذه المثابة؛ بل كان يصدّ النّاس عن أذيَّة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم وأصحابه بكل ما يقدر عليه من فعال ومقال، ونفس ومال؛ ولكن مع هذا لم يقدّر اللّٰه له الإيمان؛ لما له تعالى في ذلك من الحكمة العظيمة، والحجة القاطعة البالغة الدَّامغة التي يجب الإيمان بها والتّسليم لها، ولولا ما نهانا اللّٰه عنه من الاستغفار للمشركين لاستغفرنا لأبي طالب وترحّمنا عليه. (البداية والنهاية: ۱۵٦/۳، سيرة ابن هشام: ۲٦/۱۱–۲۷، ابن سعد: ۱٤۱/۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۷/۹/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی

(۹۸۸/ص، ۹۴۵/ص، ۱۴۳۸ھ)

کیا خانہ کعبہ شیو (ہندو دیوتا) کا گھر ہے؟

سوال: میرا ایک دوست مجھ سے کہتا ہے: کعبہ شیو کا گھر ہے، تو میں اس کو کیا جواب دوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: خانہ کعبہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنایا گیا سب سے پہلا مکان ہے۔ ﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ. الآية﴾ (آل عمران: ۹۶)

پہلے فرشتوں کے ذریعے اس کی تعمیر ہوئی، پھر طوفانِ نوح میں عمارت منہدم ہوگئی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی معیت میں دوبارہ اس کی تعمیر کی، جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے:

﴿وَإِذ يَرفَعُ إِبرَاهِيمُ القَوَاعِدَ مِنَ البَيتِ وَإِسمَاعِيلُ. الآية﴾ (البقرة: ۱۲۷)

اور وہ وقت یاد کرنے کا ہے، جب ابراہیم علیہ السلام تعمیر کے وقت؛ خانہ کعبہ کے پائے اٹھا رہے تھے، اور اسماعیل علیہ السلام اُن کے ساتھ معاون کی حیثیت سے کام کررہے تھے، پھر تعمیر مکمل ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا:

﴿وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالحَجِّ. الآية﴾ (الحج: ۲۷) (آپ لوگوں سے حج کے واسطے آنے کا اعلان کردیجیے)

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو خصوصی ہدایت دی کہ ہمارے گھر یعنی: خانہ کعبہ کو صاف ستھرا رکھو؛ طواف کے لیے آنے والوں کے لیے، اور نماز ادا کرنے والوں اور معتکفین کے واسطے؛ روزِ اول سے ہی وہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اس کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے، دورِ جاہلیت یعنی: زمانۂ جاہلیت میں کفارِ مکہ نے اگرچہ کچھ بت بھی اس میں رکھ دیے تھے؛ لیکن کعبہ ہمیشہ اُن کی نظر میں اللہ کا ہی مکان رہا؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو خاص اپنی عبادت کرنے کی دعوت دی تو اپنے ربُّ البیت ہونے کا ہی واسطہ دیا، جو اُن کے یہاں مسلم تھا؛ چناں چہ ارشاد فرمایا:

﴿فَلَيَعبُدُوا رَبَّ هَذَا البَيتِ، الَّذِي أَطعَمَهُم مِّن جُوعٍ. الآية﴾ (القريش: ۳-۴)

لہٰذا کعبے کو شیو کا گھر کہنا جھوٹ، بے سند اور فضول بات ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۲/۵ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۸/د، ۱۵۷/د، ۱۴۳۸ھ)

ابن تیمیہ کے عقائد کے سلسلے میں اہل دیوبند کا کیا نظریہ ہے؟

سوال: (۱) علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں علمائے دیوبند کی کیا رائے ہے؟

(۲) خدا کی ذات اور صفات کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا صحیح تھا؟ کیا ان کا ماننا تھا کہ اللہ عرش کے اوپر ہے؟ کیا اُنھوں نے بہت سارے مسائل میں اجماع امت کی خلاف ورزی کی تھی؟

مہربانی کر کے ضرور جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰه التوفيق: (۱) علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک حنبلی المسلک عالم تھے؛ لیکن عقائد وعبادات سے متعلق بہت سے مسائل میں اُنھوں نے جمہور سے علاحدگی کی تھی، جس پر بہت سے علماء؛ مثلاً: علامہ ابن حجر عسقلانی، ابن حجر ہیتمی، علامہ تاج الدین سبکی، فقیہ ولی الدین العراقی اور تقی الدین سبکی وغیرہ نے سخت رد فرمایا ہے۔

(۲) اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں اُن کا عقیدہ صحیح نہیں تھا، عرش کے سلسلے میں بھی اُن کا نظریہ صحیح نہیں تھا، نیز بہت سے مسائل میں انھوں نے جمہور سے الگ مستقل رائے قائم کی تھی۔

قال ابن حجر الهيتمي: واعلم أنَّه خالف النَّاس في مسائل نبَّه عليها التّاج السُّبكي وغيره. فممَّا خرق فيه الإجماع قوله في: عليّ الطّلاق أنَّه لا يقع عليه؛ بل عليه كفَّارة يمين، ولم يقُل بالكفَّارة أحدٌ من المُسلمين قبله، وأنَّ طلاق الحائض لا يقع، وكذا الطّلاق في طُهر جامع فيه، وأنَّ الصَّلاة إذا تركت عمداً لا يجب قضاؤها، وأنَّ الحائض يُباح لها الطّواف بالبيت، ولا كفَّارة عليها، وأنَّ الطّلاق الثّلاث يرد إلى واحدة، وكان هو قبل ادعائه ذلك نقل إجماع المُسلمين على خلافه، وأنّ المكوس حلالٌ لمن أقطعها، وأنَّها إذا أخذت من التُّجار أجزأتهم عن الزكاة وإن لم تكن باسم الزكاة ولا رسمها، وأنّ المائعات لا تنجس بموت حيوان فيها كالفأرة، وأنّ الجنب يصلي تطوّعه بالليل ولا يؤخره إلى أن يغتسل قبل الفجر، وإن كان بالبلد، وأنّ شرط الواقف غيرُ معتبر؛ بل لو وقف على الشَّافعية صرف إلى الحنفيّة وبالعكس، وعلى القُضاة صرف إلى الصُّوفية، في أمثال ذلك من مسائل الأصول مسألة الحُسن والقُبح

التزم كل ما يرد عليها، وأنّ مخالف الإجماع لا يكفر ولا يفسق، وأنّ ربّنا سبحانه وتعالى عما يقُول الظالمون والجاحدون علواً كبيرا محل الحوادث، تعالى اللّٰه عن ذلك وتقدّس، وأنَّه مركبٌ تفتقر ذاته افتقار الكل للجزء، تعالى اللّٰه عن ذلك وتقدس، وأنّ القُرآن محدثٌ في ذات اللّٰه، تعالى اللّٰه عن ذلك، وأنّ العالم قديمٌ بالنَّوع، ولم يزل مع اللّٰه مخلوقاً دائما فجعله موجباً بالذّات، لا فاعلا بالاختيار، تعالى اللّٰه عن ذلك، وقوله بالجسميّة والجهة والانتقال، وأنَّه بقدر العرش لا أصغر ولا أكبر، تعالى اللّٰه عن هذا الافتراء الشّنيع القبيح، والكفر البراح الصّريح، وخذل متَّبعيه وشتت شمل معتقديه، وقال: إنّ النّار تفنى، وأنّ الأنبياء غير معصُومين، وأنّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم لا جاه له ولا يتوسل به، وأنّ إنشاء السَّفر إليه بسبب الزيارة معصيةٌ لا تقصر الصَّلاة فيه، وسيحرم ذلك يوم الحاجة ماسة إلى شفاعته، وأنّ التَّوراة والإنجيل لم تبدل ألفاظهما وإنَّما بدلت معانيهما اهـ. (الفتاوى الحديثية: ۸۵/۱، ط:دار الفكر، بيروت)

قال ابن حجر العسقلاني: ومن ثم نسب أصحابه إلى الغلو فيه، واقتضى له ذلك العجب بنفسه، حتى زها على أبناء جنسه واستشعر أنّه مجتهدٌ، فصار يرد على صغير العلماء وكبيرهم، قويّهم وحديثهم، حتى انتهى إلى عمر، فخطأه في شيء، فبلغ الشَّيخ إبراهيم الرقي فأنكر عليه، فذهب إليه واعتذر واستغفر، وقال في حق عليّ أخطأ في سبعة عشر شيئا، ثم خالف فيها نصّ الكتاب، منها اعتداد المتوفى عنها زوجها أطول الأجلين، وكان لتعصُّبه لمذهب الحنابلة يقع في الأشاعرة، حتى أنّه سبّ الغزالي، فقام عليه قومٌ كادوا يقتلونه. ولما قدم غازان بجيوش التّتر إلى الشّام خرج إليه وكلّمه بكلام قويّ فهمّ بقتله ثم نجا، واشتهر أمره من يومئذٍ، واتفق الشّيخ نصر المنبجي، كان قد تقدم في الدولة لاعتقاد بيبرس الجاشنكير فيه، فبلغه أنّ ابن تيمية يقع في ابن العربي؛ لأنّه كان يعتقد أنه مستقيم وأنّ الذى ينسب إليه من الاتحاد أو الإلحاد من قصور فهم من ينكر عليه، فأرسل ينكر عليه، وكتب إليه كتابا طويلا، ونسبه وأصحابه إلى الاتحاد الذي هو حقيقة الإلحاد، فعظم ذلك عليهم وأعانه عليه قوم آخرون ضبطوا عليه كلمات في العقائد مغيرة وقعت منه في مواعيده وفتاويه، فذكروا أنّه ذكر حديث

النّزول، فنزل عن المنبر درجتين، فقال: كـ نُزولي هذا، فنسب إلى التَّجسيم، وردّه على من توسّل بالنبي صلى اللّٰه عليه وسلّم أو استغاث، فأشخص من دمشق في رمضان سنة خمس وسبع مائة، فجرى عليه ما جرى وحبس مرارًا، فأقام على ذلك نحو أربع سنين أو أكثر وهو مع ذلك يشغل ويفتي إلى أن اتفق أنّ الشّيخ نصراً قام على الشّيخ كريم الدين الآملي، شيخ خانقاه سعيد السُّعداء، فأخرجه من الخانقاه، وعلى شمس الدين الجزري، فأخرجه من تدريس الشَّريفية، فيقال: إنّ الآملي دخل الخلوة بمصر أربعين يومًا، فلم يخرج حتى زالت دولة بيبرس، وخمل ذكر نصر، وأطلق ابن تيمية إلى الشَّام وافترق النَّاس فيه شيعًا، فمنهم من نسبه إلى التَّجسيم؛ لما ذكر في العقيدة الحمويّة والواسطية وغيرهما من ذلك، كقوله: إنّ اليد والقدم والسَّاق والوجه صفاتٌ حقيقيةٌ للّٰه، وأنَّه مستوٍ على العرش بذاته، فقيل له: يلزم من ذلك التّحيز والانقسام، فقال: أنا لا أسلّم أنّ التّحيز والانقسام من خواص الأجسام، فألزم بأنّه يقول بتحيّز في ذات اللّٰه............

(الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة: ۱/۱۷۸، ذكر من اسمه أحمد، ط: مجلس دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد، الهند). فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۳/۱۰/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۹۹۹/تتمہ/ص، ۱۰۲۸/ص، ۱۴۳۸ھ)

’’اللہ کے یہاں انصاف نہیں‘‘ کہنے والے کے کفر کا حکم

سوال: مسئلہ ذیل کے بارے میں مفتیانِ کرام کیا فرماتے ہیں:

ایک شخص؛ یعنی: مسلمان کہتا ہے کہ اللہ کے ہاں انصاف نہیں ہے، اور وہ اس بات کو یقین کے ساتھ کہتا ہے، اس کے بعد جب کچھ علماء اور دوسرے لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تم دل سے یقین کے ساتھ یہ کہہ رہے ہو، تو اس نے جواب میں کہا کہ ہاں! میں دل سے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ اللہ کے پاس انصافِ بے چارنہیں ہے، میں نے اگر یہ کہہ دیا تو کیا ہوگیا؟ جو ہوگا میں اور اللہ سمجھ لوں گا، تو ایسی بات کہنے والے کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ تحریر فرمادیجیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: **حامداً ومصلّيا ومسلّما**: اللہ تعالیٰ کی طرف ناانصافی کی نسبت کرنے کو فقہاء نے کفر لکھا ہے، صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ کے یہاں انصاف نہیں ہے، تو اُس پر تجدید ایمان، نیز اگر وہ شادی شدہ ہے، تو تجدید نکاح ضروری ہے، اور اگر وہ شخص اپنی بات پر قائم رہتا ہے، تو مسلمان حضرات اس کی بیوی کو اس سے الگ کردیں، اور اس سے قطع تعلق کرلیں۔

يكفّر إذا وصف الله تعالىٰ بمالا يليق ...... أو نسبه إلى النّقص. (هندية: ۲/ ۲۷۱، ط: اتحاد) **ولو قال: لو أنصف الله عز وجل يوم القيامة أنتصف منك يكفر.** (هندية: ۲/ ۲۷۲، ط: زكريا) **من نسب الجور إلى الله تعالىٰ فقد كفر.** (تاتار خانية: ۶/ ۲۸۹، ط: زكريا)

فإذا كان في المسألة وجوهٌ توجب الكفر ووجهٌ واحدٌ يمنع فعلى المفتي أن يميل إلى ذلك الوجه ...... إلا إذا صرّح بإرادة توجب الكفر فلا ينفعه التأويل حينئذ. (هندية: ۲/ ۲۹۳) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۵/۱۷ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۰۲/ل، ۸۳۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

مرتد کسے کہتے ہیں؟ اور کیا زمانۂ ارتداد کی نماز اور روزوں کی قضا لازم ہے؟

سوال: اگر کوئی ایسا مرتد جس نے اپنا ارتداد زبان سے ظاہر نہ کیا ہو، تائب ہو جاتا ہے، تو کیا اس پر زمانۂ ارتداد کے نماز اور روزوں کی قضا لازم ہوگی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمه تعالیٰ: الجواب وبالله التوفيق: شرعاً کسی آدمی کے مرتد ہونے کے لیے شرط ہے کہ اس نے کلمۂ کفر کا تلفظ کیا ہو، یا کوئی کفریہ عمل کیا ہو۔

صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص نے کلمۂ کفر کا تلفظ کیا ہو یا کوئی کفریہ عمل کرلیا ہو؛ لیکن کسی کو اپنے ارتداد کی خبر نہ دی، اور تائب ہوگیا، تو وہ ارتداد کے بعد توبہ کرنے والا کہلائے گا، اور زمانۂ ارتداد کی نماز اور روزوں کی قضا لازم نہ ہوگی، اور اگر نہ زبان سے کفریہ کلمے کا تلفظ کیا، اور نہ کوئی کفریہ عمل کیا، تو وہ شرعاً مرتد نہیں ہوگا؛ لہٰذا چھوٹی ہوئی نماز اور روزوں کی قضا لازم ہوگی۔

قال في الهندية: وركن الرّدة إجراءُ كلمة الكفر على اللّسان بعد وجود الإيمان.

(الفتاوى الهندية: ٢/٦٦، ط: مكتبة اتحاد، ديوبند)

وفي الدر: وما أدّى منها (العبادة) فيه (زمن الردة) يبطل، ولا يقضى من العبادات إلا الحج. (الدرالمختار مع الشامي: ٦/٣٩٧، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۹ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۲/د، ۱۶/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا کوئی آدمی ”میں شادی میں شریعت کو نہیں مانتا“ کہنے سے کافر ہوجائے گا؟

سوال: دو شخص آپس میں جھگڑا کررہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ تو شادی شریعت کے مطابق کر، تو اس نے جواب دیا کہ ”میں شادی میں شریعت کو نہیں مانتا“ تو اس مجیب کا کیا حکم ہے؟ آیا اس کے ایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہوا کہ نہیں؟ کیوں کہ اس نے شادی کے اندر شریعت کا انکار کیا ہے، بہ راہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلياً ومسلماً: الجواب وبالله التوفيق: ”میں شادی میں شریعت کو نہیں مانتا“ اس جملے میں یہ تاویل ممکن ہے کہ تمھاری پیش کردہ شریعت کو نہیں مانتا، گویا حقیقۃً شریعت کا انکار نہیں؛ بل کہ مدعی کے دعوے کا انکار ہے، اگر یہی مراد ہے، تو مسئولہ صورت میں مذکور شخص کافر نہ ہوگا، اور اگر واقعۃً اس نے بغیر کسی تاویل کے شادی میں شریعت کو ماننے کا انکار کیا ہے، تو یقیناً وہ کافر ہوجائے گا، اور اس پر تجدیدِ اسلام اور تجدیدِ نکاح لازم ہوگا۔

لایفتی بکفر مسلم أمکن حمل کلامه علی محل حسن. (درمختار: ۳۶۷/۶) **ثم إن کان نیة القائل الوجه الذي یوجب التّکفیر لا تنفعه فتوی المفتي، ویؤیِّد بالتّوبة والرجوع عن ذلك، بتجدید النّکاح بینه وبین امرأته.** (هندیة: ۲۸۳/۲، شرح الفقه الأکبر: ۱۹۲) **وفي شرح الفقه الأکبر: أو قال: ماذا الشَّرع هذا؟** (شرح الفقه الأکبر: ۱۷۴، عقائد أهل السنة والجماعة: ۷۳-۷۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۱۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۱۳۰/ص، ۱۱۷۷/ص، ۱۴۳۸ھ)

دہریے کے سوال ’’اللہ تعالیٰ خود کیسے وجود میں آ گئے‘‘ کا جواب

سوال: اگر ہم کسی دہریے کو یہ کہیں کہ ایک چھوٹا سا ذرہ خود بہ خود نہیں بن سکتا، تو اتنی بڑی کائنات کیسے خود بہ خود بن گئی، یعنی: اس کا بنانے والا کوئی ہے؛ جو اللہ ہے، تو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جب کائنات خود بہ خود نہیں بن سکتی، تو اس کو بنانے والا اللہ کیسے خود بہ خود بن گیا؟ اس سوال سے کافی دن پریشان رہا۔ از راہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمادیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰه التوفیق والعصمة: اسلامی عقائد کی تمام باتیں ہر ایک کے عقل کے مطابق ہوں؛ یہ ضروری نہیں؛ اس لیے مخبرِ صادق کی خبر پر یقین کرنے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے، اور سارے انبیائے کرام نے اپنی اپنی امت کو اس بات کی خبر دی کہ اللہ ہر چیز کا خالق و مالک ہے، وہ ازل (ہمیشہ) سے ہے، اور ابد (ہمیشہ) تک رہے گا، وہ اپنی ذات وصفات کے ساتھ قدیم ہے، جس پر نہ کبھی فنا طاری ہوئی تھی، اور نہ ہوگی، اور اسی کی خبر ہمارے ہادی وپیغمبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دی ہے، اور ایک سچے مومن کی یہی شان ہے کہ تمام عقائدِ اسلام کو مانے، چاہے عقلاً سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، اور یہی اصل ہے، جہاں تک دہریے کے اس شبہے کی بات ہے کہ ’’جب کائنات خود بہ خود نہیں بن سکتی ہے تو اُس کو بنانے والا کیسے خود بہ خود بن گیا؟‘‘ تو اُس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ کائنات خود بہ خود نہیں بن سکتی ہے؛ لیکن یہ کہنا کہ اُس کو بنانے والا کیسے خود بہ خود بن گیا؟ یہ غلط ہے؛ اس لیے کہ ’’بننا‘‘ اس بات کو چاہتا ہے کہ پہلے وہ چیز نہ ہو؛

بل کہ بعد میں وجود میں آئی ہو، یعنی: اُس پر کسی وقت عدم طاری رہا ہو؛ حالاں کہ کائنات کو بنانے والی ذات پر کبھی بھی عدم طاری نہیں ہوا ہے؛ بل کہ وہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گی؛ اس لیے یہ کہنا ہی غلط ہے کہ وہ خود بہ خود کیسے بن گیا؟ نیز متکلمینِ اسلام اس طرح کے شبہے کا جواب یوں بھی دیا کرتے ہیں کہ اس بات کو ہر ایک ماننے پر مجبور ہے کہ یہ عالم (کائنات) خود بہ خود نہیں بن گیا؛ بل کہ اُس کا بنانے والا کوئی نہ کوئی ہے، اب وہ کون ہے؟ اس میں تین احتمال ہیں:

۱۔ کوئی ایسا ہو جو خود موجود نہ ہو، جس کو ممتنع کہتے ہیں۔

۲۔ یا کوئی ایسا ہو جس کا وجود اصلی نہ ہو، یعنی: پہلے وہ معدوم ہو، پھر وجود میں آیا ہو، جس کو ممکن کہتے ہیں۔

۳۔ یا کوئی ایسا ہو جس کا وجود ذاتی و اصلی ہو، جس پر کبھی بھی کسی بھی وقت عدم (نہ ہونا) طاری نہ ہوا ہو؛ بل کہ وہ ہمیشہ سے ہو، اور ہمیشہ رہنے والا ہو، جس کو واجب الوجود کہتے ہیں۔

ان تین احتمالات میں سے سب سے پہلے نمبر پر جو مذکور ہے وہ عالم کا خالق نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ جو خود موجود نہ ہو، وہ کیسے دوسروں کو وجود دے سکتا ہے؟ لہٰذا وہ عالم کا بنانے والا نہیں ہوگا، اب دوسرے نمبر پر جس کا ذکر ہے، وہ بھی کائنات کا بنانے والا نہیں ہے؛ اس لیے کہ جب کسی زمانے میں اس پر عدم (نہ ہونا) پایا جاتا تھا، تو وہ خود اُس وقت وجود کا محتاج تھا، اور جو خود وجود کا محتاج ہو، وہ کیسے کسی کو وجود بخش سکتا ہے؟ جب یہ دونوں احتمال ختم، تو لازمی طور پر یہ کہنا پڑے گا کہ اس کائنات کو وجود میں لانے والی کوئی ایسی ذات ہو، جس پر نہ کبھی عدم طاری ہوا ہو، اور نہ وہ اپنے وجود میں کسی کا محتاج ہو؛ بل کہ وہ خود سب کو وجود عطا کرے؛ لیکن اُسے کسی چیز کی ضرورت نہ ہو، اور وہ ذات؛ باری تعالیٰ کی ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اور اسی نے سب کو وجود بخشا ہے۔ دیکھیں: (شرح عقائد وشرحہ بیان الفوائد: ۱۴۷-۱۴۸، ط: امان بک ڈپو، افریقی منزل) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ: **محمد اسد اللہ غفر لہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند** ۱۴۳۸/۵/۱۶ھ، سہ شنبہ

الجواب صحیح: **محمد نعمان سیتاپوری غفر لہٗ**

نوٹ: جواب درست ہے، جس طرح گنتیوں کی ابتدا ایک سے ہوتی ہے، اُس سے پہلے کوئی گنتی نہیں، اسی طرح اللہ کی ذات سے پہلے کچھ ہونے کا سوال نہیں ہوتا، جب واحدِ مجازی کے پہلے کچھ نہیں ہے، تو واحدِ حقیقی کے پہلے کچھ ہونے کا سوال کیسے پیدا ہوگا۔ زین الاسلام قاسمی

(۶۷۳/تتمہ/س، ۶۵۰/س، ۱۴۳۸ھ)

کلیات امدادیہ میں مذکور ''استمداد بالارواح'' سے متعلق عبارت کی وضاحت

سوال: کلیاتِ امدادیہ تصوف کی کتاب ہے، جس کو حضرت مہاجر مکی صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے، اس کے صفحہ (۶۸) پر لکھا ہے کہ ''مرشد کے واسطے سے مشائخ طریقت کی روح سے مانگتے ہوئے خلوت میں آجائے'' اس عبارت پر آپ کا کیا حکم ہے؟ اور روح سے مدد مانگنا کہاں تک جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: استعانت بالمخلوق میں قدرے تفصیل ہے، بوادر النوادر جلد اول میں ہے: حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ضیاء القلوب (ص:۵۵) میں تحریر فرماتے ہیں: استعانت واستمداد از ارواحِ مشائخ طریقت بہ واسطۂ مرشد خود کردہ الخ، الجواب: جو استعانت واستمداد بالمخلوق؛ بہ اعتقادِ علم وقدرتِ مستقل مستمد منہ ہو؛ شرک ہے، اور جو بہ اعتقادِ علم وقدرتِ غیر مستقل ہو؛ مگر وہ علم وقدرت کسی دلیل صحیح سے ثابت نہ ہو؛ معصیت ہے، اور جو بہ اعتقادِ علم وقدرتِ غیر مستقل ہو، اور وہ علم وقدرت کسی دلیل سے ثابت ہو؛ جائز ہے، خواہ وہ مستمد منہ حی ہو یا میت، اور جو استمداد بلا اعتقادِ علم وقدرت ہو، نہ مستقل نہ غیر مستقل؛ پس اگر طریقِ استمداد مفید ہو، تب بھی جائز ہے، جیسے: استمداد بالنار والماء والواقعات التاریخیہ؛ ورنہ لغو ہے۔

یہ کل پانچ قسمیں ہیں؛ پس استمداد؛ ارواحِ مشائخ سے صاحبِ کشف بالارواح کے لیے قسم ثالث ہے، اور غیر صاحبِ کشف کے لیے محض ان حضرات کے تصور اور تذکر سے قسم رابع ہے؛ کیوں کہ اچھے لوگوں کے خیال کرنے سے ان کو اتباع کی ہمت ہوتی ہے، اور طریق مفید بھی ہے، اور غیر صاحبِ کشف کے لیے بدون قصدِ نفع وتذکر قسم خامس ہے اھ۔ (ص:۸۲-۸۳، ط: مکتبہ جاوید، دیوبند)

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ قسم ثالث و رابع کی حد تک؛ ارواحِ مشائخ سے استعانت درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۲/۲۹ھ الموافق: ۲۰۱۷/۹/۲۱ء، یوم الخمیس

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۵۲۰/ھ، ۸۵۱/ھ، ۱۴۳۸ھ)

یہود و نصاریٰ سے دوستی کو قرآن منع بھی کرتا ہے اور ان سے مناکحت وغیرہ کو جائز بھی کہتا ہے، کیا جواب ہے؟

سوال: کیا یہ درست نہیں ہے کہ قرآن ایک جگہ کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرو، اور دوسری جگہ کہتا ہے کہ یہود و نصاری کے ساتھ کھانا بھی جائز ہے، اور نکاح بھی جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: قرآن پاک میں جہاں یہودونصاری کی دوستی سے منع کیا گیا ہے، وہاں دوستی کرنے سے مراد: اُنھیں دلی دوست، راز دار اور معتمد بنا لینا ہے، اسی کو سورۂ آل عمران (آیت نمبر: ۱۱۸) میں بتلایا گیا ہے کہ اپنے مذہب وملت کے افراد کے علاوہ کسی اور کو راز دار مت بناؤ، وہاں ایک لفظ ﴿بطانة﴾ کا استعمال کیا گیا ہے، اور بطانة عربی میں: دلی دوست، راز دار، معتمد وغیرہ کو کہتے ہیں، بطانة الثّوب: کپڑے کے اندرونی استر کو کہتے ہیں، اور عربی زبان کی معتمد کتاب لسان العرب میں بطانة کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

بطانة الرجل: صاحب سرّه وداخلة أمره الذي يشاوره في أحواله.

(لسان العرب لابن منظور: ۱۳/۵۵)

مفسرین نے بھی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں، اور اس طرح کی دوستی کو اسلام منع کرتا ہے؛ کیوں کہ اس میں بہت سے مفاسد ہیں، اور یہ بالکل ایک معقول حکم ہے، پھر چوں کہ اسلام سب کے لیے رحمت ہے؛ اس لیے وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہم دردی وغم گساری اور صلہ رحمی کی تاکید کرتا ہے، اور ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اور آپ نے جو لکھا ہے کہ قرآن کریم یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا کھانے کو جائز کہتا ہے، آپ سے یہاں اس کی تعبیر میں غلطی ہوئی ہے، قرآن کریم نے ان کے ساتھ کھانا کھانے کی نہیں؛ بل کہ ان کا ذبیحہ کھانے کی اجازت دی ہے، وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اور ذبح کرنے والا اصلی کتابی ہو، یہی حکم نکاح میں بھی ہے؛ لیکن ہمارے زمانے کے اکثر یہودی اور عیسائی برائے نام یہودی اور عیسائی ہیں؛ ورنہ درحقیقت سب مشرک اور ملحد ہیں؛

لہٰذا اُن کا ذبیحہ بھی حلال نہیں، اور ان کے ساتھ مناکحت بھی جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

جب قانونِ الٰہی اٹل ہے تو انبیاء کی شریعتیں الگ الگ کیسے ہیں؟

سوال: اگر خدا کے قوانین شروع ہی سے اٹل ہیں، نہ ہی بدلتے ہیں، اور نہ ہی بدل سکتے ہیں، تو پھر انبیاء کی شریعتیں؛ یعنی: قوانین اور ضابطے ہر دور میں یک ساں کیوں نہیں رہتے؟ جب کہ تمام انبیاء دعوے دار ہیں کہ ان کو شریعت خدا کی طرف سے ملی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: خدا کے قوانین اور ضابطے متعین ہیں، اُن میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے وعدے اور وعید میں تخلف نہیں ہوسکتا، یعنی: جو وعدے اللہ نے کیے ہیں، وہ اپنے وعدوں سے نہیں مکرتا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شرائع میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، تمام انبیاء کی شرائع اللہ کی طرف سے ہی نازل شدہ ہیں، اور تمام شرائع؛ اصولِ دین: (توحید رسالت اور آخرت) میں تو متفق ہیں، اُس میں تبدیلی اور اختلاف نہیں ہے؛ البتہ فروعی اور جزوی احکام میں اختلاف ہوسکتا ہے، اور یہ اختلاف زمانے اور طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ہے؛ کیوں کہ ہر زمانے میں بندوں کے مزاج مختلف رہے، جس کی وجہ سے احکام بھی مختلف رہے؛ البتہ اصولِ دین میں اختلاف کسی بھی شریعت میں نہیں ہوا، اس کے علاوہ ایک اور حکمت ہے، اور وہ ہے بندوں کی آزمائش، عبادت کی حقیقت: اطاعت اور پیروی ہے، اور یہ کسی شکل میں منحصر نہیں ہے؛ پس جس وقت جو حکم ہوگا وہی عبادت ہوگی، اور اسی کا بجا لانا بندوں پر واجب ہوگا، جیسے کہ روزہ سال کے ایک مہینے میں فرض ہے، باقی میں نفل ہے؛ لیکن ایام عیدین میں روزہ رکھنا گناہ ہے، تو ایک ہی شریعت کے اندر زمانے کے اختلاف کی وجہ سے حکم میں اختلاف پایا گیا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے اس میں تعارض ہے؛ بل کہ اس کی حکمت بندوں کی آزمائش ہے، اسی کو سورۂ مائدہ (آیت: ۴۸) میں کہا گیا ہے

کہ ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ تم سب کو ایک ہی امت میں کر دیتے؛ لیکن ایسا نہیں کیا؛ تاکہ جو دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرماویں''۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

جب آپؐ آخری نبی ہیں تو حضرت عیسیٰؑ آپؐ کے بعد نبی بن کر کیسے تشریف لائیں گے؟

سوال: میں نے سنا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائیں گے، تو بہ حیثیت نبی آئیں گے، تو میں تذبذب میں ہوں؛ کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور رسول ہیں، اور آپؐ کے بعد اس دنیا میں کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے، تو بہ دستور نبی ہوں گے؛ لیکن چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ان کی شریعت منسوخ ہوگئی؛ اس لیے جب وہ تشریف لائیں گے تو شریعتِ محمدیہ کی پیروی کریں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی کی حیثیت سے آئیں گے۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم: ألا إنّ عيسىٰ بن مريم ليس بيني وبينه نبيٌ ولا رسولٌ؛ إلّا أنّه خليفتي في أمتي من بعدي. (مجمع الزوائد)

فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱/جمادی الثانیہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۳۸/۷رم، ۹۷۷/رم، ۱۴۳۸ھ)

اس دور میں جب الٹراساؤنڈ سے استبرائے رحم کی تحقیق ہوسکتی ہے تو عدت کی اتنی لمبی مدت کیوں؟

سوال: جب مقصد یہ جاننا ہو کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں، اور یہ بات الٹراساؤنڈ وغیرہ سے جب چاہیں معلوم ہوجاتی ہے، تو پھر کسی بیوہ کو چار ماہ دس دن تک، اور کسی طلاق یافتہ کو تین ماہ تک عدت کے نام پر کسی ایک جگہ مقید رکھنا کیوں ضروری ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: عدت کا مقصد صرف حمل ہونے نہ ہونے کی تصدیق نہیں ہے؛ بل کہ درحقیقت یہ اللہ کا حکم ہے، جو اُن عورتوں کو دیا گیا ہے، جن کے شوہروں نے طلاق دے دی ہو یا ان کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہو، اگر صرف حمل کی تصدیق کے لیے عدت ہوتی، تو بڑی بوڑھی عورتوں پر عدت نہ ہوتی؛ کیوں کہ اُن میں حمل کی کوئی امید نہیں ہوتی، اسی طرح اُس عورت پر جو برس ہا برس سے اپنے شوہر سے الگ رہ رہی ہے، اُس پر بھی عدت نہ ہوتی، اسی طرح حیض والی عورتوں میں بھی صرف ایک حیض عدت کے لیے کافی ہوتا، مکمل تین حیض عدت نہ ہوتی؛ کیوں کہ ایک بار حیض آنے سے حمل نہ ہونا متعین ہوجاتا ہے؛ لیکن طلاق، خلع یا فسخ نکاح کی صورت میں ان عورتوں کی عدت؛ جنھیں حیض آتا ہو، مکمل تین حیض ہے، جیسا کہ قرآن پاک، سورۂ بقرہ (آیت: ۲۲۸) میں ہے، اس کے بارے میں فقہائے کرام نے بہ طور حکمت یہ بات لکھی ہے کہ پہلا حیض براءت رحم جاننے کے لیے ہے، اور دوسرا حرمت نکاح کی وجہ سے، اور تیسرا آزادی کی فضیلت حاصل ہونے کی وجہ سے۔

فالأولیٰ؛ لتعرف برأة الرّحم، والثّانیة؛ لحرمة النّكاح، والثالثة؛ لفضیلة الحریة. (در مختار مع الشامي: ۵/ ۱۸۲، ط: مکتبة زکریا) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/ ۷/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/ تتمہ/ د، ۶۴۹/ د، ۱۴۳۸ھ)

جب ہدایت اور گم راہی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو بندوں کو عذاب کیوں؟

سوال: قرآن کہتا ہے کہ اللہ جس کو چاہے گم راہ کرتا ہے، اور جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے، تو پھر جب انسان کو گم راہ اللہ ہی کرتا ہے، تو پھر اس کو سزا اور دوزخ کا عذاب کیوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ ہی گم راہ کرتا ہے، اور اللہ ہی ہدایت دیتا ہے؛ لیکن بندہ اس میں مجبورِ محض نہیں ہے؛ بل کہ اللہ نے دونوں راستے دکھادیے، اچھائی اور برائی کا راستہ بتلانے کے لیے انبیاء بھیجے، اور کتابیں نازل کیں؛ تاکہ جو چاہے اپنے اختیار سے سیدھا راستہ اپنائے، اور جو چاہے غلط راستے پر چلے، یہ بات بار بار قرآن میں بیان کی گئی ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھادیے ہیں، اب اگر کوئی سیدھا راستہ اختیار نہ کرے، تو اس کا وبال اسی کے سر ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کے باوجود اللہ نے موذی جانور کیوں پیدا کیے ہیں؟

سوال: اللہ اگر انسانوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے، تو پھر اس نے انسان کی موت کے لیے زہریلے اور موذی جانور کیوں پیدا کرر کھے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: بے شک اللہ انسان سے ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتے ہیں، یہ بات سچ اور درست ہے؛ لیکن موذی جانوروں کو پیدا کرنے میں اللہ کی بے شمار

حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، اُن کے پیدا کرنے کی تمام حکمتیں تو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے؛ لیکن اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ زہریلے جانوروں کا زہر مختلف قسم کی دوائیں بنانے کے کام آتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

اللہ رحمان و رحیم ہیں پھر سیلاب اور زلزلے جیسی آفتیں کیوں؟

سوال: اللہ اگر رحیم و رحمان ہے، تو پھر زلزلوں، سیلابوں اور وباؤں کے ذریعے لاکھوں جانیں کیوں تلف کر دیتا ہے، اور اسی طرح فاقوں اور موسم کی سختیوں سے لوگوں کو کیوں مارتا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ بلا شبہ رحیم و رحمٰن ہے؛ لیکن اس کے ساتھ وہ قہار و جبار بھی ہے، جس طرح اس کی شانِ رحیمی کا ظہور ہوتا ہے، اسی طرح اس کی صفتِ قہاریت و جباریت کا بھی ظہور ہوتا ہے، یہ جو حوادث ہیں، یہ اُنھی صفات کے مظہر ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ ان صفات کا ظہور بلا وجہ ہی ہوتا ہو؛ بل کہ یہ خدا کی نافرمانیوں کی وجہ سے آنے والی پریشانیاں ہیں، اور ان سب کی پہلے ہی پیشین گوئی کی جا چکی ہے، خود قرآن میں ہے کہ ''جو بھی مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمھارے اعمال کا ہی نتیجہ ہوتی ہے، پھر بھی خدائے تعالیٰ بہت سی چیزوں کو معاف فرما دیتے ہیں''۔ (الشوریٰ: ۳۰) اور احادیث میں تو ان کے متعلق مستقل ابواب ہیں، ہر گناہ کے اثر پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر ہے، جیسے کہ ایک حدیث میں ہے: ''جب زنا عام ہوگا تو زلزلے کثرت سے آئیں گے''، سو آج کل ہو رہا ہے، تو زلزلوں کی بھی کثرت ہے، اللہ ہم سب کی اپنے غضب سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا نیچر یعنی فطرت کا خدا کے قبضۂ قدرت میں ہونا اس کے رحم وکرم کے خلاف ہے؟

سوال: کیا یہ درست نہیں ہے کہ نیچر؛ یعنی: فطرت؛ خدا کے قبضۂ قدرت میں نہیں؛ کیوں کہ نیچر میں جبر ہے، جب کہ خدا رحیم وکریم ہے، اور وہ جبر واستبداد کو پسند نہیں کرتا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''فطرت میں جبر ہے'' سے کیا مراد ہے؟ اگر یہ مراد ہے کہ قانونِ فطرت میں تخلف نہیں ہوتا، تو یہ بات کیسے معلوم ہوئی، کیا استقراء سے؟ جب کہ استقراء میں صرف چند جزئیات کا مشاہدہ ہوتا ہے، عدم تخلف کے لیے مستقل دلیل چاہیے؛ کیوں کہ استقراء سے اسبابِ عادیہ پر آثار کا مرتب ہونا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اسبابِ عادیہ پر آثار کا مرتب ہونا ضروری ہو، ایسا نہیں ہے؛ لہٰذا جو کچھ بھی مشاہدہ ہوتا ہے، اس کے پیچھے فاعلِ حقیقی اللہ کی ذات ہے، اور اللہ نے ہی قانونِ فطرت بنایا ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ خود اب قانون کے آگے مجبور ولاچار ہے؛ بل کہ وہ کبھی اس کے خلاف بھی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جنھوں نے اسبابِ عادیہ ہی کو موثر سمجھا، وہ خدا کو قانونِ فطرت کے آگے مجبور سمجھنے لگے، جس کی وجہ سے اُنھوں نے معجزات کا انکار کیا، حالاں کہ معجزہ بلا واسطہ سببِ عادی کے؛ بہ راہِ راست فاعلِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے فعل کا اثر ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے وہ مخالفِ عادت ہوتا ہے، اور باقی آثار جو اسبابِ عادیہ پر مرتب ہوتے ہیں، وہ بہ واسطہ اسبابِ عادیہ کے؛ فاعلِ حقیقی کے افعال کا اثر ہوتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

اللہ کی عبادت سے جب مشکلات حل ہوتی ہیں تو مسلمان بدحال کیوں ہیں؟

سوال: اگر اللہ کی عبادت اور اللہ کے حضور جھکنے سے انسانوں کی مشکلات آسان ہوجاتی ہیں،

اللہ اُن پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے، تو ایسا کیوں ہے کہ یہ سب کرنے والے بدحال ہیں؟ اور اس قسم کا کوئی بھی عمل نہ کرنے والے خوش حال ہیں؟ جس کی دنیا میں بے شمار مثالیں موجود ہیں، مثال کے طور پر پاکستان اور جاپان کا نام لیا جاسکتا ہے کہ پاکستان بدحال ہے، اور جاپان خوش حال ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: یقیناً کبھی ایسا بھی بہ ظاہر نظر آتا ہے کہ فرماں بردار زیادہ مشکل میں ہوجاتے ہیں؛ لیکن یہ مشکلات حقیقی مشکلات نہیں ہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کا امتحان اور آزمایش ہوتی ہے؛ لیکن خوش حالی اور خوش عیشی سے مقصود؛ جو اطمینانِ قلب اور جمعیتِ خاطر ہے؛ سو دیکھ لیجیے کہاں زیادہ ہے؟ یقیناً وہ اُنھی نیک لوگوں کے پاس زیادہ ہے، جو دنیاوی اعتبار سے بدحال پریشان ہیں، اُنھیں سکون زیادہ ہے، اُنھیں آرام سے نیند آتی ہے، اس کے برخلاف جو لوگ دنیاوی اور مادی اعتبار سے خوش حال ہیں، اُن میں سے اکثر قلبی طور سے پریشان ہیں، ڈپریشن کے شکار ہیں، کیا فائدہ ہوا ایسی خوش حالی کا جس کے ساتھ سکون نصیب نہ ہوا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

جب رزق من جانب اللہ متعین ہے تو اب سعی کا کیا فائدہ؟

سوال: اللہ ایک جگہ کہتا ہے کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے، جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے، دوسری جگہ کہتا ہے کہ ہم جس کا چاہتے ہیں رزق فراخ کر دیتے ہیں، اور جس کا چاہتے ہیں تنگ، پھر انسان کی سعی اور کاوش کا کیا مطلب رہ جاتا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اللہ تعالیٰ نے قرآن کی جس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ انسانوں کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، اس آیت کو اگر ہم سیاق وسباق سے ملا کر دیکھیں تو بات سمجھ میں آجائے گی کہ اس آیت میں وہاں رزق کا بیان نہیں؛ بل کہ آخرت میں جزا وسزا کا بیان ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کے حوالے سے دو حکم؛ احکام آخرت میں سے

نقل کیے گئے ہیں: (۱) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ آخرت میں نہیں اٹھائے گا۔(۲) اور انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کیا ہوگا، اور اسی کو اگلی آیت میں کہا ہے کہ ’’وہ اپنی سعی کو عن قریب دیکھ لے گا، پھر اسے پورا پورا بدلا ملے گا‘‘۔ (نجم: ۳۹، ۴۰، ۴۱)

اور رہا رزق کا معاملہ؛ تو یقیناً ہر بندے کی تقدیر میں اس کا رزق لکھ دیا گیا ہے؛ لیکن اس کے حصول کے لیے محنت اور کسب شرط ہے، محض تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا، اور بالعموم تدبیر کے بغیر کچھ نہیں ملتا، تدبیر تو ہزاروں لوگ ایک جیسی کرتے ہیں؛ مگر نتائج مختلف کیوں ہوتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ آدمی کے اختیار میں صرف کسب، کمانا اور محنت کرنا ہے، اور اسے تقدیر کا علم نہیں ہے؛ لہٰذا جتنی کوشش بندے کے بس میں ہے، اتنی کوشش مسلسل ضروری ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

جب اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی ایمان نہیں لاسکتا تو کافروں کا کیا قصور ہے؟

سوال: قرآن میں ہے کہ اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی ایمان نہیں لاسکتا، تو پھر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کا کیا قصور؟ پھر قرآن میں ہے کہ اللہ تم سے بھلائی کرنا چاہے، تو کوئی روک نہیں سکتا، اس کا مطلب ہے کہ سب اچھائی برائی اللہ کی مرضی سے ہوتی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: کسی کے ایمان نہ لانے کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتے ہیں؛ لیکن کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے علم و ارادے کے بغیر پائی بھی نہیں جاتی، یعنی: اللہ کو معلوم ہے کہ کون ایمان لائے گا، اور کون نہیں، ایمان لانے نہ لانے کے سلسلے میں بندے کو اختیار دیا گیا، اسے عقل دی گئی، اچھے راستے کی طرف اس کی راہ نمائی کی گئی، پھر بھی اگر بندہ سیدھا راستہ نہ اختیار

کرے، تو اس کا اپنا قصور ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۷/۶ھ
الجواب صحیح: وقار علی غفر لہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ
(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

ہر بچہ اللہ کی مرضی سے آتا ہے تو ناجائز اولاد کس کی مرضی سے آتی ہے؟

سوال: کوئی بھی بچہ اللہ کی مرضی کے بغیر دنیا میں نہیں آتا، جو بچے ماں کی کوکھ میں ناجائز پل رہے ہوتے ہیں، اُن میں روح اور زندگی کون بخشتا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ اُن بچوں کی پیدایش میں اللہ کی رضا شامل ہوتی ہے، تو ایسے بچوں سے نفرت کیوں؟ یا ایسے بچوں کا قتل کیوں درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: بلا شبہ کوئی بھی بچہ اللہ کے ارادے کے بغیر دنیا میں نہیں آتا؛ اگر چہ اللہ تعالیٰ ناجائز عمل سے راضی نہیں ہوتے، جو بچے ماں کی کوکھ میں ناجائز پلتے ہیں، اُن میں روح اور جان اللہ ہی ڈالتے ہیں، اُن کی پیدایش بھی اللہ کی مشیت سے ہی ہوتی ہے؛ لیکن اُن سے نفرت کرنے اور اُنھیں قتل کرنے کا حکم نہیں ہے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے؛ بل کہ اسے بھی وہ سارے حقوق حاصل ہیں، جو ایک عام بچے کو حاصل ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اس میں بچے کا کیا قصور ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۷/۶ھ
الجواب صحیح: وقار علی غفر لہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ
(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

دنیا میں شادی کی شرط نکاح ہے تو آخرت میں بنا نکاح بہتّر حوروں کا وعدہ کیوں؟

سوال: قرآن میں شادی کی بنیادی شرط نکاح رکھی گئی ہے، وہ بھی ایک سے؛ البتہ یتامی النساء کی صورت میں دو دو، تین تین، چار چار؛ لیکن جنت میں بہتّر حوروں کا وعدہ، اور وہ بھی نکاح کے بغیر کیوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: شادی کی واحد شرط نکاح ہے، اور ایک سے نہیں، چار تک نکاح کی اجازت ہے؛ بہ شرطے کہ ایک سے زائد ہونے کی صورت میں انصاف سے کام لے، رہا جنت میں بہتّر حوروں کا وعدہ، تو وہاں کے احکام دنیا کے احکام سے مختلف ہیں؛ کیوں کہ وہاں کی ہر چیز یہاں کی ہر چیز سے جدا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

قرآن جب ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ ہے تو غیروں کے لیے کون سی کتابِ ہدایت ہے؟

سوال: قرآن ہدایت ہے اُن کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، جو خدا کے آگے سجدہ کرتے ہیں، جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جو انبیاء پر ایمان لاتے ہیں، جو ملائکہ کو خدائی قوتیں تسلیم کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا اس بارے میں کسی پر بھی ایمان نہیں، اُن کے لیے کون سی الہامی کتاب ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: قرآن جس طرح متقیوں کے لیے ہدایت ہے، اسی طرح تمام عالم اور تمام انسانوں کے لیے بھی ہدایت ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ (آیت: ۱۸۵) میں کہا گیا ہے کہ ''قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے''، اور ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے؛ کیوں کہ ہدایت کے ایک معنی ہیں: اراءۃ الطریق (راستہ دکھا دینا)، اور دوسرے معنی ہیں: ایصال الی المطلوب (مقصود تک پہنچانا)؛ پس جہاں عام لوگوں کے لیے ہدایت کہا گیا ہے، وہ پہلے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی: قرآن راستہ تو سب کو دکھاتا ہے، اور جہاں متقیوں کے لیے ہدایت کہا گیا ہے، وہاں دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی: یہ متقین کے لیے منزلِ مقصود تک پہنچانے کا سبب ہے؛ کیوں کہ اس معنی کر ہدایت تو صرف اللہ کا فعل ہے؛ لہٰذا وہ لوگ جو اللہ، آخرت وغیرہ کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے، اُن کے لیے بھی

قرآن ہی ہدایت کا ذریعہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

آیت ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِم﴾ پر ایک غیر مسلم کا اعتراض اور آیت کا صحیح مفہوم

سوال: میرا ایک ہندو دوست کہتا ہے کہ آپ کے قرآن کے سورۂ بقرہ میں، نیز قرآن کے مختلف مقامات میں لکھا ہوا ہے کہ ''ان کے دلوں پر مہر لگا دیے گئے ہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے'' تو اس کا کہنا ہے کہ جب میرے دل پر مہر لگا دیا گیا ہے، اور میری زندگی کا فیصلہ کرلیا گیا ہے، تو کیسے اور کیوں میں اسلام قبول کروں؟ میں اسلام کو نہیں سمجھ سکتا؛ کیوں کہ اسلام مجھے منع کرتا ہے، بہ راہِ کرم اس بارے میں راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: آپ کے ہندو دوست کے دل پر بھی مہر لگی ہو، یہ تو قرآن شریف میں کہیں بھی نہیں، قرآنِ کریم جب سے نازل ہونا شروع ہوا یا دوسرے الفاظ میں مذہبِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے آج تک لاکھوں؛ بل کہ کروڑوں لوگوں نے مذہبِ اسلام کو قبول کرکے دنیا وآخرت میں سعادت ونیک بختی کو حاصل کیا، اور آج بھی بے شمار منصف مزاج غیر مسلم بھائی محاسنِ اسلام کو خوب سمجھتے ہیں، اور ایمان واسلام قبول کرنے کے واقعات بھی پیش آتے رہتے ہیں؛ البتہ جو لوگ شر وعناد، بغض وحسد کی بنا پر بغیر کسی وجہ کے اسلام دشمنی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں، ایسے لوگ آہستہ آہستہ صحیح فہم اور سمجھ کی صلاحیت کو برباد کردیتے ہیں، تو اُن میں سے بعض لوگوں کے دلوں پر مہر لگادی جاتی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۲۴/۱۲/۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۶/۹/۲۰۱۷ء، یوم السبت

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۵۱۸/ھ، ۱۴۷۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)

شجرِ ممنوعہ سے کیا مراد ہے؟

سوال: شجرِ ممنوعہ سے کیا مراد ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: ”شجرِ ممنوعہ“ کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے گندم کا، اور بعض نے اسے انجیر کا درخت کہا ہے؛ لیکن جس چیز کو شریعت نے مبہم رکھا ہے، اس کی تعیین کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ اس پر کسی عقیدے اور عمل کی صحت بھی موقوف نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

آدم وحوا جب میاں بیوی تھے تو وہ اپنی ستر کس سے چھپا رہے تھے؟

سوال: آدم اور حوا جب شیطان کے بہکاوے میں آکر شجرِ ممنوعہ کا مزہ چکھنے لگتے ہیں، تو ان کی ستر کھل جاتی ہے، تو وہ درخت کے پتوں سے اپنے اپنے ستر چھپانے لگے، سوال یہ ہے کہ اگر میاں بیوی تھے، تو اپنی ستر کی چیزیں کس سے چھپانے لگے تھے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: ستر پوشی تو ابتدائے آفرینش سے ہی انسانوں کا خاصہ ہے، کوئی بھی مہذب شخص ستر کھولنا پسند نہیں کرتا، بھلے ہی وہ اپنی بیوی ہی کے سامنے کیوں نہ ہو، خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحبت کرتے ہوئے تمام کپڑے اتارنے سے منع فرمایا ہے، اور اسے جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔

عن عتبة بن عبد أنّ رسُول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم قال: إذا أتى أحدكم أهله فليستتر، ولا يتجرّد تجرّد العير. (المعجم الكبير للطبراني: ۱۷/۱۲۹، باب العين، رقم: ۳۱۵)

(ترجمہ:) حضرت عتبہ ابن عبد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں

سے کوئی جب اپنی بیوی کے پاس (ہم بستری کے لیے) آئے تو ستر کو چھپا لے، اور گدھے کی طرح بالکل برہنہ نہ ہو۔

عن عائشة رضي اللّٰه عنها قالت: ما نظرتُ – أو ما رأيتُ– فرج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم قط. رواه ابن ماجه، قال القاري: وفي رواية: ما رأيتُ منه ولا رآى منّي، تعني: الفرج. (مرقاة المفاتيح: ٦/٢٦٣–٢٦٤، باب النظر إلى المخطوبة وبيان العورات، رقم: ٣١٢٢)

(ترجمہ:) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ زندگی بھر نہ میں نے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر دیکھا، اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میرا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۹/تتمہ/د، ۶۴۹/د، ۱۴۳۸ھ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کم عمری میں نکاح ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب

سوال: حضرت! ایک عیسائی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ کیوں میرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶/سالہ لڑکی (عائشہ) سے شادی کی، اور ۹/سال کی عمر میں ان کے ساتھ صحبت کی، اس کے بعد اس عیسائی عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا اُنھوں نے صحیح کیا؟ میں نے کہا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کیا وہ صحیح کیا، اُنھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی کوئی وجہ ہوگی، اور میں اپنے بڑے علماء سے معلوم کر کے بتاؤں گا۔

حضرت! آپ سے میری درخواست ہے کہ بہ راہِ کرم مجھ کو بہت جلد جواب عنایت فرمائیں؛ تاکہ میں اس عیسائی عورت کو جواب دے سکوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰه التوفيق: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نکاح؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی بنا پر ہوا تھا، ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جبرئیل

میرے پاس آئے، اور یہ کہا کہ اللہ عز وجل نے آپ کا نکاح ابوبکر کی بیٹی سے کر دیا، یہ مضمون صحیحین کی روایتوں میں بھی آتا ہے، جب آپؐ کا نکاح باضابطہ اللہ کی طرف سے وحی کی بنا پر ہوا، تو اب اس میں بندوں کو اپنی عقل لگانے کا کوئی حق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب چیزوں سے خوب واقف ہے، نیز شریعتِ اسلام میں کم عمری میں نکاح اور رخصتی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کسی بھی آیت یا حدیث سے اس کی ممانعت ثابت نہیں ہے، پھر بعض مورخین نے لکھا ہے کہ عرب کے ماحول میں اگر نو سال کی عمر میں بچی؛ شادی کے قابل ہوجائے، تو اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۶/۱۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ زین الاسلام قاسمی

(۱۱۱۲/ص، ۱۱۹۱/ص، ۱۴۳۸ھ)

عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کا حکم

سوال: (۱) قابل دریافت امر یہ ہے کہ زیارۃ القبور للنساء کے مسئلے میں راجح عندالاحناف کیا ہے؟ جواب میں حنفیہ کا مدلل مسلک مع الترجیح، ووجہ ترجیح، انطباق بین الاحادیث والآثار، رعایتِ احوال و زمانہ، ان تمام امور پر روشنی ڈالیں تو احسان ہوگا۔

(۲) نیز اس امر کی بھی وضاحت از حد ضروری فرما دیں کہ حالاتِ زمانہ کی وجہ سے کسی امرِ مشروع کو بند کرا دینا زیادہ بہتر ہے، یا پھر اس کو درست طریقے پر جاری کرانا زیادہ بہتر ہے، ہم غلطیوں سے بچانے کے لیے ایسا کیوں کرتے ہیں کہ اُس کام کو ہی بند کرا دیتے ہیں، اس کی ذرا وضاحت فرمائیں، کافی وقت سے اس میں احقر کو خلجان ہے۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: (۱) احناف کے یہاں راجح قول کے مطابق زیارۃ القبور للنساء مکروہ ہے، حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کی زیارت کرنے سے منع کر دیا تھا، پھر بعد میں اجازت دی، تو بعض علماء نے فرمایا کہ اجازت صرف مردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے زیارت بہ دستور ممنوع ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ عورتوں کے لیے بھی اجازت ہے؛ بہ شرطے کہ کوئی فتنہ وفساد لازم نہ آئے؛ لیکن چوں کہ عورتوں کے اندر تحمل کم ہوتا ہے، بسا اوقات قبر کو

دیکھ کر رونا، چلانا، بال نوچنا وغیرہ شروع کر دیتی ہیں، اور اگر بزرگوں کی قبریں ہوں، تو طواف وسجدہ کرنے لگتی ہیں، اور ان سے مرادیں مانگتی ہیں، نیز آج کل عورتوں کا گھر سے نکلنا موجبِ فتنہ وفساد ہے؛ اس لیے عورتوں کا مطلقاً قبرستان جانا منع ہے۔

قال العيني: وحاصلُ الكلام من هذا كلّه أنّ زيارة القُبور مكروهةٌ للنِّساء؛ بل حرامٌ في هذا الزّمن، ولا سيّما نساء مصر؛ لأنّ خروجهنّ على وجه فيه الفساد والفتنة.

(عمدة القاري: ۸/۷۰، ط: مكتبة رشيديه)

قال الشَّامي: والأصح أنّ الرُّخصة ثابتةٌ لهنّ، وجزم في شرح المنية بالكراهة؛ لما مرّ في اتباعهن الجنازة، وقال الخير الرّملي: إن كان ذلك لتجديد الحزن والبُكاء والنّدب على ماجرت به عادتهن فلا تجوز، وعليه حمل حديث: لعن اللّٰه زائرات القُبور، وان كان للاعتبار والتّرحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصّالحين فلا بأس إذا كنّ عجائز، ويكره إذا كنّ شوابّ، كحضور الجماعة في المساجد.

(رد المحتار: ۳/۱۵۰-۱۵۱، ط: مكتبة زكريا)

(۲) کسی امرِ مشروع کو مفاسد کے سبب روکنے میں یہ تفصیل ہوگی کہ وہ امرِ مشروع شریعت کی جانب سے مطلوب ہے یا مستحسن ومحمود ہے، اس کا تعلق دین کی بنیادی چیزوں سے ہے یا نہیں؟ نیز مفاسد کس درجے کے ہیں وغیرہ، اور یہ سب کام محقق عالم ومفتی کے دیکھنے سمجھنے کا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱۶ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۱۶۹/د، ۱۹۳/د، ۱۴۳۸ھ)

فتاوی ہندیہ میں قبروں پر پھول ڈالنے سے متعلق عبارت کا صحیح مفہوم

سوال: بریلوی الفتاوی الهندية کا حوالہ دیتے ہیں، اور قبروں پہ پھول ڈالنے کو جائز کہتے ہیں:

وضع الوُرود والرّياحين على القُبور حسنٌ، وإن تصدّق بقيمة الورد كان أحسن.

(ترجمہ:) گلاب کے یا دوسرے پھول قبروں پر رکھنا اچھا ہے، اور ان پھولوں کی قیمت صدقہ کرنا

زیادہ اچھا ہے۔ (الشیخ نظام وجماعة من علماء الهند، الفتاوى الهندية: ۳۵۱/۵، ط: دار الفكر) برائے مہربانی جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: اگر کسی شخص کو کشف ہوگیا، یا کسی فاسق فاجر آدمی کی قبر کے متعلق اس کو خیال ہوا کہ شاید صاحبِ قبر عذاب میں مبتلا ہوگا، اور اس نے کچھ پھول خرید کر اس نیت سے رکھ دیے کہ جب تک یہ پھول تر رہیں گے، عذاب میں ان شاء اللہ تخفیف ہوگی، تو اس نے اچھا کیا، تاہم اگر قیمت پھولوں کی؛ صدقہ فقراء پر کرکے صاحبِ قبر کو ثواب پہنچادیتا، تو پھول قبر پر رکھنے کے بجائے زیادہ بہتر ہوتا، بریلوی صاحبان نے آپ کے سامنے فتاوی ہندیہ کی عبارت پیش کرکے اگر یہی مطلب ومراد آپ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے، تو یہ مطلب صحیح ہے، اور اگر اس عبارت کو آپ کے سامنے پیش کرکے آپ کو یہ سمجھانا چاہتے ہوں کہ آج کل جو بریلوی لوگ اولیاء اللہ کی قبروں پر تقرب حاصل کرنے کی خاطر پھول چڑھاتے ہیں، اُس کا جواز فتاوی ہندیہ کی عبارت سے ہوتا ہے، تو ان بریلوی صاحبان کا یہ سمجھنا اور سمجھانا سراسر باطل ہے، خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اولیاء اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے قبروں پر پھول چڑھانا حرام ہے، حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ اپنی کتاب ''مائۃ مسائل'' میں اکتالیسویں سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ''اگر برائے تقربِ میت می اندازند غیر جائز است وحرام الخ''، یعنی: اگر میت کا تقرب حاصل کرنے کی خاطر پھول ڈالے جائیں، تو ناجائز اور حرام ہے الخ، فتاوی رحیمیہ جلد دوم میں (ص: ۲۱۵ سے ۲۱۷ تک، بہ عنوان: قبروں پر پھول چڑھانا) مائۃ مسائل کی فارسی عبارت اور اس کا ترجمہ مذکور ہے، اگر بریلوی صاحبان کا مقصود؛ تقرب نہ ہوتا ہو، تو اولیاء اللہ کی قبور کے بجائے؛ فساق فجار کی قبروں پر کبھی کبھار پھول رکھ دیا کرتے، اور اکثر وبیش تر رقم وغیرہ فقراء پر صدقہ کرکے ثواب پہنچایا کرتے؛ مگر ایسا کرتے ہوئے شاید کسی بریلوی صاحب کو کسی نے نہ دیکھا ہوگا، اللہ پاک ہدایت سے نوازے، اور اتباعِ سنت کی توفیق بخشے۔ آمین۔

اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ فتاویٰ ہندیہ میں اس عمل کے سنت ہونے نہ ہونے سے بحث نہیں؛ بل کہ دو عمل میں تقابل کا حکم بیان کردیا گیا کہ اگر کسی نے کسی کی قبر پر پھول رکھ دیے، تو حسن ہے، اور قیمت فقراء کو دے دے، تو احسن ہے، اور جو شخص دونوں میں سے کوئی بھی عمل نہ کرے، تو اس پر

تارکِ سنت ہونے کا حکم نہیں، حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نیز ائمہ مجتہدین وبزرگانِ دین رحمہم اللہ کی عادتِ شریفہ قبور پر پھول رکھنے کی نہیں تھی۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴/۱۲/۱۴۳۸ھ الموافق: ۶/۹/۲۰۱۷ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۴۱۸/ھ،۲۱۴/ھ، ۱۴۳۸ھ)

اجتماعی مجلسِ توبہ منعقد کرنے کا حکم

سوال: محترم مفتی صاحب، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند! عرض یہ ہے کہ ہمارے شہر مالیگاؤں میں ماہِ رمضان کے اخیر عشرے میں واٹس ایپ پر ایک اشتہار تراویح میں تکمیل قرآن کے تعلق سے بھیجا گیا تھا۔ اشتہار اس طرح تھا:

''تکمیلِ قرآن کریم ومجلس توبہ، مکرمی!............ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ...... مسجد کے دوسرے منزلے پر منعقد ہونے والی دوسری تراویح میں ۲۸/رمضان بہ روز: سنیچر؛ قرآن کی تکمیل ہوگی، اور اس کے فوراً بعد مجلسِ توبہ منعقد ہوگی (ان شاء اللہ)، گذشتہ برسوں کی طرح اس سال بھی اس اہم مجلس میں............حضرت مولانا............صاحب دامت برکاتہم اپنے مخصوص انداز میں خطاب فرمائیں گے، اور خطاب کے بعد حضرت ہی کی رقت آمیز دعا بھی ہوگی (ان شاء اللہ)، آخری طاق رات میں...... رمضان المبارک کی آخری ساعتوں میں...... قبرستان کے یادِ آخرت دلانے والے ماحول میں...... قرآنِ کریم کی تکمیل کے مبارک موقع پر............ منعقد ہونے والی اس توبہ اور دعا واستغفار کی اہم مجلس میں خود بھی شریک ہوں، اور اپنے احباب کو بھی شرکت کے لیے توجہ دلائیں۔

نوٹ: نمازِ عشاء گیارہ بجے ہوگی۔ الداعیان: ٹرسٹیان ...... مسجد...... مالیگاؤں''۔

سوال یہ ہے کہ ''مجلسِ توبہ'' یا ''مجلسِ توبہ اور دعا واستغفار'' منعقد کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا قرآن وسنت میں ایسی مجالس کا انعقاد کرنے کا ثبوت ملتا ہے؟ کیا یہ بدعت ہے؟ تکمیلِ قرآن کے موقع پر اشتہار شائع کرنا، اور لوگوں سے ''توبہ اور دعا واستغفار'' کی مجلس میں شرکت کی اپیل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ عوام کو اس طرح مدعو کرکے جمع کرنا، اور (گلے میں مائک لگا کر) بلند آواز سے

(طے شدہ) رقت آمیز دعا کرنا، خود بھی رونا، اور حاضرین کو بھی رلانے کی کوشش کرنا شریعت کی نظر میں کیسا فعل ہے؟

ہمارے شہر میں برسوں سے یہ روایت قائم ہے کہ رمضان میں تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر تمام مساجد میں طویل دعائیں ہوتی ہیں، بعض مساجد میں اندھیرا کر دیا جاتا ہے، امام گلے میں مائک لگا کر بلند آواز سے رقت آمیز دعا کرتا ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام اپنی دعا، اور اپنا رونا دھونا اللہ تعالیٰ سے زیادہ حاضرین کو سنا رہا ہے، اور اُنھیں رلانے پر کمر بستہ ہے، حاضرین بھی بلند آواز سے ''آمین آمین'' کہتے ہیں، اور روتے ہیں، جو امام جتنی طویل دعا کرتا ہے، اور حاضرین کو جتنا زیادہ رلاتا ہے، اس سے لوگوں کو اتنی ہی عقیدت ہوتی ہے، اور اس کی دعا میں شرکت کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں، یہ پہلا موقع ہے جب ''توبہ اور دعا واستغفار'' کی مجلس کا اشتہار شائع ہوا ہے، اور عوام سے شرکت کی اپیل کی گئی ہے، اس بات کا قوی خدشہ ہے کہ آیندہ سال کچھ اور مساجد کے ٹرسٹی حضرات بھی اس دوڑ میں شامل ہو جائیں گے، اور ایک نئی روایت قائم ہو جائے گی۔ ازراہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ مرحمت فرما کر مشکور فرمائیے۔ ان شاء اللہ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: قرآن کی تکمیل کے موقع پر اجتماعی مجلسِ توبہ یا مجلسِ دعا واستغفار منعقد کرنا، اس کے لیے اشتہار دینا، اور اعلان کرنا قابلِ ترک ہے، خیر القرون میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، یہ بدعت کا پیش خیمہ ہوسکتا ہے، نماز میں جو لوگ شریک ہوں، وہ دعا واستغفار کرلیا کریں، اس کے لیے باقاعدہ اعلان کی ضرورت نہیں ہے، نیز دعا میں شرعاً سر پسندیدہ ہے؛ اس لیے اگر کوئی خاص اجتماعی مسئلہ درپیش نہ ہو تو سراً ہی دعا کرنی چاہیے۔

نــــوٹ: یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ایک ہی مسجد میں تراویح کی دو جماعت کرنا کراہت سے خالی نہیں؛ اس لیے اگر دوسری جماعت کرنی ہی ہو، تو مسجد میں عشاء باجماعت پڑھ کر محلّے میں کسی کمرے یا ہال وغیرہ میں تراویح کی جماعت کرلی جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۲/۱ھ، پنج شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۸۵/تتمہ/س، ۱۳۴۷/س، ۱۴۳۸ھ)

قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) زید کا انتقال ہوا، اُس کو دفنانے کے بعد کچھ لوگ یہ اعلان کرتے ہیں کہ کل یا کسی اور دن اُس کے نام سے مسجد یا کسی اور متعین جگہ میں قرآن خوانی ہوگی، پھر اُس کے بعد دعا وغیرہ کرکے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں، ایسا کرنا کیسا ہے؟

(۲) اور دوسری بات یہ ہے کہ قرآن خوانی کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

برائے مہربانی اس مسئلے کو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرما دیجیے، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱)** میت کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کرکے اُسے ثواب پہنچانا درست ہے؛ لیکن قرآن پڑھنے والوں کو کھانا، ناشتہ کھلانا درست نہیں۔

(۲) مروجہ قرآن خوانی جس میں لوگوں کے بلانے کا اہتمام ہوتا ہے، اور بہت سے لوگ اکٹھا ہوکر قرآن خوانی کرتے ہیں، یہ طریقہ ثابت نہیں؛ بل کہ انفرادی طور پر جس سے جس قدر ہو سکے قرآن پڑھ کر ایصالِ ثواب کر دیا کرے۔

ویکره اتخاذ الضّیافة من الطّعام من أهل المیّت؛ لأنّه شرع في السُّرور لا في الشُّرور، وهي بدعة مستقبحة ...... ویکره اتخاذ الطّعام في الیوم الأوّل والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطّعام إلی القبر في المواسم واتخاذ الدّعوة لقراء ة القرآن وجمع الصُّلحاء والقُرَّاء للختم أو لقراء ة سورة الأنعام أو الإخلاص. (رد المحتار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة: ۱۴۸/۳، ط: زکریا، دیوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند   ۲۱/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۳۰۹/ب، ۱۸۹/ب، ۱۴۳۸ھ)

قبروں پر پھول ڈالنے کے جواز پر حافظ ابن حجرؒ کے قول سے استدلال کی حقیقت

سوال: بریلوی؛ قبروں پہ پھول ڈالنے پر امام ابن حجر عسقلانی کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں، امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

إنّ المعنى فيه أنّه يسبِّح ما دام رطباً فيحصُل التّخفيف ببركة التّسبيح، وعلى هذا فيطرد في كلّ ما فيه رطوبةٌ من الأشجار وغيرها، وكذلك فيما فيه بركةٌ، كالذِّكر وتلاوة القُرآن من باب الأولى.

مطلب یہ کہ جب تک ٹہنیاں (پھول، پتیاں، گھاس) سرسبز رہیں گی، اُن کی تسبیح کی برکت سے عذاب میں کمی ہوگی، بنابریں درخت وغیرہ جس جس چیز میں تری ہے (گھاس، پھول وغیرہ) یوں ہی بابرکت چیز؛ جیسے: ذکر، تلاوتِ قرآن کریم بہ طریقِ اولی باعثِ برکت وتخفیف ہیں، **وهو أولى أن يتّبع من غيره.** اس حدیثِ پاک کا زیادہ حق ہے کہ بجائے کسی اور کے اس کی پیروی کی جائے۔ عسقلانی (فتح الباری: ۱/۳۲۰، دارالمعرفۃ، بیروت) برائے مہربانی اس کا جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: قبروں پر پھول ڈالنے کی رسم بے اصل اور بدعت ہے، شرعاً اس کا ثبوت نہیں ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین یا ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ میں سے کسی سے پھول چڑھانا ثابت نہیں، اور نہ ہی کسی متداول کتب فقہ میں اس کا تذکرہ ملتا ہے، حدیث میں وارد الفاظ سے بھی پتا چلتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دونوں قبروں پر ٹہنیاں رکھنا اُنھی کے ساتھ خاص تھا، مسلم شریف کی روایت میں ہے:

أَحبَبتُ بشَفاعتي أن يرفه ذلك عنهما ما دام الغُصنان رطبين. (مسلم: ۲/۴۱۸)

یعنی: میں نے ان کے لیے سفارش کی ہے، میری سفارش مطلقاً تو قبول نہیں کی گئی؛ مگر مقید قبول کرلی گئی ہے، جب تک یہ ٹہنیاں تر رہیں گی ان کے عذاب میں تخفیف ہوگی؛ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا معمول قبروں پر ٹہنیاں رکھنے کا نہ تھا،

علاوہ ازیں اگر پھول چڑھانے سے مقصود عذاب میں تخفیف ہے، تو اس کے مستحق اموات ِفساق وفجار ہیں، نہ کہ اولیاء اللہ اور مقربینِ خدا، جیسا کہ اس کا رواج ہے، نیز حدیث میں ٹہنی کا ذکر ہے، نہ کہ پھول وغیرہ کا؛ حالاں کہ اہلِ بدعت پھول چڑھاتے ہیں۔

قال العيني: إنّ إلقاء الرّياحين ليس بشيء. (فيض الباري: ٤٨٩/٢) قلتُ: وإن كانوا يدعون اتّباع الحديث فعليهم أن يصنعوا الجرائد دون الرّياحين، وعلى المعذّبين دون المقرّبين؛ لأنّ الحديث إنّما ورد في المعذّبين. (البدر الساري على حاشية فيض الباري: ٣١١/١، باب من الكبائر)

جہاں تک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے حوالے سے سوال میں مذکور عبارت کا تعلق ہے، تو خود حافظ ابن حجر نے ''قیل'' سے اس کو بیان کیا ہے، جو اُس کے ضعف کی طرف اشارہ ہے؛ یہی وجہ ہے کہ علمائے محققین؛ مثل: علامہ خطابی، قاضی عیاض وغیرہ نے اس کو عام حکم ماننے سے انکار کیا ہے، اور ٹہنی رکھنے پر عذاب میں تخفیف کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی برکت کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، حافظ ابن حجر کی پوری عبارت اس طرح ہے:

وقال الخطابي: هو محمولٌ على أنّه دعا لهما بالتّخفيف مدة بقاء النّداوة، لا أنّ في الجريدة معنى يخصُّه، ولا أنّ في الرطب معنى ليس في اليابس، قال: وقد قيل: إنّ المعنى فيه أنّه يسبِّح مادام رطباً فيحصُل التّخفيف ببركة التّسبيح، وعلى هذا فيطرد في كل ما فيه رطوبةٌ من الأشجار وغيرها وكذلك، وقد استنكر الخطابي ومن تبعه وضع النّاس الجريدة ونحوه في القبر؛ عملاً بهذا الحديث. (فتح الباري: ٣٨٣/١)

صاحبِ معارف السنن اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وقيل: لكونهما يسبِّحان ما داما رطبتين، وضعف بأن التّسبيح لا يختص بالرّطب؛ بل يعمُّ الرّطب واليابس، وإلى عمومه ذهب المحقِّقُون في قوله تعالىٰ: ﴿وإِن من شَيءٍ إلا يُسَبِّح بحَمده﴾ كما حقَّقه الرّازي في تفسيره. (معارف السنن: ٢٦٤/١) وقال: قال الراقم: اتفق الخطابي والطّرطوسي والقاضي عياض على المنع، وقولهم أولى بالاتباع؛ حيث أصبح تلك المسامحات والتعلُّلات مثاراً للبدع المنكرة والفتن السائرة، فترى العامّة يلقون الزهور على القبور، وبالأخص على قبور الصُّلحاء والأولياء،

والجهلة منهم ازدادوا إصراراً على ذلك. (معارف السنن: ۱/ ۲٦٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۲/۲۲ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۳۴/تتمہ/ل، ۲۴۱/ل، ۱۴۳۸ھ)

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟

سوال: میں نے کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا جائز نہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ اگر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لیں تو گناہ تو نہیں ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں حرج نہیں؛ البتہ دعا کرتے وقت رخ قبلے کی طرف کرے، نہ کہ قبر کی طرف؛ تاکہ استمداد کا شبہ نہ ہو، اور لوگوں کے عقیدے کی خرابی کا سبب نہ بنے۔

في فتح الباري (۱۱/ ۱۷۳، رقم الحديث: ۲٤۳): في حديث ابن مسعود رضي الله عنه: رأيتُ رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلّم في قبر عبد الله ذي النجادين، وفيه: فلمّا فرغ من دفنه، استقبل القبلة رافعاً يديه، أخرجه أبو عوانة في صحيحه.

وفي صحيح مسلم مع شرح النّووي (۱/۳۲۳): قالت عائشة: ألا أحدثكم عنّي وعن رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم، قلنا: بلى، الحديث بطوله، وفيه: ثم انطلقتُ على أثره حتى جاء البقيع، فقام، فأطال القيام، ثم رفع يديه ثلاث مرّات، قال النّووي: قوله: جاء البقيع، فقام، فأطال القيام، ثم رفع يديه ثلاث مرّات، فيه استحباب إطالة الدُّعاء وتكريره، ورفع اليدين فيه، وفيه أنّ دعاء القائم أكملُ من دعاء الجالس في القُبور. فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱/۱۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۱۹/ل، ۹۴/ل، ۱۴۳۸ھ)

عرس کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: حضرت! دارالافتاء کی ویب سائٹ پر جوفتویٰ موجود ہے، اسے پڑھنے کے بعد دو سوال عرض کرنا ہے:

(۱) عرس کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) (http://alssnnah sufi.in) ویب سائٹ پر ایک پوسٹ میں جس کا خلاصہ ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ پوسٹ یہاں کاپی (بعینہ نقل کرنا) کررہا ہوں:

اس موضوع میں دو باب ہیں:

پہلا باب عرس کے ثبوت میں، اور دوسرا باب مسئلہ عرس پر اعتراضات وجوابات میں ہے۔

پہلا باب ثبوت عرس: عرس کے لغوی معنی ہیں شادی کے؛ اس لیے دلہا اور دلہن کو عرس کہتے ہیں، بزرگانِ دین کی تاریخ وفات کو اس لیے عرس کہتے ہیں کہ مشکاۃ باب اثبات عذاب القبر میں ہے کہ جب نکیرین میت کا امتحان لیتے ہیں، اور وہ کام یاب ہوجاتا ہے، تو وہ کہتے ہیں:

نم کنومة العروس الذي لا یوقظه؛ إلا أحبّ أهله إلیه. (مشکاۃ، ص:۲۵)

(تو اس دلہن کی طرح سو جا، جس کو سوائے اس کے پیارے کے کوئی نہیں اٹھاسکتا)

چوں کہ اس دن نکیرین نے اس کو عروس کہا؛ اس لیے وہ دن روزِ عرس کہلایا؛ کیوں کہ وہاں جمالِ مصطفیٰ علیہ السلام کے دیکھنے کا دن ہے، کہ نکیرین دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ ان کو کیا کہتا تھا؟ اور وہ تو خلافت کے دولہا ہیں، تمام عالم انھی کے دم سے باہر ہے، اور وسیلۂ محبوب کا دن عرس کا دن ہے؛ لہٰذا یہ دن عرس کا کہلایا، عرس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ ہر سال تاریخ وفات پر قبر کی زیارت کرنا، اور قرآن خوانی وصدقات کا ثواب پہنچانا، اس اصل عرس کا ثبوت حدیث اور اقوالِ فقہاء سے ہے۔

(شامی، جلد اول، باب زیارت القبور)

ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام ہر سال شہدائے احد کی قبروں پر تشریف لے جایا کرتے تھے، تفسیر کبیر اور تفسیر درمنثور میں ہے:

حضور علیہ الصلاۃ والسلام سے ثابت ہے کہ آپ ہر سال شہدائے احد کی قبروں پر تشریف لے جاتے، اور اُن کو سلام فرماتے تھے، اور چاروں خلفاء بھی ایسا ہی کرتے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فتاویٰ عزیزیہ (ص:۴۵) پر فرماتے ہیں:

دوسرے یہ کہ بہت سے لوگ جمع ہوں، اور ختم قرآن کریم اور کھانا شیرینی پر فاتحہ کرکے حاضرین میں تقسیم کریں، یہ قسم حضور علیہ الصلاۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مروج نہ تھی؛ لیکن اگر کوئی کرے تو حرج نہیں؛ بل کہ زندوں سے مردوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب مولوی عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی علیہ الرحمہ کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

یہ طعن لوگوں کے حالات سے خبردار نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہے، کوئی شخص بھی شریعت کے مقرر کردہ فرائض کے سوا کوئی فرض نہیں جانتا، ہاں صالحین کی قبروں سے برکت لینا، اور ایصالِ ثواب اور تلاوت قرآن کریم اور تقسیم شیرینی و طعام سے ان کی مدد کرنا اجماع علماء سے اچھا ہے، عرس کا دن اس لیے مقرر ہے کہ وہ دن ان کی وفات کو یاد دلاتا ہے؛ ورنہ جس دن بھی یہ کام کیا جائے اچھا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مکتوب (۱۸۲) میں مولانا جلال الدین کو لکھتے ہیں:

پیروں کا عرس پیروں کے طریقے سے قوالیاں اور صفائی کے ساتھ جاری رکھیں، مولوی رشید احمد، اشرف علی تھانوی صاحبان کے پیر؛ حاجی امداد اللہ صاحب اپنے ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' میں عرس کے جواز پر بہت زور دیتے ہیں، خود اپنا عمل یوں بیان فرماتے ہیں: فقیر کا مصرف اس عمر میں ہے کہ ہر سال اپنے پیرومرشد کی روح مبارک پر ایصال ثواب کرتا ہے، اول قرآن خوانی ہوتی ہے، اور کبھی کبھی اگر وقت میں گنجایش ہوتو مولود پڑھا جاتا ہے، پھر ماحضر کھانا کھلایا جاتا ہے، اور اس کا ثواب بخش دیا جاتا ہے۔

مولوی رشید احمد صاحب اصل عرس کو جائز مانتے ہیں؛ چناں چہ فتاوی رشیدیہ (کتاب البدعۃ، ص:۲۸۰، ط: دارالکتاب، دیوبند) میں فرماتے ہیں:

بہت سی چیزیں ہیں کہ پہلے جائز تھیں، پھر کسی وقت منع ہوگئیں، عرس ومولود میں بھی ایسا ہی ہے، اہل عرب سے معلوم کیا کہ عرب کے لوگ حضرت سید احمد باندوی رحمتہ اللہ علیہ کا عرس بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے، خاص کر علمائے مدینہ منورہ؛ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا عرس کرتے رہے، جن کا مزارِ مقدس احد پہاڑ پر ہے، غرض کہ دنیا بھر کے مسلمان، خصوصاً اہل مدینہ؛ عرس پر کاربند ہیں، اور جس کو مسلمان اچھا جانیں، وہ عنداللہ بھی اچھا ہے، عقل بھی چاہتی ہے کہ عرسِ بزرگان عمدہ چیز ہو۔

اول تو اس لیے کہ عرس زیارتِ قبور اور صدقات وخیرات کا مجموعہ ہے، زیارتِ قبور بھی سنت، صدقہ بھی سنت، دو دو سنت کا مجموعہ حرام کیوں کر ہوسکتا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو زیارتِ قبور سے منع فرمایا تھا، اب زیارت کیا کرو۔ (مشکاۃ، زیارت قبور)

اس سے ہر طرح زیارتِ قبور کا جواز معلوم ہوا، چاہے روزانہ ہو یا سال کے بعد، اور خواہ تنہا زیارت کی جائے یا جمع ہوکر، اب اپنی طرف سے اس میں قید لگانا کہ مجمع کے ساتھ زیارت کرنا منع ہے، سال کے بعد مقرر کرکے زیارت کرنا منع؛ محض بے کار ہے، معیّن کرکے ہو یا بغیر معیّن کیے، ہر طرح سے جائز ہے۔

دوم اس لیے کہ عرس کی تاریخ مقرر ہونے سے لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی ہوتی ہے، اور لوگ جمع ہوکر قرآن خوانی، کلمۂ طیبہ اور درودِ پاک پڑھتے ہیں، بہت برکات جمع ہوجاتی ہیں۔

تیسرے اس لیے کہ ایک پیر کے مریدین اس تاریخ میں اپنے پیر بھائیوں سے بلاتکلف مل لیتے ہیں، جس سے ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتے ہیں، آپس میں محبت بڑھتی ہے۔

چوتھے اس لیے کہ طالبین کو پیر کی تلاش میں آسانی ہوتی ہے، اگر کسی عرس میں پہنچے، تو وہاں مختلف جگہ کے بزرگانِ دین جمع ہوتے ہیں، اور وہ علماء اور صوفیہ کا مجمع ہوتا ہے، سب کو دیکھ کر جس سے عقیدت ہو، اس سے بیعت لیں، آخر حج اور زیارتِ مدینہ منورہ بھی تاریخِ مقررہ میں ہی ہوتے ہیں، اس میں بھی گذشتہ فائدہ شامل ہے، ہم نے دیوبندی اکابر کی قبریں بھی دیکھی ہیں، وہاں نہ رونق ہے، نہ کوئی ایصالِ ثواب، نہ کسی کو ان سے اور نہ کسی سے ان کو فائدہ، امورِ خیر بند کرنے کی یہ وجہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: مروجہ مجالسِ عرس؛ چوں کہ معاصی وبدعات سے خالی نہیں ہوتیں؛ اس لیے یہ مجالس درست نہیں ہیں، اور جو اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام ہر سال شہدائے احد کی قبروں پر جایا کرتے تھے، تو یہ استدلال درست نہیں ہے؛ کیوں کہ حدیث شریف میں یہ مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سال کے شروع میں تشریف لے جاتے تھے، نہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی تاریخ کو متعین کر رکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی تاریخ کو جانے کا التزام کرتے ہوں، اور نہ یومِ وفات کو متعین کر رکھا تھا، جیسا کہ مروجہ عرس میں ہوتا ہے،

نیز کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کسی قبر پر جا کر کھانا بنا کر تقسیم کیا ہو؛ کیوں کہ غرباء کو کھانا کھلا کر یا قرآن خوانی وغیرہ کے ذریعے ایصالِ ثواب کرنا کسی جگہ کے ساتھ مقید نہیں ہے؛ بل کہ کسی بھی جگہ رہ کر کیا جاسکتا ہے، جب کہ مروجہ عرس میں کھانے اور شیرینی کی تقسیم کا التزام؛ قبر کے پاس کیا جاتا ہے، جو کہ ثابت نہیں ہے۔

اور رہا بزرگانِ دین کا عرس کی مجالس قائم کرنا، تو اس میں مروجہ رسومات، معاصی ومنکرات نہیں ہوا کرتے تھے؛ بل کہ صرف جائز امور کی حد تک معاملہ تھا؛ اسی لیے حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے فتوے میں مذکور بات ارشاد فرمائی ہے، مولانا محمد اسحاق دہلوی، نواسہ وشاگرد مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی کتاب مسائل اربعین میں لکھتے ہیں:

مقرر ساختن روزے عرس جائز نیست، و در تفسیر مظہری می نویسد: ''**لا يجوز ما يفعله الجُهّال بقُبور الأولياء والشُّهداء من السُّجود والطَّواف حولها، واتخاذ السُّرج والمساجد إليها، ومن الاجتماع بعد الحول كالأعياد، ويسمّونها عرسا**''.

ترجمہ: عرس کے لیے دن مقرر کرنا جائز نہیں ہے، اور قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ ''جو کچھ جاہل لوگ اولیاء اور شہداء کی قبروں کے ساتھ کرتے ہیں وہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ سجدہ کرنا، اور اس کے اطراف طواف کرنا، اور چراغوں کا جلانا، اور اس کو سجدہ گاہ بنانا، اور ہر سال کے بعد عید کی طرح اجتماع کرنا، اور اس کا نام عرس رکھتے ہیں''۔ (فتاوی رشیدیہ، ص: ۱۳۵)

مذکورہ معاصی ومنکرات جو عرس کے موقع پر قبور پر ہوتے ہیں، شامی میں ان کو بالاجماع باطل اور حرام قرار دیا ہے؛ چناں چہ لکھا ہے:

واعلم أنّ النّذر الذي يقع للأموات من أكثر العوام وما يؤخذ من الدّراهم والشّمع والزّيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقرّباً إليهم فهو بالإجماع باطلٌ وحرامٌ مالم يقصدوا صرفها لفقراء الأنام. (شامي: ۴۲۷/۳، ط: مكتبة زكريا)

نیز علامہ شامی نے بزازیہ کے حوالے سے لکھا ہے:

ويكره اتخاذ الطّعام في اليوم الأول والثّالث وبعد الأسبوع، ونقل الطّعام إلى القبر في المواسم، واتخاذ الدّعوة؛ لقراءة القرآن، وجمع الصُّلحاء والقُرّاء؛ للختم أو لقراءة سورة الأنعام والإخلاص، والحاصل أنّه اتخاذ الطّعام عند قراءة القرآن؛ لأجل الأكل يكره. (شامي: ۱۴۸/۳، ط: زكريا، ديوبند)

مذکورہ بالا عبارات سے معلوم ہوا کہ عرس کی شریعت میں کوئی حقیقت نہیں ہے؛ کیوں کہ جن منکرات و معاصی کے مجموعے کو عرف میں عرس کہتے ہیں، شریعت میں نہ اس کا ثبوت ہے، اور نہ وہ جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۶۷/تتمہ/د، ۲۱۱/د، ۱۴۳۸ھ)

سال گرہ (برتھ ڈے) منانا کیسا ہے؟

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ دین درج ذیل مسئلے کے بارے میں کہ گھر میں بیٹے کی ولادت پر جب اس کی سال گرہ ہوتی ہے، پورا خاندان ہنسی اور خوشی مناتے ہیں، اور کیک، بسکٹ وغیرہ کاٹتے ہیں، اور طرح طرح کے واہیات امر میں مصروف ہوتے ہیں، اور اس پر فخر کرتے ہیں، کسی شخص نے ان کو اس کام سے منع کیا اور سمجھایا، تو اُنھوں نے اس کی نصیحت کو برا سمجھا۔

دریافت طلب یہ ہے کہ اس طرح کی خرافات کرنا کیسا ہے؟ اور خیر خواہوں کی بات کو برا سمجھنا کیا اُن کے ایمان کو متزلزل کر دے گا؟ اور اس جنم دن کو یہودیوں کا کام سمجھتے ہوئے، بہ خوشی اس خرافات پر عمل کرنے سے کیا ایمان باقی رہے گا؟ تسلی بخش جواب دے کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: سال گرہ (جنم دن) منانا یہ غیر قوموں کی ایجاد کردہ رسم ہے، اس موقع پر کیک، بسکٹ وغیرہ کاٹنا، تالیاں بجانا اور خوشیاں منانا، یہ سب چیزیں واہیات ہیں، مسلمانوں کو ان امور سے اجتناب لازم ہے، مسلمانوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا عمل نمونہ اور مشعلِ راہ ہے، غیروں کی تقلید لعنت ہے؛ فخر کی چیز نہیں۔

مـن أَحـدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردٌّ. (بخاري ومسلم) **من تشبّه بقومٍ فهو منهم.** (أبو داؤد) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۶/ربیع الثانی/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - فخر الاسلام عفی عنہ

(۴۲۴/تتمہ/م، ۳۰۷۴/م، ۱۴۳۸ھ)

طہارت، نماز اور جنازے سے متعلق مسائل

اے سی سے نکلنے والے پانی سے وضو کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ اے سی سے نکلنے والے پانی؛ جس کی حقیقت یہ ہے کہ اے سی (A.C) مشین؛ ہوا کی نمی کو کھینچ کر پانی میں تبدیل کر دیتا ہے، تو کیا اس پانی سے وضو کرنا صحیح ہے؟ بینوا توجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: **حامداً ومصلّیا ومسلّما:** جب ہوا کی ماہیت تبدیل ہوگئی، اور مشین نے ہوا کی نمی کو پانی میں تبدیل کر دیا، تو اس پر پانی کے احکام جاری ہوں گے، اور اُس پانی سے وضو کرنا درست ہوگا۔

(يرفع الحدث) مطلقاً (بماء مطلق) هو ما يتبادر عند الإطلاق (كماء سماء وأودية وعيون وآبار وبحار وثلج مذاب) بحيث يتقاطر وبرد وجمد وندا، هذا تقسيمٌ باعتبار ما يشاهد؛ وإلا فالكلّ من السّماء. ﴿أَلَم تَرَ أَنَّ اللّٰه أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ ماء﴾ (الحج:٦٣) (الدر المختار: ١/ ٣٢٤) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۲۲۵/ل، ۱۰۰۲/ل، ۱۴۳۸ھ)

گندی نالیوں کے قریب جو کنواں کھودا جائے اُس کے پانی کا کیا حکم ہے؟

سوال: ہمارے یہاں مسجد کے قریب ایک بڑی نالی جاری ہے، اس میں سارے شہر کا گندا

پانی بہتا ہے، اسی کے قریب کنواں کھودنے کا مسجد کی انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے، ایسی صورت میں کیا اُس کنویں کا پانی پاک ہوگا؟ اس سے وضو غسل وغیرہ کرسکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: گندی نالی سے کنواں اتنے فاصلے پر ہونا چاہیے کہ ناپاکی کا اثر نکالے جانے والے پانی میں ظاہر نہ ہو، اس کی مقدار فقہائے کرام نے کم ازکم پانچ ہاتھ لکھی ہے؛ لیکن یہ حتمی نہیں ہے، اصل مدار اثر ظاہر نہ ہونے پر ہے، اگر ناپاکی کا اثر واضح طور پر ظاہر ہوجائے، تو نکالا جانے والا پانی ناپاک ہوگا، اور اگر اثر ظاہر نہ ہو، تو ناپاک نہ ہوگا۔

وفي الأصل: أدنى ما ينبغي أن يكون بين بئر الماء والبالوعة خمسة أذرع، وهذا في رواية أبي سليمان، وفي رواية أبي حفص: سبعة أذرع. قال شمس الأئمة الحلواني رحمه اللّٰه: ليس هذا بتقدير لازم؛ بل الشَّرط أن يكون بينهما برزخٌ يمنع خلوص طعم البالوعة أو ريحها إلى ماء البئر، ولا يقدر عليها بالزّرعان، حتى إذا كان بينهما عشرةُ أذرع وكان يوجد في البئر أثر البالوعة فماء البئر نجسٌ، وإن كان بينهما ذراعٌ واحدٌ وكان لا يوجد أثر البالوعة في البئر فماء البئر طاهر. (المحيط البرهاني: ۱/ ۱۱۱، الفصل الرابع في المياه التي يجوز التوضؤ، ط: دار الكتب العلمية، بيروت). فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱۱/۲۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ – زین الاسلام قاسمی

(۱۲۶۲/تتمہ/ص، ۱۳۰۷/ص، ۱۴۳۸ھ)

حوض مدور (گول) ہوتو دہ دردہ کی مقدار کیا ہے؟ اور چھوٹے حوض میں جانور مرجائے تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ہمارے علاقے راجستھان میں عموماً گھروں میں پانی کے حوض بنے ہوئے ہوتے ہیں، جن کی گہرائی عموماً ۶/ فٹ سے ۱۵/ فٹ، اور عرض مدور ۴/ فٹ سے ۷/ فٹ تک ہوتی ہے، اگر ایسی صورت میں اس حوض میں چوہا، چھپکلی، مینڈک، چڑیا یا کبوتر اور کوئی چھوٹا جانور گرجائے یا مرجائے یا پھول پھٹ جائے، تو شرعاً اس پانی کا کیا حکم ہے؟ پانی پاک رہا یا ناپاک؟ جواب مفصل مرحمت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: حوض کی گہرائی کا اعتبار نہیں صرف لمبائی اور چوڑائی معتبر ہے، اور حوض مدوّر (گول حوض) میں اس کا گھیراو چھتیس (۳۶) گز ہونا چاہیے، اور یہ قول صاحبِ محیط: احتیاط اس میں ہے کہ ۴۸؍گز ہو، اور گہرائی کم از کم اتنی ہو کہ چلّو سے پانی لیا جائے؛ تو زمین نظر نہ آئے، بس کافی ہے۔

وأمّا إذا كان عشراً في عشرٍ بحوض مربّع أو ستة وثلاثين في مدوّر، وعمقه أن يكون بحال لاتنكشف أرضه بالغرف منه على الصحيح. (مراقي الفلاح، مستفاد من: فتاوی رحیمیہ: ۲/۳۳۰، ط: احسان، دیوبند)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ کے علاقے میں، گھروں میں جو حوض بنے ہوئے ہوتے ہیں، جن کا عرض مدور صرف ۴؍فٹ سے ۷؍فٹ تک ہوتا ہے، یہ حوضِ کبیر (شرعی حوض دہ در دہ) کے حکم میں نہیں؛ لہٰذا ان میں اگر چوہا، چڑیا، کبوتر اور مینڈک جس میں دمِ سائل ہو وغیرہ گرکر مرجائے تو پورا حوض ناپاک شمار ہوگا، اور اگر مرکر پھول پھٹ جائے، اور گرنے کا وقت معلوم نہ ہو، تو ایسی صورت میں تین دن تین رات سے وہ ناپاک سمجھا جائے گا، اور اگر حوض میں بہت چھوٹی چھپکلی یا کوئی کیڑا وغیرہ جس میں دمِ سائل نہیں ہوتا گرکر مرجائے، تو اس سے حوض ناپاک نہیں ہوگا۔

يحكم بنجاستهامغلّظة من وقت الوقوع إن علم....منذ ثلاثة أيام بلياليها إن تنفخ أو تفسّخ استحساناً (درِ مختار) **والضِّفدع البرّي إذا مات في الماء إن كان كبيراً له دمٌ سائلٌ ينجس الماء.** (المحيط البرهاني) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　　۲۰؍محرم؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۳۷؍م، ۹۴؍م، ۱۴۳۸ھ)

کیا وضو کے دوران پڑھی جانے والی دعاؤں کا ثبوت احادیث سے ہے؟

سوال: جن کتابوں میں مسنون دعائیں ذکر کی جاتی ہیں، اُن میں وضو کے درمیان میں

پڑھی جانے والی دعائیں بھی منقول چلی آ رہی ہیں، مثلاً: منہ دھوتے وقت کی دعا، ہاتھ پاؤں دھوتے وقت کی دعا وغیرہ، تو کیا ان دعاؤں کا سنت سے ثبوت ہے، یا ان کو بدعت کہا جائے گا؟ بہ ہرصورت ان دعاؤں کی ترغیب دینا یا لوگوں کی مجلس میں سنانا درست ہے؟ جب کہ کلی کرتے یا ناک میں پانی ڈالتے وقت کسی بھی طرح کی دعا پڑھنے میں حرج لازم آتا ہے، اور زیادہ وقت کا متقاضی ہوتا ہے، اس سلسلے میں صحیح تحقیق کیا ہے؟ اور ان دعاؤں کو کس زمرے میں رکھا جاسکتا ہے؟ بہ راہِ کرم صحیح صورتِ حال سے آگاہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: اعضائے وضو کے دھونے کے وقت کی دعاؤں کو بعض فقہاء اور صوفیہ؛ مثلاً: علامہ حصکفی، شامی، طحطاوی، مرتضی زبیدی، امام غزالی، شیخ شہاب الدین سہروردی اور صاحب قوت علامہ مکی وغیرہم نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے؛ لیکن محققین؛ مثلاً: امام نووی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے ان دعاؤں کے احادیث سے ثابت ہونے کا انکار کیا ہے؛ البتہ بعض سلفِ صالحین سے یہ دعائیں ثابت ہیں، جس کی بنا پر ان کے پڑھنے کی گنجایش ہے؛ لیکن اسے مستحب نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ استحباب ایک حکم شرعی ہے، جس کے لیے کسی دلیل شرعی کا ہونا ضروری ہے، نیز اس کی ترغیب دینا بھی مناسب نہیں۔

في تلخيص الحبير (١/١٠٠): قال الرّافعي: ورد بها الأثر عن الصَّالحين، وقال النّووي في الرَّوضة: لا أصل له، ولم يذكره الشَّافعي والجمهور، وقال في شرح المُهذّب: لم يذكره المُتقدِّمون، وقال ابن الصّلاح: لم يصح فيه حديثٌ، قلتُ: روي فيه عن عليٍّ من طرق ضعيفة جداً، أوردها المستغفري في الدّعوات و ابن عساكر في أماليه ...... ورواه ابن حبّان في الضُّعفاء من حديث أنس ...... ومن الحديث البراء بن عازب، وليس بطوله، واسناده واهٍ إلخ.

وفي حاشية الطّحطاوي على المراقي (ص:٧٦): قال ابن أمير حاج: سئل شيخنا حافظ عصره شهاب الدين ابن حجر العسقلاني عن الأحاديث التي ذُكرت في مقدّمة أبي الليث في أدعية الأعضاء، فأجاب: والعلماء يتساهلون في ذكر الحديث الضَّعيف، والعمل به في الفضائل، ولم يثبت منها شيءٌ عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم لا من

قولـه، ولامن فعله إلخ ......، وطرقُها كلُّها لا تخلو عن متّهم بوضع، ونسبة هذه الأدعية إلى السَّلف الصَّالح أولىٰ من نسبتها إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم .... وقال الهندي وغيره: ولم يثبت منه إلا الشّهادتان بعد الفراغ منه إلخ.

وفي إتحاف السّادة (۲/۲۵۲): وأما الدُّعاء على أعضاء الوضوء، فلم يجئ فيه شيءٌ عن النّبي صلى اللّٰه عليه وسلّم، وقال في الرّوضة: لا أصل له إلخ.

وفي الأذكار (ص: ۲٤): أما الدُّعاء على أعضاء الوضوء فلم يجئ فيه شيءٌ عن النّبي صلى اللّٰه عليه وسلّم، ...... يستحبُّ فيه دعواتٌ جاءت عن السّلف إلخ.

وفي الشّامية (۹/۵۸۲) نقلاً عن الإمام ابن دقيق العيد: لأنّ الاستحباب حكمٌ شرعيٌّ لا بُدّ له من دليل، وليس استسهال ذلك بصواب إلخ. فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۵۲/تتمہ/ل، ۶۷۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

وضو کے بعد کی دعا کب پڑھے اور واش روم میں ہو تو دعا کا کیا حکم ہے؟

سوال: (۱) اگر ہم آفس کے واش روم میں؛ جہاں بیت الخلاء بھی ہوتا ہے وضو کریں، تو کیا وضو کرنے کے بعد واش روم کے اندر ہی دل میں وضو کی دعا پڑھ سکتے ہیں، یا واش روم کے باہر دعا پڑھنی چاہیے؟

(۲) اگر ہم چہرے اور ہاتھ کے وضو کا پانی؛ ٹیشو پیپر سے پوچھیں، اور پھر دعا پڑھیں، تو کیا اس طرح کیا جاسکتا ہے؟ کیا چہرہ اور ہاتھ پوچھنے سے پہلے؛ یعنی: عضو خشک ہونے سے پہلے؛ دعا پڑھنی چاہیے؟

(۳) دوسرا طریقہ جو میں کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں وضو کر لیتا ہوں، ٹیشو پیپر لیتا ہوں، واش روم سے باہر جاتا ہوں، اور دعا پڑھتا ہوں، پھر ٹیشو پیپر سے پوچھتا ہوں، میرا دوست جس کے ساتھ میں جماعت سے نماز پڑھتا ہوں، وہ سلفی ہے، وہ ٹیشو پیپر سے پوچھتا ہے، اور پھر وہ اپنا پیر دھوتا ہے، تو کیا یہ درست ہے؟ یا آخر تک عضو تر رہنا چاہیے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: (۱) دل دل میں دعا پڑھنے میں تو مضائقہ نہیں، اور اگر بیت الخلاء کچھ فاصلے پر ہو، اور نجاست ظاہر نہ ہو، تو بعض حضرات کے نزدیک زبان سے بھی دعا پڑھ لینے میں مضائقہ نہیں۔

قال في الشّامي : قوله: إلا حال انكشاف الظّاهر أنّ المُراد أنّه يسمي قبل رفع ثيابه إن كان في غير المكان المُعدّ لقضاء الحاجة؛ وإلا فقبل دخوله، فلو نسي فيها سمى بقلبه ولا يحرِّك لسانه تعظيماً لاسم اللّٰه تعالىٰ. (شامي: ۱/۲۲۷)

(۲) بہتر یہی ہے کہ دعا متصلا بعد فراغ وضو؛ اعضاء کے خشک ہونے سے پہلے پڑھی جائے؛ البتہ اگر کوئی ایسی جگہ ہو جہاں زبان سے دعا نہیں پڑھ سکتا، تو وہاں سے نکلنے کے بعد بھی پڑھنے کی گنجایش ہے۔

قال في الشّامي: لكن قال في الحلية : إنّ الوارد في السُّنة بعده متصلاً بما تقدم من ذكر الشهادتين، كما هو في رواية التِّرمذي. (شامي: ۱/۲۵۳)

(۳) وضو میں ولاء؛ یعنی: پے در پے کرنا کہ پہلے عضو کے خشک ہونے سے پہلے؛ دوسرے عضو کو دھولیا جائے سنت ہے؛ اس لیے آپ کا عمل درست ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۷/ل، ۴/ل، ۱۴۳۸ھ)

وضو کے بعد آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر دعا اور کلمۂ شہادت پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: (۱) وضو کے بعد آسمان کی جانب کلمے والی انگلی کر کے کیا پڑھنا چاہیے؟ کیا یہ پڑھنا صحیح ہے؟

(۲) وضو کے بعد آسمان کی جانب کلمے والی انگلی کر کے دوسرا کلمہ پڑھنا کیسا ہے؟ کیا وہ صحیح ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: (۱-۲) وضو کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھا کر (دوسرا کلمہ) یعنی: کلمۂ شہادت اور دعا پڑھنا ثابت ہے؛ البتہ شہادت کی انگلی اٹھانا کسی روایت میں صراحۃً نظر سے نہیں گذرا؛ لیکن بعض فقہاء نے اسے مستحسن قرار دیا ہے؛ اس لیے انگلی کر کے پڑھنے میں حرج نہیں؛ مگر اسے ضروری یا سنت نہ سمجھا جائے۔

وفي رواية عنه مرفوعاً قال: من توضَّأ بأحسن وضوء ثم رفع إلى السَّماء، فقال: أشهدُ أن لا إلٰه إلا اللّٰه وحده لا شريك له وأنّ محمَّداً عبدُه ورسولُه؛ فُتحت له ثمانية أبواب من الجنَّة يدخل من أيّها شاء. (مسند احمد: ۱۵۱/۴، ابو داؤد: ۲۲/۱) **وزاد في المنية أن يقول بعد فراغه: سُبحانك اللّٰهم وبحمدك أشهدُ أن لا إلٰه إلا أنت أستغفرك وأتوب إليك، وأشهد أنّ محمَّداً عبدُك ورسولُك، ناظراً إلى السَّماء.** (شامي، زكريا: ۲۵۳/۱)

انگلی سے اشارہ کرنے کی بات علامہ طحطاوی نے غزنوی کے حوالے سے نقل فرمائی ہے:

ذكر الغزنوي أنه يشير بسبَّابة حين النّظر إلى السَّماء. (حاشية الطحطاوي، ص: ۷۷)

فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۳؍صفر؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۹۸؍م، ۴؍م، ۱۴۳۸ھ)

وضو کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر شہادت پڑھنے کے سلسلے میں دو متضاد فتووں کے درمیان تطبیق اور راجح حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ شرع متین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

وضو کے بعد آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر شہادت پڑھنا؛ آیا درست ہے یا مستحسن ہے، جیسا کہ کتاب النوازل میں مذکور ہے؟ یا بالکل درست نہیں ہے؛ بل کہ استقبالِ قبلہ افضل ہے، اور **نظر إلى السَّمَاء** والی حدیث بالکل ضعیف اور موضوع ہے، جیسا کہ **المسائل المُهمَّة فيما ابتلت به العامّة:**

(۲۴/۱) میں مذکور ہے؟ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کا کیا فتویٰ ہے؟ کس فتوے پر عمل کی ترغیب دی جاسکتی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: نظر إلی السَّماء والی روایت میں ابن عمہ راوی مجہول ہے، اور مجہول راوی کی روایت ضعیف ہوتی ہے، موضوع نہیں ہوتی؛ اس لیے فضائل کے باب میں اس پر عمل کی گنجایش ہوگی۔

قال في حديث غريب: مجهول: من لم يرو عنه غيرُ واحدٍ ولم يوثق فهو مجهولُ العين، ويلحق به: لا يعرف، وسنده ضعيفٌ يصلح للاعتبار، ويرتفع بتعدّد الطُّرق إلى الحسن لغيره. (حدیث غریب، ص: ۴۹)

جہاں تک ترغیب کا مسئلہ ہے، تو چوں کہ احادیثِ صحیحہ میں **نظر إلی السَّماء** کی قید نہیں ہے؛ اس لیے ترغیب اسی کی دی جائے؛ البتہ اگر کوئی **نظر إلی السَّماء** والی حدیث پر عمل کرے، تو اس پر نکیر نہ کی جائے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۱۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۷۹/تتمہ/ل، ۲۹۴/ل، ۱۴۳۸ھ)

استنجے کے لیے انگریزی بیت الخلاء کے علاوہ کوئی اور جگہ نہ ہو تو کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کی گنجایش ہے

سوال: میرے آفس میں انگریزی بیت الخلاء ہیں، اور قضائے حاجت کے لیے کموڈ فکس ہے، بیٹھ کر استنجا کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے، تو کیا کھڑے ہوکر استنجا کرنے کی اجازت ہے، اس طرح سے کہ کپڑے یا جسم پر کوئی چھینٹا نہ پڑے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: اگر بیٹھ کر استنجا کرنے کی کوئی صورت نہیں، تو آفس میں مجبوراً کھڑے ہوکر کر لینے کی گنجایش ہے؛ البتہ اس کی کوشش

کرتے رہیں کہ ایسا بیت الخلاء بھی بن جائے کہ جس میں بیٹھ کر بہ سہولت استنجا کیا جاسکے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۴/۱۰ھ الموافق: ۲۰۱۷/۱/۹ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۴۳۸ھ، ۴۵۳/ھ، ۳۷۷/ھ)

نفاس کی حالت میں آیاتِ مبارکہ پڑھنے کا حکم

سوال: نفاس میں منزل پڑھنا جس میں سورۂ فاتحہ بھی ہے؛ کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: سورۂ فاتحہ یا وہ آیاتِ مبارکہ کہ جن میں دعا کا مضمون ہے، اُن کو دعا کی نیت سے پڑھ لے تو جائز ہے، تلاوت کا قصد اُن کے پڑھنے میں نہ کرے، اور جن آیاتِ شریفہ اور سورتوں میں دعا کا مفہوم نہیں ہے، اُن کے پڑھنے میں غیرِ قرآن کا قصد کرنا موثر نہیں؛ پس اُن کو نفاس وحیض کی حالت میں پڑھنا بھی جائز نہیں۔

وقراءةُ قرآن بقصده اهـ. درمختار، وفي شرحه الفتاوى ردّ المحتار (قوله بقصده) فلو قرأت الفاتحة على وجه الدُّعاء أو شيئًا من الآيات التي فيها معنى الدُّعاء ولم ترد القرأة لا بأس به، كما قدّمناه عن العيون لأبي الليث، وإنّ مفهومه أنّ ما ليس فيه معنى الدُّعاء كسورة أبي لهب لا يؤثر فيه قصد غير القرآنية إلخ. (۱/۱۹۵، باب الحیض)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۲/۲۰ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۱/۲۱ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۴۳۸ھ، ۱۵۷/ھ، ۶۵۵/ھ)

پیشاب کے راستے سے پتلا سفید مادّہ نکلنے کی صورت میں پاکی کا حکم

سوال: (۱) میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ پیشاب کرنے کے بعد پتلا سفید سیال مادّہ نکلتا ہے، تو کیا غسل کرنا ضروری ہوگا؟

(۲) کیا میں انڈرویئر کو دھوئے بغیر نماز پڑھ سکتا ہوں؟

(۳) اب میں حج کرنے آیا ہوں، ایامِ حج میں احرام میں پریشانی ہو رہی ہے، بہ راہِ کرم جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: **(۱)** پیشاب کے بعد بغیر شہوت کے جو پتلا سفید سیال مادّہ نکلتا ہے، اس کی وجہ سے غسل واجب نہیں ہوتا۔

(۲) اگر انڈرویئر یا کسی اور کپڑے میں وہ لگا، یا جسم کے کسی حصّے میں لگا، تو وہ ناپاک ہوجائیں گے، اگر اس کی مقدار ایک درہم یا اس سے زائد ہے تو اس کو دھوئے بغیر نماز درست نہ ہوگی۔

(۳) اگر آپ لنگوٹ باندھ لیا کریں، اور اس کے اندر والے حصّے میں ٹیشو پیپر رکھ لیا کریں، نماز وطواف کے لیے وضو کرنے سے پہلے؛ ٹیشو پیپر نکال کر پاکی حاصل کرکے وضو کرلیا کریں، تو امید ہے کہ ان شاء اللہ پریشانی نہ ہوگی، اگر کچھ ہو تو اس کو لکھ کر معلوم کریں۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۲۱/۱۲/۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۳/۹/۲۰۱۷ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: محمد اسد اللہ غفرلہٗ

نوٹ: جواب درست ہے؛ البتہ اگر یہ رطوبت صرف پیشاب کے تھوڑی دیر بعد نکلتی ہو، تو نماز، طواف وغیرہ سے اتنی دیر پہلے پیشاب کرلیا کریں کہ رطوبت کا نکلنا بند ہوجائے۔ فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۵۱۲/ھ، ۱۴۸٦/ھ، ۱۴۳۸ھ)

مصنوعی بال لگانے کے بعد غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟

سوال: میں نے کچھ عرصے پہلے hair extension (مصنوعی بال لگانا) لگایا تھا؛ گنجے پن کی وجہ سے، اب مجھے پریشانی ہو رہی ہے کہ اس یونٹ (لمبائی) کے ساتھ میرا غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟ کیوں کہ اس یونٹ کو میرے سر کی جلد پر glue (گوند) سے چپکایا گیا ہے، تو اس جگہ تک پانی نہیں پہنچے گا؛ جو جگہ گوند سے چپکی ہے۔ برائے مہربانی راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: آپ کے سر کے مصنوعی بال اگر گوند سے اس طرح چپکائے گئے کہ وہ جزوِ بدن بن گئے، اور اصل سر تک پانی پہنچانا متعذر ہوگیا، اور جس گوند سے چپکائے گئے، وہ سر کا جزو بن گیا، تو مصنوعی بالوں کا دھونا ہی کافی ہے، اسی سے غسل درست ہوجائے گا۔

إنّ الغُسل في الاصطلاح غسل البدن، واسم البدن يقع على الظّاهر والباطن؛ إلا ما يتعذّر إيصال الماء إليه أو يتعسّر، كما في البحر. (شامي: ۱/ ۲۸٤، ط:زكريا ديوبند)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۱۴ھ الموافق: ۲۰۱۷/۳/۱۴ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۷۱/ھ/۶۵۸، ھ/۱۴۳۸ھ)

کیا کیپ والی مہندی لگا کر وضو اور غسل ہوجاتا ہے؟

سوال: حضرات مفتیانِ کرام دارالعلوم دیوبند! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

مسئلہ یہ ہے کہ جو کیپ کی مہندی آتی ہے، اس میں ایک کیپ ایسی آنے لگی کہ دو چار دن کے بعد وہ مہندی؛ بہ شکلِ جلد اترنی شروع ہوجاتی ہے، یعنی: ایک کیپ تو وہ ہوتی ہے، جس کا صرف رنگ چڑھتا ہے، اور ایک کیپ وہ ہے، جس کا رنگ بھی چڑھتا ہے؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کا اثر جسم کی شکل میں ہاتھ پر رہ جاتا ہے، جو کہ وضو کے پانی کے لیے مانع ہے، اس دوسری مہندی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ مفصل جواب دے کر ممنون فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلياً ومسلما: الجواب وباللّٰه التوفيق: سوال میں جس نوعیت کی مہندی کا ذکر کیا گیا ہے، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس مہندی کے لگانے کے بعد شروع میں عام مہندی کی طرح رنگ ابھر جاتا ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد رنگ زیادہ ابھر جاتا ہے، اور تھوڑا تھوڑا چھٹنا شروع ہوتا ہے،

یہ مہندی کی پرت نہیں ہوتی ہے؛ بل کہ اس طرح کی مہندی میں کیمیکل ملایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بعد میں رنگ کے چھوٹنے کے ساتھ ساتھ کھال بھی چھوٹتی ہے؛ لہٰذا ایسی مہندی لگانے کے بعد وضو اور غسل صحیح ہے، یہ مہندی کی پرت نہیں ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے پانی اصل کھال تک نہ پہنچ سکے، ہاں! اگر واقعی پرت والی مہندی ہو، تو اس کو چھٹائے بغیر وضو اور غسل صحیح نہیں ہوگا، اور اگر کوشش کے باوجود پرت نہ چھوٹ سکے، تو اس کے ساتھ بھی ضرورۃً وضو اور غسل صحیح ہوجائے گا؛ لیکن ایسی مہندی کو بھی وضو اور غسل میں چھٹانے کی کوشش کرنا ضروری ہوگا۔

وفي الجامع الصّغير: سئل أبوالقاسم عن وافر الظّفر الذي يبقى في أظفاره الدّرن، أو الذي يعمل عمل الطّين أو المرأة التي صبغت إصبعها بالحناء أو الصوم أو الصّباغ، قال: كلّ ذلك سواء يجزيهم وضوئهم؛ إذ لايستطاع الامتناع إلا بحرج، والفتوى على الجواز. (الفتاوى الهندية: ۱/ ٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۶/۳/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفااللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۴۸/ تتمہ/ص، ۱۵۵/ص، ۱۴۳۸ھ)

قدیم اور جدید جنتریوں کا اختلاف اور اُس کا حل

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اس وقت ہمارے علاقے میں اوقاتِ نماز کے لیے قدیم اور جدید ۲/ جنتریاں استعمال ہو رہی ہیں، اور دونوں کے اوقات میں کچھ منٹ کا فرق ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قدیم کا وقت درست ہے، اور کچھ کہتے ہیں کہ جدید کا درست ہے؛ لہٰذا حضور والا سے مودبانہ التماس ہے کہ راہ نمائی فرمائیں کہ کس پر عمل کیا جائے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: دیوبند میں بھی قدیم وجدید جنتریوں کو لے کر اختلاف ہوا تھا، اور تحقیق کی رو سے قدیم جنتریاں صحیح ثابت ہوئی تھیں؛ البتہ چوں کہ جنتریاں ظنی ہوتی ہیں، قطعی ویقینی نہیں ہوتیں؛ کیوں کہ جنتریاں محض فلکی حسابات پر تیار کی جاتی ہیں، نیز گھڑیوں کے اوقات کا سو فی صد

صحیح ہونا بھی ضروری نہیں؛ اس لیے قدیم جنتریوں پر احتیاط کی رعایت کے ساتھ عمل کرنا چاہیے، یعنی: ختم سحر اگر ۳:۴۵ پر ہے، تو احتیاطاً آٹھ، دس منٹ پہلے؛ یعنی: ۳:۳۵ یا ۳:۳۷ پر سحری بند کردی جائے، اورغروب آفتاب ۶:۵۵ پر ہے، تو احتیاطاً کم از کم تین منٹ بعد؛ یعنی: ۶:۵۸ پر اذان کہی جائے، یا افطار کا اعلان کیا جائے، اور حتی الامکان جدید جنتریوں کا بھی لحاظ کیا جائے، اور وہ اس طرح کہ جدید جنتریوں کا اختلاف عام طور پر صبح صادق کے اوقات میں ہے، دیوبند اور دیگر متعدد علاقوں کی جدید جنتریوں کا قدیم جنتریوں سے موازنہ کیا گیا، تو زیادہ سے زیادہ آٹھ، دس منٹ کا فرق ظاہر ہوا، یعنی: جدید جنتریوں میں آٹھ دس منٹ کے بعد صبح صادق کا وقت لکھا گیا ہے۔

پس اس میں احتیاط یہ ہے کہ فجر کی اذان؛ قدیم جنتریوں کے حساب سے صبح صادق سے دس منٹ کے بعد کہی جائے، اس صورت میں لوگوں کے روزے بھی بلا شک وشبہ صحیح ودرست ہوں گے، اور فجر کی اذان اور نماز بھی یقینی طور پر فجر کا وقت شروع ہونے کے بعد ہوگی؛ اسی لیے دارالعلوم دیوبند سے ہر سال ماہِ رمضان میں جو نقشۂ اوقاتِ سحر وافطار شائع ہوتا ہے، اس میں چند سالوں سے اذانِ فجر کا بھی خانہ رکھا گیا ہے، اور ہر روز اذانِ فجر کا وقت؛ قدیم جنتریوں کے حساب سے ختم سحر سے دس منٹ بعد لکھا جاتا ہے؛ لہٰذا آپ لوگ بھی ایسا کرسکتے ہیں، اس صورت میں قدیم وجدید جنتریوں میں عملی طور پر اتفاق ہوجائے گا، اور پورا رمضان خیر وعافیت کے ساتھ گذرے گا، اللہ تعالی توفیق عطا فرمائے۔

ومحلُّ الاستحباب–أي: استحباب تأخير السُّحور– إذا لم يشكّ في بقاء اللَّيل، فإن شكّ كره الأكل في الصَّحيح، كما في البدائع أيضاً. (ردالمحتار، كتاب الصوم: ٣/ ٤٠٠، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ٦/ ٣٤٢، ت: الفرفور، ط: دمشق)

ويكره تأخيره إلى وقت يقع فيه الشَّك، هندية. (حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ٦٨٣، ط: دارالكتب العلمية، بيروت) فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۹ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۹ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۶۶۳/ن، ۴۰۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

۱۵؍ڈگری صبح صادق وغیرہ کے حساب پر تیار کردہ ایک جنتری کا حکم

سوال: امید ہے کہ بہ خیر وعافیت ہوں گے، اللہ جل جلالہ آپ کی مساعیِ جمیلہ کو قبول فرمائے، اور صحت وعافیت کے ساتھ امت کو آپ کے فیوض سے مستفید فرمائے، آمین!

عرض یہ کہ اللہ جل جلالہ نے نمازوں کے اوقات متعین فرمائے ہیں، جن کی پابندی کا حکم ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَت عَلَى المُؤمِنِينَ كِتَابًا مَوقُوتًا﴾ (النساء: ۱۰۳)

(ترجمہ:) ''بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے''۔

اور شریعت نے آسانی و ہر ایک کی رسائی کے لیے آسمانی علامات کو اوقات الصلاۃ کے لیے مقرر فرمایا ہے، جن کا تعلق مشاہدے سے ہے؛ لیکن موجودہ زمانے میں مشاہدہ ممکن نہ ہونے کی وجہ سے عموماً جنتری وتقویم پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس وقت ہمارے علاقے رتنا گیری میں جتنی تقاویم رائج ہیں، وہ بالعموم ممبئی کے اوقات کے اعتبار سے چھپی ہوئی ہیں۔

یہ بات بھی معلوم رہے کہ ہر علاقے کے طول البلد وعرض البلد کی بنیاد پر اوقاتِ صلاۃ میں فرق پڑتا ہے، اس اعتبار سے ممبئی ورتنا گیری کے اوقات میں کافی فرق معلوم ہوتا ہے؛ اسی وجہ سے مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ علاقۂ رتنا گیری کے لیے ایک الگ سے تقویم مرتب کی جائے، نیز اس وقت مسجدوں میں ڈیجیٹل گھڑیاں عام ہو رہی ہیں، اسی طرح موبائل سافٹ ویئر بھی عام ہو چکے ہیں، جن کا مدار علاقے کے طول البلد اور عرض البلد پر ہوتا ہے، اور ڈیجیٹل گھڑیاں وسافٹ ویئر دونوں کے اوقات اور مسجدوں میں رائج تقویم میں تفاوت نظر آتا ہے، اسی طرح عام تقاویم میں رمضان المبارک میں سحر وافطار کے اوقات؛ سال بھر کے صبح صادق، غروب آفتاب کے بالمقابل احتیاطاً پانچ منٹ کے فرق کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، پھر خصوصیت سے رمضان المبارک کا ٹائم ٹیبل چھاپنے والے حضرات؛ اس احتیاطی وقت کو اصل وقت جان کر مزید پانچ منٹ کی احتیاط کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اصل وقت سے تقریباً دس منٹ کا تفاوت ہو جاتا ہے، پھر اس پر افطاری کے لیے کہیں دس منٹ، اور کہیں پندرہ منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے، اس ساری ترتیب میں افطار میں بھی تاخیر ہوتی ہے، اور نمازِ مغرب بھی اصل غروب کے پندرہ یا بیس منٹ کے بعد ادا کی جاتی ہے، جب کہ افطار اور نمازِ مغرب دونوں ہی میں تعجیل مطلوب ہے۔

دوسری طرف پانچ نمازوں میں سے عصر کے علاوہ تمام نمازوں کے اوقات؛ اس وقت جدید فلکیات کا بھی موضوع ہے، مثلاً: طلوع صبح صادق، طلوع آفتاب، استوائے شمس، غروبِ آفتاب وغیرہ؛ چناں چہ اس وقت کے جدید فلکیات کے مطابق (جن کی بنیاد طول البلد وعرض البلد پر ہوتی ہے) جب مروجہ تقاویم کو دیکھا گیا، تو محسوس ہوا کہ اُن میں ایک منٹ سے زائد کا تفاوت ہے، جب کہ ایک منٹ کا تفاوت قابلِ تسامح ہوسکتا ہے۔

بہ ہر حال! مذکورہ باتوں کے پیشِ نظر شہر رتنا گیری کے کچھ علمائے کرام نے ساحلِ سمندر سے غروبِ آفتاب وغروبِ شفق احمر کا مشاہدہ کیا، اور اس کو جدید فلکیاتی حساب کے مطابق پایا۔

اوقات الصلاۃ کے نقشے کو درج ذیل اصول کے مطابق مرتب کیا گیا ہے:

(۱) انتہائے سحر (ختم سحری): جدید فلکیات میں اس کو اسٹرانومیکل ٹوائیلائٹ (astronomical twilight) کہتے ہیں، یہ اس وقت ہوتا ہے، جب سورج افق سے اٹھارہ ڈگری نیچے ہوتا ہے؛ جانبِ مشرق میں، اس سے پہلے روشنی نہیں ہوتی، اور جانبِ مغرب میں بھی اس کے بعد کوئی روشنی افق پر باقی نہیں رہتی؛ چناں چہ جانبِ مشرق ۱۸/ ڈگری پر جو روشنی ہوتی ہے، اس کو فقہائے کرام ''صبح کاذب'' کہتے ہیں، اور جانبِ مغرب ۱۸/ڈگری پر جب ساری روشنی ختم ہوجاتی ہے، تو اس کو ''غروبِ شفق'' کہا جاتا ہے۔

(۲) صبح صادق (اذانِ فجر): جدید فلکیات میں یہ اس وقت ہوتا ہے، جب سورج پندرہ ڈگری زیر افق جانبِ مشرق میں ہوتا ہے، طلوع سے پندرہ ڈگری زیر افق یقینی طور سے صبح صادق کا وقت ہے۔

دراصل صبح کاذب وصبح صادق کی تعیین میں اکابر علمائے کرام کی دو رائیں کتابوں میں نظر آئیں:

۱۔ مولانا رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ تعالی صاحبِ ''احسن الفتاوی'' کی رائے ہے کہ اسٹرانومیکل ٹوائیلائٹ (اٹھارہ ڈگری زیر افق جانبِ مشرق) صبح کاذب کا وقت ہے؛ اس لیے کہ اس سے پہلے آسمان میں کہیں روشنی نہیں رہتی ہے، اور اکثر جنتریوں میں یہی وقت احتیاط کی وجہ سے صبح صادق لکھا ہوتا ہے۔

۲۔ اور مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالی وغیرہ اکابر کی رائے ہے کہ پندرہ ڈگری زیر افق جانبِ مشرق؛ صبح صادق ہے کہ اس میں یقینی طور پر صبح صادق ہوجاتی ہے، اور دونوں رایوں میں فیصلہ کن بات اس لیے نہیں کہی جاسکتی کہ اس وقت تقریباً ہر جگہ فضائی آلودگی کی وجہ سے صبح صادق کا

بہ راہِ راست مشاہدہ کرنا ممکن نہیں ہے؛ البتہ مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اوقات الصلاۃ کے نقشے میں دو خانے بنائے جائیں: اول میں اسٹرانومیکل ٹوائیلائٹ (اٹھارہ ڈگری زیرِ افق جانبِ مشرق) اور اس پر عنوان ''انتہائے سحر'' لکھا جائے، اور دوسرا خانہ ''اذان فجر'' کا بنایا جائے، جس میں پندرہ ڈگری زیرِ افق کا وقت لکھا جائے، اور درمیانی وقت میں نہ سحری کھائی جائے، نہ نماز پڑھی جائے۔ (فتاوی عثمانی: ۱/۳۵۱ تا ۳۵۶)

مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ کی رائے اس لحاظ سے محتاط معلوم ہورہی ہے کہ اگر اٹھارہ ڈگری پر صبح صادق مانی جائے، جو کہ یقینی نہیں ہے، تو اس وقت احتیاطاً مفسداتِ صوم سے رکنا تو اچھی بات ہے؛ لیکن اسی وقت فجر کی سنتیں یا فرائض ادا کرنا وقت سے پہلے ہوگا، اور پندرہ ڈگری یقینی طور پر صبح صادق کا وقت ہے؛ لیکن اس وقت تک روزے کے ایام میں کھانا پینا جاری رکھنا روزے میں شک پیدا کرسکتا ہے؛ اس لیے مفتی تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ کی رائے پر اوقات الصلاۃ کے نقشے میں دو خانے بنائے گئے ہیں، ۱۵ اور ۱۸/ ڈگری میں تقریبا ۱۳/ منٹ کا فاصلہ ہوتا ہے، اور اس وقت برصغیر میں عام جنتریوں اور سافٹ ویئر میں ۱۸/ ڈگری پر صبح صادق لکھا جاتا ہے۔

(۳) طلوع آفتاب: اس کو سن رائز (sun rise) کہا جاتا ہے، جو اخبار وغیرہ میں بھی معروف ہے؛ البتہ غلس اور اسفار کا مشاہدہ کیا گیا، تو پتا یہ چلا کہ طلوع آفتاب سے تقریباً ۳۰/ منٹ قبل اتنی روشنی عام ہوجاتی ہے، جس کو اسفار کہا جاسکتا ہے۔

(۴) استوائے شمس: اس کو نون (noon) کہا جاتا ہے، جس وقت سورج درمیانِ افق پر ہوتا ہے، جو شرعاً وقتِ مکروہ ہے، عام جنتریوں میں یہ وقت مذکور نہیں ہوتا ہے، اس کو اس لیے لکھا گیا ہے؛ تاکہ استواء اور زوال کے درمیان کا جو وقتِ مکروہ ہے، اس میں نماز سے احتراز کیا جائے، استواء کا وقت بہت معمولی ہوتا ہے؛ البتہ فقہاء نے احتیاطاً پانچ منٹ کا وقفہ لکھا ہے۔ (فتاوی عثمانی: ۱/۳۵۷)، اس اعتبار سے استواء سے پانچ منٹ بعد زوال کا وقت مرتب کیا گیا ہے، نیز اس وجہ سے بھی کہ عوام بعض جگہوں پر استواء سے پہلے کے وقت کو مکروہ سمجھتی ہے، اور بعض جگہ زوال کے بعد کے وقت کو۔

(۵) زوالِ شمس: استواء سے پانچ منٹ بعد کا وقت۔

(۶) عصر شافعی وحنفی: جدید سافٹ ویئر کی بنیاد پر اس کو مرتب کیا گیا ہے، اور تقریبا یہی وقت؛ موجودہ جنتریوں میں بھی مذکور ہے۔

(۷) اذانِ مغرب و افطار: اس سے مراد غروبِ آفتاب (sunset) کا وقت ہے، یہ بھی معروف ہے؛ البتہ نقشے میں اذانِ مغرب کا وقت؛ غروبِ آفتاب سے احتیاطاً تین منٹ بعد کا وقت لکھا گیا ہے؛ تاکہ روزہ افطار کرنے والے بروقت افطار کرکے تعجیلِ افطار کے حکم پر عمل کرسکیں۔

(۸) عشائے شافعی: اس کو بھی نوٹیکل ٹوائیلائٹ (تقریباً پندرہ ڈگری زیرِافق جانبِ مغرب) کہا جاتا ہے، جس کے بعد افق پر سرخی باقی نہیں رہتی ہے، جس کو فقہاء؛ غروبِ شفقِ احمر لکھتے ہیں، جو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک انتہائے نمازِ مغرب، اور ابتدائے نمازِ عشاء ہے، علاقے میں اس کا مشاہدہ بھی کیا گیا، نیز جدید فلکیات کے ماہرین کی بھی یہی رائے ہے۔

(۹) عشائے حنفی: اس کو بھی اسٹرانومیکل ٹوائیلائٹ (اٹھارہ ڈگری زیرِافق جانبِ مغرب) کہا جاتا ہے، جس کے بعد افق پر کوئی روشنی باقی نہیں رہتی، جس کو فقہاء؛ غروبِ شفقِ ابیض کہتے ہیں، عام جنتریوں میں یہی وقت عشاء کا لکھا ہوا ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں تعلقہ: رتنا گیری کے لیے اوقات الصلاۃ مرتب کیا گیا، اور اس کو ہر ماہ عام بھی کیا جاتا ہے، اب اس کو سالانہ تقویم کی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہے؛ لہٰذا مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں آں جناب سے درخواست ہے کہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق؛ جواب دے کر ممنون فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ بینوا توجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامے میں ذکر کردہ تفصیلات کی روشنی میں تعلقہ: رتنا گیری کے لیے جو جدید تقویم تیار کی گئی ہے، اُس سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔

مختصر طور پر چند وجوہات درج ذیل ہیں:

(۱) صبح صادق کے سلسلے میں حضرت مولانا رشید احمد لدھیانویؒ (صاحب احسن الفتاوی) نے جو ۱۵ر ڈگری کا قول اختیار فرمایا ہے، وہ اکابر علمائے دیوبند کے نزدیک قدیم وجدید فلکیات اور کثیر مشاہدات کی روشی میں مرجوح ہے؛ اس لیے حضرت مولانا موصوفؒ نے قدیم جنتریوں کی جو تغلیط وتردید کی ہے، اور ان جنتریوں میں مذکور؛ صبح صادق کے اوقات کو صبح کاذب پر محمول کیا ہے، اسے اکابر علمائے دیوبند نے قبول نہیں فرمایا؛ البتہ چند سالوں سے ۱۸ر ڈگری کے حساب پر ہندوستان میں جو جدید جنتریاں تیار کی جارہی ہیں، اُن میں اور قدیم جنتروں میں کچھ منٹ کا فرق ہے، اس کا لحاظ کرنا

مناسب ہے، یعنی: قدیم اور جدید جنتریوں میں جتنے منٹ کا فرق ہو، اس کے حساب سے ختم سحر اور اذانِ فجر میں آٹھ، دس منٹ کا وقفہ رکھنا چاہیے، چند سالوں سے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقاتِ سحر وافطار میں بھی منتہائے سحر؛ قدیم جنتری کے حساب سے رکھا گیا ہے، اور اذانِ فجر کا وقت اُس سے دس منٹ بعد؛ تاکہ ۱۸/ڈگری کے حساب پر روزہ بھی بلا شک وشبہ درست ہوجائے، اور اذان بھی یقینی طور پر فجر کا وقت شروع ہونے کے بعد کہی جائے۔

ہندوستان کی قدیم وجدید جنتریوں میں اوقاتِ صبح صادق میں جو معمولی سا اختلاف پایا جاتا ہے، اس سلسلے میں راجح؛ قدیم جنتریوں کا حساب ہی ہے؛ لیکن اختلاف سے بچنے کے لیے اور احتیاط کے طور پر حتی الامکان جدید جنتریوں کی رعایت مناسب ہے، اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کا ایک مفصل فتویٰ (۵۰۷/تتمہ/ن، ۹۱۷/ن، ۱۴۳۷ھ) بھی ارسال خدمت ہے، اُسے بھی ملاحظہ فرمالیں۔

(یہ فتویٰ جواب کے بعد اخیر میں درج کر دیا گیا ہے۔ حبان)

(۲) صبح صادق کے مسئلے میں ۱۸/ڈگری اور ۱۵/ڈگری کے دونوں قولوں میں تطبیق کے لیے جو صورت اختیار کی گئی ہے، وہ قابل عمل نہیں ہے؛ کیوں کہ ۱۵/ڈگری اور ۱۸/ڈگری میں ہر موسم میں اور ہر علاقے میں صرف ۱۳/منٹ کا فرق نہیں ہوتا؛ بل کہ موسم اور علاقوں کے اختلاف سے؛ اِس سے زیادہ بھی ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ خطِ استواء پر عام موسم میں سورج؛ ۳/ڈگری کی مقدار؛ ۱۲/منٹ میں طے کرتا ہے، اور دوسرے موسم میں یا دوسرے علاقوں میں اِس سے زیادہ ہوسکتا ہے؛ چناں چہ کراچی اور لاہور میں بعض ایام میں ۱۹/منٹ کا فرق ہوتا ہے۔ (دیکھیے: صبح صادق وصبح کاذب، حصہ اول، ص: ۱۲-۱۳، مولفہ: پروفیسر عبد اللطیف بن عبد العزیز صاحب کراچی، ومصدقہ: مختلف اکابر علمائے پاکستان) اور اس میں بھی ۱۸/ڈگری کے حساب سے جو وقت ہوگا، ختم سحر احتیاطاً اس سے کم از کم پانچ منٹ پہلے کی جائے گی، اور ۱۵/ڈگری کے حساب سے جو صبح صادق کا وقت ہوگا، اذانِ فجر اس سے احتیاطاً کم از کم پانچ منٹ بعد کہی جائے گی؛ کیوں کہ جنتریوں کا حساب محض ظنی وتخمینی ہوتا ہے، قطعی ویقینی نہیں ہوتا، اور گھڑیوں کا ٹائم مکمل طور پر صحیح ہونا ضروری نہیں؛ پس جب مثلاً: ۱۹/منٹ کے ساتھ دس منٹ اور ملائیں گے، تو یہ تقریباً آدھے گھنٹے کا وقفہ ہوگا، جو ماہِ رمضان میں عوام الناس کے لیے حد درجہ شاق وبھاری ہوگا، اور نظام قابو میں لانا مشکل ہوگا۔

نیز صبح صادق کے سلسلے میں صرف ۱۵ اور ۱۸/ڈگری کا اختلاف نہیں ہے، اس میں ۱۴، ۱۶، ۱۹، اور ساڑھے ۱۹/ڈگری کے بھی اقوال ہیں، اور ان میں سے ۱۹ اور ساڑھے ۱۹/ڈگری کا قول؛ مختلف ممالک

میں معمول بہ بھی ہے؛ پس تطبیق دینا ہے، تو سب کو لے کر تطبیق دی جائے، اور جب سب کو لے کر تطبیق دی جائے گی، تو اس پر عمل انتہائی مشکل ہوگا، اور منتہائے سحر اور فجر میں آدھ گھنٹہ یا اس سے کم وبیش وقت مہمل ہوگا، جو صحیح نہیں۔

نیز اصول میں یہ بات طے شدہ ہے کہ راجح کا اعتبار ہوتا ہے، مرجوح راجح کے مقابلے میں معدوم کے درجے میں ہوتا ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے شرح عقود رسم المفتی میں تحریر فرمایا ہے؛ اس لیے ۱۸/ ڈگری کے قول پر جو نقشے تیار کیے گئے ہیں، احتیاط کی رعایت کے ساتھ اُن پر عمل کیا جائے، ۱۵/ ڈگری کا قول اختیار کرنے یا اس کی رعایت کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے حوالے سے جو تطبیق کی شکل پیش کی گئی ہے، یہ حضرت مفتی صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور علامہ بنوریؒ کی مرجوع عنہ رائے ہے، جیسا کہ اِن اکابرین کی اُن تحریرات اور فتاوی سے واضح ہے، جو سنہ: ۱۳۹۲ھ کے بعد لکھے گئے ہیں: اسی لیے دارالعلوم کراچی کے کلینڈر میں ۱۵/ ڈگری کے قول کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی ہے؛ لہٰذا اس مسئلے میں اب حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا حوالہ دینا صحیح نہیں۔

(۴) عوام کی رعایت میں وقتِ زوال میں ترمیم غلط ہے؛ البتہ نقشے میں صحیح وقت لکھ کر نوٹ میں قبل اور بعد؛ پانچ پانچ منٹ کی احتیاط لکھ دینے میں کچھ حرج نہیں۔

(۵) نقشے میں غروبِ آفتاب کا صحیح وقت لکھنا چاہیے، اور احتیاط کے لیے نوٹ بڑھانا چاہیے، احتیاط کے لیے غروب آفتاب کے وقت میں اضافہ کرنا، یا غروب آفتاب کا وقت نہ لکھ کر صرف؛ اذانِ مغرب کا وقت لکھنا، اور اُس میں ۳/ منٹ کا اضافہ کرنا صحیح نہیں۔ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۶/۲۳ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۳ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۸۲/ تتمہ/ ن، ۵۵۸/ ن، ۱۴۳۸ھ)

==========

سوال: مخدوم ومکرم حضرت اقدس مہتمم صاحب (دارالعلوم دیوبند) دامت برکاتکم وعمت فیوضکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! امید کہ مزاج گرامی بہ خیر ہوں گے۔

چند ضروری معروضات خدمتِ عالی میں پیش ہیں:

(۱) مظفرنگر شہر اور مضافات میں پورے سال؛ اوقاتِ نماز کی راہ نمائی کے لیے ''اسلامی نعیمی دوامی جنتری'' سے مدد لی جاتی ہے، اکثر دیہات وشہر کی مساجد کی منبروں پر یہ جنتری رکھی ہوئی نظر آتی ہے، اور عوام الناس اس کے علاوہ کسی جنتری کو معتبر نہیں سمجھتے۔

(۲) ''الفلاح دائمی اوقات الصلاۃ'' (شائع کردہ: دارالافتاء جامعہ فلاح دارین، بلاس پور، مظفرنگر) ''دائمی اوقات الصلاۃ برائے ہندوستان'' مرتبہ: محمد انس صاحب دہلی سے ماخوذ، ماہرِ فلکیات جناب قاری عبدالحفیظ صاحب منیار، سورت کی نظرِ ثانی کے بعد؛ گذشتہ پانچ سالوں سے مطبوعہ ہے، میرٹھ، دہلی کی بہت سی مساجد میں اسی کے مطابق اوقات کی تبدیلی کا معمول ہے۔

دیار کے مشہور مورخ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی مدظلہ نے نیٹ سے جو جنتری تیار کی ہے، اُس کے اوقات؛ ہماری اس تقویم کے مطابق ہیں، بہ ہرحال! دونوں تقویم میں طلوعِ آفتاب، زوال، وقتِ عصر، غروبِ آفتاب، وقتِ عشاء میں تین، چار منٹ کا فرق ہے، جب کہ صبح صادق کے خانے میں ۱۳، ۱۴، اور بعض مہینوں میں ۱۸/منٹ کا فرق ہے، بہ الفاظِ دیگر؛ نعیمی جنتری میں ختم سحر پندرہ، سولہ منٹ پہلے ہوجاتا ہے؛ لیکن رمضان شریف میں اس کی بنیاد پر سحر وافطار کے جو نقشے علاقائی اہل مدارس مرتب کرتے ہیں، عوام اُس کے موافق سحری ختم کرکے پانچ، سات منٹ بعد اذان فجر شروع کردیتے ہیں؛ حالاں کہ ''الفلاح دائمی اوقات الصلاۃ'' کے موافق؛ ابھی صبح صادق ہونے میں تقریباً دس منٹ باقی رہ جاتے ہیں، اور اذان کے چند منٹ بعد نماز شروع کردی جاتی ہے۔

(۳) تقویم کے اختلاف کے باعث؛ دیہات میں ختم سحر کے اعلان میں عجیب وغریب صورتِ حال پیش آتی ہے کہ ایک مسجد میں وقت سحر ختم ہونے میں وقت باقی رہنے کا اعلان ہوتا ہے، اور دوسری مسجد میں اذان شروع ہوجاتی ہے، اس صورتِ حال کا عوام الناس پر جو منفی اثر ہوتا ہے، ظاہر ہے۔

اس تفصیل کے تناظر میں حضرت والا کی خدمت میں مودبانہ گزارش ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ایک تقویم؛ صبح صادق وصبح کاذب کے تازہ مشاہدے کے بعد مرتب ہوجائے؛ تاکہ علاقے میں تقویمات کے اختلافات سے انتشار کی صورتِ حال پر روک لگے، اور دارالعلوم کی شائع کردہ تقویم کی روشنی میں رمضان کے اوقاتِ سحر وافطار کے نقشے مرتب ہوسکیں۔ حضرت والا اس سلسلے میں خصوصی توجہ مبذول فرماکر ہم خدام کو مشکور وممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامے کے ساتھ ''اسلامی نعیمی دوامی جنتری'' نام سے جو جنتری ارسال کی گئی ہے، وہ ''قاسمی دوامی جنتری'' کی نقل معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ جب اس کے اوقات کا ''قاسمی دوامی جنتری'' کے اوقات سے موازنہ کیا گیا، تو دونوں میں یک ساں اوقات دریافت ہوئے، صرف ایک دوجگہ ایک، آدھ منٹ کا فرق نظر آیا، جو بہ ظاہر کاتب کی غلطی ہوسکتی ہے؛ البتہ ''اسلامی نعیمی دوامی جنتری'' کے ناشر نے منتہائے سحر کا خانہ بڑھا کر؛ اس میں صبح صادق سے دس منٹ پہلے منتہائے سحر کا وقت درج کیا ہے، اور طلوعِ صبح صادق کا وقت؛ وقتِ اذان فجر کے نام سے درج کیا ہے، جب کہ ''قاسمی دوامی جنتری'' میں منتہائے سحر کا کوئی خانہ نہیں ہے، صبح صادق کا وقت؛ صبح صادق ہی کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، اور یہی منتہائے سحر کا وقت ہے، اور 'قاسمی دوامی جنتری' کے شروع میں لکھا ہے: ''وقت سحر سے احتیاطاً پانچ منٹ پہلے سحری بند کردی جائے''، اور ''اسلامی نعیمی دوامی جنتری'' میں دس منٹ کی احتیاط کے ساتھ ''قاسمی دوامی جنتری'' کا درج بالا نوٹ بھی لے لیا گیا ہے، جس سے شبہ ہوتا ہے کہ منتہائے سحر کا وقت؛ صبح صادق کا وقت ہے، جب کہ اس جنتری میں دونوں کو الگ الگ کیا گیا ہے۔

اور ''قاسمی دوامی جنتری'' ۱۸ر ڈگری صبح صادق کے حساب پر بنائی گئی ہے، جیسا کہ اکابر کے زمانے کی بہت سی جنتریاں: (اشرف التقویم اوقاتِ نماز، مرتبہ: منشی محمد مظہر صاحب تھانویؒ، رحیمی دوامی جنتری، پسند فرمودہ: حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ، اسلامی دوامی جنتری، مرتبہ: مرزا عزیز بیگ صاحب، مختار عدالت سہارن پور وغیرہ) اسی حساب پر بنائی گئی تھیں، اور مشاہدے سے اُن کی صحت ثابت شدہ تھی، اور ''قاسمی دوامی جنتری'' تقریباً مکمل طور پر اُن کے موافق ہے، جب کہ جناب انس صاحب کی مرتب کردہ جنتری اور قاسمی جنتری میں اکثر تاریخوں میں ۴ سے ۶ر منٹ کا فرق ہے، اور بعض تاریخوں میں ایک سے ۴ر منٹ کا، اور جناب مولانا نور الحسن راشد صاحب نے جو جنتری تیار کی یا کرائی ہے، اُس میں اور ''قاسمی دوامی جنتری'' میں اکثر تاریخوں میں ۴ سے ۹ر منٹ کا فرق ہے، اور بعض تاریخوں میں اس سے کچھ کم۔

اور'' قاسمی دوامی جنتری'' میں صبح صادق کے جو اوقات لکھے گئے ہیں، اُن میں سے بعض کے بارے میں مستقل طور پر جدید مشاہدہ بھی کیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم نے فرمایا:

''جب قاسمی دوامی جنتری چھپ کر منظر عام پر آئی، تو بعض علماء نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں؛

طلوعِ صبح صادق کا وقت صحیح نہیں ہے، اور وہ حضرات یہ اعتراض لے کر حضرت مولانا مفتی محمد نظام الدین صاحب اعظمیؒ (سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند) کے پاس آئے، تو حضرت مفتی صاحب قدس سرہ نے فرمایا: حسابی بنیاد پر کسی جنتری کی تصحیح یا تغلیط کی ضرورت نہیں، مشاہدہ کرلیا جائے، اور جو جنتری مشاہدے کی رو سے صحیح ثابت ہو، اُس پر عمل کیا جائے، اور جو اس کے خلاف ثابت ہو، اُس پر عمل نہ کیا جائے، اور مشاہدے کے لیے یہ کیا جائے کہ آپ حضرات اور ہم لوگ اپنی اپنی سحری لے کر کل، صبح صادق سے پہلے دیوبند سے باہر کسی کھلی فضا میں چلیں، وہیں سحری بھی کھائیں، اور سب لوگ اپنی اپنی آنکھوں سے بہ راہِ راست طلوع صبح صادق کا مشاہدہ کریں، اور جس وقت صبح صادق کا مشاہدہ ہو، اُسے نوٹ کرلیں، پھر آکر دیکھیں، جو جنتری اس کے مطابق ہو، وہ صحیح سمجھی جائے، اور اس پر عمل کیا جائے؛ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، اور تین کاریں گئیں، اور باہر جاکر خود لوگوں نے دیکھا، اور صبح کاذب کے بعد جوں ہی آسمان کے افق پر چوڑائی میں پھیلتی ہوئی روشنی نظر آئی؛ اپنی اپنی گھڑی دیکھ کر وہ ٹائم نوٹ کرلیا، اور واپس آکر وہ ٹائم مختلف جنتریوں سے ملایا گیا، تو ''قاسمی جنتری'' کا وقت بالکل صحیح نکلا، معترض لوگ خاموش ہوگئے، اور اس جنتری کی صحت بالاتفاق تسلیم کرلی گئی''۔

لیکن چوں کہ جنتریاں محض ظنی وتخمینی ہوتی ہیں، حتمی اور یقینی نہیں ہوتیں، نیز گھڑیوں کے اوقات کا مکمل طور پر صحیح ہونا بھی ضروری نہیں؛ اس لیے جنتریوں میں درج اوقات کو سو فی صد صحیح سمجھنا، اور نماز روزے کے سلسلے میں من وعن اُن اوقات کے مطابق ہی عمل کرنا صحیح نہیں؛ بل کہ جنتریوں میں درج اوقات پر عمل کرنے میں احتیاط کی رعایت ضروری ہے، مثلاً: صحیح جنتری میں صبح صادق کا جو وقت لکھا ہو، اس سے کم از کم پانچ، سات منٹ پہلے ہی سحری ختم کردی جائے، اور صبح صادق کا جو وقت درج ہو، اذانِ فجر اس کے دس منٹ کے بعد کہی جائے؛ تا کہ روزہ بھی کسی شک شبہے کے بغیر صحیح ہوجائے، اور اذان اور نماز بھی یقینی طور پر فجر کا وقت آجانے پر پڑھی جائے، آج کل ماہِ رمضان میں روزہ یا اذان ونماز میں جو عام بے احتیاطی پائی جارہی ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ ''دوامی اشرف التقویم اوقات نماز'' کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں:

'' نقشہ ہذا میں صبح صادق کا جو وقت درج ہے، وہ اصولِ علم ہیئتِ جدید اور مشاہدے سے بالکل ابتدائے صبح ہے؛ مگر احتیاطاً یہ لازمی ہے کہ صبح کی اذان اس سے کم از کم دس منٹ بعد کہی جائے''۔

اور بوادر النوادر (ص: ۴۲۹) میں نقشہ: الساعات للطاعات کے بعد؛ تنبیہات متعلقہ اوقاتِ نماز وروزہ کے عنوان کے تحت؛ تنبیہ نمبر ۹ کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور یہ نقشہ چوں کہ تقریبی ہے، اس میں جن تاریخوں کا امورِ اربعہ مذکورہ میں توافق لکھا ہے، وہ تقارب ہے، جس کو بہ وجہ تفاوتِ معتد بہ نہ ہونے کے؛ کہ غالباً دو تین منٹ سے زائد نہیں ہے، بہ حکم تماثل قرار دیا گیا ہے، اگر سب میں مناسب احتیاط کر لی جاوے، تو عملی غلطی سے حفاظت رہے گی، مثلاً: صبح صادق کا جو وقت نقشے میں ہے، اس سے دس یا پندرہ منٹ پہلے سحری چھوڑ دیں، اور طلوع شمس کا جو وقت لکھا ہے، اس سے پانچ منٹ پہلے نمازِ فجر ختم کر دیں؛ لیکن اگر کوئی ختم نہ کر سکا، تو مشتبہ وقت میں پڑھ لینا واجب ہے، قضا کر دینا جائز نہیں، اور غروب کا جو وقت لکھا ہے، اس سے پانچ منٹ بعد روزہ افطار کریں الخ''۔

رحیمی دوامی جنتری میں ایک ضروری ہدایت کے عنوان کے تحت مرقوم ہے:

''اس نقشے میں صبح صادق اور طلوع وغروب کا جو وقت درج ہے، وہ چوں کہ بالکل ابتدائی ہے؛ اس لیے صبح کی اذان کم از کم پانچ منٹ بعد کہی جائے، اور سحری کا کھانا بھی پانچ منٹ پہلے بند کر دیا جائے الخ''۔

رحیمی دوامی جنتری (مع اوقات نماز پنج گانہ وطلوع وغروب) میں ہے:

''اس نقشے میں صبح صادق اور طلوع وغروب کا جو وقت درج ہے، وہ چوں کہ بالکل ابتدائی ہے؛ اس لیے صبح کی اذان کم از کم پانچ منٹ بعد کہی جائے، اور سحری کا کھانا بھی پانچ منٹ پہلے بند کر دیا جائے، اور اسی طرح اذانِ مغرب اور افطار میں بھی احتیاط ضروری ہے، اس کے علاوہ جنتری انسان کی بنائی ہوئی ہے، غلطی اور بھول چوک ہونے کا احتمال ہے، اور گھڑی کا بالکل صحیح ہونا بھی یقینی نہیں؛ لہٰذا احتیاط کرنا بہت ضروری ہے، لوگ اس میں بہت بے احتیاطی کرتے ہیں''۔

اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

''میں قدیم جنتری کے اوقات کو حسابی اعتبار سے صحیح سمجھتا ہوں؛ البتہ یہ حسابات خود یقینی نہیں ہوتے، نماز روزے کے معاملے میں احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرنا چاہیے''۔

(احسن الفتاوی: ۲/۱۹۱، مطبوعہ: ایچ، ایم، سعید کمپنی، کراچی، محررہ: ۲۴/ذی الحجہ، سنہ: ۱۳۹۳ھ)

فقہائے کرام نے صراحت فرمائی ہے کہ صحیح قول کے مطابق؛ شک وتردد کے ساتھ سحری میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔

ومحلُّ الاستحباب – أي: استحباب تأخير السُّحور – إذا لم يشكّ في بقاء اللّيل، فإن شكّ كره الأكل في الصَّحيح، كما في البدائع أيضاً. (ردالمحتار، كتاب الصوم: ۳/۴۰۰، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۶/۳۴۲، ت: الفرفور، ط: دمشق)

ویکرہ تأخیرہ إلی وقت یقع فیہ الشّك، ہندیة. (حاشیة الطحطاوي علی المراقي، ص: ۶۸۳، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت)

فتاوی رشیدیہ (ص: ۴۶۲، مطبوعہ: گلستاں کتاب گھر، دیوبند) میں ہے:

''سحری کھانے کے اندر تاخیر مستحب ہے، اور ایسی تاخیر کہ جس سے شک واقع ہوجائے، اُس سے بچنا واجب ہے''۔

فتاوی محمودیہ (۳۶۲/۵، سوال: ۲۱۵۷، مطبوعہ: ادارۂ صدیق، ڈابھیل) میں مختلف اوقات کی جنتریوں کے متعلق ایک سوال کے جواب میں ہے:

''اگر سحری صبح کے وقتِ مشتہر سے قبل ختم کردی جائے، اور نمازِ فجر اسفار میں ادا کی جائے جو کہ اصل مذہب ہے، تو کوئی خدشہ نہ رہے، یا اسفار میں نہ ہو، تو کم از کم اتنا تو لحاظ کرلیا جائے کہ یہ خدشہ دفع ہوکر نماز بالتعیین صحیح وقت پر ادا ہو''۔

اسی لیے گذشتہ سال (شعبان، سنہ: ۱۴۳۶ھ میں) حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم نے دار الافتاء کے دیگر مفتیانِ کرام سے مشورے کے بعد حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کی خدمت میں یہ تحریر فرمایا:

''دارالعلوم کی طرف سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقاتِ سحر وافطار میں وقتِ اذان فجر کا ایک خانہ بڑھادیا جائے؛ اور منتہائے سحر سے دس منٹ بعد؛ اذانِ فجر کا وقت درج کردیا جائے، اور نوٹ میں یہ لکھ دیا جائے: اذانِ فجر کا وقت احتیاطاً ختم سحر کے دس منٹ بعد درج کیا گیا ہے''۔

کیوں کہ اس صورت میں احتیاط بھی ہے، اور دیگر جنتریوں کے حساب سے بھی ہر موسم وتاریخ میں فجر کا وقت شروع ہوجاتا ہے؛ چناں چہ حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم نے دار الافتاء کی تجویز قبول فرماتے ہوئے؛ متعلقہ شعبے کو اس کا حکم صادر فرمایا، اور گذشتہ سال دارالعلوم کے نقشۂ اوقات سحر وافطار میں اذانِ فجر کا خانہ بڑھایا گیا، اور یہ نوٹ بھی تحریر کیا گیا: ''اذانِ فجر کا وقت احتیاطاً ختم سحر کے دس منٹ بعد درج کیا گیا ہے''۔

اور جب مظاہر علوم سہارن پور کے مفتیانِ کرام اور ذمے دار حضرات کو اس کا علم ہوا، تو اُن حضرات نے بھی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے اسے قبول فرمایا، اور اُن حضرات نے بھی اپنے یہاں سے شائع ہونے والے نقشۂ اوقاتِ سحر وافطار میں؛ اذانِ فجر کے خانے کا اضافہ فرمایا، اور اس میں منتہائے سحر سے دس منٹ کے بعد اذانِ فجر کا وقت درج کروایا۔

اس لیے راجح ''قاسمی دوامی جنتری'' ہے، اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے؛ البتہ اوپر ذکر کردہ احتیاط کی رعایت اہم ہے؛ تاکہ لوگوں کے روزے بھی بلا شک وشبہ صحیح و درست ہوجائیں، اور اذان اور نماز بھی یقینی طور پر فجر کا وقت ہوجانے پر ہی پڑھی جائے، اور اس صورت میں عملی طور پر جناب انس صاحب کی مرتب کردہ جنتری یا مولانا نور الحسن راشد صاحب مدظلہ کی تیار کردہ جنتری سے کوئی تعارض یا ٹکراو بھی نہ ہوگا، اور ماہِ رمضان میں عوام میں پھیلنے والا انتشار بھی ختم ہوجائے گا۔ اللہ تعالی توفیق عطا فرمائیں، اور قبول فرمائیں، آمین۔ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۲/۷/۱۴۳۷ھ، مطابق: ۳۰/۴/۲۰۱۶ء، شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

زین الاسلام قاسمی- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۷۵۰/تتمہ/ن، ۷۹۱/ن، ۱۴۳۷ھ)

==

عورتیں اول وقت میں نماز ادا کریں یا اخیر وقت میں؟

سوال: عورتوں کے لیے اولِ وقت میں نماز ادا کرنا بہتر ہے یا اخیر وقت میں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق: عورتوں کے لیے فجر کی نماز؛ وقت ہوجانے کے بعد اولِ وقت پڑھنا مستحب ہے، اور فجر کے علاوہ دیگر نمازوں میں؛ جب مسجد کی جماعت ہوجائے، تب عورتیں اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، افضل یہی ہے۔

وفي المبتغى: الأفضل للمرأة في الفجر الغلس، وفي غيره الانتظار إلى فراغ الرِّجال عن الجماعة. (مجمع الأنهر، أول كتاب الصلاة: ۱/ ۱۰۸، ط: دارالكتب العلمية، بيروت)

ومثله في: (الدر المختار مع رد المحتار، أول كتاب الصلاة: ۲/ ۲٤، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۲/ ۵۱۱، ت: الفرفور، ط: دمشق) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲/۶/۱۴۳۸ھ = ۲/۳/۲۰۱۷ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری- محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

فجر کا وقت ختم ہونے کا اعلان کرنا کیسا ہے؟

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام وعلمائے کرام اُس اعلان کے بارے میں، جو کچھ مسجدوں میں فجر کی قضا نماز کے لیے کیا جاتا ہے، آیا وہ اعلان کرنا جائز ہے یا ناجائز، یا قرآن وحدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟ جواب تحریر فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: سورج نکلنے کے وقت؛ مروجہ اعلان کرنا شریعت میں ثابت نہیں ہے؛ بل کہ فقہی جزئیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی عام آدمی مکروہ وقت میں نماز پڑھ رہا ہو، تو اسے نہ روکا جائے؛ اس لیے کہ اس وقت روکنے سے بعد میں وہ بالکل چھوڑ دے گا؛ لہٰذا چھوڑنے کے بجائے پڑھ لینا ہی بہتر ہے؛ اس لیے کہ بعض علماء کے نزدیک اس وقت بھی نماز درست ہوجاتی ہے، فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

سُئل عن شمس الأئمّة الحلواني عن قوم کُسالیٰ عادتھم الصَّلاۃ وقت طلوع الشّمس أ یمنعون من ذلك؟ قال: لا؛ لأنّھم لو مُنعوا لایصلُّون بعد ذلك.

(الفتاوی التاتارخانیة: ۲/۱۵، رقم:۱۵۱۸، زکریا)

(ترجمہ:) ”شمس الائمہ حلوانی سے پوچھا گیا کہ کچھ لوگ جو سستی کرتے ہوں، اُن کی عادت طلوعِ شمس کے وقت نماز پڑھنے کی ہو، کیا اُنھیں نماز سے روکا جائے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ نہیں؛ کیوں کہ اگر اُنھیں روک دیا گیا، تو وہ بعد میں نماز ہی نہ پڑھیں گے“۔

وفي القنیة: کُسالیٰ العوامّ إذا صلُّوا الفجر وقت الطُّلوع لاینکر علیھم؛ لأنّھم لو منعوا یترکونھا أصلاً ظاھراً، ولو صلُّوھا تجوز عند أصحاب الحدیث، والأداء الجائز عند البعض أولی من التّرك. (شامی: ۲/۳۰-۳۱، زکریا)

(ترجمہ:) ”سستی کرنے والے لوگ اگر سورج نکلتے وقت؛ فجر کی نماز پڑھیں، تو اُنھیں نہ روکا جائے؛ اس لیے کہ اُنھیں روک دیا، تو وہ نماز ہی نہ پڑھیں گے، اور اگر پڑھ لیں، تو بعض اصحابِ حدیث کے نزدیک اُن کی نماز درست ہوجائے گی؛ لہٰذا بعض علماء کے نزدیک جائز نماز پڑھنا بالکل نہ پڑھنے سے اولیٰ ہے“۔

بریں بنا اس اعلان کی رسم کو ختم کرنا چاہیے، اور ہر آدمی کو خود خیال رکھتے ہوئے صحیح وقت پر نماز کی ادائیگی کی کوشش کرنی چاہیے، یہ اعلان اس لیے بھی قابلِ ترک ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ ہی قضائے صلاۃ کے جرم کا مرتکب ہورہا ہے، جس کے لیے اعلان کی ضرورت پڑ رہی ہے، نیز صحابہ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں؛ جب کہ گھڑی گھنٹے رائج نہ ہونے کی بنا پر اس کے اعلان کی زیادہ ضرورت تھی؛ کہیں اس اعلان کے اہتمام کا ثبوت نہیں ملتا، تو آج جب کہ کوئی گھر؛ گھڑی اور وقت کا اندازہ لگانے والے اسباب سے خالی نہیں ہے، بہ درجۂ اولی اس طرح کے اعلان کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔ فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۲۶ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۲۴۵/تتمہ/ص، ۱۳۰۵/ص، ۱۴۳۸ھ)

سورج کے طلوع ہونے کا اعلان کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرمان ہے علمائے دیوبند و مفتی صاحبان کا اس مسئلے کے متعلق کہ ہمارے علاقے کے اندر سورج طلوع ہونے کا اعلان ہوتا ہے کہ سورج نکلنا شروع ہوگیا ہے؛ ۲۰/ منٹ کے بعد نماز ادا کریں، اور بعض لوگ اس کے عدمِ جواز کے قائل ہیں کہ اعلان کرنا صحیح نہیں ہے، اور اگر ہم لوگ اعلان نہ کریں، تو بہت لوگ ایسے ہیں جن کو ٹائم دیکھنا نہیں آتا، اُن کو بہت زیادہ دقت ہوگی، اُن کو نماز کے ٹائم کا اعلان ہی سے پتا چلتا ہے، اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں بہت کافی دنوں سے یہ اعلان ہوتا ہے، اور ایک دم اس اعلان کو ختم کرنا ناممکن ہے؛ لہٰذا آپ سے بڑی مودبانہ درخواست ہے کہ اس سوال کی صحیح صورت واضح انداز میں رقم فرمادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: سورج کے طلوع ہونے کا اعلان کرنا صحیح نہیں ہے، اس رسم کو بالکل ختم کرنا چاہیے، جاہل عوام جو سورج نکلتے ہوئے اپنی ناواقفیت میں نماز پڑھتے ہیں؛ فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ بعض ائمہ کے نزدیک اُن کی نماز ادا ہوجاتی ہے؛ اگرچہ احناف کے نزدیک؛ ادا نہیں ہوتی، نماز کے اوقات؛ قطعی اور یقینی ہیں، اور ہم جنتری دیکھ کر سورج کے طلوع کا اعلان کرتے ہیں،

جب کہ جنتری ظنی ہے، قطعی اور یقینی نہیں ہے، قطعی چیز کا اعلان ظنّی چیز کو دیکھ کر کرنا، یہ جائز نہیں، جنتری کو ہم نے قرآن وحدیث کا درجہ دے دیا۔ نعوذ باللہ!

اسلامی تاریخ میں یہ اعلان کہیں کبھی کسی اسلامی ملک میں نہیں ہوا، مکہ مکرمہ میں، مسجد الحرام میں نہیں ہوا، مسجد نبوی میں نہیں ہوا، نہ ہی ہمارے ہندوستان میں؛ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور میں ہوا، پھر یہ بتائیں کہ سورج غروب ہونے کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ ظہر کے وقت اور مغرب وعشاء کے وقت کے ختم ہونے کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟ جس کام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، نہ صحابۂ کرام وتابعین نے، نہ ہمارے ائمہ اربعہ میں سے کسی نے کیا، نہ بزرگوں نے کیا؛ ہم ایک نیا طریقہ؛ جو جاہل بدعتی لوگوں کا نکالا ہوا ہے، کیوں اختیار کریں؟! اسے بالکلیہ بند کرنا چاہیے۔

وهي – أي البدعةُ –:.......... ما أحدث على خلاف الحقِّ المتلقى عن رسول الله– صلى الله عليه وسلّم – من علم أو عمل أو حال بنوع شُبهة واستحسان، وجعل ديناً قويماً وصراطاً مستقيماً. (شامي، كتاب الصلاة، باب الإمامة: ۲/ ۲۹۹، ط: زكريا، ديوبند)

من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردٌّ. (صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة وردّ محدثات الأمور: ۲/ ۷۷، ط: اتحاد، ديوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۸۳/ب، ۲۲۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

اذان کے جواب میں کیا کلمات کہے جائیں گے؟

سوال: اذان کے جواب میں وہی کلمات دہرائے جائیں گے؟ یا کچھ اور کلمات بھی پڑھے جاسکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق: اذان کے جواب میں وہی کلمات دہرائے جائیں، جو موذن کہتا ہے؛ البتہ **حَيَّ عَلَى الصَّلَاة** اور **حَيَّ عَلَى الفَلاح** کے جواب میں **لَا حَولَ وَلَا قُوَّةَ إلا بالله**، اور فجر کی اذان میں **الصَّلَاةُ خَيرٌ مِنَ النَّوم** کے جواب میں **صَدَقتَ وَبَرَرتَ** کہا جائے۔

ویجیب من سمع الأذان بأن یقول کمقالته؛ إلا في الحیعلتین، وفي الصّلاة خیرٌ من النّوم. (تنویر الأبصار مع الدر والرد، کتاب الصلاة، باب الأذان: ۲/ ٦٥– ٦٧، ط: مکتبة زکریا، دیوبند، ۲/ ٦١٧– ٦٢٣، ت: الفرفور، ط: دمشق)

(إلا في الحیعلتین) فیحوقل، (وفي الصّلاة خیرٌ من النّوم) فیقول: صدقت وبررت. (الدر المختار مع رد المحتار) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۲/ ٦/ ۱۴۳۸ھ = ۲/ ۳/ ۲۰۱۷ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

اذان وتکبیر میں شہادت کے جواب میں درود شریف کہنا ثابت نہیں؟

سوال: اذان یا تکبیر میں أشهد أنّ محمَّداً رسولُ اللّٰہ پر صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہنا کیسا ہے؟ اور کہنے والے کو روکنا چاہیے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اذان یا تکبیر (اقامت) میں أشهد أنّ محمَّداً رسولُ اللّٰہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرامؓ، تابعین عظامؒ، تبع تابعینؒ اور ائمۂ مجتہدین، اور دیگر فقہائے امت میں سے کسی سے درود شریف پڑھنا ثابت نہیں؛ بل کہ اذان کا جواب صراحت کے ساتھ حدیث میں آیا ہے، اور اس میں بھی صرف أشهدُ أنّ محمَّداً رسولُ اللّٰہ آیا ہے، اس کے ساتھ درود شریف منقول نہیں ہے؛ لہٰذا اس وقت صرف أشهدُ أنّ محمَّداً رسولُ اللّٰہ کہا جائے، درود شریف وغیرہ کچھ نہ پڑھا جائے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۲/ ۹۴-۹۵، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم دیوبند، حاشیہ فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۲/ ۱۲۱، سوال: ۱۷۷، اور احسن الفتاوی: ۲/ ۲۷۸-۲۷۹، مطبوعہ: ایچ ایم سعید، کراچی) اور اگر کوئی پڑھتا ہے، تو اسے اچھے انداز سے صحیح بات بتادینے میں کچھ حرج نہیں۔

عن عمر قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم: إذا قال المؤذّن: اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر، فقال أحدُکم: اللّٰہ أکبر اللّٰہ أکبر، ثم قال: أشهدُ أن لاإله إلا اللّٰہ، قال: أشهدُ أن لاإله إلا اللّٰہ، ثم قال: أشهدُ أنّ محمَّداً رسولُ اللّٰہ، قال: أشهدُ أنّ محمَّداً رسولُ اللّٰہ،

ثـم قـال: حيَّ على الصَّلاة، قال: لاحول ولاقوّة إلا بالله، ثم قال: حيَّ على الفلاح، قال: لاحول ولاقوّة إلا بـاللّـه، ثم قال: الله أكبر الله أكبر، قال: الله أكبر الله اكبر، ثم قال: لاإله إلا الله، قال: لاإله إلا الله من قلبه دخل الجنّة. رواه مسلم. (مشكاة المصابيح، كتاب الصلاة، باب الأذان، الفصل الأول، ص: ٦٥، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند) وعـن عبدالله ابن عمر وابن العاص قالا: قال رسول الله صلى الله عليه وسلّم: إذا سمعتم المؤذّن فقولوا مثل ما يقول، ثمّ صلُّوا عليَّ؛ فإنّه من صلّى عليَّ صلاةً صلّى الله عليه عشراً. الحديث. رواه مسلم.
(المصدر السابق، ص: ٦٤-٦٥)

قـال حـذيفة رضي الله عنه: كلّ عادة لم يتعبدها أصحابُ رسول الله صلى الله عـلـيـه وسـلّـم فـلاتـعـبـدوهـا؛ فإنّ الأوّل لم يدع للآخر مقالاً، فاتقُوا الله يا معشر القُرّاء وخُذوا بطريق من كان قبلكم، ونحوه لابن مسعود أيضا. (الموافقات: ٣/٥٣)

عـن عـائشة رضـي الـلّـه عـنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلّم: من أحـدث فـي أمـرنـا هذا ما ليس منه فهو ردٌّ. متّفقٌ عليه، وعن جابر رضي الله عنه قال: قال رسـول الله صلّى الله عليه وسلّم: أما بعد! فإن خير الحديث كتابُ الله وخير الهدي هديُ مـحـمَّـد صـلّى الله عليه وسلّم، وشر الأمور محدثاتُها وكلّ بدعة ضلالة. رواه مسلم.
(مشكاة المصابيح، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسّنة، الفصل الأول، ص: ٢٧) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۱۷ھ = ۲۰۱۷/۳/۱۷ء، جمعہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۸۰/تتمہ/ن، ۶۱۴/ن، ۱۴۳۸ھ)

تکبیر یا اذان میں کلمۂ شہادت کہنے کے بعد درود شریف پڑھ لیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ دینِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

تکبیر یا اذان میں کلمۂ شہادت کے وقت تصلیہ (صلی اللہ علیہ وسلم کہنے) کا کیا حکم ہے؟ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر کوئی پڑھ لے تو کیسا ہے؟ اور کیا تکبیر واذان کا اعادہ ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اذان یا تکبیر (اقامت) میں **أشهد أنّ محمّدا رسول اللّٰه** کے وقت درود شریف پڑھنا ثابت نہیں؛ لہٰذا اس وقت اذان یا اقامت میں یا ان میں سے کسی کے جواب میں صرف **أشهدُ أنّ محمّداً رسولُ اللّٰه** کہا جائے، درود شریف وغیرہ کچھ نہ پڑھا جائے۔ (احسن الفتاوی: ۲/۲۷۸-۲۷۹، مطبوعہ: ایچ ایم سعید، کراچی) اور بہ ہر صورت اذان یا اقامت کے اعادے کی ضرورت نہ ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۵/۶ھ = ۲۰۱۷/۲/۴ء، شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۳۷۸/تتمہ/ن، ۳۵۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

تکبیر کے وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا کیسا ہے؟

سوال: کچھ لوگ جس وقت تکبیر ہوتی ہے، ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر؛ ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں، پھر تکبیر ختم ہونے پر ہاتھ اٹھا کر باندھ لیتے ہیں، دریافت طلب یہ ہے کہ تکبیر کے وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: تکبیر (اقامت) کے وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھنے اور دونوں کو لٹکانے کا شریعت میں نہ کوئی حکم ہے، اور نہ ہی اس کا کچھ ثبوت ہے؛ لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔

قال حذيفة رضي اللّٰه عنه: كلّ عادة لم يتعبدها أصحابُ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم فلاتعبدوها؛ فإنّ الأوّل لم يدع للآخر مقالاً، فاتقُوا اللّٰه يا معشر القُرّاء وخُذوا بطريق من كان قبلكم، ونحوه لابن مسعود أيضا. (الموافقات: ۳/۵۳)

عن عائشة رضي اللّٰه عنها قالت: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم: من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردٌّ. متّفقٌ عليه، وعن جابر رضي اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: أما بعد! فإن خير الحديث كتابُ اللّٰه وخير الهدي هديُ محمَّد صلّى اللّٰه عليه وسلّم، وشر الأمور محدثاتُها وكلّ بدعة ضلالة. رواه مسلم.

(مشكاة المصابيح، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسّنة، الفصل الأول،ص: ۲۷، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　۱۷/۶/ ۱۴۳۸ھ = ۱۷/۳/ ۲۰۱۷ء، جمعہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۸۰/تتمہ/ن، ۶۱۴/ن، ۱۴۳۸ھ)

جس اذانِ اول کے بعد سعی واجب ہوجاتی ہے اس سے کس مسجد کی اذان مراد ہے؟ اور سعی کا کیا مطلب ہے؟

سوال: استفتاء بہ خدمت مفتیانِ کرام دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم!

عرض ہے کہ جمعے کے دن اذان ہوجانے پر سعی الی ذکر اللہ فرض ہے، اور امرِ مخل فی السعی حرام ہوجاتا ہے، ذکر اللہ سے مراد؛ فقہاء و مفسرینِ کرام نے خطبہ، صلاۃِ جمعہ تحریر فرمایا ہے، اور ندا سے راجح قول کے مطابق؛ اذانِ اول مراد ہے، بہت ترغیب دلانے کے باوجود زیادہ تر نمازی اذان کے بعد اپنے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں، اور جب خطبے کا وقت قریب ہوجاتا ہے، تب مسجد میں آتے ہیں، اور اس امرِ منکر میں اچھے خاصے دین دار اور علماء بھی ملوث ہیں، ہمارے علاقے میں اذانِ اول اور خطبے کے درمیان آدھا گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ وقفہ ہوتا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر آبادی اور ہر محلّے میں مسجد ہوتی ہے؛ بل کہ عرفی محلّے میں ایک سے زائد بھی ہوجاتی ہے، اور ایک سے زائد میں جمعے کی نماز ہوتی ہے، بندہ یہ سمجھا ہوا تھا کہ زوالِ شمس کے بعد جو اذان سب سے پہلے ہوگی، اس اذان سے پوری بستی والوں پر جہاں تک سب سے پہلی اذان کی آواز پہنچی؛ سعی الی المسجد الجامع فرض ہوجاتی ہے، بندہ اس تلاش میں تھا کہ اذانِ اول سے مراد محلّے کی مسجد کی پہلی اذان ہے، یا بستی کی پہلی اذان، کوئی جزئیہ کتبِ فقہ میں مل نہیں پایا تھا، بسیار تلاش کے بعد احسن الفتاوی میں ملا کہ محلّے کی اذان مراد ہے، یہ حضرت مفتی صاحب کی دلیل پر مبنی رائے ہے، حوالہ نہیں؛ کیوں کہ زمانۂ قدیم میں جمعے کی نماز ہونے والی مساجد کی کثرت نہیں تھی؛ بل کہ تعدد ہی نہیں تھا، ایک بستی میں ایک جامع مسجد ہوتی تھی، اور اذان بغیر مائک کے ہوتی تھی، اگر محلّے کی اس مسجد کی اذان مراد ہے، جس میں نماز پڑھنی ہے، تو اس میں یہ آسانی ہوسکتی ہے کہ اذانِ اول خطبے کی اذان سے دس منٹ پہلے پڑھی جائے، تو اس صورت میں بہت لوگ گناہ سے بچ جائیں گے۔

(۱) محلّے کی مسجد کی اذانِ اول مراد ہوگی یا بستی کی پہلی اذان، جہاں تک آواز جاتی ہے؟

(۲) اگر محلّے کی اذان کا اعتبار ہے، تو اگر ایک عرفی محلّے میں چند جامع مسجد ہیں، تو جس مسجد میں نماز پڑھنی ہے، اس کا اعتبار ہوگا، یا عرفی محلّے کی پہلی اذان کا اعتبار ہوگا؟

(۳) مفتی شفیع صاحب نے معارف القرآن میں سعی کو اہتمام پر محمول کرتے ہوئے جمعے کی تیاری مراد لی ہے، جس سے غسل وغیرہ کا سعی میں داخل ہونا معلوم ہوتا ہے، مطالعۂ کتب کا سعی الی ذکر اللہ کے منافی ہونا ظاہر ہے؛ کہ وہ ذکر نہیں ہے، اگر اذان کے بعد خطبہ شروع ہونے سے پہلے؛ مسجد میں پہنچ جانے کے یقین کے ساتھ کسی نے گھر پر وضو کیا، یا غسل کیا، یا سنتیں یا نفل نماز ادا کی، یا قرآن کریم کی تلاوت کی، یا تسبیحات پڑھیں، یا مسجد کے احاطے میں واقع کمرے میں مذکورہ اعمال میں سے کوئی عمل کیا، تو یہ سعی الی ذکر اللہ کے منافی ہوگا یا نہیں؟ بہ ظاہر منافی معلوم نہیں ہوتا؛ کیوں کہ مذکورہ اعمال اور خطبہ وصلاۃِ جمعہ میں صرف ظاہر ونص کا فرق معلوم ہوتا ہے، خطبہ یا صلاۃِ جمعہ کی ایسی تخصیص معلوم نہیں ہوتی کہ اس موقع پر نفل نماز وغیرہ ذکر سے خارج ہوگئے ہوں؛ البتہ ان اعمال میں مشغولیت سے اگر خطبے کا کچھ حصہ چھوٹ گیا، تو یہ شغل یقیناً سعی مذکور کے منافی ہوگا؛ کہ ظاہر پر عمل سے نص پر عمل متروک ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱،۲)** دلائل کی روشنی میں راجح ومختار قول یہ ہے کہ ہر شخص جس مسجد میں جمعہ پڑھتا ہے، یا جس مسجد میں وہ جمعہ پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے حق میں خرید وفروخت وغیرہ ممنوع ہونے میں اس مسجد کی اذانِ اول کا اعتبار ہوگا۔ (حاشیہ امداد الفتاوی: ۱/۱۶۹، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند، اور احسن الفتاوی: ۱۰/۲۰۷، مطبوعہ زیر اہتمام: الحجاز پبلشرز، کراچی) جیسا کہ دیگر نمازوں میں اگر مختلف مساجد سے کچھ وقفے کے ساتھ اذانیں ہوں، تو راجح قول کے مطابق علی الاطلاق ہر مسجد کی اذان کا جواب مطلوب نہیں؛ بل کہ اصل اس مسجد کی اذان کا جواب دینا ہے، جس میں آدمی نماز پڑھتا ہے، یا وہ نماز جس مسجد میں پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ (احسن الفتاوی: ۴/۱۲۸، مطبوعہ: ایچ ایم سعید، کراچی)

وأن يجيب بقدمه اتفاقاً في الأذان الأول يوم الجمعة؛ لوجوب السّعي بالنّص، وفي التّاتر خانية: إنما يجيب أذان مسجد. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلاة، باب الأذان: ۲/۷۰-۷۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

والظّاهرُ أنّ المأمورين بترك البيع هم المأمورون بالسَّعي إلى الصَّلاة.

(روح المعاني: ۱۰۳/۲۸، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

سُئل عالم العُلماء بسمرقند: المؤذّنون كلّ واحد بعدالأذان في مواضع شتّى يشتغل بجواب الكلام الواحد؟ قال: يشتغل بجواب أذان المؤذّن الذي هو مؤذّن مسجد حيِّه فحسب، ولا يجب عليه إجابة أذانهم عند أذانه، وفي غيره إذا اشتغل بأمر نفسه فلا إثم عليه؛ لأنّه لايجب عليه إجابة أذانهم. (جواهر الفتاوی، مخطوطة، ق:۲۵/أ)

(۳) سعی الی الجمعہ کا مطلب یہ ہے کہ اذانِ اول کے بعد جمعے کی تیاری، اور جامع مسجد پہنچنے کے علاوہ کوئی بھی کام جائز نہیں، خواہ جمعے کی اذانِ ثانی اور خطبہ؛ اذانِ اول سے دس پندرہ منٹ کے بعد ہو یا آدھے، پون گھنٹے کے بعد؛ اس لیے جمعے کی مکمل تیاری کے بعد گھر میں یا مسجد سے متصل کسی حجرے میں قرآنِ پاک کی تلاوت کرنا، نفل نمازیں پڑھنا، یا ذکر واذکار وغیرہ میں لگنا جائز نہ ہوگا؛ البتہ آدمی مسجد پہنچ کر اذانِ ثانی اور خطبے سے پہلے تلاوتِ قرآن کریم وغیرہ میں مشغول رہے، تو اس میں کچھ حرج نہیں ہے، اور آیتِ کریمہ میں ذکر اللہ سے خطبہ یا نمازِ جمعہ مراد ہے؛ البتہ اس کے لیے اذانِ اول کے بعد ہی جامع مسجد پہنچنے کی کوشش کرنا، اور جمعے کی تیاری اور جامع مسجد کی طرف روانگی کے علاوہ کوئی کام نہ کرنا ضروری ہے۔

﴿وَذَرُوا البَيعَ﴾ أي: ....والأمر للوجوب، فيحرم كل ذلك؛ بل روى عطاء حُرمة اللّهو المباح، وأن يأتي الرَّجل أهله، وأن يكتب كتاباً أيضا. (روح المعاني: ۱۰۳/۲۸، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

قوله: (وترك البيع:) أراد به كلّ عمل ينافي السَّعي. (رد المحتار، كتاب الصلاة، باب الجمعة: ۳/ ۳۸، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

والنَّهيُ عن البيع وإن كان مخصوصاً بالذِّكر فليس المقصد فيه البيع دون غيره من الأمور الشَّاغلة عن الجمعة ......ونصَّ على البيع وعقل به أنّ ما دونه ممَّا يشغل عنها أولى بأن يكون منهياً عنه، كما قال اللّٰه عز وجل: ﴿فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ﴾، فاعلم أنّ هذا القدر من القول إذا كان محظوراً فما فوقه أولى بذلك. (شرح مختصر الطحاوي للجصاص، كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة: ۲/ ۱۱٤–۱۱٥، ط: شركة دار البشائر الإسلامية، بيروت)

الفُقهاء متَّفقون على تحريم أو كراهة كلّ ما يشغل عن السَّعي إلى الجمعة بعد النِّداء – على اختلافهم فيه – ويجب ترك كلُّ شيء يشغل عن السَّعي إليها، كإنشاء السّفر عند النِّداء والأكل والخياطة والصّناعات كلّها، كالمساومة والمناداة والكتابة، وكذا الاشتغال بالعبادة، وكذا المكث في بيته بعياله أو غيرهم، ولو كان منزله بباب المسجد أو قريباً منه؛ بل يجب عليه المبادرة إلى الجامع عملاً بالآية. (الموسوعة الفقهية: ۹/۲۲۹)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۱۵ھ = ۲۰۱۷/۳/۱۵ء چہار شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۶۱۱ /تتمہ/ن، ۶۱۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

ثنا میں ”وجلّ ثناؤك“ کا اضافہ کرنا کیسا ہے؟

سوال: بہ خدمت مفتیانِ کرام، زیدت معالیکم، دارالعلوم دیوبند!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ثنا میں ”وَجَلَّ ثَنَاؤُك“ کا اضافہ؛ کیا مذاہبِ اربعہ کے متقدمین فقہاء میں سے کسی سے اِس کی سنیت یا استحباب یا استحسان وغیرہ ثابت ہے، یا صرف متاخرین فقہاء میں سے کسی نے ذکر فرمایا ہے؟ بہ راہِ کرم ذرا تفصیل سے بتا کر ہمیں نوازیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے بعد جو ثنا (دعائے استفتاح) پڑھی جاتی ہے، مشہور روایات میں اُس کے جو الفاظ آئے ہیں، اُن میں ” وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ“ نہیں ہے؛ البتہ بعض روایات میں ” وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ“ کا اضافہ آیا ہے۔ (فتح القدیر: ۱/۲۰۳، مطبوعہ: مصر، غنیۃ المتملی، ص: ۳۰۲، مطبوعہ: مکتبہ اشرفیہ، دیوبند)

موصلی نے الاختیار (۱/۱۶۵) میں امام محمدؒ کے حوالے سے بھی یہ اضافہ نقل فرمایا ہے۔

بعض فقہاء (جیسے: صاحبِ ہدایہ وغیرہ) نے فرمایا کہ فرض نمازوں میں یہ اضافہ شامل نہ کرے، دیگر نمازوں میں، جیسے: نمازِ تہجد اور نمازِ جنازہ وغیرہ میں پڑھ سکتے ہیں۔

بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی کسی بھی نماز میں اس کا اضافہ کرے، تو اسے منع نہیں کیا جائے گا، اور اگر کوئی نہ پڑھے، تو اُسے پڑھنے کا حکم بھی نہیں دیا جائے گا۔

علامہ حلبیؒ اور علامہ حصکفیؒ نے فرمایا کہ نمازِ جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں "وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ" کا ترک اولی ہے۔ (درمختار مع شامی:۲/۱۸۹، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند، درمنتقی مع مجمع الانہر:۱/۱۴۱، مطبوعہ: دارالکتب العلمیۃ، بیروت)
یعنی: نمازِ جنازہ میں اس کا پڑھنا اولی ہے۔

صاحب البحر الرائق (۱/۵۴۱، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند) نے فرمایا کہ خاص دعائے استفتاح میں اس کا اضافہ کسی روایت میں نہیں آیا؛ اس لیے مروی [منقول] کی حفاظت کے مدنظر کسی بھی نماز میں اس کا نہ پڑھنا اولی ہے۔

اور علمائے دیوبند نے عام طور پر اپنے فتاوی میں؛ دعائے استفتاح میں "وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ" کا اضافہ ذکر نہیں فرمایا ہے، صرف مشہور الفاظ ذکر فرمائے ہیں؛ البتہ مولانا عبدالشکور صاحب نے عمدۃ الفقہ میں فرمایا کہ نمازِ جنازہ میں "وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ" کا اضافہ اولی ہے۔

پس خلاصہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں "وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ" کا ثبوت ہے؛ اس لیے پڑھنے اور نہ پڑھنے دونوں کی گنجائش ہے، کسی پر نکیر کرنے کی ضرورت نہیں؛ البتہ فرض نمازوں میں نہ پڑھے، بہتر یہی ہے۔

اور رہا متقدمین کا حوالہ؛ تو نمازِ جنازہ کے باب میں؛ احادیث میں پہلی تکبیر کے بعد حمد کا ذکر آیا ہے، اور ظاہر الروایہ میں بھی حمد کا ذکر آیا ہے، اور بہت سے فقہاء نے حمد کا مصداق ثنا (دعائے استفتاح) کو قرار دیا ہے؛ اس لیے متقدمین سے خاص طور پر نمازِ جنازہ کی دعائے استفتاح میں "وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ" کے اضافے کے متعلق کوئی صراحت مجھے نہیں ملی؛ البتہ متاخرین میں سے اکثر نے دعائے استفتاح کے مشہور الفاظ ہی پر اکتفا کیا ہے، اور بعض نے اس میں "وَجَلَّ ثَنَاؤُكَ" کا اضافہ؛ بہتر قرار دیا ہے۔

وقوله: وجلّ ثناؤك، لم يذكر في المشاهير، فلا يأتي به في الفرائض. (الهداية مع الفتح، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة: ١/ ٢٠٣، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر)

قوله: (لم يذكر في المشاهير:) وإن كان روي في الجملة عن ابن عبّاس في حديث طويل من قوله، ذكره ابن أبي شيبة وابن مردويه في كتاب الدُّعاء له، ورواه الحافظ أبو شُجاع في كتاب الفردوس عن ابن مسعود رضي اللّٰه عنه: إنّ من أحبِّ

الكلام إلى اللّٰه عزّوجلّ أن يقُول العبد: سبحانك اللّٰهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدُّك وجل ثناؤك ولا إله غيرك، وأبغض الكلام إلى اللّٰه أن يقُول الرّجل للرجل: اتَّق اللّٰه، فيقول: عليك نفسك. (فتح القدير)

(وإن زاد) في دُعاء الاستفتاح بعد قوله: ''وتعالى جدُّك'' لفظ: ''وجلَّ ثناؤك'' لايمنع من زيادته، (وإن سكت عنه لا يؤمر به)؛ لأنه لم يذكر في المشاهير، وقد روي عن ابن عبّاس من قوله في حديث، ذكره ابن أبي شيبة وابن مردويه في كتاب الدُّعاء، ورواه الحافظ ابن شُجاع في كتاب الفردوس عن ابن مسعود رضي اللّٰه عنه: إنّ من أحبِّ الكلام إلى اللّٰه عزوجل أن يقُول العبد: سبحانك اللّٰهم وبحمدك وتبارك اسمُك و تعالى جدُّك وجلّ ثناؤك ولا اله غيرك، وأبغض الكلام إلى اللّٰه تعالى أن يقُول الرّجل للرجل: اتَّق اللّٰه، فيقُول: عليك نفسك. (غنية المتملي، صفة الصلاة، ص: ۳۰۲، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

قال: (ويقُول: سبحانك اللّٰهم إلى آخره) وزاد محمَّد: وجلّ ثناؤك. (الاختيار لتعليل المختار، كتاب الصلاة، باب الأفعال في الصلاة: ۱/ ۱٦٥، ت: شعيب الأنؤوط، ط: دار الرسالة العالمية)

(وقرأ) كما كبّر (سبحانك اللّٰهم) تاركاً وجلّ ثناؤك؛ إلا في الجنازة. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة: ۲/ ۱۸۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۳/ ۲۸٦ – ۲۸۷، ت: الفرفور، ط: دمشق)

قوله: (تاركاً الخ:) هو ظاهر الرِّواية. بدائع؛ لأنَّه لم ينقل في المشاهير. كافي. فالأولى تركه في كل صلاة محافظة على المروي بلا زيادة، وإن كان ثناء على اللّٰه تعالى. بحر وحلبة. وفيه إشارةٌ إلى أنّ قوله في الهداية: لا يأتي به في الفرائض، لا مفهوم له؛ لكن قال صاحب الهداية في كتابه: مختارات النَّوازل: وقوله: وجلّ ثناؤك، لم ينقل في المشاهير، وما روي فيه فهو في صلاة التَّهجُّد اهـ. قوله: (إلا في الجنازة:) ذكره في شرح المنية الصّغير، ولم يعزه إلى أحد، ولم أر ه لغيره سوى ما قدّمناه عن الهداية ومختارات النَّوازل. (رد المحتار)

والأولى ترك ''وجلّ ثناؤك''؛ إلا في صلاة الجنازة، قاله المصنّف. (الدر المنتقى مع مجمع الأنهر، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة: ۱/۱٤۱، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

وفي منية المصلّي: وإذا زاد "وجلّ ثناؤك" لا يمنع، وإن سكت لا يؤمر به. وفي الكافي: إنّه لم ينقل في المشاهير، وفي البدائع: إنّ ظاهر الرّواية الاقتصار على المشهور، فالحاصلُ أنّ الأولى تركه في كلّ صلاة نظراً إلى المُحافظة على المروي من غير زيادة عليه في خُصوص هذا المحلّ، وإن كان ثناءً على الله تعالى. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة: ۱/ ۵۴۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۲/۲۷ھ = ۲۰۱۶/۱۱/۲۸ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۱۵۰/ تتمہ/ن، ۴۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

کرسی پر نماز سے متعلق بعض اہم مسائل

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ مسجد میں نماز کرسی پر بیٹھ کر پڑھنا کیسا ہے:

(۱) ایک شخص ظاہراً صحیح وسالم وتندرست ہے، چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا ٹھیک ہے؛ لیکن مسجد میں کرسی صف میں رکھ کر نماز باجماعت پڑھتا ہے، حالاں کہ نماز نیچے زمین پر بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے، تو کیا مسجد میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا درست ہے؟

(۲) کیا بلاضرورت کرسیاں مساجد میں لانے سے اغیار کی عبادت گاہوں سے مشابہت لازم نہیں آتی؟

(۳) کیا یہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے؟

(۴) اور آج کل مساجد میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا ایک رواج بنتا جارہا ہے، تو اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟

(۵) ایک صاحب نے کہا کہ نماز میں قیام فرض ہے، اور نیت کھڑے ہوکر باندھنی چاہیے، بعد میں رکوع سجدہ وغیرہ معذورین بیٹھ کر اشارے سے کرلیں، تو بعض تو کھڑے ہوکر نیت باندھتے ہیں، جب امام رکوع کرتا ہے، تو یہ نیچے زمین پر بیٹھ کر اشارے سے رکوع سجدہ وغیرہ کرتے ہیں، اور بعض صف میں کرسی رکھ کر، اور خود صف سے ایک ڈیڑھ فٹ کرسی کے آگے کھڑے ہوکر نیت باندھ لیتے ہیں،

اور وہ صف سے آگے ہی نکلے رہتے ہیں، جب امام رکوع کرتا ہے، تو یہ اپنے پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے رکوع کرتے ہیں، رکوع میں اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیتے ہیں، اور جب کرسی پر بیٹھے بیٹھے اشارے سے سجدہ کرتے ہیں، تو اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں سے ڈیڑھ بالشت آگے بڑھا کر؛ یعنی: کلائی کا جو موٹا حصہ ہے اس کو گھٹنوں پر رکھ کر، اور ہاتھ آگے بڑھا کر سجدہ کرتے ہیں، تو کیا اُن کا یہ فعل درست ہے؟

(۶) اور جو معذور ہیں، کیا اُن کے لیے بھی قیام اور کھڑے ہو کر نیت باندھنا ضروری ہے؟

(۷) اور کیا یہ کرسی پیچھے رکھ کر صف سے آگے نکل کر نیت باندھنے والے **سوُّوا صفوفکم** اور **تسویۃ الصُّفوف** سے خارج ہیں؟

برائے کرم ان امور سے متعلق شرعی حکم بالتفصیل بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جو شخص کسی طرح بھی زمین پر بیٹھ کر رکوع، سجدے کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے، اُس کے لیے کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں، یعنی: اُس کی نماز نہیں ہوگی؛ کیوں کہ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے والا؛ چوں کہ حقیقت میں سجدہ نہیں کرتا؛ بل کہ سجدے کے لیے کرسی پر بیٹھ کر صرف اشارہ کرتا ہے، اور اشارے سے سجدہ صرف اس شخص کے لیے جائز ہوتا ہے، جو کسی طرح بھی حقیقی سجدے پر قادر نہ ہو؛ اس لیے جو معذور حضرات کسی طرح بھی حقیقی سجدہ کر سکتے ہیں، اُن کے لیے کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

البتہ جو لوگ کسی طرح بھی زمین پر بیٹھ کر حقیقی سجدہ نہیں کر سکتے، وہ کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے رکوع سجدہ کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اور اگر اس طرح کے لوگ زمین پر بیٹھ کر اشارہ کر سکتے ہوں، تو اُن کے لیے زمین پر بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا افضل ہوگا۔

(وإن تعذَّرا) لیس تعذُّرهما شرطاً؛ بل تعذُّر السُّجود كافٍ (لاالقیام، أومأ)........(قاعداً). (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض: ۲/۵۶۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۴/۵۳۴-۵۳۵، ت: الفرفور، ط: دمشق)

مستفاد: وهو– أي: الإيماء قاعداً – أفضلُ من الإيماء قائماً؛ لقُربه من الأرض .
(الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض: ٢/٥٦٨، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ٤/ ٥٣٦، ت: الفرفور، ط: دمشق) قوله: (لقُربه من الأرض) أي: فيكون أشبه بالسُّجود. منح. (ردالمحتار)

(۲) بلاضرورت کرسیاں مساجد میں لانا، اور اُن کی کثرت کرنا؛ امرِ منکر ہے، اس سے احتراز چاہیے، اورضرورت کی صورت میں ضرورت کی حد تک کرسیوں کا نظم مجبوری ہے۔

(۳) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں وہ اعذار نہ تھے، یا اُن کی کثرت نہ تھی، جو دورِ حاضر میں بہ کثرت پائے جاتے ہیں؛ اس لیے آثارِ صحابہؓ میں مساجد میں نماز کے لیے کرسیاں لانے، یا ان کے انتظام کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا؛ البتہ خطبے کے لیے کرسی کا استعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جیسا کہ صحیح مسلم شریف (مع شرح النووي، كتاب الجمعة، باب التعليم في الخطبة: ٦/١٦٥، ط: المطبعة المصرية بالأزهر) اور نسائی شریف (كتاب الزينة، باب الجلوس على الكراسي: ٨/٢٢٠، ط: مكتب المطبوعات الإسلامية بحلب) میں ہے۔

اور فتح الملہم (٥/٣٦٠، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان) میں ہے: وقال عياض: فيه الجُلُوس على الكرسيِّ، ولاسيَّما في مثل هذا، وجُلُوسه عليه؛ ليسمع غيره وليتمكن من مسألته اهـ.

(۴) ضرورت کی چیز ضرورت کی حد تک رکھنا چاہیے، اس سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے، اصولِ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: الضَّرورةُ تتقدَّر بقدر الضَّرورة.

(۵) جن معذورین کے لیے اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہو، اُنھیں سجدے کے اشارے کے لیے گھٹنوں سے ڈیڑھ بالشت آگے ہاتھ بڑھانے کی ضرورت نہیں، صرف اشارہ کافی ہے؛ البتہ سجدے کے اشارے میں رکوع سے کچھ زیادہ جھکا جائے گا۔

(ويجعل سجُوده أخفض من ركوعه) لُزوماً. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب صلاة المريض: ٢/٥٦٨، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ٤/٥٣٦، ت: الفرفور، ط: دمشق) قوله: (ويجعل سجُوده أخفض إلخ:) أشار إلى أنّه يكفيه أدنى الانحناء عن الرُّكوع، وأنّه لايلزمه تقريب جبهته من الأرض بأقصى مايمكنه، كما بسطه في البحر عن الزَّاهدي. (ردالمحتار)

(۲) جو لوگ حقیقی سجدے سے عاجز ہوں، اور اُن کے لیے اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہو، اُن سے قیام کا حکم بھی ساقط ہوجاتا ہے؛ اگرچہ وہ قیام پر قادر ہوں؛ لہٰذا اس طرح کے معذورین کو نیت باندھنے یا قراءت کرنے کے لیے قیام کرنے کی ضرورت نہیں، وہ شروع ہی سے کرسی یا زمین پر بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھ سکتے ہیں، احناف کے نزدیک راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے، جیسا کہ متعدد کتبِ فقہ میں آیا ہے۔

چند حوالہ جات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

الف: قلتُ: فإن صلّٰی وکان یستطیع أن یقوم ولا یستطیع أن یسجد؟ قال: یصلّي قاعداً یؤمي إیماء. قلتُ: فإن صلّٰی قائماً یؤمي إیماءً؟ قال: یجزیه. (کتاب الأصل المعروف بالمبسوط للشیباني، کتاب الطهارة والصلاة، باب صلاة المریض في الفریضة: ۱/ ۲۰۷، ط:عالم الکتب)

ب: وأمَّا إذا کان قادراً علی القیام وعاجزاً عن الرّکوع والسُّجود فإنّه یصلّي قاعداً بإیماءٍ وسقط عنه القیام؛ لأنّ هذا القیام لیس برکن؛ لأنّ القیام إنَّما شرع لافتتاح الرکوع والسجود به، فکل قیام لا یعقبه سجود لا یکون رکناً؛ ولأنّ الإیماء إنّما شرع للتَّشبُّه بمن یرکع ویسجد، والتَّشبُّه بالقُعود أکثر؛ ولهذا قُلنا بأنّ المؤمئ یجعل السُّجُود أخفض من رکوعه؛ لأنّ ذلك أشبه بالسُّجُود؛ إلا أنّ بشراً یقُول: إنَّما سقط عنه بالمرض ما کان عاجزاً عن إتیانه، فأمّا فیما هو قادرٌ علیه لا یسقط عنه، ولکنّ الانفصال عنه علی ما بیَّنا. (المبسوط للسرخسي، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض: ۱/ ۲۱۳، ط: دار المعرفة، بیروت، لبنان)

ج: قال: (فإن عجز عن الرُّکوع والسُّجُود وقَدَر علی القیام أومأ قاعداً)؛ لأنّ فرضیَّة القیام لأجل الرُّکوع والسُّجود؛ لأنّ نهایة الخُشُوع والخُضُوع فیهما؛ ولهذا شرع السُّجود بدون القیام کسجدة التِّلاوة والسَّهو، ولم یشرع القیام وحده، وإذا سقط ما هو الأصل في شرعیَّة القیام سقط القیام، ولو صلّٰی قائماً مؤمیاً جاز، والأوَّل أفضل؛ لأنّه أشبه بالسُّجود. (الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الصلاة، باب صلاة المریض: ۱/ ۱۰۳، ط: دار الرسالة العالمیة)

د: قوله: (فلو قدر علیه) أي: علی القیام وحده أو مع الرُّکوع، کما في المنیة، قوله: (ندب إیماؤه قاعداً) أي: لقُربه من السُّجود، وجاز إیماؤه قائماً، کما في البحر، وأوجب الثَّانيَ زفر والأئمّة الثّلاثة؛ لأنّ القیام رکنٌ، فلا یترك مع القُدرة علیه. ولنا أنّ القیام

وسيلةٌ إلى السُّجود للخُرور، والسُّجود أصلٌ؛ لأنَّه شرع عبادة بلا قيام كسجدة التِّلاوة، والقيامُ لم يشرع عبادة وحده، حتّٰى لو سجد لغير اللّٰه تعالى يكفر به، بخلاف القيام. وإذا عجز عن الأصل سقطت الوسيلةُ، كالوُضوءِ مع الصَّلاة والسَّعي مع الجمعة. وما أورده ابن الهُمام أجاب عنه في شرح المنية إلخ. (رد المحتار، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، بحث القيام: ۱۳۲/۲، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۱۵۳/۳، ت: الفرفور، ط: دمشق)

(۷) اس کا جواب اوپر نمبر ۶ میں آ گیا کہ جو شخص رکوع سجدے سے عاجز ہو، اُس سے قیام بھی ساقط ہوجاتا ہے؛ اگرچہ وہ قیام پر قادر ہو؛ پس معذور شخص کو نیت باندھنے کے لیے کرسی کے آگے کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۱ھ = ۲۰۱۷/۲/۱۹ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۴۷/تتمہ/ن، ۴۶۵/ن، ۱۴۳۸ھ)

مسجد میں اسپنج والے قالین پر نماز کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

ہمارے شہر اسلام پور مرکز میں چٹائی کے ساتھ اسپنج والے قالین (گالیچے) بچھائے گئے ہیں؛ جو نرم ہیں، سجدہ کرتے وقت پیشانی دبتی رہتی ہے، زمین کی سختی کا احساس نہیں ہوتا ہے، جو سجدے کے صحیح ہونے کی شرط ہے، کیا اس طرح مسجد میں ایسے قالین بچھا سکتے ہیں؟ کیا ہماری نمازیں صحیح ہوجائیں گی؟ اگر نمازیں صحیح نہیں ہوتی ہوں، تو اس کو نکالنا ضروری ہے؟ یا کچھ گنجایش بھی ہے؟ بہ حوالہ مدلل جواب سے نوازیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: قالین وغیرہ پر سجدہ کرنے کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر اُس پر سجدہ کرتے وقت؛ پیشانی کسی ایک جگہ پر جم جاتی ہے، اور پیشانی میں مکمل ٹھہراو اور سکون پیدا ہو جاتا ہے، خواہ تھوڑا دباو کے ذریعے ٹھہراو حاصل ہو، تو ایسی قالین پر سجدہ کرنا جائز ہے، اس پر سجدہ ادا ہوجاتا ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر قالین ایسی ہی ہے،

تو اس پر سجدہ کرنا صحیح ہوجائے گا، اور نماز درست ہوجائے گی، اور اگر سجدہ کرتے وقت تھوڑے دباو کے باوجود؛ پیشانی کسی ایک جگہ جمتی نہیں ہے، تو ایسی قالین پر سجدہ ادا نہیں ہوگا۔

قال الحصكفي: وشرط سجُود فالقرار لجبهة ...... قال ابنُ عابدين: قوله: (فالقرار لجبهة) أي: يفترض أن يسجُد على ما يجد حجمه بحيث إنّ السَّاجد لو بالغ لايتسفَّل رأسُه أبلغ ممَّا كان عليه حال الوضع، فلا يصحُّ على نحو الأرُزّ والذّرة؛ إلا أن يكون في نحو جوالق، ولا على نحو القُطن والثّلج والفرش؛ إلا إن وجد حجم الأرض بكبسِه. (الدر المختار مع رد المحتار: ۱/ ٤٥٤، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، ط:دار الفكر، بيروت)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۰/۲۳ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی

(۱۰۵۰/تتمہ/ص، ۱۱۳۳/ص، ۱۴۳۸ھ)

حالتِ کفر میں جماع کیا پھر اسلام لے آیا اور صرف وضو کر کے نماز پڑھ لی تو کیا حکم ہے؟

سوال: اگر کوئی کافر ہونے کی حالت میں اپنی بیوی سے مجامعت کرتا ہے، پھر غسل کرنے سے پہلے مسلمان ہوگیا، اور نماز کا وقت آ گیا، وضو کر کے نماز پڑھ لی، تو کیا اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

نوٹ: ''حیاۃ الفقہ'' نامی کتاب میں درست کہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: یہ مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ بعض کے نزدیک غسل واجب ہوگا، اور بعض کہتے ہیں کہ غسل واجب نہ ہوگا؛ لیکن راجح یہ ہے کہ غسل واجب ہوگا، ''حیاۃ الفقہ'' میں جو قول لیا گیا ہے، وہ مرجوح ہے۔

محیط برہانی میں ہے: **والكافر إذا أجنب ثم أسلم ففي وجُوب الغُسل عليه اختلاف المشائخ، قال بعضُهم: يجب، وإليه أشار محمَّد رحمه الله في السِّير الكبير إلخ.**

(محيط برهاني: ۱/ ۸۳، ط: بيروت)

اور کبیری میں ہے: **لو أسلمت وهي حائضٌ ثم طهرت يجب عليها الغُسل، ولو انقطع ثم أسلمت لايجب؛ لأنّ الانقطاع ليس صفة باقية فلم يوجد شرط الوجوب حال التَّكليف، بخلاف ما إذا أحدث أو أجنب ثم أسلم حيث يجب عليه الوضُوء والغُسل؛ لأنّ الحدث والجنابة صفتان باقيتان وقت التَّكليف بعد الإسلام إلخ.** (حلبي كبيري، ص: ۴۲، ط:سهيل، نیز دیکھیں: ص: ۵۶) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفر لہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۵ھ، یک شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی-محمد نعمان سیتاپوری غفر لہٗ

(۳۷ رتتمہ رس، ۴۵ رس، ۱۴۳۸ھ)

نئے کپڑے بغیر دھوئے پہننا اور اُن میں نماز کا حکم

سوال: کیا ہم نئے کپڑوں کو دھوئے بغیر پہن سکتے ہیں، اور نماز پڑھ سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق: نئے کپڑے عام طور پر پاک ہوتے ہیں؛ اس لیے اگر بہ ظاہر ان میں کوئی ناپاکی نہ ہو، تو دھوئے بغیر پہن سکتے ہیں، اور ان میں نماز بھی درست ہے، محض شک شبہے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

ولو شكَّ في نجاسة ماءٍ أو ثوب – إلى قوله – لم يعتبر. (الدرالمختار مع رد المحتار، كتاب الطهارة، قبيل بيان فرض الغسل: ۱/۲۸۳، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

قوله:(ولوشكَّ إلخ) في التاترخانية: من شكَّ في إنائه أو ثوبه أو بدنه أصابته نجاسةٌ أو لا؟ فهو طاهرٌ ما لم يستيقن، وكذا الآبار والحياض و الحباب الموضوعة في الطُّرقات ويستقي منها الصّغار والكبار والمسلمون والكفّار، وكذا مايتّخذه أهل الشِّرك أو الجهلة من المُسلمين كالسّمن والخبز والأطعمة والثياب.اهـ. ملخصًا. (ردالمحتار: ۱/۲۸۳-۲۸۴) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفر لہٗ ۱۴۳۸/۲/۴ھ = ۲۰۱۶/۱۱/۵ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفر لہٗ بلندشہری-محمد مصعب عفی عنہ

(۹۰ رن، ۱۲۰ رن، ۱۴۳۸ھ)

بغیر ٹوپی پہنے نماز پڑھنے کا حکم

سوال: میں سورت گجرات سے ہوں، اور حنفی مسلک پر عمل کرتا ہوں، میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ہم بغیر ٹوپی کے نماز پڑھ سکتے ہیں؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: ٹوپی پہننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام سے ثابت ہے، ترمذی شریف کی روایت ہے:

عن أبي كبشة قال: كان كمام أصحاب رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم بُطحا، رواه التِّرمذي، كمام جمع كمة: هي القلنسُوة المُدوّرة، بطحاً: أي مبسوطةً على رؤوسهم ولازقةً على رؤوسهم غير مرتفعة. (مرقاة) **وعن ركانة عن النبي صلى اللّٰه عليه وسلّم قال: فرق ما بيننا وبين المُشركين العمائم على القلانس، رواه التِّرمذي.** (مشكاة، ص: ٣٧٤)

پہلی روایت سے صحابۂ کرام کی جماعت کا ٹوپی پہننا ثابت ہوا، اور دوسری روایت سے معلوم ہوا کہ عمامے کے باوجود؛ نیچے ٹوپی پہننا مسلمانوں کا شعار ہے، جب عام حالات میں ٹوپی پہننا ثابت ہوا، تو نماز میں بہ درجۂ اولیٰ؛ اسی لیے فقہاء نے سر ڈھک کر نماز پڑھنے کو نماز کے آداب میں سے لکھا ہے، اگر احیاناً کبھی بھول ہو جائے، یا کسی اور ضرورت کی بنا پر ننگے سر نماز پڑھ لے، تو مضائقہ نہیں؛ لیکن کسل مندی سے اس کا ترک کرنا مکروہ ہے۔

قال في الدّر: وكره ...... وصلاتُه حاسرًا، أي: كاشفًا رأسه للتّكاسل، ولا بأس به للتّذلل، وأمّا للإهانة فكفرٌ. (شامي: ٤٧٤/١) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱۰/۲۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۳۱۵/ل، ۱۲۱۸/ل، ۱۴۳۸ھ)

آدھے بازو کی بنیان یا شرٹ یا ٹخنے سے نیچے پاجاما لٹکا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال: (۱) آدھے بازو کی بنیان یا شرٹ سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

(۲) نیز کوئی ٹخنے کھولے بغیر نماز پڑھ لے تو کیا نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق :(۱) آدھی بازو والی بنیان پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ یہ کفِ ثوب (کپڑا اسمیٹنا) میں داخل ہے، جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔

عن ابن عبّاس عن النّبي صلی اللّٰه علیه وسلّم قال: أمرتُ أن أسجد علی سبعة أعظم، ولا أکفّ ثوباً ولا شعراً. (الصحیح لمسلم، کتاب الصلاة، باب أعضاء السجود والنهي عن کف الشعر والثوب وعقص الرأس في الصلاة: ۱/۱۹۳، ط: المکتبة الأشرفیة، دیوبند)

(و) کره (کفّه) أي: رفعه ولو لتراب کمشمّر کمّ أو ذیل. (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الصلاة، باب ما یفسد الصلاة وما یکره فیها: ۲/۴۰۶، ط: مکتبة زکریا، دیوبند، ۴/۱۳۷، ت: الفرفور، ط: دمشق) **قولُه:(کمشمّر کمّ أو ذیل:) أي: کما لو دخل في الصّلاة وهو مشمّر کمّه أو ذیله، وأشار بذلك إلی أنّ الکراهة لا تختصُّ بالکفّ وهو في الصّلاة، کما أفاده في شرح المنیة.** (رد المحتار)

ولو صلّی رافعاً کمَّیه إلی المرفقین کره، کذا في فتاوی قاضي خان. (الفتاوی الهندیة، کتاب الصلاة، الباب السابع فیما یفسد الصلاة وما یکره فیها، الفصل الثاني فیما یکره في الصلاة وما لا یکره: ۱/۱۰۶، ط:المطبعة الکبری الأمیریة، بولاق، مصر)

(۲) ہر مسلمان مرد کو ایسا لباس پہننا چاہیے، جس میں اوپر سے آنے والے لباس سے ٹخنے نہ ڈھکیں، یعنی: کرتا، پاجاما اور لنگی وغیرہ ٹخنے سے اوپر رہے، ٹخنے سے نیچے نہ ہو؛ کیوں کہ کرتا یا پاجاما وغیرہ ٹخنے سے نیچے لٹکانا ناجائز اور گناہِ کبیرہ ہے، متعدد احادیث میں اس پر وعید آئی ہے۔

اور اگر کسی کا پاجاما وغیرہ ٹخنے سے نیچے ہو، تو کم از کم اُسے نماز میں ضرور اونچا کر لینا چاہیے، خواہ پائینچے موڑ کر یا نیفے کے پاس کپڑے کا کچھ حصہ موڑ کر؛ تا کہ نماز ناقص نہ ہو، اور مکمل ثواب حاصل ہو، اور اگر کسی نے نماز کی حالت میں بھی پاجاما یا لنگی وغیرہ ٹخنے سے نیچے رکھی، تو کراہت کے ساتھ نماز ادا ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری-محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

چست اور تصویر بنے ہوئے کپڑے پہننا اور ان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال: اگر لڑکا اِسکن ٹائٹ کپڑے پہنے ہو، یا کپڑے میں جان دار کی تصویر بنی ہو، تو کیا یہ حرام ہے؟ ایسی صورت میں نماز ہوگی یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایسا تنگ وچست لباس پہننا، جس سے اعضائے مستورہ جیسے: سرین کی ساخت نظر آئے؛ ناجائز ہے، اور جان دار کی تصویر والا لباس بھی ممنوع ہے، اور دونوں صورتوں میں نماز مکروہ ہوگی۔

إنّ رؤية الثّوب بحيث يصف حجم العضو ممنوعةٌ؛ ولو كثيفًا لا ترى البشرة منه ...... وعلى هذا لا يحل النّظر إلى عورة غيره فوق ثوب ملتزق بها يصف حجمها .

(رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس: ٩/٥٢٦، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

و-كره - لبس ثوب فيه تماثيلُ ذي روح إلخ. (المصدر السابق، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها: ٢/٤١٦)

والتِّمثالُ خاصٌّ بمثال ذي الرُّوح...... قال في البحر: وفي الخلاصة: وتكره التَّصاوير على الثَّوب، صُلِّي فيه أو لا، انتهى، وهذه الكراهةُ تحريميَّةٌ. (رد المحتار: ٢/٤١٦). فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۵/تتمہ/ن، ۴۰۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

لپ اسٹک لگا کر عورت کا وضو اور نماز پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: عورت کے ہونٹ میں لپ اسٹک لگی ہو، تو کیا اس سے اس کی نماز ہو جائے گی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر لپ اسٹک میں کوئی ناپاک مادہ نہ ہو، نیز وہ کھال تک

پانی پہنچنے میں مانع نہ ہو، تو اس کے ساتھ وضو اور نماز دونوں درست ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۵/تتمہ/ن، ۴۰۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

ناخون اور بغل وغیرہ کے بال چالیس دن سے زیادہ چھوڑے رکھنا اور اس حالت میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: اگر بغل کے بال یا موئے زیر ناف چالیس دن سے زیادہ ہونے پر صاف نہیں کیا، تو کیا یہ حرام ہے؟ ایسے میں نماز ہو جائے گی؟ اور اسی طرح ناخون بھی خوب بڑھا رکھے ہیں؛ کاٹتے نہیں، تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر بغل کے بال یا موئے زیر ناف وغیرہ کی صفائی پر چالیس دن گذر گئے، اور آدمی نے صفائی نہیں کی، تو اس کا یہ عمل ناجائز ہے، اور ایسا شخص گنہ گار ہوتا ہے، اور اس کی نماز بھی مکروہ ہوتی ہے؛ اس لیے چالیس دن سے پہلے ضرور بالضرور ان چیزوں کی صفائی کر لینی چاہیے۔

قوله: (وكره تركه:)أي: تحريماً لقول المُجتبى: ولا عذر فيما وراء الأربعين، ويستحقّ الوعيد. اهـ، وفي أبي السّعود عن شرح المشارق لابن ملك: روى مسلمٌ عن أنس بن مالك رضي الله عنه: وقّت لنا في تقليم الأظفار وقصّ الشّارب ونتف الإبط أن لا نترك أكثر من أربعين ليلة، وهو من المقدّرات التي ليس للرّأي فيها مدخلٌ، فيكون كالمرفوع. اهـ. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع وغيره: ۵۸۳/۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۵/تتمہ/ن، ۴۰۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

کیا بالوں میں کلر کروانے کے بعد نماز ہو جاتی ہے؟

سوال: اگر بالوں میں برابر ہیئر کلر (بالوں کو رنگنا) کرواتے ہیں، تو کیا ایسے میں نماز درست ہوگی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اگر بالوں میں صرف رنگ چڑھتا ہو، کوئی ایسی پرت یا تہ نہ جمتی ہو، جو پانی پہنچنے میں رکاوٹ ہو، تو ایسے کلر کے ساتھ وضو ہو جائے گا، اور نماز بھی؛ البتہ سفید بالوں میں سیاہ خضاب ناجائز ہے، اور کالے بالوں میں مختلف فیشنی کلر منع ہیں؛ کیوں کہ یہ فیشن پرستوں یا غیروں کی نقالی ہے، دین دار مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیے۔

قال اللّكنوي في التّعليق الممجّد (باب الخضاب، ص: ۳۹۲) **: وأمّا الخضاب بالسّواد الخالص فغير جائز، كما أخرجه أبوداؤد والنّسائي وابن حبّان والحاكم وقال: صحيح الإسناد، عن ابن عبّاس رضي اللّٰه عنهما مرفوعا: يكون قوم يخضبون في آخر الزّمان بالسّواد كحواصل الحمام لايريحون رائحة الجنّة .... ومن ثمّ عدّ ابن حجر المكّي في الزّواجر الخضابَ بالسّواد من الكبائر، ويؤيّده ما أخرجه الطَّبراني عن أبي الدّرداء رضي اللّٰه عنه مرفوعا: من خضب بالسّواد سوّد اللّٰه وجهه يوم القيامة ......اهـ.**

وقال السّهارنفوري في بذل المجهود (باب ماجاء في خضاب السواد: ۹۹/۱۷، ط: دارالكتب العلمية، بيروت) **في شرح الحديث المذكور أعلاه فيما نقلناه عن التّعليق الممجّد: وفي الحديث تهديدٌ شديدٌ في خضاب الشّعر بالسّواد، وهو مكروهٌ كراهة تحريم. اهـ.**

وفي العرف الشّذي (باب ماجاء في الخضاب: ۲۵۸/۳) **: الخضاب في اللُّغة: اللَّون، ولايجب أن يكون سواداً، وفي الحديث النّهيُ الشَّديدُ عن الخضاب الأسود الذي لايميّز به بين ا لشَّيخ والشَّابّ. اهـ، ويكره – الخضاب – بالسَّواد، وقيل: لا.**

ومرّ في الحظر (الدر المختار مع رد المحتار، مسائل شتى: ۴۸۷/۱۰، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **وفي الرد: قال الحموي: وهذا في حقِّ غير الغُزاة، ولا يحرم في حقِّهم للإرهاب، ولعلّه محملُ من فعل ذلك من الصَّحابة. ط. اهـ.**

نیز احسن الفتاویٰ (۳۵۶/۸-۳۵۷) فتاویٰ رشیدیہ (ص:۴۸۹) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (۲۳۹/۱۶-۲۴۵) اور امداد الفتاویٰ (۲۱۸/۴) وغیرہ دیکھیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۵/تتمہ/ن، ۴۰۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

فجر اور عصر کی نماز کے بعد امام کس رخ کی جانب بیٹھے؟

سوال: ہمارے یہاں کے امام صاحب؛ فجر اور عصر کے بعد صرف دائیں طرف مڑ کر بیٹھتے ہیں، بائیں طرف کبھی نہیں مڑتے، اُن کا یہ عمل کیسا ہے؟ کیا اس سے اُن کو گناہ ہوگا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: امام فجر اور عصر میں سلام پھیرنے کے بعد؛ اوراد و وظائف کے لیے دائیں جانب چہرہ کرکے بھی بیٹھ سکتا ہے، اور بائیں جانب بھی، اور اگر سامنے کوئی (مسبوق) نمازی نہ ہو، تو مقتدیوں کی جانب چہرہ کرکے بھی بیٹھ سکتا ہے، اور یہ تینوں طریقے درست ہیں، اور ان میں سے کوئی طریقہ لازم وضروری نہیں ہے، حسبِ سہولت جس پر چاہے عمل کرسکتا ہے؛ البتہ دائیں جانب چہرہ کرکے بیٹھنا بہتر ہے؛ لیکن اس کو لازم وضروری نہ سمجھے، اور نہ ہی عملی طور پر اس کا التزام کرے؛ بل کہ گاہے گاہے بائیں جانب بھی بیٹھا کرے۔ (درمختار وشامی: ۲/ ۲۴۸-۲۴۹، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند، حاشية الطحطاوي على الدر: ۲۳۳/۱، مطبوعة: مكتبة اتحاد، ديوبند، حاشية الطحطاوي على المراقي، ص: ۳۱۳-۳۱۴، مطبوعة: دار الكتب العلمية، بيروت)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا حصہ نہ رکھے کہ وہ یہ سمجھے کہ سلام کے بعد دائیں طرف ہی رخ کرکے بیٹھنا لازم ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی مرتبہ بائیں طرف مڑتے ہوئے بھی دیکھا ہے، اور علامہ طیبیؒ نے فرمایا: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کا کسی مندوب ومستحب چیز پر اصرار کرنا، اور رخصت پر بالکل عمل نہ کرنا شیطان کی گم راہی کا حصہ ہے؛ اس لیے آپ کے یہاں کے امام صاحب کو چاہیے کہ کبھی کبھی بائیں جانب بھی رخ کرکے بیٹھا کریں۔

عن عبداللّٰہ بن مسعود قال: لایجعل أحدکم للشّیطان شیئاً من صلاته یری أنّ حقاً علیه أن لا ینصرف؛ إلا عن یمینه، لقد رأیتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلّم کثیراً ینصرف عن یساره، متّفقٌ علیه. (مشکاة المصابیح، کتاب الصلاة، باب الدعاء في التشهد، الفصل الأول، ص:٨٧، ط: المکتبة الأشرفیة، دیوبند) **قال الطِّیبي: وفیه أنّ من أصرّ علی أمر مندوب و جعله عزماً ولم یعمل بالرُّخصة فقد أصاب منه الشّیطان من الإضلال إلخ.** (مرقاة المفاتیح: ٢٦/٣، ط: دارالکتب العلمیة بیروت) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ١٧/٦/١٤٣٨ھ = ١٧/٣/٢٠١٧ء، جمعہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(٥٨٠/تتمہ/ن، ٦١٤/ن، ١٤٣٨ھ)

فجر کی سنت جماعت شروع ہوجانے کے بعد کب تک پڑھی جاسکتی ہے؟

سوال: میں روز فجر کے وقت مسجدوں میں دیکھتا ہوں کہ امام صاحب فرض نماز پڑھا رہے ہیں، اور دوسرے لوگ فرض میں شامل ہونے کے بجائے سنت پڑھتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی رکعت اور کبھی کبھی تو پوری فرض نماز چھوٹ جاتی ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللّٰہ التوفیق: فجر کی سنتوں کے بارے میں اصل حکم شرعی یہ ہے کہ جماعت شروع ہونے سے پہلے ہی ادا کرلی جائے؛ تاکہ جماعت میں شروع سے شرکت کی جاسکے، تاہم جماعت شروع ہونے کے بعد اگر امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ ملنے کی امید ہو، تب بھی پہلے فجر کی سنتیں پڑھنی چاہییں، خواہ فرض کی دونوں رکعتیں فوت ہوجائیں؛ پس جماعت شروع ہونے کے بعد اگر خارج مسجد کوئی جگہ ہو، تو وہیں سنتیں پڑھی جائیں؛ ورنہ جماعت کے حصّے کے علاوہ دوسرے حصّے میں پڑھ لی جائیں؛ البتہ اگر قعدۂ اخیرہ بھی ملنے کی امید نہ ہو، تو ایسی صورت میں سنتیں شروع ہی نہ کی جائیں؛ بل کہ ترک کردی جائیں؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں فجر کی سنتوں میں مشغول ہونے کی وجہ سے جن لوگوں کی مکمل جماعت ہی فوت ہوجاتی ہے؛ ان کا عمل صحیح نہیں ہے، اور جو لوگ جماعت سے پہلے فجر کی سنتیں نہ پڑھنے کی صورت میں؛ جماعت کھڑی ہونے کے بعد پہلے فجر کی سنتیں پڑھتے ہیں، جس کی وجہ سے کبھی کبھی اُن کی ایک رکعت بھی فوت ہوجاتی ہے؛ اُن کا عمل شریعت کے مطابق ہے۔

قال الحصكفي: إذا خاف فوت ركعتي الفجر؛ لاشتغاله بسُنّتها تركها؛ لكون الجماعة أكمل، وإلا– بأن رجا إدراك ركعة في ظاهر المذهب، وقيل: التّشهُّد، واعتمده المصنّف والشّرنبلالي تبعاً للبحر؛ لكن ضعَّفه في النّهر– لايتركها ؛ بل يصلِّيها عند باب المسجد إن وجد مكاناً، وإلا تركها؛ لأنّ ترك المكروه مقدَّمٌ على فعل السُّنة. قال ابن عابدين: قولُه: (تركها) أي: لايشرع فيها، وليس المراد يقطعها.... قوله: (بأن رجا إدراك ركعة) تحويلٌ لعبارة المتن، وإلا فالمتبادر منها القول الثّاني. قوله: (قيل: التّشهُّد) أي إذا رجا إدراك الإمام في التّشهد لايتركها؛ بل يصليها وإن علم أنه تفوته الرّكعتان معه ...... قوله (لكن ضعَّفه في النّهر) حيث قال: إنّه تخريجٌ على رأي ضعيف . قلتُ: لكن قوَّاه في فتح القدير بما سيأتي من أن أدرك ركعة من الظُّهر مثلاً، فقد أدرك فضل الجماعة، وأحرز ثوابها كما نصّ عليه محمَّد وفاقاً لصاحبيه، وكذا لو أدرك التّشهُّد يكون مُدركاً لفضيلتها على قولهم، قال: وهذا يعكر على ما قيل: إنّه لو رجا إدراك التّشهُّد لايأتي بسُنَّة الفجر على قول محمَّد، والحقُّ خلافه؛ لنصِّ محمَّد على ما يناقضه.اهـ، أي: لأنّ المدار هنا على إدراك فضل الجماعة، وقد اتَّفقُوا على إدراكه بإدراك التَّشهُّد، فيأتي بالسُّنّة اتفاقاً، كما أوضحه في الشّرنبلالية أيضاً، وأقرّه في شرح المنية وشرح نظم الكنز وحاشية الدّرر لنوح آفندي وشرحها للشَّيخ إسماعيل، ونحوه في القهستاني، وجزم به الشّارح في مواقيت الصّلاة ..... قال ابن عابدين: الحاصل أنّ السُّنّة في سُنَّة الفجر أن يأتي بها في بيته، وإلا فإن كان عند باب المسجد مكانٌ صلّاها فيه، وإلا صلّاها في الشّتوي أو الصّيفي إن كان للمسجد موضعان، وإلا خلف الصُّفوف عند سارية ... ثمّ هذا كلّه إذا كان الإمام في الصّلاة، أما قبل الشُّروع بها في أيِّ موضع شاء، كما في شرح المنية. (ردالمحتار مع الدرالمختار: ٢/ ٤٤٥ ـ ٤٤٦، كتاب الصّلاة، ط: دارإحياء التراث العربى، بيروت) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۳ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ – زین الاسلام قاسمی

(۸۴۷/تتمہ/ص، ۹۴۰/ص، ۱۴۳۸ھ)

حنفی مقلد سعودی عرب جاکر عصر کی نماز کس طرح ادا کرے؟

سوال: میں ہندوستان سے ہوں، اور میں بچپن سے فقہِ حنفی پر عمل کر رہا ہوں؛ لیکن اب میں سعودی عرب آ گیا ہوں، جہاں اگر میں فقہِ حنفی پر عمل کروں، تو مجھے عصر کی نماز میں پریشانی ہوتی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں بھیڑ سے باہر ہوں، سوال یہ ہے کہ کیا میرے لیے شافعی مسلک پر عمل کرنا جائز ہے؛ تاکہ میں یہاں کے ماحول میں گھل مل جاؤں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: حنفی مسلک میں راجح قول کے مطابق؛ عصر کا وقت مثلِ ثانی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے؛ اس لیے آپ کوشش کریں کہ کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر جماعت سے مثلِ ثانی پر نماز ادا کریں، اس وقت نمازِ عصر ادا کرنے سے بالیقین ذمہ فارغ ہوجائے گا، اگر یہ شکل نہ بن سکے، تو تنہا مثلِ ثانی پر نمازِ عصر ادا کریں؛ البتہ کبھی کبھار مثلِ اول پر ادا کرلی، تو وہ بھی درست ہوگئی، یا حرمین شریفین میں مثلِ اول پر باجماعت ادا کرلی، تو وہاں کی خصوصیت کی وجہ سے درست ہے۔

ووقتُ الظُّهر من زواله .... إلى بلوغ الظّل مثليه.... ووقتُ العصر منه إلى الغُروب. قال ابن عابدين: هٰذا ظاهر الرِّواية عن الإمام. نهاية، وهو الصَّحيح. بدائع ومحيط وينابيع، وهو المُختار. غياثيه، واختاره الإمام المحبوبي، وعوّل عليه النَّسفي وصدر الشَّريعة. تصحيح قاسم، واختاره أصحابُ المُتون وارتضاه الشَّارحون. (الدر مع الرد: ٢/١٤-١٦، كتاب الصلاة، ط:زكريا) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۳۰ھ الموافق: ۲۰۱۷/۸/۲۳ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- وقار علی غفرلہٗ

(۱۳۰۶/ھ، ۲۵۸/ھ، ۱۴۳۸ھ)

تراویح میں دیکھ کر قرآن پڑھنے کا حکم

سوال: تراویح میں امام کا دیکھ کر قرآن پڑھنا کیسا ہے؟ کیا ایسے امام کے پیچھے تراویح پڑھنا

درست ہے یا نہیں؟ سعودی عرب میں اکثر مساجد میں امام قرآن دیکھ کر تراویح پڑھتے ہیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: نماز میں دیکھ کر قرآن کریم پڑھنا مفسدِ صلاۃ ہے؛ اس لیے کہ یہ تلقّن من الخارج ہے، جو کہ مفسد ہے، جیسا کہ کسی خارجِ نماز شخص سے لقمہ لینا مفسد ہے، شامی میں ہے:

أنّه تلقّن من المصحف، فصار كما إذا تلقّن من غيره. (رد المحتار: ۳۸۴/۲، ط: زکریا، دیوبند)

نیز اعلاء السنن میں ابوداؤد اور ترمذی کی ایک روایت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے، اعلاء السنن میں ہے:

عن رفاعة بن رافع أنّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم علّم رجلا الصّلاة، فقال: إن كان معك قرآناً فاقرأ؛ وإلا فاحمد اللّٰه، وكبّره، وهلّله، ثم اركع، رواه أبوداؤد والتّرمذي، وقال: حديثٌ حسنٌ، فنقُول: لو كانت القرأة منه مباحاً في الصّلاة غير مفسدة لها، كما زعمه بعضُهم لكان ذلك واجباً على العاجز عن الحفظ؛ لكونه قادراً على القرأة من وجه.

یعنی: حضرت رفاعہ بن رافع سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز سکھلائی، پھر اس سے کہا: اگر تمھارے پاس کچھ قرآن ہے؛ یعنی: تمھیں یاد ہے، تو نماز میں اسے پڑھو؛ ورنہ قرأت کی جگہ اللہ کی حمد کرو، اور تکبیر و تہلیل پڑھو، اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے، پھر فرمایا: یہ حدیث حسن ہے، میں (صاحب اعلاء السنن) کہوں گا: نماز میں دیکھ کر قرآن پڑھنا اگر مباح ہوتا، مفسدِ صلاۃ نہ ہوتا، جیسا کہ بعض لوگوں کا گمان ہے، تو حفظ سے عاجز شخص پر (نماز میں دیکھ کر تلاوت کرنا) ہوتا؛ اس لیے کہ وہ من وجہ تلاوت پر قادر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۸/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۳۴/تتمہ/د، ۹۴۷/د، ۱۴۳۸ھ)

جلسے کی وجہ سے آبادی کے باہر کسی کھیت وغیرہ میں جمعے کی نماز ادا کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ کسی جگہ عام اجلاس منایا گیا، اجلاس کے پہلے دن جمعے کا دن تھا، کچھ لوگوں نے اسی جگہ جمعے کی نماز ادا کرنا چاہا، وہ جگہ کھیتی کی جگہ تھی، وہاں بالو پُر کر کے میدان بنا کر محفل بنائی گئی، محفل سے ہٹ کر تھوڑی دور میں ایک پھوس کی مسجد بنائی گئی تھی، خدمت کرنے والے وہاں پنج وقتہ نماز پڑھتے رہتے، تو سنیچر اتوار اور سوموار کو جلسہ تھا؛ مگر جمعے کے دن؛ جمعے کی نماز اسی محفل میں پڑھنے کے لیے کچھ لوگ، اور علماء میں سے کچھ علماء تیار ہو گئے؛ مگر بہت سارے علماء نے اس جگہ جمعے کی نماز ادا کرنا جائز نہیں؛ ناجائز کہہ کر انکار کر دیا، تو علماء اور عوام کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے، یہ معلوم ہو کہ اس میدان میں کوئی گھر نہیں، گاؤں کہیں یا شہر؟ وہاں مقیم مسجد نہیں تھی، پنج وقت نماز کے لیے جو پھوس کی مسجد بنائی گئی تھی، اس سے ہٹ کر محفل تھی، اسی محفل میں جمعے کی نماز کچھ علماء نے عوام میں اعلان کر کے ادا کی، کیا وہاں جمعے کی نماز ادا کرنا جائز تھا یا نہیں؟ اگر نہیں تو ادا کرنے والوں پر اور کرانے والوں پر کیا حکم ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عطا فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب و باللہ التوفیق: جمعے کی نماز؛ شہر، قصبے یا قریہ کبیرہ بہ حکمِ قصبہ کی آبادی میں درست ہوتی ہے، یا ان کی فنا میں؛ یعنی: ایسے میدان میں جو باشندگانِ آبادی کی مصالح وضروریات کے لیے بنایا گیا ہو، اور وہاں اہلِ شہر اپنی ضروریات پوری کرتے ہوں، جیسے: عیدگاہ، کھیل کا میدان، گھوڑ دوڑ کا میدان وغیرہ، اور صورتِ مسئولہ میں آبادی سے باہر جس جگہ کوئی اجلاس منعقد کیا گیا؛ سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ شہر کی مصالح وضروریات کے لیے بنایا گیا میدان نہیں ہے؛ بل کہ لوگوں کی کھیتی باڑی کی زمینات ہیں، جنھیں ہموار کر کے عارضی طور پر جلسہ گاہ بنا دیا گیا؛ اس لیے جن لوگوں نے جلسہ گاہ میں جمعے کی نماز ادا کی، ان کی نمازِ جمعہ نہیں ہوئی، وہ اب ظہر کی نماز ادا کریں۔

(مستفاد: تتمہ احسن الفتاوی: ۱۰/۳۸۵-۳۸۶، مطبوعہ: پاکستان، بہشتی زیور مدلل: ۱۱/۸۰، عنوان: جمعے کی نماز کے صحیح ہونے کی شرطیں، مطبوعہ: کتب خانہ اختری، متصل مظاہر علوم، سہارن پور)

ویُشترط لصحَّتها سبعةُ أشياء: الأول: المصر............أو فناؤه بكسر الفاء وهو ماحوله اتّصل به أو لا، كما حرَّره ابن الكمال وغيره؛ لأجل مصالحه، كدفن الموتى وركض الخيل إلخ. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب الجمعة: ۳/۵-۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) وأمّا الفناءُ وهو المكانُ المعدُّ لمصالح البلد، كركض الدّواب ودفن الموتى وإلقاء التُّراب إلخ. (ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب صلاة المسافر: ۲/۵۹۹-۶۰۰) أنّه المعدُّ لمصالح المصر، فقد نصَّ الأئمَّة على أنّ الفناء ما أعدَّ لدفن الموتى، وحوائج المعركة، كركض الخيل والدَّواب، وجمع العساكر، والخُروج للرَّمي، وغيرذلك.
(ردالمحتار، كتاب الصلاة، باب الجمعة: ۳/۸، ومنحة الخالق على البحر الرائق،كتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة: ۲/۲۴۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، نقلًا عن الشرنبلالي في تحفة أعيان الغِنى بصحة الجمعة والعيدين في الفِناء)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۸/۳/۱۴۳۸ھ = ۱۸/۱۲/۲۰۱۶ء، یک شنبہ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ
(۲۳۵/ن، ۲۵۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

درمیانِ نماز بچوں کو صف سے پیچھے ہٹانے یا اگلی صف پُر کرنے کے لیے اُن کے آگے سے گذرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین، مفتیانِ شرع مسئلہ ذیل میں:

ہماری مسجد میں فرض نماز کی صف میں؛ بالغوں کے بیچ میں چھوٹے بچے نماز میں شامل رہتے ہیں، بچوں کو پیچھے ہٹانے پر کچھ لوگ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں؛ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ جماعت کی ترتیب؛ شریعت کے مطابق بیان فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: ترتیب تو یہی ہے کہ بالغین نمازیوں کی صفوں کے بعد بچوں کی صفیں قائم کی جائیں؛ لیکن یہ حکم؛ نماز شروع کرنے سے پہلے کا ہے، جب نماز شروع ہوگئی، تو یہ حکم نہیں کہ بچوں کو اُن کی جگہ سے ہٹایا جائے، بعض حضرات نے

بچوں کو بڑوں کی صف میں کھڑے ہونے کی اس صورت میں اجازت دی ہے کہ بچے شرارت نہ کرسکیں؛ کیوں کہ جب وہ اپنے باپ، بھائی وغیرہ کے برابر میں ہوتے ہیں، تو شرارت نہیں کرتے، اور جب بچے ہی بچے ہوں، تو شرارت عامۃً کیا کرتے ہیں، تقریرات رافعی علی الدر المختار سے ایسا ہی ثابت ہوتا ہے؛ اس لیے جماعت کھڑی ہوجانے کے بعد درمیانِ نماز بچوں کو ان کی جگہ سے نہ ہٹانا چاہیے؛ البتہ بڑوں کی صفوں میں اگر جگہ ہے، اور اس کو پُر کرنے کے لیے بچوں کے سامنے سے گذر جائیں، تو اس میں کچھ حرج نہیں؛ بل کہ اس کی اجازت ہے، فتاویٰ رحیمیہ میں اس کی صراحت ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۱۳ھ الموافق: ۲۰۱۷/۶/۹ء، یوم الجمعۃ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ

نوٹ: جواب صحیح ہے؛ البتہ واضح رہے کہ جواب میں جو تفصیل ذکر کی گئی؛ یہ سمجھ دار بچوں کے بارے میں ہے، اور جو بچے بہت چھوٹے اور ناسمجھ ہوں، جیسے: تین چار سالہ بچّے، اُنھیں مسجد لانا ہی نہیں چاہیے، بعض لوگ ایسے بچوں کو بھی مسجد لے آتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۰۳۸/ھ، ۱۰۲۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

مسجد کی تحتانی صفوں کے خالی ہونے کے باوجود مکتب کے بچوں کی بالا خانے میں صف لگانے کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

ہمارے یہاں ایک بڑی مسجد ہے، جس میں ایک اصل مسجد والا حصہ ہے، جو کہ ۱۵/صفوں پر مشتمل ہے، اور دوسرا بالا خانہ جو کہ در اصل مسجد کی دسویں صف سے شروع ہوتا ہے، اور پندرہویں صف پر ختم ہوتا ہے، مسجد تقریباً جمعے کے علاوہ دیگر نمازوں میں ۵، ۶/صفوں سے زیادہ نہیں بھرتی ہے؛ چوں کہ اوپر بالا خانے میں دینیات مکتب چلتا ہے، اور نمازوں کے اوقات میں وہیں بچوں سمیت نماز پڑھنے کا انتظامیہ کا حکم ہے؛ تاکہ بچے معلمین کی غیر موجودگی میں شور نہ کریں، تو کیا مسجد کی پچھلی صفوں کے خالی ہوتے ہوئے، بالا خانے میں اُسی امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھنا درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اصل تو یہی ہے کہ پہلے تحتانی منزل میں صف بندی کی جائے،

اس کے بعد فوقانی منزل میں، تحتانی منزل میں جگہ ہوتے ہوئے؛ فوقانی منزل میں صف بندی کرنا مکروہِ تنزیہی ہے؛ کیوں کہ تحتانی منزل اصل ہے؛ لیکن عذر کی صورت میں تحتانی منزل کا کچھ حصہ چھوڑ کر فوقانی منزل میں صف بندی کرنا بلا کراہت جائز ہے، جیسے: تحتانی منزل کا باہری حصہ غیر مسقّف ہو، اور سخت دھوپ یا بارش کی وجہ سے وہاں نماز پڑھنا دشوار ہو۔

اور مکتب میں عام طور پر چھوٹے بچے پڑھتے ہیں، اور وہ نگراں کی عدمِ موجودگی میں شرارت کرتے ہیں؛ اس لیے اگر ان کی نگرانی اور تربیت کے لیے ان کی نماز کا نظم تحتانی حصّے کے بجائے فوقانی میں رکھا جائے، اور وہ بچے اساتذہ کی نگرانی میں فوقانی حصّے سے ہی جماعت میں شرکت کرلیا کریں، تو شرعاً بلا کراہت اس کی گنجایش معلوم ہوتی ہے، اور اقتدا بہ ہرصورت درست ہے، اور نماز و جماعت کا ثواب بھی ہرصورت میں ملے گا۔

ولو صلّٰی علی رفُوف المسجد إن وجد في صحنه مكاناً كره، كقيامه في صفٍّ خلف صفٍّ فيه فرجةٌ، قلتُ: وبالكراهة أيضاً صرَّح الشّافعيّة، وقال السُّيوطي في ''بسط الكفّ في إتمام الصفّ'': وهذا الفعل مفوتٌ لفضيلة الجماعة الذي هو التَّضعيف، لا لأصل بركة الجماعة، فتضعيفُها غير بركتها هي عود بركة الكامل منه على النّاقص. اهـ، وفي الرد: قوله:(كره)؛لأنّ فيه تركاً لإكمال الصُّفوف، والظّاهر أنّه لو صلّٰی فيه المبلغ في مثل يوم الجمعة؛ لأجل أن يصل صوتُه إلى أطراف المسجد لايكره. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصلاة، باب الإمامة: ٢/ ٣١٢، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

قوله: (كره:) أي: تنزيهاً؛ لاستعلائه ...... قوله: (وهذا الفعلُ مفوتٌ إلخ:) ليس مذهباً لنا، والذي تُفيده عباراتُ المذهب الكراهةُ فقط. (حاشية الطحطاوي على الدر: ١/ ٢٤٦، ط: مكتبة الاتحاد، ديوبند)

نیز **فتاوی محمودیہ جدید** (۶/ ۵۲۷، سوال: ۲۹۴۵، مطبوعہ: ادارۂ صدیق، ڈابھیل) اور **امداد الاحکام** (۲/ ۱۲۴-۱۲۵، سوال: ۱۷، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند) دیکھیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۱/۱۴ھ = ۲۰۱۶/۱۰/۱۶ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۳/ ن، ۱۸/ ن، ۱۴۳۸ھ)

سفر میں جمع بین الصلاتین کا حکم

سوال: امام؛ شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کا ہو یا کوئی اور مسلک کا ہو، تو کیا ہم سفر میں ظہر، عصر اور مغرب عشاء کی نمازیں ملا کر اُن کے پیچھے پڑھ سکتے ہیں، میرا تعلق حنفی مسلک سے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: ظہر، عصر، مغرب، عشاء؛ دو نمازوں میں جمع تقدیم کرنا؛ یعنی: اگلے وقت کی نماز اس کے وقت سے پہلے پڑھ لینا، سفر میں بھی دلائل کی روشنی میں حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں؛ لہٰذا حنفی مصلّی کو شافعی امام کی اقتدا میں بھی؛ اگلے وقت کی نماز پہلے پڑھنا جائز نہیں، حنفی کی نماز ادا نہ ہوگی؛ پس حنفی مقتدی صرف اس وقت کی نماز؛ مثلاً: ظہر میں اقتدا کر لے، اور عصر کی نماز وقت آنے کے بعد پڑھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَت عَلَى الْمُؤمِنِينَ كِتَاباً مَّوقُوتاً﴾ (النساء: ۱۰۳)

یعنی: ہر نماز اپنے وقتِ مقررہ کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

اور جن حدیثوں میں جمع بین الصلاتین کا ذکر ہے، ان سے جمع صوری مراد ہے، کہ ایک نماز اس کے آخری وقت میں، اور دوسری نماز اس کے اول وقت میں پڑھی جائے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

وعن أنس رضي اللّٰه عنه أنّه كان إذا أراد أن يجمع بين الصّلاتين في السَّفر أخّر الظُّهر إلى آخر وقتها وصلاَّها، وصلّى العصر في أوّل وقتها، ويصلّي المغرب في آخر وقتها، ويصلّي العشاء في أوّل وقتها، ويقُول : هكذا كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلّم يجمع بين الصّلاتين في السَّفر. (مجمع الزوائد، باب مدة الجمع، رقم :۲۹۷۳)

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بھی جمع صوری پر دلالت کرتی ہے۔ (إعلاء السنن: ۹۵/۲، باب عدم جواز الجمع بين الصلاتين جمعا حقيقيا)

نوٹ: جمع بین الصلاتین کا حکم مزید تفصیل سے جاننے کے لیے چند اہم عصری مسائل (۷۰/۱) میں مندرج؛ مفصل فتویٰ ملاحظہ فرمائیں، یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ پر موجود ہے،

نیز مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے طبع بھی ہوئی ہے۔

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۸/۲۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۳۴/تتمہ/د، ۹۴۷/د، ۱۴۳۸ھ)

وطنِ اقامت وطنِ اصلی کب بنتا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

زید بہار کا رہنے والا ہے، اور وہ یوپی میں ایک مدرسے میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتا ہے، اور مدرسے ہی کے بغل میں عاریت پر ایک مکان لے کر اپنے بال بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے، جب کہ بہار میں زید کا مکان، اور زمین وجائداد وغیرہ موجود ہیں؛ لیکن زید بیسیوں سال سے فیملی کے ساتھ یوپی میں رہ رہا ہے، اور اس کے سارے کاغذات: مثلاً: پاسپورٹ، راشن کارڈ وغیرہ یوپی ہی کے بنے ہوئے ہیں، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا زید کے لیے عاریت والا گھر: وطنِ اصلی ہے یا وطنِ اقامت؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورتِ مسئولہ میں زید؛ اگر محض درس وتدریس کی ملازمت کی وجہ سے یوپی میں مع اہل وعیال رہ رہا ہے، مستقل وہاں رہنے کا عزم نہیں ہے، تو چاہے بیسیوں سال رہے، وہ جگہ زید کے حق میں وطنِ اصلی نہیں بنے گی، وطنِ اقامت ہی رہے گی؛ اس لیے کہ وطنِ اصلی بننے کے لیے مع اہل وعیال؛ وہاں مستقل رہنے کا عزم ہو، عارضی سبب کی بنا پر قیام نہ ہو، اور اگر زید وہاں مستقل رہنے کا عزم کر چکا ہے، چاہے درس وتدریس کا سلسلہ باقی رہے یا نہ رہے، تو وہ جگہ اس کے حق میں وطنِ اصلی بن جائے گی۔

والوطنُ الأصليُّ: هو وطنُ الإنسان في بلدته أو بلدةٍ أخرىٰ اتّخذها داراً وتوطّن بها مع أهله وولده، وليس من قصده الإرتحالُ عنها؛ بل التَّعيش بها. (البحر الرائق: ۲/۲۳۹، ط: زکریا، دیوبند)

وفي الدّر: الوطنُ الأصليُّ: هو موطنُ ولادته أو تأهُّله أو توطُّنه. قوله: (أو توطُّنه) أي: عزم على القرار فيه وعدم الارتحال. (الدر المختار مع الرد: ٢/ ٦١٤، ط: زکریا، دیوبند)

فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند　　۳/ ربیع الاول/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۴۷/ ب، ۲۶۱/ ب، ۱۴۳۸ھ)

مختلف مقامات پر بنائے گئے ذاتی مکانات میں بہ غرض تجارت آنے جانے اور عارضی قیام کی صورت میں قصر واتمام کا مسئلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں:

ایک کمپنی ہے، جس کے مالکان چھ بھائی ہیں، جو کمپنی میں برابر کے شریک ہیں اور کمپنی نے مختلف شہروں؛ مثلاً: دہلی، ممبئی، کلکتہ، کانپور، لکھنؤ وغیرہ میں اپنے مکانات بنا رکھے ہیں، جہاں یہ تجارت کی غرض سے آتے جاتے رہتے ہیں، اور کبھی کبھی دو چار دن کا قیام بھی کرتے ہیں، ان دو چار دن کے قیام کی صورت میں نماز میں اتمام کریں گے یا قصر کریں گے؟ واضح رہے کہ تجارت کی غرض سے ہی یہ ذاتی مکانات بنائے گئے ہیں، نہ کہ مستقل رہایش کے لیے، نیز ان کے اہل وعیال وہاں رہتے بھی نہیں، مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: مختلف شہروں میں؛ مثلاً: ممبئی، دہلی، کانپور، لکھنؤ وغیرہ میں جو مکانات تجارت کی غرض سے بنائے گئے ہیں، اور تجارت کی غرض سے وہاں آنا جانا بھی ہوتا ہے، کسی جگہ کو مستقل وطن بنانے کا ارادہ نہیں کیا، نہ ہی کسی جگہ اس ارادے سے رہایش اختیار کی کہ اب یہی رہیں گے، تو ایسی صورت میں وہ جگہیں وطنِ اصلی نہیں ہوں گی؛ بل کہ وطنِ اقامت کے درجے میں ہوں گی، وطنِ اقامت کا مطلب یہ ہے کہ دو چار روز؛ حتی کے پندرہ دن سے کم رہنے کی صورت میں آدمی مسافر ہی رہے گا، اور نماز قصر ادا کرے گا؛ لیکن اگر کبھی پندرہ دن رہنے کا ارادہ ہو گیا، تو پھر ان دنوں میں پوری نماز پڑھنی ہوگی، یعنی: اتمام کرنا ہوگا۔

والوطنُ الأصليُّ هو وطنُ الإنسان في بلدته أو بلدةٍ أخرى اتّخذها داراً وتوطّن بها مع أهله وولده، وليس من قصده الارتحال عنها؛ بل التَّعيُّش بها. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، باب المسافر: ۵۸۶/۲، ط: زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۲/۷ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۲۷/د، ۱۷۱/د، ۱۴۳۸ھ)

تبلیغی جماعتوں کے دور دراز قیام کے دوران قصر واتمام کا مسئلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ شرع متین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

جو تبلیغی جماعتیں اپنے شہر کو چھوڑ کر دور دراز مقامات پر جماعت میں جاتی ہیں، اور کسی ایک بستی میں چالیس دن گذارتی ہیں، اور ایک ہی مسجد میں ایک ہفتہ؛ اور ایک ہفتہ یا آٹھ دن یقینی طور پر قریبی مسجد میں گذاریں گے، تو اب یہ جماعت؛ مذکورہ دونوں مساجد میں قصر کرے گی یا اتمام کرے گی؟

جواب مدلل؛ فتاوی عربی کی روشنی میں دیں؛ اس لیے کہ ہم عالم ہیں، اور عالم کے لیے دلیل کا مطالبہ کرنا درست ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: اگر ایک شہر میں پندرہ دن یا اس سے زائد قیام کا ارادہ ہے، تو اس صورت میں ہر جماعتیں اتمام کریں گی، خواہ مساجد متعدد ہوجائیں؛ البتہ اگر کسی ایک جگہ قطعی طور پر پندرہ دن رہنے کا ارادہ نہ ہو، تو پھر جماعتیں مسافر رہیں گی، اور قصر کریں گی۔

فيقصر إن نوى الإقامة في أقلّ منه، أي: في نصف شهرٍ أو نوى فيه؛ لكن في غير صالح، أو نوى فيه؛ لكن بموضعين مستقلّين. (درمختار: ۶۰۶/۲، ط: زکریا) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۳/۱۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۷۹ تتمہ/ل، ۲۹۴/ل، ۱۴۳۸ھ)

عمداً متروکہ نمازوں میں عدم وجوبِ قضا سے متعلق ابن بازؒ کے ایک فتوے کی تحقیق

سوال: قضا نمازوں کے حوالے سے سعودی مفتیِ اعظم الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کا فتویٰ ملاحظہ کیجیے:

''علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے پر اُس کی قضا واجب نہیں ہے؛ کیوں کہ جان بوجھ کر نماز چھوڑنا کفر ہے، جو آدمی کو اسلام سے نکال کر زمرۂ کفار میں داخل کر دیتا ہے، اور کافر پر حالتِ کفر میں چھوڑے ہوئے کاموں کی قضا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے: آدمی اور کفر وشرک کے درمیان نماز کو چھوڑ دینے (کا فرق) ہے۔ (صحیح مسلم، الإیمان، ۸۲، سنن الترمذي، الإیمان، ۲۶۲۰، سنن أبو داؤد، السنة، ۴۶۷، سنن ابن ماجه، إقامة الصلاة والسنة فیها، ۱۰۷، مسند أحمد بن حنبل: ۳/ ۳۷۰، سنن الدارمي، الصلاة، ۱۲۳۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام قبول کرنے والوں سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ سابقہ نمازیں دہرائیں، جو اُن پر حالتِ کفر میں فرض تھیں، نہ اُن کے بعد صحابہ نے اُن لوگوں سے یہ مطالبہ کیا، جو مرتد ہونے کے بعد دوبارہ اسلام میں داخل ہوئے، بھول جانے، سوئے رہنے کی وجہ سے اور بے ہوشی کی وجہ سے رہ جانے والی نمازوں کو قضا کیا جائے گا، بہت سے لوگ سابقہ نمازوں کی قضا کے خوف سے نماز کی باقاعدہ ادائیگی شروع نہیں کرتے، دین آسان ہے، اسے اسی طرح رہنا چاہیے، جیسے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔

ادھر تو یہ حال ہے کہ کوئی مسجد میں چلا جائے، تو آسانی پیدا کرنے کے بجائے اُسے کہا جاتا ہے کہ میاں! پچھلے بیس تیس برس کدھر تھے؟ سابقہ نمازوں کی گنتی پوری کرو؛ پھر آگے چلنا، یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے کہ توبہ کرنے والے انسان کو حوصلہ دینے کے بجائے الٹا پچاس سال کی نمازوں کی قضا کا مژدہ سنا دیا جائے۔ فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے: بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (خوش خبری سناؤ، اورنفرت نہ دلاؤ) يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا (لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، مشکلات نہ بناؤ) (صحیح بخاری)

قضا نمازوں کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کا مسئلہ کفر واسلام کا مسئلہ نہیں ہے، صحیح قول یہی ہے کہ ان کی ادائیگی ضروری نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ (الفرقان: ۷۰) (الا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کرے اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگے، ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ نیکی سے بدل دے گا) اور فرمایا: ﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى﴾ (طٰہٰ: ۸۲) (جو توبہ کر لے، اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے، پھر سیدھا چلتا رہے، اُس کے لیے میں بہت درگذر کرنے والا ہوں)

اگر کسی شخص نے شرعی عذر کی بنا پر نماز ترک کی؛ مثلاً: نیند یا بھول کر، تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے یاد آئے، اور سویا ہوا بیدار ہو، تو اُسی وقت نماز ادا کر لے، اس کے علاوہ کوئی اور کفارہ نہیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: جو کوئی بھی نماز بھول جائے، یا اس سے سویا رہے، تو جب اسے یاد آئے، وہ نماز ادا کر لے، اس کا کفارہ یہی ہے۔ (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۷۲، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۶۴) کوئی فدیہ چھوڑی ہوئی نماز کے لیے نہیں دیا جا سکتا؛ کیوں کہ یہ بات دین میں ثابت نہیں ہے، جس نے ایک یا زیادہ فرض نمازیں بغیر کسی عذر کے ترک کر دیں، اسے اللہ تعالیٰ کے یہاں سچی توبہ کرنی چاہیے، اور اس کے ذمے کوئی قضا اور کفارہ نہیں؛ کیوں کہ فرض نماز جان بوجھ کر ترک کرنا کفر ہے؛ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ہمارے اور اُن کے مابین عہد نماز ہے، جس نے بھی نماز ترک کی اس نے کفر کیا۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۴۲۸، سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۲۱، سنن نسائی، حدیث نمبر: ۴۶۲) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: آدمی اور شرک اور کفر کے مابین نماز کا ترک کرنا ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۴۲) اور اس میں سچی اور پکی توبہ کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وبالله التوفيق والعصمة: استفتاء میں شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی طرف منسوب جو فتویٰ نقل کیا گیا ہے؛ ہمارے نزدیک وہ صحیح نہیں ہے، جس شخص کی کوئی فرض یا واجب نماز چھوٹ جائے، یا قصداً سستی و تکاسل کی وجہ سے چھوڑ دے، اس پر اس کی قضا شرعاً واجب ہے؛ چناں چہ البحر الرائق میں ہے:

فالأصل فيه أنّ كلّ صلاة فاتت عن الوقت بعد ثبوت وجوبها فيه فإنّه يلزم قضاؤها، سواءٌ تركها عمداً أو سهواً أو بسبب نوم، وسواءٌ كانت الفوائتُ قليلةً أو كثيرةً إلخ. (البحر الرائق: ۲/ ۱٤۰، ط: زکریا)

یہ صرف امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک نہیں؛ بل کہ امام شافعی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی قضا کے نفسِ وجوب میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ساتھ ہیں، یعنی: ان تمام حضرات کے نزدیک عمداً کی صورت میں بھی قضا واجب ہے، ہاں تفصیلات میں ان حضراتِ ائمہ کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔ دیکھیں: (المدوّنة الكبرى: ۲۱۵/۱، ط: دار الكتب العلمية، حاشية الدّسوقي على الشّرح الكبير: ۲۶۴/۱، ط: دار الفكر، الإنصاف للمرداوي: ۴۴۳/۱، باب شروط الصّلاة، ط: بيروت، فقہی مقالات: ۱۳/۴، ط: نعیمیہ) یہاں تک کہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی عمد کی صورت میں وجوبِ قضا کے سلسلے میں جمہور کے ساتھ ہیں؛ چناں چہ فتاوی ابن تیمیہ میں ہے:

ومن عليه فائتةٌ فعليه أن يُبادر إلى قضائها على الفور، سواءٌ فاتته عمداً أو سهواً عند جمهُور العُلماء، كمالك وأحمد وأبي حنيفة وغيرهم، وكذلك الرَّاجح في مذهب الشَّافعي أنّها إذا فاتت عمدًا كان قضاؤها واجبًا على الفور. (فتاوی ابن تیمیہ: ۲۵۹/۲۳، ط: مجمع الملك، سعودي عربيه)

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ شاملِ استفتاء فتوے میں؛ جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ علماء کے صحیح ترین قول کے مطابق جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والے پر اس کی قضا واجب نہیں ہے؛ یہ دعویٰ خلافِ حقیقت ہے، اور عدمِ وجوب کا قول صحیح ہو بھی کیسے سکتا ہے؟! جب کہ یہ بات طے ہے کہ جو چیز دلیلِ قطعی سے ثابت ہو، اس کے اسقاط کے لیے بھی کم از کم اس درجے کی دلیل ضروری ہے، اور زیر بحث مسئلے میں اسقاط کے لیے قطعی نص تو کجا؛ کوئی کمزور نص بھی نہیں ہے، مذکور فی الاستفتاء فتوے میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ عمداً ترکِ صلاۃ کفر ہے، اور کافر پر حالتِ کفر میں چھوڑے ہوئے کاموں کی قضا نہیں ہوتی، اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر کوئی شخص سستی و کاہلی کی وجہ سے عمداً نماز ترک کردے، تو جمہور علماء کے نزدیک وہ فاسق ہے، کافر نہیں ہے، صرف امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی ایک روایت، اور معدودے چند لوگوں کا یہ قول ہے کہ وہ کافر ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ جمہور کے بالمقابل یہ قول؛ شاذ اور مرجوح قرار پائے گا؛ لہٰذا یہ استدلال مرجوح اور نادرست ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں:

(شرح مهذب: ۱۶/۳، فرع في مذاهب العلماء، ط: دار الفكر، المغني: ۲۹۸/۲، ط: بيروت)

عمداً ترکِ صلاۃ کفر ہے، اس پر دلیل کے طور پر جن نصوص کا ذکر کیا گیا ہے، یہ استدلال انتہائی کمزور ہے؛ کیوں کہ شراحِ حدیث کے مطابق؛ جمہور علماء کے نزدیک اس طرح کے نصوص

اُس صورت پر محمول ہیں، جب کہ نماز ترک کرے، اس بنا پر کہ وہ نماز کو فرض نہیں سمجھتا، یا فرض تو سمجھتا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ استہزاء کرتا ہے، یا پھر ان نصوص کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے نماز عمداً ترک کیا، اس نے کافروں والا عمل کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (فتح الباري: ۳۲/۲، ط: دار المعرفة، مرقاة: ۵۱۲/۲، ط: دار الفكر) وغیرہ۔

اور فتوے میں یسر اور عسر کی جو بحث کی گئی ہے، وہ بھی بے جوڑ اور نادرست ہے؛ کیوں کہ تمام نمازیں علی الفور قضا کرنا واجب ہو، ایسا نہیں؛ بل کہ آدمی حسبِ سہولت ادا کرے گا، اگر اخیر عمر تک نہ کر سکے، تو فدیے کی وصیت کر جائے، اور یہ استدلال بھی صحیح نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام قبول کرنے والوں سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ سابقہ نمازیں دہرائیں الخ، یہ استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ کفار؛ حالتِ کفر میں فروع کے مخاطب ہی نہیں ہوتے؛ لہٰذا اُن پر نماز فرض نہیں تھی، تو مطالبے کی بات بے محل ہے، الغرض اگر کوئی شخص عمداً یا سہواً نماز ترک کر دے، تو اُس پر اس کی قضا بہ ہر حال واجب ہے؛ البتہ اگر کسی شخص نے بہت سی نمازیں عمداً یا سہواً چھوڑی ہیں، تو وہ اپنی معاشی تنگ ودو کے ساتھ؛ حسبِ سہولت تھوڑی تھوڑی قضا کرتا رہے، اگر بالفرض اخیر عمر تک ادا نہ کر سکے، تو فدیے کی وصیت کر جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۵ھ، یک شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۷۰۰/تتمہ/س، ۳۴۷/س، ۱۴۳۸ھ)

مساجد کے ائمہ ومؤذنین کے لیے سرکاری امداد لینے کا حکم

سوال: (۱) حکومت آندھرا پردیش کی جانب سے مساجد کے ائمہ ومؤذنین کو بالترتیب پانچ ہزار اور تین ہزار روپے؛ بہ طور امداد دینے کا علان کیا گیا، اور اس کے لیے ان مساجد سے درخواستیں لی جارہی ہیں، جن کی آمدنی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کا لینا جائز ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ چوں کہ یہ رقم مسجد کے اکاؤنٹ میں آئے گی، تو کیا یہ رقم امام اور موذن کو دینا ضروری ہے؟ یا اُن کو حسبِ معمول سابقہ تنخواہ دے کر؛ حکومت کی امدادی رقم کو مسجد کے اکاؤنٹ میں روک لینا جائز ہے، بہ الفاظِ دیگر حکومت کی امداد کو سابقہ تنخواہ میں مدغم کر دینا، مثال کے طور پر

امام کی تنخواہ دس ہزار ہو، تو حکومت کی امداد آنے کے باوجود؛ پندرہ ہزار کے بجائے دس ہزار ہی دینا، یا بالکل نہیں، تو بعض رقم روک لینا اور امام وموذن کو نہ دینے کا کیا حکم ہے؟ بہ راہِ کرم ان سوالوں کا ایسا مفصل ومدلل جواب عطا فرمائیں کہ پھر کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) مساجد کے لیے حکومت سے امداد لینا فی نفسہ ناجائز نہیں ہے؛ لیکن ہمارے اکابر رحمہم اللہ نے مساجد وغیرہ کے لیے حکومت کی امداد قبول کرنے کو؛ بعض مصالح کے پیشِ نظر اور مفاسد کے اندیشے سے کبھی پسند نہیں فرمایا ہے، اور اب حالات کے تجربے سے اکابر کی رائے کا راجح اور بہتر ہونا ثابت ہو چکا ہے؛ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ مساجد کے ائمہ اور موذنین کے لیے؛ حکومت کی امداد کو قبول نہ کیا جائے؛ بل کہ مسلمانوں کے عمومی چندے اور تعاون سے اُن کی تنخواہ کا نظم کرنا چاہیے۔

(۲) اگر بالفرض حکومت کی امداد قبول کر لی گئی، تو حکومت کی رقم جس مد کے لیے آئے گی، شرعاً اُس رقم کو اسی مد میں خرچ کرنا لازم ہوگا، اگر حکومت کی رقم ائمہ اور موذنین کے لیے آئے گی، تو اسی میں رقم خرچ کرنا لازم ہوگا، اس رقم کو روک کر کسی اور مصرف میں استعمال کرنا شرعا جائز نہیں ہوگا؛ البتہ عمومی چندے کی رقم؛ جس میں چندہ دہندگان کی طرف سے کسی خاص مصرف کی تعیین نہ کی گئی ہو، اس کو متولی یا منتظمہ کمیٹی؛ مصالحِ مسجد میں کہیں بھی استعمال کر سکتی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۶ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۳۴۹/ص، ۴۶۵/ص، ۱۴۳۸ھ)

مساجد کی کمیٹی اور اس کی ذمے داریوں سے متعلق چند سوالات

سوال: (۱) کسی مسجد کی کمیٹی کا صدر، سکریٹری، خزانچی شریعتًا کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ اس کی کیا کیا ذمے داریاں ہونی چاہییں؟

(۲) کیا مسجد کی آمد اور خرچ کا حساب کتاب کرنا، یا عوام کو دینا ضروری ہے؟

(۳) کیا کسی مسجد میں کمیٹی بنی چاہیے؟

(۴) مسجد کے متعلق مشورہ دینے کا حق کس کس کو ہوتا ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق : **(۱)** مسجد کی کمیٹی کا صدر، یا سکریٹری؛ ایسا شخص ہو، جو نیک وصالح، لوگوں کے نزدیک قابلِ اعتماد، امین اور دیانت دار ہو، اس کی ذمے داریاں موقع محل کے لحاظ سے طے کی جائیں گی، اجمالی طور پر:

(الف) مسجد اور اس سے متعلق وقف کی حفاظت۔

(ب) نظم وانتظام صفائی مرمت وغیرہ سے متعلق۔

(ج) آمد وخرچ کا حساب کتاب رکھنا وغیرہ امور ہیں۔

اگر مشورے سے یہ ذمے داریاں؛ سکریٹری یا دیگر ممبران کو دے دی جائیں، تو ان سے متعلق ہوجائیں گی؛ ورنہ اجمالی طور پر مذکورہ امور کا ذمے دار اعلیٰ صدر ہی ہوتا ہے۔

(۲) چندہ دہندگان کو؛ اجمالی یا تفصیلی حساب سے ماہانہ یا سالانہ مطلع کرنا ضروری ہے؛ البتہ اگر کمیٹی کے سامنے حساب پیش کردینے کو وہ کافی سمجھیں، تو پھر ضروری نہیں۔

(۳) اگر واقف کی طرف سے کوئی متولی؛ شخصی یا خاندانی طور پر مقرر ہے، تو پھر یہی ذمے دار ہوگا، اگر اپنے تعاون کے لیے کمیٹی بنالے، تو مضائقہ نہیں؛ لیکن کمیٹی بنانا اس پر لازم نہیں، ہاں اگر یہ خائن یا خرد برد کرنے والا ہو، تو ذمے دارانِ محلّہ؛ کمیٹی بناسکتے ہیں، اسی طرح اگر واقف کی طرف سے کوئی شخصی یا خاندانی طور پر متولی مقرر نہیں ہے، تو پھر اہل محلّہ نظم وانتظام اور حفاظت کی غرض سے کمیٹی بناسکتے ہیں۔

(۴) اپنے اپنے حدود اور دائرے میں مناسب انداز سے، مخلصانہ طور پر؛ مشورہ ہر نمازی دے سکتا ہے، شر، فساد، فتنہ، خودرائی کا اظہار وغیرہ امور متصور نہ ہوں، نہ ہی ان کا خدشہ ہو۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۳/۱۷ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۲۵۰/د، ۳۰۲/د، ۱۴۳۸ھ)

مساجد میں فرض نماز کے فوراً بعد اعلان کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک مسجد جس میں ہر نماز

میں مصلیوں کی کثیر تعداد ہوتی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے مصلی مسبوق ہوتے ہیں، فرض نماز کے بعد فوراً اعلانات (چندے، ایصال ثواب اور جلسے وغیرہ کے اعلانات) کا معمول ہے، جو کافی تفصیلات کے ساتھ کیے جاتے ہیں، مسبوق حضرات نے کئی دفعہ اعتراضات بھی کیے؛ لیکن انتظامیہ کوئی توجہ نہیں دے رہی ہے۔ از راہِ مہربانی وضاحت فرمائیں کہ نماز میں اس طرح خلل ڈالنا کیسا ہے؟ فقط والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: نمازیوں کی نماز میں تشویش وخلل پیدا کرنا، یا اُن کے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کرنے والے امور کرنا مکروہ ہے، یک سوئی میں خلل کی وجہ سے ہی مصلی کے سامنے سے گذرنے کو منع کیا گیا ہے؛ لہٰذا ایسے اعلانات سے گریز کیا جائے، جو مخلِ صلاۃ ہوں، اور کوئی ضروری اعلان؛ مسجد یا نماز سے متعلق ہو، تو بہت مختصر الفاظ میں پست آواز سے کیا جائے، جو مسبوقین تک نہ پہنچے۔

قال في الشّامي: في الذّخيرة: نُقِل قولُ محمَّد في الأصل: وإن شاء الإمام استقبل النَّاس بوجهه إذا لم يكن بحذائه رجلٌ يصلِّي، ثمّ قال: ولم يفصل أي: محمَّد بين ما إذا كان المُصلِّي في الصَّف الأوّل أو الأخير، وهٰذا هو ظاهرُ المذهب؛ لأنّه إذا كان وجهُه مُقابل وجه الإمام في حالة قيامه يُكره، ولو بينهما صفوفٌ. (الدر مع الرد، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها: ۲/۴۱۲، ط: زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۳/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۷۴/د، ۶۱۹/د، ۱۴۳۸ھ)

نمازِ جنازہ فرض نماز کے بعد فوراً پڑھی جائے یا سنن موکدہ کے بعد؟ اور اس سلسلے میں حرمین شریفین کا عمل دلیل میں پیش کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ بکر کہتا ہے کہ ”جنازے کی نماز فرض کفایہ ہے؛ اس لیے فرض نمازوں کے بعد فوراً ادا کی جائے“، خالد کہتا ہے کہ ”سنت نمازوں کے بعد جنازے کی نماز پڑھی جائے؛ اس لیے کہ بعضے لوگ مسبوق ہوتے ہیں،

فوراً نمازِ جنازہ کا اعلان کرنے سے اُن کی نمازوں میں خلل آتا ہے، اور بعضے لوگ جنازے کی نماز پڑھنے کے فوراً بعد سنت پڑھے بغیر گھر چلے جاتے ہیں، سنتوں سے محروم ہوتے ہیں''۔

اب مفتی صاحبان سے دریافت کرنا ہے کہ ان دونوں کی گفتگو کی روشنی میں شریعت کیا کہتی ہے:

(۱) نمازِ جنازہ فرض نماز کے بعد فوراً ادا کی جائے، یا سنت نمازوں کے بعد؟

(۲) فرض نمازوں کے فوراً بعد نمازِ جنازہ اولی اور افضل ہے، یا سنت نمازوں کے بعد؟

(۳) اس افضلیت واولویت پر حرمین شریفین کے عمل کو دلیل میں پیش کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق: (۱،۲) فرض نماز سے پہلے یا بعد میں جو سنتِ موکدہ ہیں، وہ سنت ہونے کے باوجود حکماً فرائض ہی کے ساتھ ملحق ہیں؛ کیوں کہ سنن درحقیقت فرائض کا تتمہ وتکملہ ہوتی ہیں، یعنی: فرض نماز میں جو کمی وکوتاہی ہوجاتی ہے؛ سنن کے ذریعے اُس کی تلافی ہوتی ہے، یا فرض نماز میں کمال آتا ہے؛ اس لیے فتویٰ اس پر ہے کہ فرض نماز کے بعد پہلے سنن موکدہ ادا کی جائیں؛ پھر نمازِ جنازہ، سننِ موکدہ نمازِ جنازہ سے موخر نہ کی جائیں، بالخصوص جب کہ عام طور پر لوگ نمازِ جنازہ اور تدفین کے بعد، یا صرف نمازِ جنازہ کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، اور وہاں سننِ موکدہ بالکل نہیں پڑھتے۔

وفي شرح المُنية معزياً إلى حجّة الدّين البلخي: إنّ الفتوى على تأخير صلاة الجنازة عن سُنَّة الجُمعة وهي سُنَّةٌ، فعلى هذا تؤخر عن سُنَّة المغرب؛ لأنَّها آكدُ. (البحر الرائق، كتاب الصلاة، قبيل باب الأذان: ۱/ ٤٤٠، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

وفي البحر قُبيل الأذان عن الحلبي: الفتوى على تأخير الجنازة عن السُّنة، وأقرّه المُصنِّف، كأنّه إلحاقاً لها بالصَّلاة؛ لكن في آخر أحكام دين الأشباه: ينبغي تقديمُ الجنازة والكسُوف حتّى على الفرض ما لم يضق وقته، فتأمل. (الدرالمختار مع حاشية الطحطاوي عليه، كتاب الصلاة، باب العيدين: ۱/ ۳۵۲، ط: مكتبة الاتحاد، ديوبند)

قولُه: حتّى على الفرض:...... والذي يظهر أنّ الأوّل – من القولين لابن نجيم، والمُراد بالأوّل هو مافي البحر– هو المعتمد؛ لأنّه نصٌّ صريحٌ، وما في الأشباه بحث لايعارض النّص، وعبارة الأشباه: .... اهـ. وإذا علمتَ كلام الأشباه متأمّلاً تعلم أنه

لایصحّ ما وفق به المُحشّي – علی الدُّر وهو الشَّیخ إبراهیم الحلبي المدَّاري– وإنّما الوجه ماقلنا. (حاشیة الطحطاوي علی الدر: ۱/ ۳۵۲)

ومفادُه تقدیمُ الجُمعة علی الجنازة؛ للعلَّة المذکُورة؛ ولأنّها فرضُ عین؛ بل الفتوی علی تقدیم سُنَّتها علیها، ومرّ تمامُه في أوّل باب صلاة العید. (ردالمحتار، کتاب الصلاة، باب صلاة الجنازة: ۳/ ۱۳٦، ط: مکتبة زکریا دیوبند، ۵/ ۳۲۸، ت: الفرفور، ط: دمشق)

(۳) حرمین کے ائمہ مسلکاً حنبلی ہیں، وہ حرمین شریفین میں اپنے مسلک کے مطابق عمل کرتے ہیں؛ اس لیے حنفیہ کے لیے اُن کا عمل دلیل وحجت نہیں ہوسکتا؛ لہٰذا حرمین شریفین میں حنبلی مسلک کا عمل دلیل میں پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۱۹ھ = ۲۰۱۷/۳/۱۹ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۶۲۸/ تتمہ/ ن، ۶۳۱/ ن، ۱۴۳۸ھ)

نمازِ جنازہ کی وجہ سے مسبوق حضرات کی رعایت میں امام صاحب کا فرض نماز کے بعد لمبی دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلے میں کہ بکر کہتا ہے کہ ''ہمارے امام صاحب لمبی دعا کرتے ہیں، ان کی دعا ختم ہونے تک مسبوقین کی نماز پوری ہوجاتی ہے، کوئی خلل نہیں ہوتا اور فوراً نماز جنازہ ادا کردینے سے لوگ پھر سنتوں میں مصروف ہوتے ہیں؛ ورنہ سنتوں کے بعد نمازِ جنازہ پڑھنے کی صورت میں لوگ مسجد کے اندر غیبتوں میں لگ جاتے ہیں''۔

خالد اس کے جواب میں کہتا ہے (ہمارے علاقے میں تدفین کے بعد قبرستان میں دعا ہونے کے بعد مسجد میں بھی ایک دعا ہوتی ہے، جس کے انتظار میں بڑا مجمع رہتا ہے) کہ ''جنازے کی نماز فوراً ادا کرنے کے باوجود سنتیں پڑھ کر بھی لوگ دعائے ثانیہ تک آپس میں مسجد کے اندر بات چیت کرتے رہتے ہیں، اور اس میں شاید غیبت بھی ہوتی ہے''۔

بکر کہتا ہے کہ ''یہ طریقہ لوگوں کو اچھا لگتا ہے اور دوسری مساجد والے بھی اپنانے لگے ہیں''۔

اب مفتی صاحبان سے دریافت کرنا ہے کہ ان دونوں کی گفتگو کی روشنی میں شریعت کیا کہتی ہے؟ مسبوقین کی نماز میں خلل نہ آنے کی خاطر امام صاحب کا فرض کے بعد کی دعا کو لمبی کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق : جن فرض نمازوں کے بعد سنتِ موکدہ ہیں، یعنی: ظہر، مغرب، عشاء اور جمعہ، اُن میں سلام کے بعد مختصر (سری) دعا کر کے سنتوں میں مشغول ہو جانا چاہیے، سلام کے بعد طویل دعا یا اذکار میں لگ کر سنتِ موکدہ میں تاخیر کرنا خلافِ سنت اور برا ہے۔

پس صورتِ مسئولہ میں نمازِ جنازہ کے لیے مسبوق حضرات کی رعایت میں ظہر اور مغرب وغیرہ میں سلام کے بعد لمبی دعا نہیں کرنی چاہیے؛ بل کہ مختصر دعا پر اکتفا کرنا چاہیے، اور نمازِ جنازہ سنتِ موکدہ کے بعد پڑھنی چاہیے۔

(فإن كان بعدها) أي: بعد المكتُوبة (تطوُّعٌ يقوم إلى التَّطوُّع) بلا فصل؛ إلا مقدار مايقُول: اللّٰهم أنت السَّلامُ ومنك السَّلامُ تباركت يا ذا الجلال والإكرام، (ويكره تأخير السُّنة عن حال أداء الفريضة) بأكثر من نحو ذلك القدر إلخ. (غنية المتملي، آخر صفة الصلاة، ص: ۳۴۱، ط: المكتبة الأشرفيه، ديوبند)

و قد يوفّق بأن تحمل الكراهة على كراهة التَّنزيه، و مرادُ الحلواني عدم الإساءة؛ فإنّ العبارة المشهُورة عنه أنّه قال: لا بأس بأن يقرأ بين الفريضة والسُّنة الأوراد المشهُورة، في هذه العبارة إطلاقُها فيما خلافُه أولى، وهو قريبٌ من المكروه كراهة التّنزيه، فتحصل منه أنّ الأولى أن لايقرأ الأوراد قبل السُّنة، ولو فعل، لابأس به، ولا تسقط السُّنة بذلك، حتّى إذا صلاها بعد الأوراد تقع سُنّةً مؤدّاةً لاعلى وجه السُّنة. (المصدر السابق، ص: ۳۴۳-۳۴۴)

فالحاصلُ أنّ المستحبَّ في حقّ الكل وصل السُّنة بالمكتُوبة من غير تأخير؛ إلا أنّ الاستحبابَ في حقِّ الإمام أشدُّ حتّى يؤدّي تأخيره إلى الكراهة؛ لحديث عائشة رضي اللّٰه عنها، بخلاف المُقتدي والمنفرد إلخ. (المصدر السابق، ص: ۳۴۴)

ونحوه في الدُّر المُختار وردّ المُحتار (كتاب الصّلاة، آخر باب صفة الصّلاة: ۲/ ۲۴۶-۲۴۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۳/ ۴۲۴ - ۴۲۷، ت: الفرفور، ط: دمشق)

(القیامُ إلی) أداء (السُّنة) التي تلي الفرض (متصلاً بالفرض مسنون) غیر أنّه یستحبُّ الفصل بینهما، کما کان علیه السّلام إذا سلّم یمکث قدر ما یقول: اللّٰهم أنت السَّلامُ ومنك السَّلامُ إلخ، ثم یقُوم إلی السُّنة، قال الکمال: و هذا هو الذي ثبت عنه صلّی اللّٰه علیه وسلّم من الأذکار التي تؤخر عنه السُّنة، ویفصل به بینها و بین الفرض. اهـ .... (و) قال الکمال (عن شمس الأئمّة الحلواني) أنّه قال: (لابأس بقراءة الأوراد بین الفریضة والسُّنة)، فالأولی تأخیر الأوراد عن السُّنة، فهذا ینفي الکراهة، ویخالفُه ما في الاختیار: کلُّ صلاة بعدها سُنّةٌ یکره القعود بعدها والدُّعاء؛ بل یشتغل بالسُّنة؛ کي لایفصل بین السُّنة والمکتوبة إلخ. (مراقي الفلاح مع حاشیة الطحطاوي علیه، کتاب الصلاة، فصل في الأذکار الواردة بعد الفرض، ص: ۳۱۱ – ۳۱۳، ط: دارالکتب العلمیة، بیروت)

وفي الحجة: الإمامُ إذا فرغ من الظُّهر والمغرب والعشاء یشرع في السُّنة ولایشتغل بأدعیة طویلة، کذا في التّتارخانیة. (الفتاوی الهندیة، کتاب الصلاة، الباب الرابع في صفة الصلاة، الفصل الثالث في سنن الصلاة وآدابها وکیفیتها: ۱/۷۷، ط: المطبعة الکبری الأمیریة، بولاق، مصر)

والمُختارُ عند الحنفیَّة أن یشتغل بعد أداء المکتُوبة بالسُّنة، و یکره أن یشتغل بالدُّعاء والتَّسبیح قبل أداء السُّنة، والمُختارُ عند الأکثرین غیر الحنفیَّة أن یشتغل بعد المکتُوبة بالذِّکر الماثُورة ثم ینتقل، کذا في فتح الباري والقسطلاني. (العقائد السنیة، قبیل آخر الکتاب)

وانظر أیضاً فتح القدیر: (کتاب الصلاة، باب الوتر والنوافل: ۱/۳۱۳، ۳۱٤، ط: مصر) ومعارف السنن: (۳/۱۱۸ – ۱۱۹، ط: المکتبة الأشرفیة، دیوبند) وبهشتي زیور: (۱۱/۳۲ –۳۳، رقم المسألة: ۸،۷، ط: قدیم) والفتاوی المحمودیة: (۵/٦۸۱، ط: دابیل) وغیرها. فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۱۹ھ = ۲۰۱۷/۳/۱۹ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۶۲۸/تتمہ/ن، ۶۳۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

مردے جل کر راکھ ہو جائیں یا لاشیں مخلوط ہوں اور شناخت نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں نمازِ جنازہ کا کیا حکم ہے؟

سوال: اگر کسی مسلم شخص کا انتقال ہوجائے، اور اس کی لاش کسی وجہ سے نہیں ملی، مثلاً:

وہ شخص ہوائی جہاز سے سفر کر رہا ہو، اور وہ حادثے کا شکار ہو جائے، اور تمام مسافرین کی میت جل جائے، اس کی وجہ سے کسی کی شناخت نہ ہو پائے، تو اس صورت میں اس کی نمازِ جنازہ اور کفن دفن کی کیا صورت ہوگی؟ اور اس کی قبر بنانے کے سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر ہوائی جہاز حادثے کا شکار ہو جائے، اور تمام مسافرین جل کر بالکل راکھ ہو جائیں، تو ایسی صورت میں اُن کی نمازِ جنازہ ساقط ہے، اور اگر بالکلیہ راکھ نہیں ہوئے؛ بل کہ اعضاء موجود ہیں، تو اگر بدن کا نصف حصہ سر کے ساتھ ہے، یا اکثر حصۂ بدن موجود ہے، اور وہ مسلمان ہیں، تو اُن کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، اور ان کو قبر میں دفنائیں گے، اور اگر علامات وغیرہ کے ذریعے یہ شناخت نہ ہو پائے کہ میت مسلمان ہے یا غیر مسلم، تو ایسی صورت میں اگر غلبہ مسلمانوں کا ہے، تو ان پر نمازِ جنازہ کا حکم ہوگا، اور اگر غلبہ غیر مسلموں کا ہے، تو نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔

في البحر: وقيّد بعدم التّفسُّخ؛ لأنّه لا يصلّى عليه بعد التّفسُّخ؛ لأنّ الصّلاة شُرعت على بدن الميّت، فإذا تفسَّخ لم يبق بدنُه قائماً. (البحر الرائق، كتاب الجنائز، فصل: السلطان أحق بصلاته: ۲/ ۲۳۰، ط: رشيدية)

قال في الدّر المختار: فإن استووا غسلوا، واختلف في الصّلاة عليهم، ومحلّ دفنهم، كدفن ذمّية حُبلىٰ من مسلم، قالوا: والأحوطُ دفنُها علاحدة إلخ. (الدر المختار) **قولُه: اعتبر الأكثر أي: في الصّلاة بقرينة، فإن كان بالمُسلمين علامة فلا إشكال في إجراء أحكام المُسلمين عليهم؛ وإلا فلو المُسلمون أكثر صلّي عليهم، وينوي بالدُّعاء المسلمين، ولو الكفّار أكثر ...... لا يُصلّى عليهم؛ لكن يغسلون ويكفنون ويدفنون في مقابر المُشركين، وكيفيّة العلم بالأكثر أن يحصىٰ عدد المسلمين ويُعلم ما ذهب منهم و يعدّ الموتىٰ فيظهر الحال.** (الدّر المختار وردّ المحتار، كتاب الصّلاة، باب صلاة الجنازة: ۳/ ۱۰۹-۱۱۰، ط: رشيدية) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفر لہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۸/ ربیع الثانی/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفر لہٗ بلند شہری- فخر الاسلام عفی عنہ

(۴۳۷/ م، ۴۳۹/ م، ۱۴۳۸ھ)

اپنے اعضاء کسی دوسرے کو دان کر دینا کیسا ہے؟ اور کیا اس سے غسل یا نمازِ جنازہ میں کوئی مسئلہ ہوگا؟

سوال: (۱) کیا ہم اُورگن [Organ] یعنی: اعضائے جسم؛ دان کر سکتے ہیں؟

(۲) کیا جنازے اور غسل میں کوئی مسئلہ پیدا ہوگا؟

(۳) کیا عورت بھی اپنے اعضاء دان کر سکتی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱تا۳) انسان خواہ مرد ہو یا عورت، اپنے اعضاء واجزاء کا مالک نہیں ہوتا؛ لہٰذا کسی انسان کو شرعاً یہ حق نہیں کہ وہ اپنا کوئی عضو کسی کو دان کرے، فروخت کرے، یا وصیت کرے، خواہ وہ دوسرا کتنا ہی سخت ضرورت مند ہو۔

ولو قال له: لأقتُلنَّك أو لتقطعنّ يد هذا الرّجل، فقال له ذلك الرّجل: قد أذنت لك في القطع فاقطعه، و هو غير مُكره لايسع المُكره أن يقطع يده ؛ لأنّ هذا من المظالم، وليس المقصُود بالفعل أن يأذن في ذلك شرعاً ؛ لأنّه يبذل طرفه لدفع الهلاك عن غيره، و ذلك لايسعه، كما لو رأى مضطراً فأراد أن يقطع يد نفسه؛ ليدفعها إليه حتّى يأكلها، ولايسعه ذلك، فهذا مثله، ولو لم يوجد الإذن لم يسعه الإقدام على القطع، فكذلك بعد الإذن. (المبسوط للسرخسي، كتاب الإكراه، باب الإكراه على الزنا والقطع: ٢٤/٩٠-٩١، ط: دارالمعرفة، بيروت)

ومثله في الفتاوى البزازية (على هامش الفتاوى الهندية، كتاب الإكراه: ٦/١٣٢، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر)

مضطرٌّ لم يجد ميتة وخاف الهلاك، فقال له رجلٌ: اقطع يدي وكُلها، أو قال: اقطع منّي قطعة فكُلها، لايسعه أن يفعل ذلك، ولايصحّ أمره به، كما لا يسع للمُضطرّ أن يقطع قطعة من لحم نفسه فيأكل. (الفتاوى الخانية على هامش الفتاوى الهندية، كتاب الحظر والإباحة وما يكره أكله وما لا يكره وما يتعلق بالضيافة: ٣/٤٠٤)

ونقله عنه في الفتاوى الهندية: (كتاب الكراهية، الباب الحادي عشر في الكراهة في الأكل وما يتصل به: ٥/٣٣٨)

ویُشترط للأخذ بمُقتضی الضَّرورة........أن لایقدم المُضطر علی فعل لایحتمل الرُّخصة بحال. [کذا في البدائع: ۷/۱۷۷] (الموسوعة الفقهیة: ۲۸/۱۹۴– ۱۹۵)

الإکراہ علی المعاصي أنواعٌ: .... **نوعٌ یحرم فعله ویأثم بإتیانه، کالزِّنا وقتل مُسلم أو قطع عُضوہ إلخ.** (ردّالمحتار، کتاب الإکراہ : ۹/۱۸۴، ط: مکتبة زکریا، دیوبند، نقلاً عن الطّوري عن المبسوط)

مزید تفصیل اور دلائل کے لیے رسالہ: ''**اعضائے انسانی کی پیوند کاری**'' مولفہ: **حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ** (جواہر الفقہ جدید، جلد ہفتم، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند)، اور ''**انسانی اعضاء کا احترام اور طب جدید**'' مولفہ: **مولانا مفتی عبدالسلام صاحب چاٹگامی مدظلہ** کا مطالعہ فرمائیں۔

(۲) گردہ یا آنکھ وغیرہ دینے سے؛ دینے والے یا لینے والے کے غسل یا نمازِ جنازہ وغیرہ میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ کسی کا عضو اگر دوسرے کا جزو ہوجائے، تو وہ جملہ احکام میں اُسی کا ہوجاتا ہے؛ البتہ یہ لین دین شریعت میں حرام وناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۲/۱۱ھ = ۲۰۱۶/۱۱/۱۲ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۱۰۸/ن، ۱۲۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال: مفتیانِ کرام! کیا فرماتے ہیں علمائے دینِ شرع متین در مسائلِ ذیل:

(۱) نمازِ جنازہ کے بعد؛ یعنی: نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد فوراً میت کو سامنے رکھ کر؛ تدفین (دفن) سے پہلے اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟ یعنی: ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں دلائل کے ساتھ واضح کردیں۔

(۲) بعض لوگ کہتے ہیں کہ نمازِ جنازہ کے بعد فوراً میت کو سامنے رکھ کر؛ تدفین سے پہلے اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ثواب ہے، اس حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں: **فإذا صلَّیتم علی المیِّت فأخلصُوا له الدُّعاء.** (ابن ماجه، ص: ۱۰۹، مشکاة، ص: ۱۴۶، أبوداؤد: ۱/۱۰۰) اس دعا سے کون سی دعا مراد ہے؟ واضح کردیجیے۔ فقط والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی طور پر میت کے لیے دعا کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے؛ بل کہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔

لا يقُوم بالدُّعاء بعد صلاة الجنازة؛ لأنّه دعا مرة؛ لأنّ أكثرها دعاءٌ. (بزازية حاشية هندية: ۸۰/۵)

(۲) نمازِ جنازہ میں بھی میت کے لیے دعا ہوتی ہے، جو شریعت سے ثابت ہے، اور نماز؛ فرضِ کفایہ ہے؛ لیکن نمازِ جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد اجتماعی طور پر دعا کرنا شریعت سے ثابت نہیں ہے؛ لہٰذا یہ مکروہ ہے، اور بدعت ہے۔

وفي البزّازية: لا يقُوم بالدُّعاء بعد صلاة الجنازة. (هندية: ۸۰/۵)

وفي المرقاة: ولا يدعوا للميِّت بعد صلاة الجنازة؛ لأنَّه يشبه الزِّيادة في صلاة الجنازة. (مرقاة شرح مشكاة، باب المشي بالجنازة: ۱٤۹/٤، ط: أشرفية، ديوبند)

فإذا صلَّيتُم إلخ یہ حدیث صحیح ہے، مشکاۃ میں موجود ہے؛ لیکن اس حدیث سے مراد نمازِ جنازہ کے دوران تیسری تکبیر کے بعد دعا کرنا ہے، نہ کہ نمازِ جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنا، جیسا کہ اس حدیث کے تحت ہے:

قال ابنُ حجر: الدُّعاء للميِّت بخصُوصه بعد التّكبيرة الثَّالثة رُكنٌ. (مرقاة: ۱٤۱/٤)

اور مشکاۃ میں جہاں سوال میں مذکور حدیث موجود ہے، وہیں یہ بھی حدیث آتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ جنازہ پڑھاتے، تو تیسری تکبیر کے بعد یہ دعا پڑھتے:

اللّٰهم اغفر لحيِّنا وميِّتنا وشاهدنا إلخ ...... (مشكاة، باب المشي بالجنازة)

لہٰذا ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپ کی پیش کردہ حدیث میں جو دعا پڑھنے کا حکم ہے، اس سے مراد تیسری تکبیر کے بعد والی دعا ہے، جو پڑھی جاتی ہے، نماز کے بعد دعا کرنا کسی طرح ثابت نہیں ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کر دیا گیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۲ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۶۴/د، ۵۸۰/د، ۱۴۳۸ھ)

نمازِ جنازہ کے بعد مرحوم کا چہرہ دکھانے کا حکم

سوال: نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد کیا مرحوم کا چہرہ دکھایا جاسکتا ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللہ التوفیق: نمازِ جنازہ کے بعد باقاعدہ عمومی طور پر چہرہ دکھانا ممنوع ہے؛ اس لیے کہ اس کی وجہ سے بلا وجہ دفن میں تاخیر ہوتی ہے، اور اگر میت میں تغیر آجائے، تو ایک مسلمان کی ہتکِ عزت وہتکِ حرمت بھی لازم آجاتی ہے، جو کسی طرح مناسب نہیں، نیز سلفِ صالحین سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے؛ البتہ اگر اتفاقاً کسی قریبی عزیز کے اُسی وقت آنے کی وجہ سے چہرہ دکھایا جائے، جس کی بنا پر دفن میں تاخیر لازم نہ آئے، تو اس کی گنجایش ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد باقاعدہ چہرہ دکھانے کا اہتمام ثابت نہیں؛ البتہ ضرورت کی بنا پر کسی قریبی عزیز کو دکھانا منع نہیں، عام یا غیر متعلق آدمی کو نہ دکھایا جائے۔ (مستفاد: احسن الفتاوی: ۲۱۹/۴، کفایت المفتی: ۴۴/۴)

عن أبي هريرة رضي اللّٰه عنه عن النّبي صلى اللّٰه عليه وسلّم قال: أسرعوا بالجنازة، فإن تكُ صالحةً فخَيرٌ تُقدِّمونها إليه، وإن تكُ سوىٰ ذٰلك فَشَرٌّ تضعُونه عن رقابكم. (صحيح البخاري: ۱۷٦/۱، رقم: ۱۳۱۵، صحيح مسلم: ۹٤٤، إعلاء السّنن: ۲٤٥/۸) **عن أنس بن مالك رضي اللّٰه عنه قال: قبض إبراهيم بن النّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم، قال لهم النّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم: لا تدرجوه في أكفانه حتّى أنظر إليه.** (سنن ابن ماجه، باب النظر إلى الميت: ۱۰٦) **ويسرع في جهازه؛ لما رواه أبوداؤد عنه صلّى اللّٰه عليه وسلّم، لمّا عاد طلحة بن البراء وانصرف قال: ما أرى طلحة إلا قد حدث فيه الموت، فإذا مات، فأذنوني حتّى أصلّي عليه، عجِّلوا به؛ فإنّه لاينبغي لجيفة مسلم أن تحبس بين ظهراني أهله.** (شامي: ۸۳/۳، ط: زكريا) **سألتُ يوسف بن محمَّد عمَّن يرفع السِّتر عن وجه الميِّت ليراه؟ قال: لا بأس به.** (الفتاوى التاتارخانية: ۷۸/۳، رقم: ۳۷۵۸، ط:زكريا) **ويُبادر إلى تجهيزه ولا يؤخّر، فإن مات فجاءةً ترك حتّى يتيقن بموته.** (الفتاوى الهندية: ۱۵۷/۱) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۳/۱۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۹۸/تتمہ/ص، ۲۳۶/ص، ۱۴۳۸ھ)

قبر کے پاس نہ جا کر قبر کی مٹی ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈالنا اور اسے قبر میں ڈلوانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

کچھ علاقوں میں تدفین کے سلسلے میں یہ عمل چل پڑا ہے کہ قبر کھودنے کے بعد کچھ مٹی الگ کر لیتے ہیں، اور باقی مٹی کے ذریعے قبرستان میں آئے ہوئے لوگ تدفین کرتے ہیں، اور الگ کی ہوئی مٹی اُن لوگوں کے پاس بھیجی جاتی ہے، جو بہت دور سے آئے ہوئے ہیں، اور بہت جلد اُن کو واپس جانا ہے، یا جو لوگ انتہائی کمزور وضعیف یا بیمار ہیں کہ اُن کے لیے قبرستان آنا بہت مشکل ہے، تو اس طرح کے لوگوں کے پاس اس الگ کی ہوئی مٹی کو ایک برتن میں رکھ کر ایک خالی برتن کے ساتھ بھیجا جاتا ہے، پھر وہ جس طرح قبر میں مٹی ڈالی جاتی ہے، اسی طرح دوسرے خالی برتن میں تین مرتبہ دعا پڑھ کر مٹی ڈالتے ہیں، پھر وہ قبرستان لاکر قبر میں ڈال دی جاتی ہے۔

اب دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا اس طرح دور سے آئے ہوئے؛ جلد واپسی کا ارادہ رکھنے والوں، اور انتہائی ضعیف وکمزور یا بہت مشغول لوگوں کے پاس؛ قبر کی مٹی بھجوانا یا اُن کا منگوانا، اور پھر دوسرے خالی برتن میں دعا پڑھ کر مٹی ڈالنا، اور اُس مٹی کا قبر میں ڈالنا کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں اس کی گنجایش ہے یا نہیں؟ بہ راہِ کرم وضاحت کے ساتھ جواب مرحمت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: شریعت میں کسی کے انتقال پر مٹی ڈالنے کی جو فضیلت آئی ہے، وہ قبر میں مٹی ڈالنے سے متعلق ہے؛ اس لیے قبرستان سے دور رہتے ہوئے قبر سے نکلی ہوئی مٹی کسی برتن وغیرہ میں ڈالنا کافی نہیں؛ اگر چہ بعد میں وہ مٹی قبر میں ڈال دی جائے؛ بل کہ یہ محض لغو اور فضول عمل ہے، اگر آدمی کے پاس وقت اور ہمت ہو، یا صحت کے مدنظر قبرستان جانا ممکن ہو، تو قبرستان جا کر قبر کے پاس کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے مٹی ڈالے، اور اگر ہو سکے تو سرہانے کی طرف سے ڈالے، اور اگر موقع نہ ہو یا قبرستان تک جانے کی ہمت نہ ہو، تو برتن میں مٹی ڈال کر لغو اور فضول کام کرنے کی ضرورت نہیں؛ بل کہ اس سے بچنا ضروری ہے۔

ویستحبُّ حثیُه من قبل رأسه ثلاثاً. (الدّرالمختار مع ردّ المحتار، کتاب الصّلاة، باب صلاة الجنازة: ۳/ ۱٤۳، ط: مکتبة زکریا، دیوبند، ۵/ ۳٤۷، ت: الفرفور، ط: دمشق) قوله: ویستحبُّ حثیُه: أي: بیدیه جمیعاً. جوهرة. (ردّالمحتار) قوله: (من قبل رأسه ثلاثاً:) ؛ لما في ابن ماجه عن أبي هریرة أنّ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم صلّی علی جنازة، ثم أتی القبر فحثا علیه من قبل رأسه ثلاثاً. شرح المنیة. (المصدر السّابق)

قال حذیفة رضي اللّٰه عنه: کلُّ عبادة لم یتعبَّدها أصحابُ رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم فلاتعبدوها؛ فإنّ الأوّل لم یدع للآخر مقالاً، فاتَّقُوا اللّٰه یا معشر القُراء! وخُذوا بطریق من کان قبلکم، ونحوه لابن مسعُود أیضاً، وقد تقدَّم من ذلك کثیر. (الاعتصام، الباب الثامن في الفرق بین البدع والمصالح المرسلة والاستحسان، فصل: أمثلة عشرة إلخ : ۳/ ۵۳، ت: أبو عبیدة مشهور بن حسن آل سلمان، ط: مکتبة التوحید)

عن عائشة رضي اللّٰه عنها قالت: قال رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: من أحدث في أمرنا هذا مالیس منه فهو ردٌّ، متَّفقٌ علیه، وعن جابر رضي اللّٰه عنه قال: قال رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: أمَّا بعد! فإنَّ خیر الحدیث کتابُ اللّٰه، وخیر الهدي هديُ محمَّد صلّی اللّٰه علیه وسلّم، وشرّ الأمور محدثاتُها، وکل بدعة ضلالة، رواه مسلم. (مشکاة المصابیح، کتاب الإیمان، باب الاعتصام بالکتاب والسّنة، الفصل الأول، ص: ۲۷، ط: المکتبة الأشرفیة، دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۵ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۵ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۳۲/ن، ۶۶۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر سورۂ بقرہ کا اول وآخر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ کیا جب میت کو دفن کیا جاتا ہے، تو اُس کے بعد اُس کے سر اور پیر کی جانب کھڑا ہو کر تلقین کی غرض سے سورۃ الفاتحہ، البقرۃ کا پہلا رکوع، اور پھر البقرۃ کا آخری رکوع پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟ برائے کرم جواب جلد عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: میت کی تدفین کے بعد میت کے سرہانے کھڑے ہوکر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات: ﴿الٓمّٓ﴾ سے ﴿مُفلِحُون﴾ تک پڑھنا، اور پیر کی جانب سورۂ بقرہ کی آخری آیات: ﴿آمَنَ الرَّسُولُ﴾ سے اخیر آیت تک پڑھنا حدیث سے ثابت ہے، حدیث میں کچھ ضعف ہے؛ لیکن فضائلِ اعمال میں معتبر ہے، بیہقی اور طبرانی کی روایت میں فاتحۃ الکتاب کی صراحت ہے؛ البتہ مشکاۃ میں یہی روایت بہ حوالہ بیہقی فاتحۃ البقرۃ کے ساتھ مذکور ہے، اور ملا علی قاری نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے ﴿الٓمّٓ﴾ سے ﴿مُفلِحُون﴾ تک پڑھنا لکھا ہے، اور علامہ طیبی کے حوالے سے اس کی وجہ اور حکمت بھی لکھی ہے؛ اس لیے ممکن ہے کہ بیہقی اور طبرانی کی روایت میں مذکور؛ فاتحۃ الکتاب سے فاتحۃ البقرۃ ہی مراد ہو، ویسے ایصالِ ثواب کی غرض سے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کرنے میں بھی مضائقہ نہیں ہے۔

عن عبد اللّٰہ بن عمر –رضي اللّٰہ عنهما – سمعتُ النَّبي – صلّی اللّٰہ علیه وسلّم– یقُول: إذا مات أحدُکم فلا تحبسُوه، وأسرعوا به إلی قبره ولیقرأ عند رأسه بفاتحة الکتاب، وعند رجلیه بخاتمة البقرة في قبره، رواه البیهقي في شعب الإیمان: (رقم الحدیث: ۹۷۹٤) والطبراني في الکبیر: (رقم الحدیث: ۱۳۶۱۳)

قال الهیثمي في المجمع (٤٤۱۳): وفیه یحییٰ ابن عبد اللّٰہ الباهلي وهو ضعیفٌ.

و في المرقاة: ولیقرأ عند رأسه فاتحة البقرة، أي: إلی ﴿المفلحون﴾ و عند رِجْلَیه بخاتمة البقرة، أي: من ﴿آمن الرَّسُول﴾ إلخ، قال الطِّیبي: لعلّ تخصیص فاتحتها؛ لاشتمالها علی مدح کتاب اللّٰہ، وأنّه هدی للمُتَّقین، المُوصوفین بالخلال الحَمِیدة من الإیمان بالغیب، و إقامة الصَّلاة، و إیتاء الزَّکاة، و خاتمتها؛ لاحتوائها علی الإیمان باللّٰہ وملائکته وکُتُبه ورُسُلِه، وإظهار الاستکانة، وطلب الغفران والرَّحمة، والتَّولي إلی کنف اللّٰہ تعالی وحمایته، قال النّووي في الأذکار: قال محمّد بن أحمد المروزي: سمعتُ أحمد بن حنبل یقول: إذا دخلتم المقابر فاقرؤوا بفاتحة الکتاب والمعوَّذتین، وقُل هو اللّٰہ أحد، واجعلُوا ثواب ذلك لأهل المقابر؛ فإنّه یصل إلیهم.

(مرقاۃ: ۸۱/٤، باب دفن المیت) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۳/۱۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۲۰/تتمہ/ل، ۱۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

مسلمان کے جنازے کو دیکھ کر کھڑا ہونا کیسا ہے؟

سوال: کسی مسلم کے جنازے کو آتے ہوئے دیکھ کر کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: محض کھڑا نہ ہونا چاہیے۔ **ولا يقُوم من في المُصلّى لها إذا رآها قبل وضعها، ولا من مرَّت عليه، هو المُختار، وما وَرَدَ فيه منسُوخٌ، زيلعي اهـ.** (درمختار علی ہامش الفتاویٰ رد المحتار: ۵۹۸/۱، مطبوعۃ: نعمانیۃ)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱۱/۱ھ الموافق: ۲۰۱۷/۷/۲۵ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۱۳۵/ھ، ۱۲۳۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

غیر مسلم کے جنازے میں شریک ہونا، تعزیتی کلمات کہنا یا خراجِ عقیدت پیش کرنا کیسا ہے؟

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین ذیل کی محررہ صورت میں کہ مسلم یا غیر مسلم کی تعزیت کے اجلاس ونشست کے موقع پر؛ میت کے اظہارِ تعزیت کے لیے حاضرینِ نشست وشرکائے اجلاس تھوڑی دیر کے لیے بالکل خاموش کھڑے ہوجاتے ہیں، جس کو انگریزی میں (mourn) کہا جاتا ہے، کیا خراجِ عقیدت واظہار تعزیت کے لیے اس طرح خاموش کھڑا ہونا؛ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(۲) مسلم کے جنازے میں کسی غیر مسلم کا، اور غیر مسلم کے جنازے میں کسی مسلم کا شریک ہونا، از روئے شرع شریف جائز ہے یا نہیں؟

(۳) غیر مسلم کی موت کی خبر سن کر، یا غیر مسلم کے جنازے کو آتے ہوئے دیکھ کر "**إنَّا للّٰہ و إنَّا إلیہ راجعُون**" پڑھنا درست اور جائز ہے، یا پھر کیا کہنا اور کیا پڑھنا چاہیے، یا خاموش ہی رہنا چاہیے؟ از راہِ کرم مذکورہ بالا تینوں استفتاء کا مدلل ومفصل فتویٰ عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: **حامدا ومصلیاً ومسلماً**: **(۱)** یہ غیر اسلامی رسم ہے، اس کو اختیار کرنا جائز نہیں۔

(۲) غیر مسلم کے انتقال پر اس کے پس ماندگان کی تعزیت کر لینا، ان کو تسلی دے دینا، اس کی گنجایش ہے، اُن کے خاص مذہبی امور میں شرکت جائز نہیں، مثلاً: ارتھی اٹھانا، جلانے میں شریک ہونا وغیرہ امور سے اجتناب لازم ہے، اگر غیر مسلم جنازہ اٹھالے، یا قبرستان تک چلا جائے، مٹی دینے میں شریک ہو جائے، تو روکنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) خاموش رہے؛ البتہ خبر دینے والے کے سامنے؛ اظہارِ افسوس اور تعزیتی کلمہ کہے، تو مضائقہ نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　　۱/۱۱/۱۴۳۸ھ الموافق: ۲۵/۷/۲۰۱۷ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۱۳۵/ھ، ۱۲۳۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)
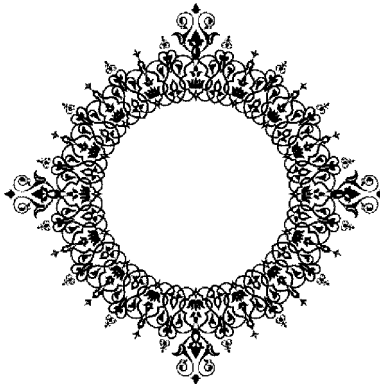
روزہ، اعتکاف اور زکاۃ وصدقے سے متعلق مسائل

کیا روزے کی حالت میں بڑے استنجے سے فارغ ہوکر مقام کو خشک کرنا ضروری ہے؟

سوال: ہمارے یہاں مولانا صاحب مسئلہ بتارہے ہیں کہ روزے کی حالت میں بڑے استنجے سے فارغ ہونے سے پہلے؛ پانی سے دھوکر اگر اس جگہ کو ٹیشو پیپر یا کپڑے سے نہیں سکھائیں گے، تو روزے میں شک ہوسکتا ہے کہ پانی بڑی طہارت کی جگہ سے (نہ پوچھنے کی وجہ سے) اندر جاکر روزہ خطرے میں پڑسکتا ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کے بارے میں تفصیل کیا ہے؛ بتائیں، ساتھی تذبذب میں ہورہے ہیں۔ جزاک اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: استنجے سے فارغ ہونے سے پہلے؛ پانی سے دھوکر مقام کو ٹیشو پیپر یا کپڑے وغیرہ سے سکھانا ضروری نہیں ہے، اس کی وجہ سے روزے میں کوئی شک پیدا نہیں ہوتا، فقہاء نے جو مسئلہ لکھا ہے، اُس کا مصداق دوسری صورت ہے، حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عباراتِ درمختار اور شامی اور فتح القدیر سے معلوم ہوا کہ استنجے میں تری کا اندر پہنچنا؛ جب مفسد صوم ہے کہ تری قدرِ محقنہ پر پہنچ جائے، اور ہم کو طبیبِ حاذق کے قول سے جن پر ہم کو اعتماد و وثوق ہے، معلوم ہوا کہ حالت احتقان میں رأسِ محقنہ پانچ چھ انگل اندر پہنچایا جاتا ہے، تب احتقان ہوسکتا ہے، اس سے کم میں نہیں''۔ انتہی؛ اسی وجہ سے علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ لکھنے کے بعد فرمایا ہے: **وھذا قلّما یکون ولو کان، فیُورثُ داءً عظیماً**؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مولانا صاحب نے جو مسئلہ بتایا ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔

قال الحصكفي: ولو بالغ في الاستنجاء حتّى بلغ موضع الحقنة فسد، وهذا قلّما يكون، ولو كان فيُورثُ داءً عظيماً. قال ابن عابدين رحمه اللّٰه: (قوله: حتّى بلغ موضع الحقنة) هي دواءٌ يجعل في خريطة من أدم، يقال لها: المحقنة. مغرب، ثم في بعض النُّسخ: المحقنة بالميم وهي أولى، قال في الفتح: والحدُّ الذي يتعلّق بالوصول إليه الفسادُ قدر المحقنة اهـ . أي قدر ما يصل إليه رأسُ المحقنة التي هي آلةُ الاحتقان، وعلى الأوّل فالمراد الموضع الذي ينصب منه الدَّواء إلى الأمعاء. (الدر المختار مع رد المحتار: ۲/ ۳۹۷، باب ما يفسد الصوم و مالا يفسد، ط: دار الفكر، بيروت، امدادالاحکام: ۳/ ۱۲۸)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴/ ۱۰/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۹۷۲/ تتمہ/ ص، ۶۱۷/ ص، ۱۴۳۸ھ)

روزے یا وضو میں دانت سے خون نکل آئے تو کیا حکم ہے؟

سوال: (۱) روزے میں سوتے ہوئے دانت سے خون نکلے، اور اس کا ذائقہ حلق میں بھی محسوس ہو، اور یہ نہیں معلوم ہو کہ خون کتنا اور کب تک نکلتا رہا ہے، بس سو کر اٹھنے پر حلق میں ذائقہ محسوس ہوا، اب اس روزے کا کیا حکم ہے؟

(۲) نیز وضو کرتے ہوئے بھی کلی کے بعد تھوکنے پر خون آتا ہے، کبھی کم اور کبھی زیادہ، اسے کیسے روکے؟ مسلسل کلیاں کرنے پر بھی آتا رہے، تو کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: (۱) دانت سے خون نکل کر؛ اندر داخل ہونے پر روزہ ٹوٹنے اور نہ ٹوٹنے کے سلسلے میں فقہاء نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر خون حلق تک ہی رہا، پیٹ تک نہیں پہنچا، تو روزہ بہ ہرحال نہ ٹوٹے گا، خواہ خون کم ہو یا زیادہ؛ البتہ اگر پیٹ میں پہنچ جائے، اور اس کا مزہ بھی محسوس ہو، تو بہ ہرحال روزہ ٹوٹ جائے گا، اگر مزہ محسوس نہ ہو، تو خون مغلوب ہونے کی صورت میں روزہ نہ ٹوٹے گا؛ ورنہ یعنی: اگر خون غالب یا برابر ہو،

تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اب آپ خوب غور کرلیں کہ آپ کے دانت سے خون نکلنے کی نوعیت کیا تھی؟ اور جس کی طرف ذہن جائے؛ مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں اس کے حکم پر عمل درآمد کریں؛ بل کہ بہتر ہے کہ غور وفکر کے بعد ایک صورت متعین کر کے کسی مفتی کے پاس جا کر حکم شرعی کی تعیین کرالیں، پھر اس کے مطابق روزے کی قضا یا عدم قضا کے بارے میں عمل کریں۔

أو خرج الدَّمُ من بين أسنانه، ودخل حلقه يعني: ولم يصل إلى جوفه ، أمَّا إذا وصل فإن غلب الدَّم أو تساويا فسد؛ وإلا لا؛ إلا إذا وجد طعمه. بزازية، واستحسنه المُصنِّف، وهو ما عليه الأكثر إلى آخر ما في رد المحتار. (درمختار مع الشامي: ۳/۳۶۷-۳۶۸، ط: زکریا)

(۲) اگر خون غالب ہو، اور تھوک مغلوب ہو، تو چوں کہ یہ ناقضِ وضو ہے؛ اس لیے جب تک خون اسی کیفیت کے ساتھ جاری رہے، آپ وضو نہ کریں؛ کیوں کہ وضو صحیح نہ ہوگا؛ بل کہ جب خون بند ہو جائے، تب وضو کریں۔

وينقضُه دمٌ مائعٌ من جوف أو فم غلب على بزاق؛ حكماً للغالب إلخ. (درمختار مع الشامي: ۱/۲۶۷، ط: زکریا) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱۱/۱۲ھ، یک شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۳۱۸/تتمہ/س، ۶۳۰/س، ۱۴۳۸ھ)

روزے میں گائینک جانچ (سونوگرافی، ٹرینس وغیرہ) کروانا اور انجکشن لگوانا یا آنکھ اور کان میں دوا ڈلوانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں:

(۱) روزے کی حالت میں گائینک جانچ؛ جیسے: سونوگرافی، ٹرینس (sonography trans) کیا جائز ہوگی؟

(۲) روزے کی حالت میں کیسے انجکشن لینا جائز ہے؟ آنکھ اور کان کی دوائی، جو ڈروپس میں آتی ہے، وہ روزے کی حالت میں استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما:الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: (۱) سونوگرافی کرانے کی گنجایش ہے؛ لیکن ٹرینس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس میں دوا پر مشتمل آلہ اندر داخل کیا جاتا ہے، اگر ایسا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے۔

(۲) آنکھ میں ڈالنے کی گنجایش ہے، کان میں نہیں، جن انجکشنوں کے ذریعے رگوں اور گوشت پوست میں دوا پہنچائی جاتی ہے؛ روزے کی حالت میں اُن کا استعمال جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

کئی محلے اور مساجد والے گاؤں کی صرف ایک مسجد میں اعتکاف؛ نیز اجرت دے کر اعتکاف میں بٹھانے کا حکم

سوال: جناب مفتی صاحب! مندرجہ ذیل مسئلے کا جواب مرحمت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں:

(۱) ایک بڑا گاؤں ہے، جس میں چھ محلے ہیں، ہر محلے کی الگ الگ مسجد ہے، اور ہر محلے والا اپنی ہی مسجد میں نماز پڑھتا ہے؛ پس بعض محلے کا اعتکاف پورے گاؤں کے لیے کافی ہوگا یا نہیں؟

(۲) نیز اجرت پر اعتکاف کے لیے بٹھانا کیسا ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: (۱) اگر وہ بڑا گاؤں ہے، جس کے کئی محلے ہیں، تو اس سلسلے میں دو اقوال ہیں:

۱۔ بعض کے نزدیک پورے گاؤں والوں پر سنت علی الکفایہ ہے؛ لہٰذا پورے گاؤں کی کسی مسجد میں بھی کوئی بیٹھ گیا، تو سنت کی ادائیگی ہو جائے گی۔

۲۔ اور بعض کے نزدیک ایک مسجد میں اعتکاف کرنا کافی نہیں؛ بل کہ ہر محلے کی مسجد میں

اعتکاف کرنا؛ سنت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے، اور عبادات میں چوں کہ احتیاط والی جہت کو ترجیح ہوتی ہے؛ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں اعتکاف کیا جائے۔

قال في الشَّامي: قولُه: أي: سنَّةٌ على الكفاية، نظيرُها إقامةُ التَّراويح بالجماعة، فإذا قام بها البعضُ سقط الطَّلب عن الباقين، فلم يأثمُوا بالمُواظبة على التَّرك بلا عُذر، ولو كان سُنَّة عين لأثمُوا بترك السُّنة المُؤكَّدة. (شامي: ۳/۴۳۰)

و في التَّراويح وهل المُرادُ أنَّها سنَّة كفاية لأهل كلّ مسجد من البلدة أو مسجدٍ واحدٍ منها أو من المحلّة ؟ ظاهرُ كلام الشَّارح الأوّل، واستظهر "ط" الثَّاني، ويظهر لي الثَّالث؛ لقول المُنية: حتّى لو ترك أهل محلّة كلّهم الجماعة فقد تركُوا السُّنة وأساؤوا. (شامي: ۲/۴۹۵)

(۲) اعتکاف عبادتِ مقصودہ ہے، اُس پر اجرت لینا دینا دونوں حرام ہیں۔

الأصل أنّ كلّ طاعةٍ يختصُّ بها المُسلم لا يجوز الاستيجار عليها عندنا. (شامي: ۹/۷۶) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۶/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۷۹۶/ل، ۸۱۵/ل، ۱۴۳۸ھ)

زکاۃ اصل ریٹ کے حساب سے یا جس ریٹ پر فروخت کیا ہے اس کے حساب سے نکالی جائے گی؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

سوال یہ ہے کہ مثلاً: ۲۰/روپے میں مال لاتا ہوں، کرایہ وغیرہ سب لگا کر ۲۷/روپے پڑتا ہے، اور میں ۳۲ یا ۳۵/روپے میں بیچتا ہوں، آں جناب بتائیں کہ ۲۰ یا ۲۷ پر؛ یا ۳۲ پر زکاۃ کا قانون لاگو ہوگا؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: جس ریٹ پر

آپ سامان فروخت کرتے ہیں، مثلاً: ۳۲ یا ۳۵؍روپے، اُس ریٹ کے حساب سے زکاۃ کی ادائیگی کا حکم ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۹؍۳؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۳۸؍ل، ۴۱۹؍ل، ۱۴۳۸ھ)

کیا زکاۃ اور قربانی کے نصاب کی تعیین کے لیے موجودہ دور میں بھی چاندی کا اعتبار ہوگا؟

سوال: نصابِ زکاۃ کے حوالے سے علماء جو راہ نمائی فرماتے ہیں، اُس کے مطابق ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے برابر مال رکھنے والا صاحبِ نصاب ہوجاتا ہے، اگر کسی کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا یا اس کے برابر مال نہ بھی ہو، تب بھی زکاۃ واجب ہے، اب صورتِ حال یہ ہے کہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت؛ آج کل کوئی چالیس ہزار کے آس پاس ہے، یہ اتنی رقم ہے کہ اکثر لوگوں کے پاس کسی نہ کسی صورت میں موجود ہوتی ہے، اور بہت لاچارگی اور شدید ضرورت مند ہونے کے باوجود صاحبِ نصاب بھی ہے، یہاں تک کہ ایک لاغر سی گائے کا مالک بھی صاحبِ نصاب ٹھہرتا ہے، چاہے گھر میں بچے بھوک سے بلک رہے ہوں، اور مزے کی بات یہ ہے کہ صاحبِ نصاب ہونے کی وجہ سے خود زکاۃ کا مستحق بھی نہیں ٹھہرتا، جب کہ قربانی کا معاملہ اس سے بھی زیادہ گمبھیر ہے؛ کیوں کہ چالیس پچاس ہزار کا مالک جتنی زکاۃ دے گا، قربانی پر اُس کے مقابلے میں چھ سے دس گنا زیادہ خرچ ہوجاتا ہے، اس ضمن میں ایک اور دل چسپ بات یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس ایک تولہ سونا ہو، اور جیب میں پانچ روپے ہوں، تو بھی وہ صاحبِ نصاب ٹھہرتا ہے کہ دونوں کو ملایا جائے تو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت حاصل ہوجاتی ہے، گویا ساڑھے سات تولہ سونے والی شرط؛ عملاً موقوف ہوچکی ہے، اور نصاب کی اصل معیار صرف چاندی ٹھہرتی ہے، پیسے یا کوئی اور مال ہو، تو چاندی کے حساب سے زکاۃ دینا پڑ رہا ہے، جب کہ سونا ہو، تو ایک تولہ سونا رکھنے والا بندہ بھی صاحب نصاب ہے؛ کیوں کہ ہر بندہ جیب میں سو پچاس روپے ضرور رکھتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ چاندی کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایسی تھی کہ ساڑھے باون تولہ چاندی اور ساڑھے سات تولہ سونے کی قیمت برابر تھی، جب کہ آج کل زمین وآسمان کا فرق ہے، کیا اب زکاۃ وقربانی کا نصاب صرف سونے کو قرار نہیں دیا جاسکتا؟ اس حوالے سے راہ نمائی درکار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: چاندی اور سونا؛ دونوں کا نصاب منصوص اور مقرر ہے، یعنی: اگر کسی کے پاس صرف سونا یا صرف چاندی ہو، دیگر اموالِ زکاۃ بالکل نہ ہوں، تو چاندی اور سونے کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا، اور اگر سونے یا چاندی کے علاوہ کرنسی یا مالِ تجارت ہو، تو فقہاء نے یہ ضابطہ تحریر کیا ہے کہ دراہم یا دنانیر کسی سے بھی قیمت مقرر کی جاسکتی ہے؛ الا یہ کہ ایک سے نصاب کو پہنچتا ہو، دوسرے سے نہیں، تو پہلے سے نصاب مقرر کرنا متعین ہوجاتا ہے۔

ثُمَّ في تقويم عُروض التِّجارة التَّخيير، يقوِّم بأيِّهما شاء من الدَّراهم والدَّنانير؛ إلا إذا كانت لا تبلُغ بأحدهما نصاباً، فحينئذٍ تعيَّن التَّقويم بما يبلُغ نصاباً، هكذا في البحر الرائق. (الفتاوى الهندية: ۱/۱۷۹)

اس لیے اگر کسی کے پاس اموالِ زکاۃ ہوں، اور سونے کی قیمت کے اعتبار سے نصاب کو نہ پہنچتے ہوں؛ لیکن چاندی کی قیمت کے اعتبار سے آدمی صاحبِ نصاب ہوجاتا ہو، تو زکاۃ وقربانی کے نصاب میں اسی کا اعتبار ہوگا، اس کے علاوہ جو اشکال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دونوں نصابوں کی مالیت تقریباً برابر تھی؛ اب نہیں رہی، اس لحاظ سے اب نصاب سونے سے مقرر ہونا چاہیے، تو اس تعلق سے عرض یہ ہے کہ یہ محض حکمت ہے؛ علت نہیں جو موجب ہو، اور جب چاندی کا نصاب من جانبِ شرع مقرر ہے، تو اس کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۹/۳ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - وقار علی غفرلہٗ

(۱۴۰۴/تتمہ/ل، ۱۰۶۳/ل، ۱۴۳۸ھ)

حاجت اصلیہ کے لیے جمع شدہ رقم پر زکاۃ کا حکم

سوال: ایک شخص نے ایک جگہ خرید کر؛ گھر بنانے کے واسطے پیسہ جمع کرنا شروع کیا،

جگہ خریدنے کے لیے کم سے کم بیس لاکھ روپیہ جمع کرنا پڑتا ہے، اور پھر ایک سادہ گھر بنانے کے لیے ہمارے یہاں کم سے کم پندرہ لاکھ تقریباً لگتا ہے، تو پوچھنا یہ ہے کہ یہ شخص جو پیسہ جگہ خریدنے کے لیے اور گھر بنانے کے لیے جمع کررہا ہے، اس پیسے میں زکاۃ ادا کرنا پڑے گا یا نہیں؛ کیوں کہ یہ دونوں کام حاجتِ اصلیہ ہیں۔ برائے مہربانی راہ نمائی فرمائیں، بہت کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: صورتِ مسئولہ میں اگر وہ شخص سال گذرنے سے پہلے پہلے اپنی جمع کردہ رقم سے رہایش کے لیے گھر بنانے کی نیت سے جگہ خرید لیتا ہے، تب تو اس پلاٹ پر زکاۃ واجب نہیں؛ لیکن اگر مذکورہ مقصد کے لیے جمع کردہ رقم پر سال پورا ہوگیا، اور ابھی تک اس پیسے سے پلاٹ نہیں خریدا، اور وہ بہ قدرِ نصاب ہے، تو سال گذرنے پر اس جمع شدہ رقم کی زکاۃ واجب ہے۔

إذا أمسكه لينفق منه كلّ ما يحتاجه فحال عليه الحول، وقد بقي معه منه النِّصاب، فإنَّه يُزكّي ذلك الباقي، وإن كان قصدُه الإنفاق منه أيضاً في المستقبل؛ لعدم استحقاقه صرفه إلى حوائجها الأصليَّة وقت حولان الحول. (شامي زكريا: ۱۷۹/۳) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۸/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۵۴/م، ۲۳/م، ۱۴۳۸ھ)

مکان کرایے پر دینے کی صورت میں زکاۃ کا حکم

سوال: امید کہ آپ تمام احباب اللہ کے فضل وکرم سے بہ خیر ہوں گے، میں اور ہمارا چھوٹا بھائی؛ والدین ہی کے مکان میں رہتے ہیں، میری فیملی نیچے (گراؤنڈ فلور) پر، اور میرے بھائی کی فیملی اوپر (فرسٹ فلور) پر رہتی ہیں، والد صاحب کا آٹھ سال پہلے انتقال ہوا، اور حال ہی میں دو ماہ پہلے والدہ صاحبہ بھی گذر گئیں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے والدین کی اور سارے مسلمان مرحومین کی مغفرت فرمائیں (آمین)

الحمدللہ میں پچھلے تین سال سے گھر بنا رہا ہوں جس کا خرچ ۵۵ تا ۶۰/لاکھ روپے ہوا ہے، یہ خرچ زمین کی قیمت اور تعمیرات کا خرچہ ملا کر ہے، ہمارے چھوٹے بھائی نے بھی ایک چھوٹا سا گھر خریدا، جس کی

قیمت تقریباً ۱۵/لاکھ روپے ہے، ہم لوگ اپنے اپنے گھر کو کرایے پر دینا چاہتے ہیں، ان حالات میں زکاۃ کا مسئلہ کیا ہوگا؟ کرایے کی آمدنی پر زکاۃ دینی ہوگی؟ جو مکان کے بنانے اور خریدنے میں جو خرچ لگا: کیا اس پر بھی زکاۃ دینی پڑے گی؟ مہربانی فرما کر ان مسائل کا حل بتادیجیے۔ جزاک اللہ خیرا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آدمی نے جو مکان کرایے پر دینے کے لیے بنایا، اور اسے کرایے پر دیتا ہے، تو اس مکان کی ویلیو یا لاگت پر زکاۃ واجب نہیں ہوتی ہے؛ بل کہ ماہانہ یا سالانہ جو کرایہ حاصل ہوتا ہے، اس پر زکاۃ واجب ہوتی ہے؛ بہ شرطے کہ حاصل شدہ آمدنی میں وجوبِ زکاۃ کی تمام شرطیں پائی جائیں، مثلاً: سارا کرایہ تنہا یا دوسرے نصاب کے ساتھ مل کر؛ بہ قدرِ نصاب ہو، اور سال گذر جائے وغیرہ؛ اس لیے آپ نے کرایے پر دینے کے لیے جو مکان تعمیر کرایا ہے، اس کی ویلیو یا لاگت پر زکاۃ واجب نہ ہوگی؛ بل کہ اسے کرایے پر دے کر آپ کو ماہانہ یا سالانہ جو کرایہ حاصل ہوگا، وہ عام آمدنی کے حکم میں ہوکر؛ اُس پر حسبِ شرائط وضابطہ زکاۃ واجب ہوگی۔

ولو اشترى قُدوراً من صفر يُمسكها أو يُؤاجرها لا تجبُ فيها الزّكاة، كما لا تجب في بُيوت الغلّة. (الفتاوى الخانية على هامش الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۵۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۰/۶/۱۴۳۸ھ = ۲۰/۳/۲۰۱۷ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۹۸/ن، ۶۵۰/ن، ۱۴۳۸ھ)

کنسٹرکشن کمپنی کی کن چیزوں پر زکاۃ ہے اور کن پر نہیں؟

سوال: آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کنسٹرکشن کمپنی کی زکاۃ کیسے نکالیں گے؟

کمپنی میں جو سامان ہوتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) کنسٹرکشن کے کام میں ڈائریکٹ استعمال ہونے والا سامان؛ یعنی: سیمنٹ، سریا، بجری وغیرہ۔ (۲) کنسٹرکشن کے کام میں مدد دینے والا سامان؛ یعنی: شٹرنگ پلیٹ، مکسر مشین، مشینری، وغیرہ۔ (۳) کنسٹرکشن کے کام میں مدد دینے والے سامان کی مرمت وغیرہ کرنے والا سامان؛ یعنی: ویلڈنگ راڈ، نٹ بولٹ، وغیرہ۔

اب ان میں سے کس سامان پر زکاۃ ہوگی اور کس پر نہیں ہوگی؟

اس کے علاوہ کمپنی جو اپنے کلائنٹ کا سول کا کام کرنے کے عوض بل بنا کر دیتی ہے، اور کلائنٹ اس بل کے عوض رقم دیتا ہے؛ لیکن یہ رقم متعین نہیں ہوتی، اس میں کٹوتی ہوتی رہتی ہے، اور ادائیگی کا بھی کوئی شیڈول نہیں ہوتا کہ ایک مہینے میں دے گا یا دو مہینے میں، اب جو رقم بل کے مطابق ہم نے یکم رمضان کو لینی ہوگی، کلائنٹ سے اس کو زکاۃ میں شامل کریں گے کہ نہیں؟ حالاں کہ وہ رقم ابھی ہمیں ملی نہیں ہوتی، مستقبل میں ملنی ہوگی، اسی طرح کمپنی نے کچھ انویسٹمنٹ وغیرہ کی ہوتی ہے پلاٹ یا دکان کی، تو پوچھنا یہ ہے کہ پلاٹ جو برائے فروخت ہوگا، اس کی قیمتِ خرید پر زکاۃ دیں گے کہ قیمتِ فروخت پر؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: کنسٹرکشن کی دوسری اور تیسری قسم کے سامانوں پر زکاۃ نہیں؛ کیوں کہ وہ آلاتِ اکتساب کے قبیل کی چیزیں ہیں؛ البتہ پہلی قسم کی مالیت اور اس کے منافع پر زکاۃ ہے؛ کیوں کہ سیمنٹ، سریا، بجری وغیرہ یہ چیزیں سامانِ تجارت میں داخل ہیں، تاریخِ زکاۃ تک کام کا جو معاوضہ وصول ہوجائے، اس کی زکاۃ حسبِ شرائط نکالیں گے، اور جو اُجرت سال پورا ہونے کے بعد وصول ہو، اس کا حساب آیندہ سال ہوگا، کمپنی جو انویسٹمنٹ کرتی ہے؛ یعنی: پلاٹ یا دکان خریدتی ہے، اگر وہ بیچنے کی نیت سے خریدتی ہے، تو اس پلاٹ یا دکان کی مالیت پر زکاۃ ہوگی، اور قیمتِ فروخت کا اعتبار ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۲؍شوال/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۲۱۳/م، ۱۱۴۱/م، ۱۴۳۸ھ)

پی ایف، انشورنس پالیسی ومختلف اکاؤنٹس میں جمع شدہ رقم کی زکاۃ کا حکم

سوال: (۱) پی ایف کی زکاۃ کا حساب کیسے کیا جائے گا؟ پی ایف میں ملازم اور کمپنی کی طرف سے مساوی طور پر پیسے جمع ہوتے ہیں، جیسے کہ اگر ملازم نے ۱۰۰۰۰/روپے جمع کیے، تو کمپنی بھی اتنی رقم جمع کرتی ہے، پی ایف میں پیسے وقت کے ساتھ ساتھ جمع ہوتے ہیں۔

(۲) کیا صرف ملازم کی طرف سے جمع شدہ رقم کی زکاۃ ادا کی جائے گی؟ یا ملازم اور کمپنی دونوں کی جمع شدہ ٹوٹل رقم کی زکاۃ نکالی جائے گی؟

(۳) کیا پیسے جمع کرتے وقت اس کی زکاۃ ادا کی جائے گی؟ یا پیسے نکالتے وقت اس کی زکاۃ ادا کی جائے گی؟

(۴) کیا ہر سال کی جمع شدہ پی ایف رقم کی زکاۃ ادا کی جائے گی؟ یا جب سے پی ایف شروع ہوا ہے، تب سے پچھلے تمام سالوں میں جمع شدہ رقم کی زکاۃ ادا کی جائے گی؟

(۵) انشورنس پالیسیوں کی زکاۃ کا حساب کیسے کیا جائے گا؟

(۶) کیا ہم تمام سیونگ اور سرمایہ کاریوں (میوچل فنڈ، فکس ڈپازٹ، رقم واپسی) کی زکاۃ کا حساب ایک ساتھ کر سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: **(۱-۴)** پی ایف کی رقم پر زکاۃ واجب نہیں ہے، زکاۃ اپنی مقبوضہ ومملوکہ رقم پر واجب ہوتی ہے، پی ایف کی رقم ابھی ہماری ملک نہیں ہے، ابھی صرف اُس کا استحقاق ہمیں حاصل ہے، ہم اس رقم کے مالک اُس وقت بنیں گے، جب وہ ہمارے قبضے میں آجائے گی، اسی وقت زکاۃ واجب ہوگی۔

ومنها: المِلكُ التَّام، وهُو ما اجتمع فيه المِلكُ واليَدُ، وأمَّا إذا وجد المِلكُ دون اليَد كالصّداق قبل القَبض، أو وجد اليَدُ دون المِلك، كمِلك المُكاتب والمديون لا تجب فيه الزّكاة. (هندية، كتاب الزكاة، الباب الأول: ۱/۲۳۳، ط: اتحاد، ديوبند)

(۵) انشورنس پالیسی میں جس قدر رقم آپ نے جمع کی ہے، اُسی پر زکاۃ واجب ہوگی، اضافے والی رقم پر زکاۃ واجب نہ ہوگی۔

(۶) سیونگ بینک میں یا میوچل فنڈ میں جس قدر رقم آپ نے جمع کی ہے؛ آپ سب کا حساب ایک ساتھ کر کے بھی اکٹھا زکاۃ نکال سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۳۵/ب، ۱۷۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

ماہی پروری (مچھلی پالن) کے سلسلے میں اسلامی تعلیمات اور زکاۃ کا حکم

سوال: السلام علیکم! ہم نے پانچ سال کے لیے حکومت سے ماہی پروری کے لیے لیز پر ایک ڈیم لیا ہے، ہم جاننا چاہیں گے کہ:

(۱) ماہی پروری کے حوالے سے اسلام میں خاص ہدایات کیا ہیں؟ یعنی: کیا کرنا چاہیے، اور کیا نہیں کرنا چاہیے، یا کیا حلال ہے، اور کیا حرام ہے؟

(۲) کسی نے ہمیں بتایا کہ ہفتے میں کسی ایک دن (جمعرات کی رات) مچھلی پکڑنا جائز نہیں ہے، بہ راہِ کرم وضاحت فرمائیں۔

(۳) ماہی پروری سے حاصل ہونے والی انکم پر زکاۃ کا حساب کیسے ہوگا؟

(۴) ڈیم میں مچھلی کی نشوونما کے لیے کوئی دعا یا ذکر بتائیں۔

(۵) مچھلی پکڑنے کے لیے کوئی دعا بتائیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: **(۱)** ماہی پروری کا عمل جائز ہے، مچھلی کو پاک صاف چیزیں کھلائیں، اور اچھا ہے کہ جس ڈیم یا تالاب میں پرورش کریں، اس کی صفائی کا خیال رکھیں، جو مچھلی پانی سے زندہ پکڑی جائے، اور باہر نکالنے کے بعد مر جائے، تو اس کا کھانا بلا کراہت جائز وحلال ہے، اور جو مچھلی بلا خارجی سبب کے از خود پانی میں مر جائے، اس کا کھانا مکروہ ہے۔

ولا يحِلُّ حيوانٌ مائي إلا السَّمك ...... غير الطَّافي على وجه الماء الذي مات حتف أنفه. (الدر المختار مع الشامي، كتاب الذبائح: ۹/۳۷۲، ط: أشرفية، ديوبند)

(۲) جس نے ایسا بتایا یہ غلط ہے، ہماری شریعت میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، ہفتے میں کسی دن بھی مچھلی پکڑ سکتے ہیں۔

(۳) اگر مچھلی فروخت کرنے کی نیت سے خرید کر پرورش کی جائے، تب مچھلی کی مالیت پر زکاۃ ہوگی؛ بہ شرطے کہ وہ نصاب کو پہنچ جائے، اور اس کا حساب سال مکمل ہونے پر لگا لیا جائے کہ کل کتنی قیمت کی مچھلیاں ہوگئی ہیں، پھر چالیسواں حصہ زکاۃ میں نکال دیا جائے۔

(۴،۵) اس بارے میں کوئی خاص دعا منقول نہیں، کاروبار میں خیر وبرکت کے لیے آیۃ الکرسی پڑھا کریں، اور بسم اللہ پڑھ کر مچھلی پکڑنے کا عمل شروع کریں، ان شاء اللہ برکت ہوگی۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۲۰/ربیع الثانی/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۵۷۶/تتمہ/م، ۵۶۷/م، ۱۴۳۸ھ)

باغ کا عشر بائع کے ذمے ہے یا مشتری کے ذمے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ مسئولہ کے بارے میں:

باغ بیچے جانے کی صورت میں عشر کس پر واجب ہوتا ہے؛ مالک پر یا خریدار پر؟ ایک آدمی کہتا ہے کہ اگر میوہ بہت چھوٹا ہو، کھانے کے لائق نہ ہو، اور بیچا جائے، تو اس صورت میں عشر خریدار پر واجب ہے؛ ورنہ بیچنے والے پر، یہ کہاں تک صحیح ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اراضیِ ہند پر عشر نہیں ہے؛ الا یہ کہ کوئی زمین ایسی ہو، جس کا عشری ہونا آباواجداد سے چلا آرہا ہو، تو اس میں عشر واجب ہے، صورتِ مسئولہ میں اگر باغ کی زمین ایسی ہے کہ اس کا عشری ہونا پہلے سے چلا آرہا ہو، تو باغ بیچنے کی صورت میں بھی عشر: مالک پر ہے، نہ کہ خریدنے والے پر، واضح رہے کہ بدوّ صلاح؛ یعنی: باغ کے پھل کے قابلِ انتفاع ہونے سے پہلے فروخت کرنا ناجائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱/۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ۔محمد مصعب عفی عنہ

(۲۱۶/د، ۱۱۳/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا زکاۃ یا صدقے کی رقم ہاسپٹل کی تعمیر وغیرہ میں لگا سکتے ہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں:

ٹرسٹ ہاسپٹل بنانے کے لیے؛ کیا زکاۃ یا صدقے کے پیسے کا استعمال کرسکتے ہیں؟

اگر استعمال کرنا جائز ہو، تو کیا صاحبِ مال اُن ہسپتال میں اپنا علاج کرواسکتے ہیں؟ کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ غریب اور صاحبِ مال پیشنٹ کے لیے جو فیس لی جاتی ہو، وہ الگ الگ ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: زکاۃ؛ اسی طرح دیگر صدقاتِ واجبہ کی رقم غریب مستحقینِ زکاۃ جو مسلمان بھی ہوں، اُن میں تملیکاً دینا ضروری ہے؛ ورنہ زکاۃ ادا نہ ہوگی؛ لہٰذا ہسپتال کی تعمیر اور دیگر لوازمات میں زکاۃ اور صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہارشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س،۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

غریبوں کے لیے ہسپتال کی تعمیر وغیرہ میں زکاۃ کا پیسہ لگانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرعِ متین مصرفِ زکاۃ کے بارے میں:

ہمارے شہر میں غریب ونادار لوگوں کی ایک بڑی آبادی ہے، ان حضرات کے علاج معالجے میں معاشی بحران کی وجہ سے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض اوقات تو دواؤں کے دست یاب نہ کرسکنے کی بنا پر؛ یا تو بیماری حد سے زیادہ سخت ہوجاتی ہے، یا پھر موت ہی واقع ہوجاتی ہے، اس پریشانی کو دیکھتے ہوئے ایک چیریٹبل ہسپتال قائم کرنے کا فیصلہ ''یوا سمیتی'' نے لیا، جس کی تعمیر کی جارہی ہے، مسئلہ یہ ہے کہ جو حضرات اس کارِ خیر میں زکاۃ کی مد سے تعاون کے خواہش مند ہیں، اُن کے عطیے کو کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟

(۱) کیا بستر (بیڈ) وغیرہ اس مد سے خریدے جاسکتے ہیں؟

(۲) کیا دواؤں کی تقسیم پر اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے؟

(۳) کیا اس مد سے آلات وغیرہ خریدے جاسکتے ہیں؟

(۴) کیا ڈاکٹروں کی فیس اس عطیے سے ادا کی جاسکتی ہے؟

اگر نہیں؛ تو پھر ہسپتال اور مریضوں پر کون کون سے انداز سے؛ یہ عطیات صرف کیے

جاسکتے ہیں؟ برائے کرم حدیث وقرآن کی روشنی میں راہ نمائی فرما کر مشکور فرمائیں، نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: (۱-۴) آپ کے شہر میں غرباء کے علاج ومعالجے کے لیے ہسپتال قائم کرنے کی ضرورت ہے، تو ہسپتال قائم کر سکتے ہیں؛ لیکن ہسپتال کی تعمیر میں، یا بیڈ وآلات وغیرہ کی خریداری میں، یا ڈاکٹروں کی فیس کی ادائیگی میں بہ راہِ راست زکاۃ کی رقم استعمال کرنا درست نہیں، زکاۃ کی ادائیگی کے لیے مستحقین کو دے کر مالک بنادینا شرط ہے، اگر کوئی صاحبِ نصاب شخص کسی غریب ومستحق مریض کو زکاۃ کی رقم سے دوا خرید کر دے کر؛ مریض کو مالک بنادے، تو اس کی اجازت ہے، اور مذکورہ مدوں کے لیے امداد وعطیات کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے۔

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ. إلخ﴾ (القرآن) ويُشترط أن يكون الصَّرف تمليكاً لا إباحةً كما مرّ، لايُصرف إلى بناء نحو مسجدٍ ولا إلى كفن ميِّت وقضاء دينه إلخ. (در مختار مع الشامي: ۳/۲۶۳، ط: أشرفي، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۸/رمضان/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۱۲۳/م، ۱۱۶۵/م، ۱۴۳۸ھ)

کیا مسجد میں بھیک مانگنے والے کو دینا جائز ہے؟

سوال: مسئلہ ذیل کے متعلق حضرات علمائے کرام کیا فرماتے ہیں کہ زید کہتا ہے:

مسجد میں اپنی ذات کے لیے سوال کرنا ناجائز وحرام ہے؛ اس لیے مساجد میں جو سائلین (فقراء ومساکین) سوال کرتے ہیں، وہ شرعاً ناجائز ہے، اور اُن کی امداد کرنے والے بھی گناہ کے مرتکب ہوں گے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

(۱) کیا اُن سائلین کا مساجد میں یوں نماز کے بعد اعلان کرکے مانگنا ناجائز ہے؟

(۲) اگر ناجائز ہے، تو کیا ان کی امداد کرنے والے بھی گناہ میں شامل ہوں گے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق: (۱-۲) مسجد اللہ کا گھر ہے، اور ہماری مقدس عبادت گاہ ہے،

اللہ کے گھر کے احترام وآداب؛ احادیث میں بتائے گئے ہیں، مثلاً: یہاں شور مچانا، مسجد میں بیٹھ کر کمائی کمانا، مسجد میں سونا، چھوٹے بچوں کا داخل ہونا، پاگل ومجنون کا آنا، ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل ہونا، عورت کا حیض کی حالت میں مسجد میں آنا؛ ممنوع فرمایا گیا ہے، انھی ممنوعات میں سے مسجد میں اپنی ذاتِ خاص کے لیے سوال کرنا بھی ہے، یعنی: مسجد کے اندر کسی کا مقتدیوں سے بھیک مانگنا ممنوع ہے، مسجد اللہ کا گھر ہے، اللہ کے گھر میں آکر اللہ کے علاوہ سے مانگنا؛ یہ مسجد کے احترام وادب کے خلاف ہے، جو مسجد میں مانگے، اسے دینا ہی نہ چاہیے، اللہ کے گھر میں آکر کوئی شخص اللہ سے نہ مانگے؛ بل کہ دوسروں سے مانگے؛ یہ غیرتِ خداوندی کے خلاف ہے، یہ بات اللہ کو پسند نہیں، جس طرح ہمارے گھر میں کچھ معزز مہمان آئیں، اور کوئی شخص ہم سے سوال کرنے کے بجائے مہمانوں سے سوال کرے، تو ہمیں غیرت آئے گی، اس کا یہ فعل ہمیں سخت ناپسند ہوگا، اللہ تعالیٰ تو بہت ہی زیادہ غیرت والا ہے، اُس کو یقیناً یہ بات پسند نہ ہوگی۔

عن أبي هُريرة قال: قال رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: من لم يسأل اللّٰه يغضب عليه. (رواه الترمذي، أبواب الدعوات: ۲/۱۷۵، ط: اتحاد، ديوبند)

و يُكره فيه السُّؤال، ويكره الإعطاء مطلقاً، وقيل: إن تخطّٰى. (الدّر المختار، كتاب الصلاة، باب ما يفسد الصلاة وما يكره فيها: ۲/۴۳۳، ط: زكريا، ديوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۳۴۳/ب، ۳۵۳/ب، ۱۴۳۸ھ)
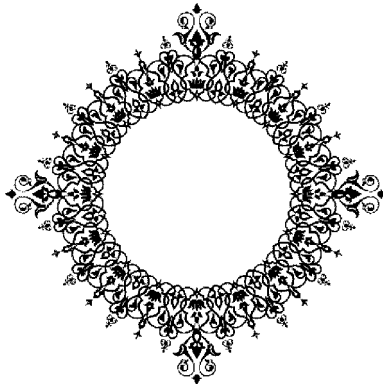
حج اور عمرے سے متعلق مسائل

نفلی حج وعمرہ افضل ہے یا مساکین پر خرچ کرنا؟

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ فرض حج کرنے کے بعد؛ بار بار حج وعمرہ کرنے کے بجائے غرباء ومساکین کی مدد کرنا زیادہ افضل ہے، کیا ایسا کہنا درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک فرض حج ادا کرنے کے بعد بھی حاجی کو ہر ۴،۵/سال کے بعد نفلی حج اور عمرے کے لیے جاتے رہنا چاہیے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی پہلے اسی نظریے کے قائل تھے؛ لیکن جب اُنھوں نے متعدد حج نفلی کیے، اور حج میں جو مشقت دیکھی، تو پھر اپنی رائے بدل دی، اور فرمایا کہ غریبوں کی مدد کرنے سے نفلی حج کرنے میں زیادہ فضیلت اور اجر وثواب ہے، حج سے آنے کے بعد غریبوں کی مدد بھی کرے، حج کرنے سے اللہ تعالیٰ مال داری نصیب فرماتا ہے، اس طرح دونوں کام ہو سکتے ہیں۔

ورجَّح في البزَّازية أفضليَّة الحجّ؛ لمشقة المال والبدن جميعاً، قال: وبه أفتى أبوحنيفة حين حجَّ وعرف المشقَّة، قال الشَّامي تحت قوله: (ورجَّح في البزَّازية إلخ) حيثُ قال: الصَّدقةُ أفضلُ من الحجِّ تطوُّعاً، كذا روي عن الإمام؛ لكنَّه لمَّا حجَّ و عرف المشقَّة أفتى بأنّ الحجَّ أفضلُ. (الدّرمع الرّد: ٤/٤٦، ط: زكريا، ديوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۹۵/ب، ۱۹۵/ب، ۱۴۳۸ھ)

بچے کے حج یا عمرہ کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

سوال: (۱) میں عمرہ کرنے جانے والا ہوں، اور میرا تین سال کا بچہ ہے، اور اس کو عمرہ کروانا ہے، تو اس کو احرام باندھنا پڑے گا؟ اور اس کے سب ارکان مجھے؛ یعنی: والد کو کرنے ہوں گے؟ اور بچے کی طرف سے طواف کے بعد کی نماز کیسے ادا کی جائے گی؟ اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) بچہ تین سال کا ہے، تو اس کو پیشاب بار بار آتا ہے، اور چڈی میں نکل جاتا ہے، تو اُس کو ڈائپر پہنا کر حرم میں لے جا سکتے ہیں؟ اور طواف اور سعی کر سکتے ہیں ڈائپر پہنا کر؟ یعنی: ڈائپر پہنا کر عمرہ کروا سکتے ہیں؟

(۳) بچہ چھوٹا ہے، تو کیا اس کو بھی طواف اور سعی میں چلوانا پڑے گا؟ یا پھر گودی میں لے کر کروا سکتے ہیں؟

(۴) بچوں کے لیے عمرہ کس طرح کیا جائے؟ وہ تفصیل سے بتائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰه التوفیق والعصمة: (۱) تین سال کا بچہ بہت چھوٹا اور ناسمجھ ہوتا ہے، اس کا احرام شرعاً معتبر نہیں ہے، اس کی طرف سے آپ احرام کی نیت کریں گے، اور افعالِ عمرہ ادا کریں گے؛ البتہ بہتر ہے کہ بچے کو بھی احرام کی چادریں پہنا دیں، بچے کی طرف سے طواف کی صورت میں طواف کی نماز (دوگانہ) واجب نہیں ہے، وہ اس سے ساقط ہے۔

أمَّا غیر الممیِّز فلا یصحُّ أن یحرم بنفسه؛ لأنه لا یعقل النیَّة ولا یقدر التلفُّظ بالتَّلبیة، وهما شرطان في الإحرام کمامرَّ، وکذا لا یصحُّ طوافُه؛ لاشتراط النیَّة له أیضًا؛ بل یحرم له ولیّه، وینبغي للوليِّ أن یُجرِّده قبل الإحرام ویُلبِسه إزارًا ورداءً، وإذا أحرم له ینبغي أن یُجنِّبه من محظُورات الإحرام، ویقضي به المناسك کلَّها، وینوي عنه حین یحمله في الطَّواف، وجاز النِّیابة عنه في کلِّ شيءٍ؛ إلا في رکعتي الطَّواف فتسقط.

(غنیة الناسك، ص: ۱۰۶، فصل في إحرام الصبي إلخ، ط: سهارنپور)

(۲) ڈائپر پہنے ہوئے ہونے کی صورت میں؛ چوں کہ تلویثِ مسجد کا خطرہ نہیں ہے؛ اس لیے بچے کو نہلا دُھلا کر نیا ڈائپر پہنا کر حرم میں لے جا سکتے ہیں؛ لیکن جب یہ محسوس ہو کہ بچے نے پیشاب یا پاخانہ کر دیا ہے، تو جتنی جلدی ہو سکے، اُسے لے کر حرم سے باہر آ جائیں۔

(۳) گود میں لے کر بھی طواف وسعی کرا سکتے ہیں، طواف کے وقت بچے کی طرف سے آپ طواف کی نیت کرلیں۔

(۴) اوپر کے جوابات کے ضمن میں یہ بات آچکی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفر لہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۲۸ھ، سہ شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی- محمد نعمان سیتاپوری غفر لہٗ

(۲۶۹/تتمہ/س، ۴۷/س، ۱۴۳۸ھ)

فیملی ویزے سے سعودی جا کر عمرہ کرلیا تو عمرہ ہوگا یا نہیں؟

سوال: سعودی جانے کے لیے میں نے فیملی ویزے کی درخواست دی تھی، اب سعودی پہنچنے کے بعد کیا عمرہ کرنا جائز ہوگا؟ کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ فیملی ویزے سے عمرہ کرنا جائز نہیں ہے، اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ویزے کے لیے درخواست دیتے وقت اُن کی ویب سائٹ میں لکھا رہتا ہے کہ کوئی وزٹ ویزے پر عمرہ نہیں کرسکتا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: فیملی وزٹ ویزے کے ذریعے سعودیہ پہنچ کر عمرہ کرلیں، تو عمرہ اگرچہ ادا ہوجائے گا؛ لیکن اگر قانوناً اس ویزے پر عمرہ کرنا ممنوع ہو، تو اس سے بچنا چاہیے، قانونی خلاف ورزی کرکے خود کو ہلاکت میں ڈالنا درست نہیں۔

لقوله تعالیٰ: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ، الآية﴾ (البقرة: ۱۹۵) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفر لہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۲/جمادی الاولیٰ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفر لہٗ بلند شہری

(۶۹۰/م، ۷۰۳/م، ۱۴۳۸ھ)

جدہ سے مکہ جاتے وقت احرام کا حکم، نیز جدہ میقات میں داخل ہے یا خارج؟

سوال: عرض یہ ہے کہ ایک مسئلہ درپیش ہے، امید ہے کہ حضرتِ والا راہ نمائی فرما کر شکر گزار فرمائیں گے۔

(۱) جولوگ جدہ میں رہتے ہیں، اگر وہ حج وعمرے کے علاوہ کسی اور کام سے مکہ مکرمہ جائیں، تو بغیر احرام کے وہ جاسکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) جدہ میقات سے خارج ہے یا داخل؟ اس بارے میں آں جناب کی کیا رائے ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق: (۱) جولوگ جدہ میں رہتے ہیں، اگر وہ حج یا عمرے کے علاوہ کسی اور ضرورت سے مکہ مکرمہ جائیں، تو وہ بغیر احرام جاسکتے ہیں، اُن پر کوئی دم وغیرہ واجب نہ ہوگا، اور اگر وہ حج یا عمرے کی نیت سے جائیں، تو حدودِ حرم سے پہلے حج یا عمرے کا احرام باندھنا لازم ہوگا۔

وحلّ لأهل داخلها – يعني: لكلِّ من وجد في داخل المواقيت– دخُول مكة غير مُحرم مالم يرد نُسكاً للحرج، كما لو جاوزها حُطَّابُو مكة، فهذا ميقاتُه الحلُّ الذي بين المواقيت والحرم. (الدّرالمختار مع ردّالمحتار، كتاب الحج: ۴۸۳/۳–۴۸۵، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

قولُه: (مالم يرد نُسكاً) أمَّا إن أراده وجب عليه الإحرام قبل دخوله أرض الحرم، فميقاتُه كلُّ الحِلّ إلى الحرم. فتح. وعن هذا قال القُطبي في منسكه: وممَّا يجب التَّيقُّظ له سُكانُ جدّة إلخ، وأهل الأودية القريبة من مكة؛ فإنَّهم غالبًا مايأتُون مكة في سادس أو سابع ذي الحجَّة بلا إحرام، و يُحرمون للحجِّ من مكة، فعليهم دمٌ؛ لمجاوزة الميقات بلا إحرام؛ لكن بعد توجُّههم إلى عرفات ينبغي سقُوطه عنهم بوصُولهم إلى أوَّل الحل مُلبِّين. (ردالمحتار)

(۲) فقہائے کرام کی تصریحات کے مطابق جدہ حل میں ہے، میقات سے خارج نہیں ہے، یعنی: جدہ سے آگے مکہ مکرمہ کی طرف کوئی میقات نہیں ہے؛ بل کہ جدہ سے مکہ مکرمہ کی طرف صرف حرم ہے۔

أمَّا لو قَصدَ موضعًا من الحِلِّ، كخليص وجدَّة إلخ. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الحج: ۴۸۲/۳، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **قولُه: (أمَّا لو قَصدَ موضعًا من الحلِّ:) ممَّا بين الميقات والحرم.** (ردالمحتار) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۸/۶/۱۴۳۸ھ = ۸/۳/۲۰۱۷ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۵۶۳/ن، ۵۷۴/ن، ۱۴۳۸ھ)

خانہ کعبہ کا طواف انبیاء کی سنت ہے، نیز داہنی طرف سے طواف شروع کرنا مسنون ہے

سوال: (۱) خانہ کعبہ میں طواف کرنا کس نبی کی سنت ہے؟ (۲) اور سیدھے ہاتھ سے شروع کرنا کیوں ضروری ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں بہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اُن کو یہ حکم بھیجا کہ وہ بیت اللہ؛ یعنی: کعبہ بنائیں، اُن حضرات نے حکم کی تعمیل کرلی، تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں، اور ان سے کہا گیا کہ آپ أوّل النّاس یعنی: سب سے پہلے انسان ہیں، اور یہ گھر أوّل بیت وضع للنّاس ہے، یعنی: سب سے پہلا گھر، جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا۔ (ابن کثیر: ۲/۶۷، آل عمران: ۹۶-۹۷، ط: بیروت) **ضعّفه ابنُ كثير بابن لهيعة، ولا يخفى أنّه ليس بمتروك الحديث مطلقاً، ولاسيّما في هذا المقام؛ فإنّ الرِّواية قد تأيّدت بإشارات الكتاب.** (معارف القرآن: ۲/۱۱۴)

پھر ابراہیم علیہ السلام کے ذریعے؛ دوبارہ اس کی تعمیر ہوئی، اور طواف و حج کا حکم ہوا، تفصیل کے لیے معارف القران میں ﴿**إِنَّ أَوَّلَ بَيتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلعَالَمِين**﴾ (آل عمران: ۹۶) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں؛ لہٰذا طواف؛ حضرت آدم علیہ السلام کی سنت بھی ہوئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہوئی؛ بل کہ کوئی بعید نہیں اگر کہہ دیا جائے کہ تمام انبیاء کی سنت ہے۔

(۲) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر عمدہ اور اچھے کام کو داہنی طرف سے شروع فرماتے تھے، طواف بھی ایک پسندیدہ عمل ہے؛ لہٰذا داہنی طرف سے کرنا مسنون ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۸/۲۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۶۵۴/د، ۸۱۰/د، ۱۴۳۸ھ)

دورانِ طواف وضوٹوٹ جائے تو بقیہ طواف کیسے پورا کرے؟

سوال: السلام علیکم! اگر دورانِ طواف تین چار چکر کے بعد وضوٹوٹ جاتا ہے، تو وضو کرنے کے بعد وہ کب سے طواف شروع کرے گا؟ والسلام

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر دورانِ طواف وضوٹوٹ جائے، تو اسی جگہ طواف کا سلسلہ روک دینا لازم ہے، پھر اگر طواف کے چار چکروں کے بعد وضوٹوٹا ہے، تو وضو کے بعد اختیار ہے؛ چاہے بقیہ چکر پورے کرے، یا ازسرِنو طواف کرے، اور اگر چار چکروں سے پہلے وضوٹوٹا ہے، تو افضل یہ ہے کہ وضو کے بعد ازسرِنو طواف کرے، اور اگر وہیں سے بقیہ طواف مکمل کرلے، تو یہ بھی جائز ہے۔

أو تجديد وضُوء ثُمَّ عاد، بنىٰ لو كان ذٰلك بعد إتيان أكثره، ولو استأنف لاشيء عليه إلخ، ويُستحبُّ الاستيناف في الطَّواف إذا كان قبل إتيان أكثره. (غنية الناسك: ١٢٧) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقارعلی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۷؍محرم؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۹۶؍تتمہ؍م،۱۰۱؍م، ۱۴۳۸ھ)

بارہ ذی الحجہ کے غروب تک اگر طوافِ زیارت کے چار چکر سے کم ہی لگا پائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال: طوافِ زیارت؛ بارہ ذی الحجہ کو مغرب کی اذان تک ساڑھے تین چکر سے زیادہ، اور چار سے کم ہوا، اب دم واجب ہوا یا صدقہ؟ بیوی کب حلال ہوگی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله العصمة والتوفيق: **حامدا ومصلياً ومسلماً**: (۱) اگر چار اشواط (چکر) سے کم ہوئے، خواہ تین چکر کے بعد آدھا یا زائد؛ یعنی: ساڑھے تین یا پونے چار چکر لگائے تھے کہ آفتاب غروب ہوگیا، تو ایسی صورت میں دم واجب ہوجائے گا۔

أخَّر الحاج الحَلق أو طواف الفرض عن أيَّام النَّحر اهـ. درمختار، وفي شرحه

الفتاوی ردّ المحتار (قوله: أو أخَّر طواف الفرض) أي: كُلَّه أو أكثره فلو أخَّر أقلَّه يجب صدقة اهـ. (۲/۲۰۸، ط: نعمانية)

(۲) اگر رمی اور قربانی کے بعد حلق کرا چکا تھا؛ یعنی: سر منڈا کر حلال ہوگیا تھا، بس صرف طوافِ زیارت باقی تھا، تو ایسی صورت میں چار چکر پورے لگا لینے کے بعد؛ یعنی: طوافِ زیارت کے چار چکر لگا لیے، تو بیوی حلال ہوجائے گی۔

وفي الفتاوى الهندیّة: وإذا طاف منه طواف الزِّيارة أربعة أشْواطٍ حلَّت له النِّساء؛ لأنَّها هي الرُّكن، هكذا في التَّبيين إلخ ...... (۱/۳۳۲) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۲/۱۲ھ الموافق: ۲۰۱۷/۹/۴ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۳۹۲/ھ، ۳۳۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)

سستا سستا کر طواف کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا طواف کے دوران بیچ بیچ میں، یا ہر چکر کے مکمل ہونے پر؛ تھک کر طواف مکمل کر سکتے ہیں؟ یا مسلسل بنا رُکے ساتوں چکر پورے کرنے ضروری ہیں، یا بیٹھ کر تھوڑا آرام کر کے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللہ التوفیق: فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ طواف میں آدمی کو باوقار طریقے پر چلنا چاہیے، کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے، جس میں طواف کی بے اہمیتی ظاہر ہو؛ لہٰذا صورت مسئولہ میں بہتر یہی ہے کہ ساتوں چکر مسلسل پورے کیے جائیں، درمیان میں ٹھہر ٹھہر کر طواف نہ کیا جائے؛ لیکن یہ کوئی واجب درجے کا حکم نہیں ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے دم یا صدقہ واجب ہو؛ لہٰذا اگر کوئی درمیان میں تھوڑی دیر ٹھہر کر سستا لے، تو اس کی گنجائش ہے، اور اگر کوئی عذر ہو، تو درمیان میں کچھ دیر رکنے میں مضائقہ نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۲۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۲۰۵/ص، ۱۲۴۴/ص، ۱۴۳۸ھ)

حج وعمرے کے بعد حلق یا قصر کروانے کی حکمت ومصلحت کیا ہے؟

سوال: میرے ایک عیسائی دوست نے پوچھا کہ عمرہ اور حج کرنے کے بعد ہم بال کیوں کٹواتے ہیں؟ کیا اسی لیے کہ یہ حضور کی سنت ہے؟ اس کے پیچھے کیا مصلحت ہے اللہ کی؟ اور کیا کوئی سائنسی وجہ بھی ہے؟ برائے مہربانی قرآن و حدیث کے حوالے سے مدلل جواب دیں؛ تاکہ میں اپنے دوست کو سمجھا سکوں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: اصل تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کرنا ثابت ہے؛ اس لیے احرام سے نکلنے کے لیے حلق یا قصر کو واجب قرار دیا گیا ہے، تاہم اس میں دو حکمتیں علماء نے تحریر کی ہیں:

۱۔ اگر اس سلسلے میں لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، تو لوگ احرام سے نکلنے کے لیے نہ جانے کیا کیا حرکتیں کر بیٹھتے؛ اس لیے احرام سے نکلنے کے لیے ایک ایسا طریقہ مقرر کیا گیا، جو وقار و متانت کے منافی بھی نہ ہو، جس طرح نماز سے نکلنے کے لیے سلام کو واجب قرار دیا گیا۔

۲۔ احرام میں سر مٹی سے بھر جاتا ہے، جڑوں میں گرد اور میل جم جاتا ہے؛ اس سر کا تفث (میل کچیل) اس وقت دور ہوگا، جب کہ سر مونڈ دیا جائے، جو کہ احرام سے نکلنے کا افضل طریقہ ہے، یا کم از کم انگلی کے ایک پورے کے بہ قدر کاٹ دیا جائے۔

قال في حُجَّة اللّٰه البالغة: والسِّر في الحلق أنَّه تعيينُ طريقٍ للخُروج من الإحرام بفعلٍ لا يُنافي الوقار، فلو تركُوا أنفُسهم لَذهبَ كلٌّ مذهباً، وأيضاً: ففيه تحقيقُ انقضاء التَّشعُّث والتَّغيُّر بالوجه الأتمِّ، ومَثلُه كمثل السَّلام من الصَّلاة. فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۲/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ- محمد اسد اللہ غفرلہ

(۲۰۷/ل، ۲۵۱/ل، ۱۴۳۸ھ)

لوپ (loop) لگا کر حج کو جانا

سوال: میں اور میری اہلیہ امسال ان شاء اللہ حج کو جا رہے ہیں، میری اہلیہ نے لوپ پہنی

ہوئی ہے وقتی طور پر؛ بچہ نہ ہو اس لیے، کیا اس حال میں ہمارا حج ہو جائے گا؟ یا لوپ کو نکال کر حج میں جانا ہوگا؟ بہ راہِ کرم جواب جلد از جلد دیں؛ کیوں کہ اگست میں حج کی روانگی ہے۔ جزاک اللہ خیرا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: لوپ پہن کر اہلیہ حج کے لیے جاسکتی ہیں، اس حال میں حج ادا ہوجائے گا؛ لیکن حالت احرام میں ہم بستری وغیرہ سے احتراز لازم ہے، اور بلا عذر لوپ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۸؍شوال؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۲۰۵؍م، ۱۲۲۶؍م، ۱۴۳۸ھ)

حالت احرام میں گھٹنے میں کیپ پہننے کا حکم

سوال: کیا میں احرام کی حالت میں گھٹنے میں کیپ (cap) پہن سکتا ہوں؟ میرے دو گھٹنوں میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰه التوفیق والعصمة: ''نی کیپ'' (knee cap) کی جو شکل ہم نے دیکھی ہے، وہ گھٹنوں کی ساخت پر بنا ہوا موزہ نما ایک کپڑا معلوم ہوتا ہے؛ لہٰذا وہ **لبس مخیط** کے تحت داخل ہوگا، اور اُس کے پہننے پر حسبِ شرائط؛ جزا لازم ہوگی، صورتِ مسئولہ میں اگر واقعۃً آپ کے گھٹنوں میں کافی درد ہو، اور اُسے پہننے سے آرام ملتا ہو، تو اس عذر کی بنا پر اُسے پہننے کی گنجایش ہوگی؛ لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ درد کے وقت ہی پہنیں؛ لیکن جزا بہ ہر حال دینی ہوگی، اگر ایک گھنٹے سے پہلے پہلے اتار دیا، تو ایک دو مٹھی گیہوں یا اس کی قیمت کا صدقہ کرنا کافی ہوگا، اور اگر ایک گھنٹے سے زیادہ پہنا؛ لیکن بارہ گھنٹے سے پہلے اتار دیا، تو ایک صدقۂ فطر لازم ہوگا، اور اگر بارہ گھنٹے یا ایک دن یا ایک رات کامل کے بعد اتارا، تو ایک دم دینا لازم ہوگا۔

ولُبس قمیص وسراویل أي: کلّ معمُول علی قدر بدن أو بعضه، کزردیة وبرنس. (الدر: ۴۹۸/۳، ط:زکریا)

یوماً کاملاً أو لیلةً کاملةً، و في الأقلّ صدقةٌ (الدّر) و في الرّد: الظّاهرُ أنَّ المُراد مقدارُ أحدهما ...... خلافاً لما في خزانة الأکمل أنَّه في ساعةٍ نصفُ صاع، وفي أقلّ من ساعةٍ قبضةٌ من بُرٍّ. (۵۷۷/۳، ط: زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱۲/۲۶ھ، دوشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۳۷۶/تتمہ/س، ۵۰۰/س، ۱۴۳۸ھ)

حجاج کرام کو جہاز میں جو خوش بودار ٹیشو پیپر دیا جاتا ہے اس کا استعمال درست نہیں

سوال: حجاجِ کرام کو جہاز میں طعام دیا جاتا ہے، پھر اس کے بعد ہاتھ صاف کرنے کے لیے ایک ٹیشو پیپر دیا جاتا ہے، جس پر مندیل منعش لکھا ہوا ہوتا ہے، غالباً بعض مفتیان کرام نے (مثلاً: مفتی شبیر احمد شاہی نے ''انوارِ مناسک'' میں، ص: ۲۳۲ پر) لکھا ہے کہ اس میں خوش بو ہوتی ہے، اور حاجی کے لیے خوش بو کا استعمال ممنوعاتِ احرام میں سے ہے، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس کے استعمال سے دم واجب ہوتا ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: جی ہاں! دم واجب ہوتا ہے، انوارِ مناسک ہی میں ہے: ''اس (مندیل منعش یا مخصوص خوش بودار ٹیشو پیپر) سے حالتِ احرام میں ہاتھ، منہ صاف کرنے سے سب کے نزدیک دم واجب ہو جائے گا؛ اس لیے کہ اس کی خوش بو مہندی کی خوش بو سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے، احرام باندھنے والے مسافروں کو اس کا خاص دھیان رکھنا چاہیے، الخ'' (ص: ۲۳۲ و ۲۳۳)، حاشیہ نمبر ایک میں بہ حوالہ بدائع اور الجوہرۃ مزید تفصیل ہے، آپ کے پاس انوار مناسک ہے، تو اس میں حاشیے والی عبارت کو بہ غور ملاحظہ کرلیں، پھر کوئی اشکال رہے، تو معلوم فرمالیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱۱/۹ھ الموافق: ۲۰۱۷/۸/۲ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۲۱۱/ھ، ۱۲۳۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

حج کی رہائشی بلڈنگوں میں جو سامان حاجی چھوڑ کر چلے جائیں ان کا کیا مصرف ہے؟

سوال: امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، میں مکہ شریف میں حاجیوں کی رہائشی بلڈنگ میں کام کرتا ہوں، میرا سوال ہے کہ حاجی جس کمرے میں رہتے ہیں، اس کمرے سے جانے کے وقت کبھی کبھی اپنا کچھ سامان بھول جاتے ہیں؛ مثلاً: موبائل، ریال، یا کھانے کا سامان، تو کیا ہم اسے لے سکتے ہیں؟ جب کہ وہ سامان حاجی تک پہنچانا ناممکن ہے، اور نہ ہی کوئی لینے آتا ہے، اور بلڈنگ کے مینیجر کہتے ہیں کہ جو سامان ملے، اُسے جمع کردو، اگر کوئی لینے آیا تو ٹھیک ہے؛ ورنہ تین مہینے کے بعد وہ سامان تم لے لو، اور استعمال کرو، تو کیا ایسی حالت میں وہ ہمارے لیے جائز ہوگا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر وہ سامان ایسا ہے جس کے متعلق گمان غالب یہ ہو کہ حاجی صاحب بھول کر چھوڑ گئے ہیں؛ مثلاً: موبائل، یا ریال، یا کوئی قیمتی سامان وغیرہ، تو وہ لقطہ کے حکم میں ہے، اسے بلڈنگ مینیجر کی ہدایت کے مطابق بہ حفاظت جمع کر کے رکھیں، اور سامان کے مالکان (حاجی صاحبان) سے رابطہ ممکن ہو، تو رابطہ کر کے، اور مالک کو بتا کر کے حسبِ اجازت وصراحت عمل کیا جائے، اور اگر کسی طرح مالک کا پتا نہ چل پائے، اور اتنی مدت گذر جائے کہ اس کے بعد ناامیدی ہو جائے کہ اب اُس سامان کا مالک؛ لینے نہیں آئے گا، تو اس کے بعد وہ سامان کسی غریب کو صدقہ کر دیا جائے، اور آپ مستحق زکاۃ ہیں، تو آپ بھی اپنے استعمال میں لے سکتے ہیں، اور اگر وہ سامان اس قبیل کا ہے کہ جس کے متعلق؛ یقین یا گمانِ غالب یہ ہو کہ اُسے مالک نے قصداً استعمال کے لیے چھوڑ دیا ہے؛ مثلاً: استعمالی چپل یا معمولی چیز وغیرہ، تو اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۰/تتمہ/م، ۸/م، ۱۴۳۸ھ)

❁❁❁❁❁

نکاح، طلاق، رضاعت ونسب اور وراثت وعدت سے متعلق مسائل

سنی لڑکی کا شیعہ لڑکے سے نکاح کرنے کا حکم

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! محترم گرامی قدر! میری بھتیجی جو کہ سنی حنفی نقشبندی عقیدے کی ہے، وہ ایک شیعہ لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے، والد حیات نہیں ہیں، ماں بہن ہیں، جو کہ لڑکی کی خوشی کے لیے راضی ہیں، اور لڑکے والے بھی گھر اور خاندان میں عقیدے کے پیشِ نظر کوئی راضی نہیں ہے، اور گناہ سمجھتے ہیں، شریعت کے مدنظر یہ شادی جائز ہوگی کہ نہیں؟ ان لوگوں نے دلیل دی ہے کہ ہم بھی قرآن کو مانتے ہیں، اور پڑھتے ہیں، اور وہ بھی، اگر یہ شادی جائز نہیں ہے، تو کیوں؟ جس سے لڑکی کو بتاسکیں کہ کیوں نہیں شادی ہوسکتی؟ برائے مہربانی مفصل فتوے سے آگاہ فرمائیں، شکریہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: شیعوں کی کتاب ''فصل الخطاب'' (ص:۲۵۳) میں ہے کہ قرآن کریم میں تحریف ہوئی ہے، ان کی کتاب ''حیات القلوب'' (۹۲۳/۲، ط: لاہور) میں ہے کہ تین صحابہ کے علاوہ تمام صحابہ مرتد ہوگئے تھے، ان کی کتاب ''اصول کافی''، ''انوار نعمانیہ'' (۳۶۰/۲) وغیرہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قرآن کو لے کر امام مہدی غار سرَّ من رأیٰ میں روپوش ہوگئے ہیں، ہمارے پاس موجود قرآن؛ بیاضِ عثمانی ہے؛ یعنی: عثمان رضی اللہ عنہ کی نوٹ بک، ''اصول کافی'' (ص:۴۸۲) میں ہے کہ اپنے عقیدوں کو چھپانے کے لیے تقیہ؛ یعنی: جھوٹ بولنا ضروری ہے، جو تقیہ نہ کرے اس کا دین نہیں رہے گا وغیرہ؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مذکورہ لڑکا اگر تحریفِ قرآن کا قائل ہو، یا حضرت علی رضی اللہ عنہ میں خدا تعالیٰ کے حلول کا عقیدہ رکھتا ہو، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمتِ زنا لگاتا ہو،

یا عقیدہ رکھتا ہو کہ حضرات شیخین کافر تھے، یا چند صحابہ کے علاوہ تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے، یا حضرت علی آخرالزمان نبی ہیں، حضرت جبریل علیہ السلام سے وحی پہنچانے میں غلطی ہوئی ہے، یا اس طرح کا کوئی اور کفریہ عقیدہ رکھتا ہو؛ ایسا شیعہ کافر ہے، اس کے ساتھ سنی لڑکی کا نکاح قطعاً حرام ہے، اور اگر وہ تقیہ کرتا ہے، اور اپنا عقیدہ تبدیل نہیں کرتا، تو بھی وہ گم راہ ہے، اس سے اپنی بھتیجی کا نکاح نہ کرائیں؛ کیوں کہ اس میں اُس کے اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد کے ایمان کا خطرہ ہے، لڑکی کو بھی اپنے دین وایمان کو خطرے میں نہ ڈالنا چاہیے، اور شیعہ سے نکاح کا رشتہ قائم کرنے سے باز آنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۲/د، ۵۷/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا ہم جنس پرست مرد کی شادی ہم جنس پرست عورت سے ہو سکتی ہے؟

سوال: کیا ایک ہم جنس پرست مرد؛ ایک لیسبین (lesbian) (ہم جنس پرست عورت) سے شادی کر سکتا ہے؟ حضرت! میرا نام توصیف ہے، اور میری عمر ۲۶/سال ہے، مجھے شروع سے لڑکیوں کو دیکھنے سے خواہش نہیں ہوئی، صرف لڑکوں کو دیکھنے سے ہی خواہش ہو رہی ہے، ڈاکٹر سے پوچھنے پر ڈاکٹر نے کہا کہ یہ تو فطری چیز ہے، یہ تو چند لوگوں میں شروع سے اس طرح کی خواہش ہوتی ہے، یہ بیماری نہیں ہے؛ بل کہ ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ خواہش جینٹس (مرد) کو تین یا چار سال کی عمر میں پیدا ہو جاتی ہے۔ براہِ مہربانی مجھے بتائیں کہ اب میں کیا کروں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: ہم جنس پرستی؛ یعنی: ایک مرد کا دوسرے مرد سے، یا ایک عورت کا دوسری عورت سے جنسی خواہش کی تکمیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اگر بالفرض آپ کے اندر یہ بات ہے کہ عورت کی طرف خواہش نہیں ہوتی، صرف مرد کی طرف ہوتی ہے، تو اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر صبر کریں، یا پھر کسی دین دار مسلمان طبیب سے رابطہ کریں، باقی اگر آپ کسی لیسبین یا عام لڑکی سے نکاح کر لیں گے، تو آپ کا نکاح بلا شبہ درست ہو جائے گا؛ لیکن غیر شرعی طریقے پر خواہش کی تکمیل؛ بہ ہر حال ناجائز ہی رہے گی۔

قال رسُول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: من وجدتمُوہ یعملُ عمل قوم لُوط فاقتلُوا الفاعل والمفعُول بہ إلخ. (ترمذي، رقم الحدیث: ٤٥٦، باب ماجاء في حداللوطيّ)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۵/۱۲/۱۴۳۸ھ، یک شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی-محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۴۰۸/تتمہ/س،۱۳۰۲/س، ۱۴۳۸ھ)

کلّما کی قسم کھا لینے کی صورت میں نکاح کا طریقہ کیا ہوگا؟

سوال: اگر کسی شخص نے کلما کی قسم کھائی کہ ''جب جب بھی وہ کسی عورت سے نکاح کرے، تو اسے طلاق''، پھر اس کا کسی رشتے دار کے گھر میں نکاح کرنا متعین ہوا، جب کہ اس بات کا علم اس شخص کو بھی ہوگیا، تو کیا اس گھر میں نکاح درست ہوگا، جب کہ اس نے والدین کی چاہت پر نکاح کو موقوف رکھا ہو، جواب تحریر فرمائیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: جب بھی یہ شخص (حالف) کسی عورت سے نکاح کرے گا، طلاق عورت پر واقع ہوجائے گی، اب نکاح کی صورت یہ ہے کہ یہ شخص کسی آدمی (فضولی) سے یہ نہ کہے کہ تم میرا نکاح فلانہ بنت فلاں سے کردو، اور نہ ہی یہ آدمی (فضولی) اس شخص سے نکاح کرنے کی اجازت لے؛ بل کہ از خود فلانہ بنت فلاں سے اس شخص کا نکاح کردے، اور پھر یہ آدمی اس سے جا کر کہہ دے کہ تمھارا نکاح فلانہ بنت فلاں سے ہوگیا، اور مثلاً: دس ہزار روپے مہر ہے، وہ شخص یہ سن کر زبان سے کچھ نہ کہے؛ بل کہ چپکے سے مہر کی رقم نکال کر اس کو دے دے، وہ آدمی مہر کی رقم لے جا کر بیوی کے حوالے کردے، یا بعد نکاح کے عورت (بیوی) کو کسی کمرے میں بٹھا دیا جائے، اور اس شخص سے کہہ دے کہ فلانہ بنت فلاں سے میں نے تمھارا نکاح کردیا، اور اب وہ (تمھاری بیوی) فلاں کمرے میں ہے، وہ شخص زبان سے کچھ نہ کہے اور بیوی سے جا کر تعلقِ زوجیت قائم کرے، تو نکاح بھی درست ہوجائے گا، اور طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔

إذا قال: كلُّ امرأة أتزوَّجُها فهي طالق، فزوَّجه فضُوليٌّ وأجاز بالفعل بأن ساق المهر ونحوه لاتطلَّق، بخلاف ما إذا وكّل به؛ لانتقال العبارة إليه اهـ. فتاوى الهندية.

(الباب الرابع في الطلاق بالشّرط من كتاب الطلاق: ۱/ ٤١٩، ط: زكريا).

جس گھر میں رشتہ طے ہوا ہے، خواہ اس کو کلما کی قسم کھا لینے کا علم ہو گیا ہو، تب بھی نکاح درست ہو جائے گا، بس شرط یہی ہے کہ نکاح فضولی پڑھادے، جس کی پوری تفصیل اوپر لکھ دی گئی ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۲۸ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۱/۲۹ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۱۸/ھ، ۲۶۴/ھ، ۱۴۳۸ھ)

والدہ سے کہا کہ فلاں سے رشتہ کردو؛ اب نکاح کے کافی دنوں بعد کہتی ہے کہ میں نے اجازت نہیں دی تھی کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ہندہ کا نکاح ایک سال پہلے زید سے ہوا، اور ابھی تک رخصتی نہیں ہو پائی ہے، نکاح سے تین ماہ پہلے لڑکی نے اپنی والدہ سے کہا کہ میرا رشتہ فلاں لڑکے سے کردو؛ چناں چہ اس لڑکے سے اس کا رشتہ کردیا گیا، اس کے بعد نکاح تک لڑکی سے اجازت کے سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی، نیز جب نکاح پڑھانے کے لیے لڑکی کا بھائی اور باپ جارہے تھے، اس وقت بھی لڑکی سے کوئی اجازت نہیں لی گئی، اور نکاح ہوجانے کے بعد بھی لڑکی کے سامنے اس نکاح کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا؛ البتہ گھر میں ماں باپ اور بھائی کے درمیان؛ نکاح کے سلسلے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی؛ لیکن باقاعدہ لڑکی سے اس مدت میں صراحۃً اجازت نہیں لی گئی، واضح رہے کہ لڑکی اور لڑکے کے درمیان موبائل فون سے نکاح سے پہلے بھی، اور نکاح کے بعد بھی گفتگو جاری رہی، تقریباً ایک ہفتے کے بعد دونوں کے درمیان فون پر ہی آپس میں کچھ کہا سنی ہوگئی، تو لڑکی نے لڑکے سے کہا: ’’میں نے نکاح کی اجازت نہیں دی؛ لہٰذا نکاح نہیں ہوا، اور اب بھی اجازت نہیں دیتی‘‘ اور لڑکا کہتا ہے کہ نکاح ہوگیا، وہ میری بیوی ہے، میں اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا؛ چناں چہ یہ مسئلہ دارالقضاء پھلت میں پیش کیا گیا، تو اُنھوں نے نکاح منعقد کرنے کا حکم دیا، اور کہا کہ زوجین آپس میں بیٹھ کر مصالحت کرلیں،

اور باہمی رضامندی سے کوئی بات طے کرکے انتشار کو دور کریں؛ چناں چہ دونوں کو باہم گفتگو کا موقع دیا گیا؛ لیکن مصالحت کی شکل نہیں بن سکی، اور دونوں اپنی اپنی بات پر مصر رہے، پھر یہی مسئلہ دارالعلوم زکریا دیوبند کے دارالافتاء میں پیش کیا گیا، تو اُن کی طرف سے یہ جواب آیا کہ ''مسئولہ صورت میں جو رضامندی لڑکی کی طرف سے پائی گئی ہے، وہ نکاح کے منعقد ہونے کے لیے کافی نہیں؛ لہٰذا نکاح نہیں ہوا''۔ میں (لڑکی کا بھائی) انتہائی پریشان ہوں، برائے کرم تشفی بخش جواب باصواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: نکاح سے تین ماہ پہلے خود ہندہ نے اپنی والدہ سے کہا کہ میرا نکاح ورشتہ فلاں لڑکے (زید) سے کردو؛ چناں چہ اُسی لڑکے سے رشتہ کردیا گیا؛ لہٰذا صراحۃً زید سے نکاح کردینے کی اجازت؛ ہندہ کی طرف سے پائی گئی، اگرچہ اجتماع گاہ میں نکاح پڑھوانے کے لیے جاتے وقت؛ ہندہ سے اجازت نہ لی گئی؛ مگر جو اجازت پہلے تین ماہ وہ دے چکی تھی، اس کو رد بھی نہ کیا تھا؛ اسی لیے ہندہ کے باپ اور بھائی نے اجتماع گاہ میں اس کا نکاح زید سے پڑھوادیا، اور نکاح کے بعد گھر میں نکاح کا ذکر وتذکرہ ہوتا رہا، اور خود ہندہ نکاح؛ زید سے ہوجانے پر مطلع ہوکر خاموش رہی، یعنی: اُس نکاح کو رد بھی نہیں کیا، تو اِس کا حکم یہ ہے کہ زید کے ساتھ ہندہ کا نکاح درست ولازم ہوگیا، نکاح ہوجانے کے بعد ہفتہ بھر گذر جانے پر زید سے کچھ اَن بن ہوئی، اور اس پر ہندہ یہ کہتی ہے کہ میں نے نکاح کی اجازت نہیں دی، اُس کا یہ قول شرعاً لغو ہے، صحیح یہی ہے کہ صورتِ مسئولہ میں نکاح درست ولازم ہوگیا۔

وإذا قال لها الوليُّ: أريدُ أن أزوِّجك من فلان بألفٍ فسكتت ثُمَّ زوَّجها، فقالت: لاأرضٰى، أو زوَّجها ثُمَّ بلَغها الخبرُ فسَكتت، فالسُّكوتُ منها رضاً في الوجهين جميعاً، إذا كان المُزوِّج هُو الوليُّ اهـ. (الفتاوى الهندية: ۱/۲۸۷)

دارالعلوم زکریا دیوبند کے دارالافتاء سے جو فتویٰ لکھا گیا، اس میں تسامح صورتِ مسئلہ کے سمجھنے میں ہوگیا ہے، ہندہ کا یہ کہنا کہ میرا نکاح اور رشتہ زید سے کردو، اور باپ بھائی کے نکاح کردینے کے بعد تک اس پر خاموشی اختیار کیے رہنا؛ اجازتِ نکاح اور اس کو برقرار رکھنے پر رضامندی ہی ہے، اُس کو یہ سمجھنا کہ یہ رضامندی کافی نہیں؛ درست نہیں ہے؛ بل کہ یہ تو مزید بڑھ کر ہے؛ اس لیے کہ نکاح سے

تین ماہ قبل ہندہ کا خود اپنی ماں کے توسط سے زید کے ساتھ نکاح ورشتے کا مطالبہ کرنا، اور اِسی کے نتیجے میں باپ اور بھائی کا اجتماع گاہ میں جا کر نکاح پڑھوانا، بعد نکاح کے مسلسل زید سے فون پر گفتگو کا رابطہ قائم رکھنا وغیرہ امور؛ باپ کے اجازت لے کر نکاح کردینے سے زائد رضامندی ہونے پر صاف دلالت کرتے ہیں، دارالعلوم زکریا کے دارالافتاء سے صادرشدہ فتوے میں جو عبارت: ”**لایجوز نکاح أحدٍ علیٰ بالغةٍ صَحیحةِ العقل من أبٍ أو سُلطان بغیر إذنها؛ بکراً کانت أو ثیباً، فإن فعل ذٰلك فالنِّکاح موقُوف علیٰ إجازتها، فإن أجازته جاز، وإن ردَّته بطل، کذا في السِّراج الوهَّاج** (۲۸۷/۱)“ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ ماں باپ سے لڑکی نے اپنے نکاح ورشتے کا؛ کسی شخصِ معین سے کرنے کا مطالبہ کیا، اور نہ باپ نے بیٹی سے نکاح کرنے کی اجازت لی؛ بل کہ ازخود باپ نے بغیر اجازت لیے کسی سے بیٹی بالغہ صحیح العقل کا نکاح کردیا، تو ایسی صورت میں وہ نکاح بیٹی کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر اجازت دے دے گی، تو صحیح ونافذ ہوجائے گا، اگر رد کردے گی، تو باطل (ختم) ہوجائے گا، اور زید وہندہ کے نکاح سے متعلق یہ صورت پیش نہیں آئی؛ بل کہ جو صورت پیش آئی ہے، اُس کا انطباق اُس عبارت پر ہوتا ہے، جو عبارتِ ہٰذا سے چند سطور بعد میں ہے، جس کو ہم نے اپنے فتویٰ ہٰذا میں نقل کردی ہے۔

الغرض نکاح تو درست ہوگیا، اب یا تو ہندہ زید کے یہاں رخصت ہوکر چلی جائے، اور یہی بہتر ہے، تاہم اگر نباہ کی کوئی صورت نہ نکل سکے، تو زید ایک طلاق دے دے، یا بتراضیِ طرفین خلع کرلیا جائے، اس کے بغیر ہندہ کو نکاحِ ثانی کی اجازت نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۲/۵ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۱/۶ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۲۰/ھ، ۱۶۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)

نکاح میں وکالت اور شہادت پر اجرت لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

نکاح میں وکیل اور گواہ کا اپنی وکالت اور شہادت پر اجرت لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ اور یہ رقم؛ مسجد یا مدرسے میں داخل کرنے کی کیا حیثیت ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: صورتِ مسئولہ میں وکالتِ نکاح پر اجرت لینے کی گنجایش ہے؛ لیکن شہادت پر اجرت لینا جائز نہیں؛ لہٰذا وکالت پر ملنے والی اجرت کو مسجد میں لگایا جاسکتا ہے؛ البتہ شہادت پر ملنے والی رقم کو دینے والے کو واپس کرنا ضروری ہے۔

وکتب أیضاً في المُجتبی عن الفضل: تُحمل الشَّهادةُ علی الکفایة کأدائها؛ وإلا لضَاعت الحُقُوق، وعلی هٰذا الکاتب؛ إلا أنَّه یجُوز أخذُ الأجرة علی الکتابة دون الشَّهادة فیمن تعیَّنت علیه الفُقهاء، وکذا من لم یتعیَّن عندنا، وبه قال الشَّافعي في قولٍ، وفي قولٍ: یجُوز؛ لعدم تعیُّنه علیه. (حاشیة الشلبي علی التبیین: ۴/۲۰۷)

وفي الفقه الإسلامي وأدلّته: تصحّ الوکالةُ بأجر، وبغیر أجر؛ لأن النَّبي صلی اللّٰه علیه وسلّم کان یبعثُ عُمَّاله لقبض الصَّدقات، ویجعل لهم عمولة؛ ولأنّ الوکالة عقدٌ جائزٌ لا یجبُ علی الوکیل القیام بها فیجُوز أخذُ الأجرة فیها، بخلاف الشَّهادة؛ فإنَّها فرضٌ یجبُ علی الشَّاهد أداؤها. (الفقه الإسلامي وأدلته: ۴/۴۴۵) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۵۳/ل، ۱۷/۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

احتیاطاً تجدیدِ نکاح کے وقت نیا مہر ضروری ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص فقہائے کرام کی ہدایات کے مطابق؛ ہر مہینے یا ہر سال میں احتیاط کے طور پر تجدیدِ نکاح کرتا ہے، یعنی: نکاح ٹوٹنے کا نہ یقین ہو نہ ظن غالب، تو اس صورت میں فقہ کی اکثر کتب نے تجدیدِ مہر لازمی نہیں بتایا؛ لیکن فتاوی محمودیہ میں تجدیدِ نکاح (احتیاطاً) کے لیے بھی تجدیدِ مہر ضروری قرار دیا۔

اب امر مطلوب یہ ہے کہ ان عبارتوں کی تطبیق کیسے ہوتی ہے:

کما في البزَّازیة: وإن جدَّد النِّکاح للاحتیاط لایلزم الزِّیادة بلانزاع؛ لأن الغرض إبقاءُ الأوَّل؛ ولأن العقد الثَّاني لم یثبت، فکیف یثبت ما في ضمنه. (بزازیة علی هامش الهندیة، الباب الثاني عشر في المهر: ۴/۱۳۳، ط: رشیدیة)

وفي فتاوى الهندية: وإن جدَّد النِّكاح للاحتياط لاتلزمه الزِّيادة بلا نزاع، كذا في الوجيز للكردري .... ثُمَّ إذا أراد الزَّوجُ أن لايلزمه مهرٌ آخر بلا خلاف ينبغي أن يُجدِّد النِّكاح، ولايذكر المهر أو يجدِّد النِّكاح بذلك المهر فلا يجبُ عليه مهرٌ آخر.

(الفصل السابع في الزيادة في المهر والحط عنه: ۳۱۳/۱، الفصل السادس في النكاح: ۳۹۳/٦، ط: دارالفكر)

وفي ردّ المحتار: (تنبيه:) في القنية: جدَّد للحلال نكاحاً بمهر يلزم إن جدَّده لأجل الزِّيادة، لا احتياطاً إلخ، أي: لو جدَّده لأجل الاحتياط لاتلزمه الزيادة بلا نزاع، كما في البزَّازية .... قلتُ: لكن قدَّمنا في أوائل باب المهر عن البزَّازية أن عدم اللُّزوم إذا جدّد العقد للاحتياط. (مطلب في أحكام المتعة: ۳۲۷/۲، كتاب البيوع: ۸/٤، ط: بيروت)

وفي البحر الرائق: وفي القنية: جدَّد للحلال نكاحاً بمهر يلزم إن جدَّده لأجل الزِّيادة لا احتياطاً إلخ. (باب المهر: ۱٥۹/۳، ط: دارالمعرفة)

وفي فتح القدير: وكأنّ القاضي الإمام قاضي خان إنَّما أفتى بأنَّه لايجبُ بالعقد الثَّاني شيءٌ؛ إلا إذا عني به الزِّيادة في المهر. (باب المهر: ۱۳۳/۷)

اسی طرح فتاوی رحیمیہ میں ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''تجدیدِ ایمان اورتجدیدِ نکاح کا حکم احتیاطاً ہے، اورتجدیدِ نکاح کے لیے تجدیدِ مہر ضروری نہیں ہے''۔ (فتاوی رحیمیہ، باب المہر والجہاز: ۲۳۵/۸، ط: دارالاشاعت، کراچی)

اوراسی طرح نجم الفتاوی میں ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''البتہ اگر تجدیدِ نکاح؛ فقط برائے تجدید ہو، کسی غرض (مثلاً: عورت کا بائنہ یا مرتدہ ہوجانے کی وجہ) سے نہ ہو، تو دوبارہ مہر مقرر کرنا ضروری نہیں، پچھلا مہر ہی کافی ہے''۔ (نجم الفتاوی، کتاب النکاح، باب ماینقعد بہ النکاح الخ: ۶۰/۴، ط: یاسین القرآن، کراچی)

اورفتاوی محمودیہ میں ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''الجواب حامداً و مصلّیاً: (۱) اس وقت بھی شاہدوں کا ہونا ضروری ہے، صرف شوہر وبیوی کا تنہائی میں ایجاب وقبول کافی نہیں۔ (۲) مہر بھی متعین کیا جائے گا، گذشتہ مہر کافی نہیں۔

فقط واللہ تعالی اعلم

حررہ العبد محمود عفا اللہ عنہ، معین مفتی مدرسہ مظاہر علوم، سہارن پور

۲۵/محرم الحرام ۱۳۶۸ھ

الجواب صحیح: سعید احمد غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: زیرِ بحث مسئلے کی دوصورتیں ہیں:

(الف) ایک مرتبہ خفیۃً گواہوں کی موجودگی میں نکاح کرنے کے بعد دوبارہ کسی مصلحت سے علانیہ نکاح کیا جائے۔

(ب) احتیاطاً تجدیدِ نکاح؛ مثلاً: کوئی موہمِ کفر کلمہ زبان سے نکل جائے، اور اس خوف سے آدمی تجدیدِ نکاح کرے کہ کہیں اس کلمے کی وجہ سے اس کا نکاح نہ ٹوٹ گیا ہو۔

فقہائے کرام؛ خصوصاً علامہ شامیؒ کی ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں کا حکم یک ساں ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر شوہر اپنے اوپر لزوم مہر سے بچنا چاہے، تو مہر کا ذکر نہ کیا جائے، ایسی صورت میں مہر بہ ہرحال لازم نہ ہوگا؛ لیکن اگر دورانِ نکاح مہر متعین کیا جاتا ہے، تو دیانۃً تو اضافے کی نیت کے بغیر یہ مہر بہ ہرحال لازم نہ ہوگا؛ لیکن قضاءً عدم لزوم کا حکم اسی صورت میں ہوگا، جب متعاقدین بہ وقتِ عقد گواہ بنالیں کہ ہمارا مہر تو سابق ہی ہے، یہ تو صرف برائے ذکر اور خانہ پُری ہے، یا پھر بیوی شوہر کی اس بات میں موافقت کرے کہ یہ مہر؛ محض برائے ذکر اور دکھاوا ہے؛ ورنہ قضاءً مہر لازم ہوگا؛ کیوں کہ ''قضاء'' کا مدار ظاہر پر ہے، اور بزازیہ کی عبارت میں جو احتیاطاً تجدیدِ نکاح کی صورت میں علی الاطلاق عدم لزوم کی بات کہی گئی ہے؛ علامہ شامیؒ نے اُس کو بھی اُس صورت پر محمول کیا، جب کہ بیوی تصدیق کرے، یا گواہ بنالیا جائے، یا پھر بزازیہ کی مراد دیانۃً عدم لزوم ہے؛ ورنہ قضاءً لزوم مہر کا حکم ہوگا؛ کیوں کہ مدارِ قضاء ''ظاہر'' ہے؛ ''نیت'' نہیں ہے، آپ نے جو عربی عبارتیں نقل کی ہیں، اُن کا مقصد؛ تجدیدِ مہر لازم ہے یا نہیں؟ یہ نہیں بتلانا ہے؛ بل کہ لزومِ مہر وعدم لزوم بتلانا ہے، اور اس سلسلے میں جو حکمِ شرعی ہے، وہ اوپر لکھ دیا گیا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صورتِ مسئولہ میں تجدیدِ مہر فی نفسہ لازم ہے یا نہیں؟ تو عالمگیری کی عبارت

(جو آپ نے دوسرے نمبر پر ذکر کی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ تجدید؛ یعنی: ذکرِ مہر؛ لازم نہیں ہے؛ کیوں کہ کہ اس عبارت میں ''زوج'' کو یہ طریقہ بتلایا گیا ہے کہ اگر وہ نئے مہر کے لزوم سے بچنا چاہے، تو وہ تجدیدِ نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ کرے، یا مہر ذکر تو کرے؛ لیکن پہلے نکاح میں جتنا مہر مذکور ہوا تھا، اتنا ہی ذکر کرے، ایسی صورت میں اس پر مزید کوئی چیز لازم نہ ہوگی۔

ينبغي أن يجدِّد النِّكاح ولايذكر المهر فلايجبُ عليه مهرٌ آخر. (هندية: ۳۱۳/۱، ط: زكريا) اگر تجدیدِ مہر (یعنی: ذکرِ مہر) لازم ہوتی، تو صورتِ مسئولہ میں عدم ذکر کی تدبیر بتلانے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہ جاتا؛ اس لیے فتاوی رحیمیہ، اور نجم الفتاوی میں جو بات لکھی گئی ہے؛ وہ درست ہے، رہی فتاوی محمودیہ کی بات کہ سابق مہر کافی نہیں ہے، تو اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ سبقتِ قلمی سے نکل گیا ہو، اصل حکم تو گواہوں کی موجودگی کا لزوم بتلانا تھا؛ کیوں کہ استفتاء میں یہی بات دریافت کی گئی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ سوال میں کچھ اور تفصیل رہی ہو، اور بہ وقتِ ترتیب سوال کو مختصر کردیا گیا ہو، جس سے صورتِ سوال بدل گئی ہو۔ (واللہ تعالی اعلم)

جواب ہٰذا کے شروع حصّے میں علامہ شامی کی جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے، اُس کی پوری عبارت درج ذیل ہے:

تنبيه: في القنية: جدَّد للحلال نكاحاً بمهر يلزمُ إن جدَّده لأجل الزِّيادة، لا احتياطا، أي: لو جدَّده لأجل الاحتياط لا تلزمه الزِّيادةُ بلانزاع، كما في البزَّازية، وينبغي أن يُحمل على ما إذا صدَّقته الزَّوجة أو أشهد؛ وإلا فلا يصدَّق في إرادته الاحتياط، كما مرَّ عن الجمهُور، أو يُحمل على ماعند الله تعالى إلخ. (در مختار مع الشامي: ۲۴۷/۴-۲۴۸، ط: زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۲۹ھ، پنج شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی- محمد مصعب عفی عنہ

(۶۵۹/تتمہ/س، ۹۷/س، ۱۴۳۸ھ)

شادی کے وقت بیٹی کو کچھ دینے اور مروجہ جہیز کا شرعی حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

کیا جہیز دینا سنت ہے؟ اگر سنت ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے سوا دوسری بیٹیوں کو کیوں نہیں دیا؟ لیکن اگر لعنت ہے، تو کیوں؟ ہوسکتا ہے کہ دینے والا ہدیہ یا اس کی وراثت دے رہا ہو، مسئلہ مذکورہ کی مکمل و مدلل وضاحت فرمائیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: نام ونمود اور تفاخر کے لیے جہیز دینا، اُس کی نمایش کرنا، محض معاشرے کے دباؤ میں زیادہ سے زیادہ جہیز دینے کی فکر سے زیر بار ہونا، اور اس کے لیے قرض اور کبھی سودی قرض سے بوجھل ہو جانا، جہیز کی مقررہ فہرست پوری کرنے کے لیے محض نام آوری کے واسطے کوشاں ہونا، جہیز کو وراثت کا بدل سمجھنا، اسی بنا پر لڑکیوں اور بہنوں کو وراثت سے محروم رکھنا، لڑکے والوں کا جہیز کے سامانوں کا مطالبہ کرنا، کم ملنے پر ناگواری کا اظہار کرنا، اور ناراض ہونا، کبھی شکوہ شکایت کرنا، مروجہ جہیز کی مذکورہ بالا خرابیوں -کہیں بعض کہیں کل- کی وجہ سے لڑکیوں کی شادی کا ان کے والدین کے اوپر بوجھ ہو جانا، نتیجۃً بسا اوقات لڑکیوں کا نامناسب اور غلط اقدام کر بیٹھنا۔

مروجہ جہیز؛ جس میں اس طرح کے مفاسد یا بِنائے مفاسد موجود ہوں، اس کا لعنت ہونا ظاہر ہے؛ پس ان مفاسد، یا بِنائے مفاسد سے اجتناب و احتراز کرنے کی کوشش کرنا واجب ہے، باقی لڑکی کو رخصت کرتے وقت، یا پہلے یا بعد کچھ تحفے، کپڑے، زیور، یا سامان وغیرہ دے دینا، اس میں حرج نہیں، جائز اور مباح ہے؛ بہ شرطے کہ ریاء ونمایش اور تفاخر نہ ہو، اسے وراثت کا بدل نہ سمجھا جائے، ان سامانوں میں سے کوئی چیز ضروری نہ سمجھی جائے، اور اس طرح کے تحائف؛ بیٹیوں کی طرح بیٹوں کو بھی دیے جائیں، شادی کے وقت کے ساتھ اسے خاص نہ سمجھا جائے؛ بل کہ تحفے تحائف دینے لینے کا وقت؛ مدۃ العمر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے گرہستی کے بعض سامان کا بندوبست کیا تھا؛ لیکن سامان کا انتظام؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کے پیسے سے کیا گیا تھا؛ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور معیت میں رہ رہے تھے، نکاح ہوجانے پر اُن کا گھر الگ بسانے کے لیے انھی کے پیسے سے کچھ سامان کر دیا گیا تھا؛ لہٰذا مروجہ جہیز

پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے واقعے سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہٰ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۱/د، ۷/د، ۱۴۳۸ھ)

جہیز نہ لانے پر سسرال والوں کا لڑکی کو پریشان کرنا جائز نہیں

سوال: سسرال والوں کا لڑکی کو اس وجہ سے پریشان کرنا کہ وہ جہیز نہیں لائی، یا جہیز میں کم سامان لائی؛ کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللّٰہ التوفیق: سسرال والوں کا لڑکی کو جہیز کے سلسلے میں طعنہ دینا ناجائز وحرام ہے، یہ لڑکی پر ظلم ہے، بغیر رضامندی کے جہیز کے نام پر مال حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

عن أبي حرَّة الرّقاشي عن عمِّه أن رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم قال: لا یحلُّ مالُ إمرئ مُسلم إلا بطِیب نفسٍ منه. (شعب الإیمان للبیهقي، باب في قبض الیدین الأموال المحرمة، دار الکتب العلمیة، بیروت: ۳۸۷/٤، رقم: ٥٤٩٢) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۷/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۵۲۳/ص، ۶۲۹/ص، ۱۴۳۸ھ)

شادی کے موقع سے متعینہ رقم مسجد میں دینے کی رسم درست نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) ہمارے گاؤں پرسولیا، ضلع مدھوبنی، بہار میں گاؤں کے ہی لوگوں نے؛ پنچایت میں یہ طے کر رکھا ہے کہ گاؤں میں جو بھی شادی ہوگی، خواہ شادی لڑکے کی ہو، یا لڑکی کی، تو اس کو لڑکے کی طرف سے تین ہزار، اور لڑکی کی طرف سے پچیس سو روپے مسجد میں دینے پڑیں گے، جو ایک طرح سے

ولیمے کا معاوضہ بھی سمجھا جاتا ہے، اگر یہ رقم ادا کردے، اور ولیمہ نہ کرے، تو اس کو گاؤں والے؛ دعوت کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتے ہیں، اس میں اس قدر شدت برتی جاتی ہے کہ اگر کوئی غریب ہے، اور دینے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے، تو اس کی طرف سے غربت ظاہر کرنے پر؛ گاؤں میں چندہ کیا جاتا ہے، کوئی بھی لڑکے والا بارات لے کر اس وقت تک نہیں جاسکتا، جب تک کہ یہ رقم ادا نہ کردے، جب کہ تمام لوگ اس سے متفق نہیں ہیں، خواہی نہ خواہی دینا ہی پڑتا ہے، اس رقم کو مسجد میں دینا، اور اس کو مسجد کے مصارف میں خرچ کرنا کیسا ہے؟

(۲) اور اگر کوئی شخص بالکل سنت کے مطابق شادی کرلے، تو اس کو یہ رقم جمع کرنا کیسا ہے؟ شریعت کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے؟ مدلل ومفصل واضح طور پر جواب دے کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: (۱) لڑکے اور لڑکی، یا اُن کے اولیاء پر رقم لازم کردینا جائز نہیں، قرآن کریم اور حدیث شریف میں باطل طریقے، اور زور زبردستی کرکے؛ دوسروں کے اموال کو حاصل کرنا حرام وگناہ اور ظلم قرار دیا گیا ہے؛ پس آپ کے علاقے میں مذکورہ فی السوال رسم کے لحاظ سے؛ رقم وصول کرکے مسجد وغیرہ میں خرچ کرنے کا رواج واجب الترک ہے، سب مل جل کر یہ رسم ختم کردیں؛ البتہ مسجد کی ضروریات بتلا کر ترغیب دے دیں، اور پھر خوش دلی سے جو شخص جو کچھ دے دے، اس کو قبول کرکے مسجد میں خرچ کرلیں، تو اس کی گنجایش ہے۔

(۲) جو شخص بالکل سنت کے مطابق شادی کرے، رقم لینے دینے کا حکم؛ اس کے متعلق بھی وہی ہے، جو نمبر: ۱ کے تحت لکھ دیا، یعنی: رضائے قلب، اور خوش دلی سے؛ مسجد میں کچھ دے دے، تو ٹھیک ہے؛ لیکن زور اور دباو کے ذریعے اس سے بھی وصول کرنا جائز نہیں۔

نوٹ: ہر مسلمان کو سنت کے مطابق سادگی کے ساتھ ہی نکاح کرنا کرانا چاہیے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۴ھ الموافق: ۲۰۱۷/۲/۲ء، یوم الخمیس

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۴۸/ھ، ۶۲۱/ھ، ۱۴۳۸ھ)

صوبۂ جھارکھنڈ میں رائج نیگی بھاگی رسم کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین؛ اس مسئلے میں کہ ہمارے صوبۂ جھارکھنڈ کے مختلف خطوں میں اس رواج کا چلن ہے کہ گاؤں اور بستی کی سطح پر انجمنیں ہوتی ہیں، جن کا مقصد؛ باہم اتحاد و اتفاق قائم کرنا، جھگڑے مٹانا، اور دوسرے دینی وسماجی کام کرنا ہوتا ہے، خصوصاً شادی بیاہ کے موقعوں پر پکانے اور کھلانے کا سامان، اور نکاح خوانی وغیرہ کے انتظامات کرتی ہے، اور اس کے لیے وہ انجمن؛ علی اختلاف المقامات لڑکے اور لڑکی والوں سے طے شدہ رقم لیتی ہے، جس رقم کو ہمارے یہاں کے عرف میں ''نیگی بھاگی'' کہتے ہیں، اور یہ رقم ایسی طے شدہ ہے کہ اگر اس کی ادائیگی نہ ہوئی، تو انجمن اس کا کسی طرح تعاون نہیں کرتی، نہ نکاح خوانی کے لیے وہ امامِ مسجد کو جانے دیتی ہے، اور نہ ہی انجمن کے دیگر سامانِ ضرورت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس رقم (جواب ہمارے یہاں تقریباً لڑکی والوں سے دو ہزار، اور لڑکے والوں سے پینتالیس سو روپے ہے) کی وصول یابی میں سارے اختیارات کو کام میں لایا جاتا ہے، اور زور تو اپنے گاؤں کے لڑکی والے پر چلتا ہے؛ اس لیے اگر کسی وجہ سے دوسرے گاؤں کا لڑکے والا وہ متعینہ رقم نہیں دیتا، تو لڑکی والے پر دباو بنایا جاتا ہے، اور بالآخر لڑکے والی رقم بھی لڑکی والے سے وصول کی جاتی ہے، اس کے بعد ہمارے یہاں اس رقم کا مصرف یہ ہوتا ہے:

(۱) گاؤں کی مسجد کی ضرورت میں خرچ کی جاتی ہے؛ مثلاً: تعمیرِ مسجد، جنریٹر، جائے نماز وغیرہ۔

(۲) گاؤں کا مدرسہ؛ مدرسے کے ذمے دار کو اس میں سے کچھ رقم دی جاتی ہے۔

(۳) قبرستان کہ اس کے اخراجات؛ مثلاً: قبرستان کی زمین کے مقدمے وغیرہ میں۔

(۴) نکاح خواں کہ اس کو کچھ عوض دیا جاتا ہے۔

استفتاء یہ ہے کہ رقم کا طے کرنا، رقم کو وصول کرنے کی موجودہ صورت، اور اس رقم کے بیان کردہ مصارف، کیا شریعتِ مطہرہ میں اس کی گنجایش ہے؟ اگر نہیں ہے، جیسا کہ بعض کا خیال ہے، تو انجمن کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے بڑے بڑے مسلمانوں کے فائدے ہیں، تو پھر کس صورت سے دولہا، دلہن والوں سے رقم لی جائے؟ کیوں کہ یہ انجمن؛ بارات والوں کے تحفظ وخاطر مدارات کے ساتھ ساتھ؛ طعام وغیرہ کے لیے دیگیں، اور دیگر سامانِ ضرورت بھی مہیا کرتی ہے۔ **بيِّنوا توجرُوا، والله لايُضِيعُ أجر المُحسِنين**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: آپ کے یہاں ''نیگی بھاگی'' کا جو عرف ہے، وہ قباحتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لائقِ ترک ہے، حدیث میں ہے: **ألا لا يحِلُّ مالُ امرءٍ مُسلم إلا بطِيب نفسٍ منه**، یعنی: کسی مسلمان کا مال؛ خوش دلی کے بغیر حلال نہیں، آپ کے گاؤں، بستی میں انجمن والے جو ایک متعین رقم لڑکے، لڑکی والے پر لازم کردیتے ہیں، اور اس کی ادائیگی پر مجبور کرتے ہیں، اس طرح لازم کرکے جبراً وصول کرنا درست نہیں۔

انجمن والوں کے پاس اگر کھانے، پکانے کے سازوسامان ہیں، تو وہ اُسے کرایے پر دے سکتے ہیں، اور حاصل شدہ کرایہ؛ انجمن کے مقاصد ومصارف میں صرف کرسکتے ہیں؛ لیکن انجمن، مسجد، مدرسہ، قبرستان وغیرہا کے نام پر لڑکے، لڑکی والوں سے جبریہ؛ متعینہ چندے کا مطالبہ غلط ہے، چندہ خالص تبرع کا عمل ہے، اس میں دینے والا اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق خوشی سے جتنا دے، اسے قبول کرلینا چاہیے۔

اور لڑکے، لڑکی والے کو اختیار ہے، جس سے چاہیں نکاح پڑھوائیں، اور نکاح خوانی کی اجرت کا مستحق وہی ہوگا، جو نکاح پڑھائے، انجمن کو یہ حق نہیں کہ وہ نکاح خوانی کی اجرت کا کل یا بعض حصہ نکاح خواں کی مرضی واجازت کے بغیر رکھ لے، اور طے شدہ رقم نہ ملنے پر امام کو نکاح خوانی سے روک دے، بہ ہرحال! انجمن کو رفاہی کاموں کے لیے چندہ لینے میں جبریہ طریقہ نہیں اپنانا چاہیے۔

فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۳/جمادی الاولیٰ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۵۹۰/تتمہ/م، ۶۶۷/م، ۱۴۳۸ھ)

شادی میں لہنگا، چنری پہننے کا حکم

سوال: خدمت اقدس میں کچھ مسائل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) لڑکی کو شادی والے دن لہنگا، چنری پہنایا جاتا ہے، پھر اپنے گھر سے رخصت کرکے شوہر کے گھر بھیجا جاتا ہے، حال یہ ہے کہ پھر اس کو کبھی نہیں پہنا جاتا ہے، تو اس کا پہننا کیسا ہے؟

(۲) اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کو لہنگا، چنری پوری آستینوں کے ساتھ اس طور پر پہنائے کہ شریعت کے مطابق: اعضاء چھپے ہوئے ہوں، اس کے اوپر برقعے کو؛ پورے پردے کے ساتھ رخصت کرے کہ اس سے پورے اعضاء چھپے ہوئے ہوں، تو اس طرح لہنگا، چنری، اور اس کے اوپر سے برقعہ پہن کر شوہر کے گھر آنا کیسا ہے؟

(۳) شوہر کے گھر پر دیکھنے والیاں (لڑکیاں، عورتیں) بہت ہوتی ہیں، تو یہ زیب وزینت کس کی طرف شمار کی جائے گی؟ اور عام طور پر لہنگا، چنری پھر کبھی نہیں پہنا جاتا ہے؛ سوائے شادی والے دن کے، حال یہ ہے کہ اس شخص کی لڑکی شوہر کے لیے بار بار پہنے گی، تو اس کا پہننا کیسا ہے؟

لہٰذا آں جناب سے مودبانہ التماس ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں جوابات تحریر فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱)** لہنگا، چنری دورِ حاضر میں غیر مسلم عورتوں کا خاص لباس نہیں رہا، بہت سی مسلمان عورتیں بھی پہنتی ہیں؛ اس لیے شادی کے موقع پر غرارے کی طرح لہنگا، چنری پہننا بھی درست ہے۔ (مستفاد: کفایت المفتی: ۹/۱۷۰، جواب: ۲۱۱، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)؛ البتہ لہنگے کے اندر شلوار یا پائجامی ہونی چاہیے؛ تاکہ اٹھتے بیٹھتے یا گاڑی میں سوار ہوتے وقت؛ ستر ظاہر ہونے کا اندیشہ نہ رہے، نیز لہنگا، چنری کے ساتھ برقعے کا بھی اہتمام کیا جائے؛ تاکہ رنگین اور زرق و برق لہنگا، چنری وغیرہ پر اتفاقی طور پر بھی کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔

اور کسی لباس کا صرف شادی کے موقع پر استعمال ہونا، شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں؛ بل کہ بہت سی عورتیں شادی کا لباس گھروں میں گاہے بہ گاہے شوہروں کے لیے بھی پہنتی ہیں، اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔

(۲) جائز ہے، جیسا کہ اوپر لکھا گیا؛ البتہ اگر کوئی خاتون؛ تقوے کے طور پر لہنگا، چنری سے پرہیز کرے، اور شادی کے موقع پر غرارہ ہی استعمال کرے، جو خالص مسلمانوں کا لباس ہے، اور بہت سی مہذب و دین دار خواتین اسی کو پسند کرتی ہیں، تو یہ اچھی بات ہے؛ کیوں کہ لہنگا، چنری دراصل غیر مسلم خواتین کا لباس ہے، جیسا کہ امداد الفتاوی (۴/۲۶۶، سوال: ۳۳۹، مطبوعہ: مکتبہ اشرفیہ، دیوبند) میں ہے: اگرچہ اب مسلمانوں میں بھی اس کا رواج ہوگیا ہے۔

(۳) یہ زیب وزینت بنیادی طور پر شوہر کے لیے ہوتی ہے، اور دیکھنے کے لیے آنے والی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے ضمنی طور پر، پھر جب کوئی عورت یا لڑکی شادی کے بعد؛ شوہر کے لیے گاہے بہ گاہے لہنگا، چنری پہننے کا ارادہ رکھتی ہے، تو یہ اچھی بات ہے۔

خلاصہ یہ کہ شادی کے بعد بھی شوہر کے لیے گاہے بہ گاہے پہننے کی نیت کے ساتھ لہنگا، چنری سلوانے، اور پہننے میں شرعاً کچھ حرج نہیں؛ بل کہ حسن نیت کی صورت میں اچھا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۶/۷/۱۴۳۸ھ = ۴/۴/۲۰۱۷ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری۔ محمد مصعب عفی عنہ

(۸۷۷/ن، ۷۲۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

کسی کو خوش کرنے یا رشتے داری نبھانے کے لیے غیر شرعی تقریبات میں شریک ہونا کیسا ہے؟

سوال: الحمدللہ! گذشتہ چند ماہ سے میں شرعی پردہ کر رہی ہوں، اور تمام برائیوں سے بھی بچنے کی کوشش کر رہی ہوں؛ تاکہ اپنی زندگی اللہ کے حکم کے مطابق گذار سکوں، سب سے زیادہ پریشانی مجھے اجتماعی معاملات میں پیش آتی ہے، آپ بھی جانتے ہیں ہمارے معاشرے میں اب تیزی سے لوگ دین کی تعلیمات کو چھوڑتے جا رہے ہیں، ماحول ایسا ہو گیا ہے کہ اگر کوئی کسی برائی کو منع کرے، تو الٹا اسے ہی برا کہا جاتا ہے، شادی کی تقریبات میں خاص طور پر غیر اسلامی کام ہو رہے ہیں، اسی سلسلے میں راہ نمائی کریں کہ میں کس طرح ان میں شرکت کروں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی بھی نہ ہو، اور رشتے داری میں بھی فرق نہ آئے۔

جن تقریبات میں مجھے مسائل پیش آتے ہیں، ان میں راہ نمائی کریں؛ تاکہ میرے ساتھ اور بہت سے لوگوں کا بھی بھلا ہو جائے:

میں نے مایوں کی تقریبات میں جانا چھوڑ دیا ہے؛ کیوں کہ اس میں ناچ گانا ہی ہوتا ہے، منگنی کی تقریب میں گانے تو نہیں ہوتے؛ مگر تصویر سازی اور کچھ رسومات، جیسا کہ اگر لڑکی کی منگنی ہو، تو خواتین اور قریبی غیر محرم رشتے دار آکر لڑکی کے پاس بیٹھتے ہیں، اور لڑکی کا منہ میٹھا کروا کر پیسوں کا لفافہ دیتے ہیں، ساتھ میں تصویر بھی کھچواتے ہیں، اس قسم کی تقریب میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

اگر میں باپردہ شرکت کروں، اور نہ لڑکی کے پاس بیٹھ کر مٹھائی کھلاؤں، نہ تصویر بنواؤں، بس چپکے سے پیسوں کا لفافہ لڑکی کی ماں کو دے دوں، تو میرا یہ عمل کیسا ہے؟ میں رسم نہیں نبھانا چاہتی، بس شرکت کر کے؛ رشتے داری کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں، اس سلسلے میں بھی میری راہ نمائی کریں کہ ان شاء اللہ میری اور پھر میرے چھوٹے بہن بھائی کی بھی شادی ہوگی، اور مجھے ڈر ہے ہمارے گھر کی شادی میں بھی یہ سب کام ہوں گے، بھائی کی ہونے والی سسرال بھی رسم و رواج نبھانے والے ہیں، اور تصویر سازی کے شوقین ہیں، مجھے معلوم ہے اس معاملے میں میری کوئی نہیں سنے گا، سب کو معلوم ہے کہ یہ غلط کام ہے؛ مگر پھر بھی لوگوں کی وجہ سے، یا اپنے نفس کی خوشی کے لیے یہ کام کرتے ہیں، اس صورت میں میرا عمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا مجھے ان رسم و رواج اور برے کاموں کو ناگواری اور دل سے برا سمجھتے ہوئے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی مایوں میں شرکت کرنی چاہیے؟ میں حتی الامکان کوشش کروں گی کہ ہمارے گھر کی شادیوں میں یہ خرافات نہ ہوں؛ لیکن اگر میں خدانا خواستہ ناکام ہو جاتی ہوں، تو پھر میری راہ نمائی کریں کہ میں کس طرح اپنے گھر کی تقریبات میں شرکت کروں، اللہ تعالیٰ سے اپنے گھر والوں کی اصلاح کے لیے دعا کرتی رہتی ہوں، آپ حضرات کی دعاؤں کی بھی ضرورت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: جس تقریب میں ناچ گانا ہو، یا فوٹوگرافی ہو، یا کوئی بھی خلافِ شرع کام ہو، اس میں شرکت درست نہیں، آپ نے اچھا کیا کہ مایوں کی تقریب میں جانا چھوڑ دیا، نفس یا لوگوں کی خوشی کے لیے، یا رسم و رواج کی انجام دہی کے لیے شریعت کی خلاف ورزی جائز نہیں، آپ کے گھر شادی ہونے والی ہے، تو آپ اپنے طور پر پوری کوشش کریں کہ غلط رسومات نہ ہوں، حکمت، نرمی اور حسنِ تدبیر سے گھر والوں کو، اور دیگر رشتے داروں کو سمجھائیں کہ ناچ گانا، فوٹوگرافی، بے پردگی یہ سب چیزیں ناجائز اور گناہ ہیں، اگر کوئی نہ مانے، اور عمل نہ کرے، تو اس کا ذمے دار وہ ہے، آپ خود بالقصد اور بہ خوشی ان خرافات میں شریک نہ ہوں، اگر کوئی اس کی وجہ سے ناراض ہو، تو اس کی پرواہ نہ کریں، خدا اور رسول کو ناراض کر کے کسی کو خوش کرنا جائز نہیں۔

لأنَّه لا طاعةَ لمخلُوقٍ في معصية الخَالِق. (در مختار مع الشامي: ۹/۴۹۸، ط: أشرفي، ديوبند)

اصلاحِ حال کی کوشش کرتی رہیں، اور خود بھی خلافِ شرع امور سے بچتی رہیں، جہاں منکر پر نکیر (روک ٹوک) کی استطاعت نہ ہو، وہاں دل سے ناگوار سمجھتے ہوئے خود کنارہ اختیار کرلیں۔

مَن رأى منكم مُنكراً فليُغيِّره بيده، فإن لم يَستطِع فبلسانه، فإن لم يَستطِع فبقلبه وذلك أضعفُ الإيمان. (الحديث) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴؍رجب ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۰۳۲؍تتمہ؍م، ۹۸۶؍م، ۱۴۳۸ھ)

تقریبات میں ٹیبل کرسی پر کھانا کھانا اور ایسی تقریبات میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

سوال: دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ آج کل شادی وغیرہ میں ٹیبل، کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا رواج بڑھتا ہی جا رہا ہے، اس کی وجہ سے کئی بار قریبی رشتے داروں کے گھروں سے دعوت آتی ہے، اب دریافت یہ کرنا ہے کہ ایسی دعوت میں شرکت کا کیا حکم ہے؟ چوں کہ بندہ مادرِ علمی دارالعلوم سے فارغ ہے، اس نسبت کی بنا پر بندہ لوگوں سے کہتا ہے کہ ہمارے اسلام میں جب بیٹھ کر کھانے کی تہذیب ہے، تو ٹیبل، کرسی کیوں؟ بندہ یہ کرتا ہے کہ اگر کسی کے یہاں جانا پڑتا ہے، تو بندہ کچھ زمین پر بچھا کر بیٹھ کر کھا لیتا ہے، اب میں کیا کروں؟ میرا یہ عمل صحیح ہے یا غلط؟ میں لوگوں کو روکوں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: تقریبات میں ٹیبل، کرسی پر کھانا کھانا بلا کسی عذر کے خلافِ اولیٰ ہے، ایسی تقریبات میں اگر کوئی اور خلافِ شرع کام نہیں پایا جاتا ہے، تو اس میں شرکت ناجائز نہیں ہے، تاہم علماء کو چاہیے کہ وہ اس بات کی ترغیب دیں کہ ٹیبل، کرسی کے بجائے نیچے فرش یا تخت پر بیٹھ کر کھلانے کا انتظام کیا جائے؛ لیکن اگر کسی جگہ یہ انتظام نہ ہو، تو کرسی پر بھی بیٹھ کر کھا لینے کی گنجائش ہے۔

عن أنس رضي الله عنه قال: ما أكل النَّبي صلّى الله عليه وسلّم على خوان ولا سكرجة، ولا خبز له مرققٌ، فقلتُ لقتادة: فعلى ما كانوا يأكلون؟ قال: هذه السّفر. (ترمذي: ۲/۱، ط: مكتبة البدر، ديوبند) **والحاصلُ أن الكلام عليه (أي الخوان) بحسب نفس ذاته لا يربُو على ترك الأولويَّة، فأمَّا إذا لزم فيه التَّشبُّه باليهُود أو النَّصارىٰ –كما هو في ديارنا–**

كـان مـكـرُوهـاً تـحـريماً، وأمَّا إذا لم يكن على دأبهم فلا يخلُو أيضاً عن تفويت منافع . (الكوكب الدّري) قال المُحشِّي رحمه اللّٰه: قال المناوي رحمه اللّٰه: يعتاد المتكبِّرون من العجم الأكل عليه؛ لئلا تخفض رؤوسهم، فالأكل عليه بدعةٌ؛ لكنَّه جائزٌ إن خلا عن قصد التَّكبُّر. (الكوكب الدري مع حاشيته: ۱/۲، ط: المكتبة اليحيوية) اعلم أنَّه يُطلق الخِوان في المُتعارف على ماله أرجل، ويكون مُرتفعاً عن الأرض، واستعمالُه لم يزل من دأب المترفين، و صنيع الجبَّارين؛ لئلا يفتقروا إلى خفض الرَّأس عند الأكل، فالأكلُ عليه بدعةٌ؛ لكنَّها جائزةٌ . (جمع الوسائل في شرح الشمائل، ص: ٤٤، ط: إدارة التأليفات اشرفية، ملتان). فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۱۷ھ الموافق: ۲۰۱۷/۱/۱۶ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۵۰/ھ، ۴۱۸/ھ، ۱۴۳۸ھ)

بفے سسٹم (کھڑے ہو کر کھانے) والی تقریب میں شرکت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

جس تقریب میں بفے کا انتظام ہو اُس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: ''بفے سسٹم'' (جس میں لوگ کھڑے کھڑے کھاتے ہیں) یہ یہود ونصاریٰ، فساق وفجار کا طریقہ ہے، اس طور پر کھانا اسلامی طریقہ نہیں ہے، جس تقریب میں اس طور پر کھانے کا انتظام ہو، اُس میں شرکت سے احتراز کرنا چاہیے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۰ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۲۱/ل، ۵۸۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

شادی میں شرکت کرنے کے لیے سفر کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

شادی میں شرکت کے لیے دوسرے شہر سفر کرکے جانا کیسا ہے؟ برائے کرم جلد از جلد مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: اگر شادی میں محظوراتِ شرعیہ کا ارتکاب نہ ہوتا ہو، تو فی نفسہ ایسی شادیوں میں سفر کرکے شرکت کرنا مباح ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۴/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۲۱/ل، ۵۸۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

شادی شدہ عورت کا اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام ملانا کیسا ہے؟

سوال: شادی شدہ عورت؛ اپنے نام کے ساتھ اپنے شوہر کا نام ملاتی ہے، کیا اِس میں کوئی حرج اور گناہ تو نہیں ہے، جب کہ ولدیت کے موقع پر اپنے باپ کا نام ملاتی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: گناہ تو نہیں؛ مگر بلاضرورت ملانا اچھا بھی نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۳/۶/۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۳/۳/۲۰۱۷ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۸۱/ھ، ۱۷۲/ھ، ۱۴۳۸ھ)

عورت کا اپنے نام کے ساتھ والد کے بجائے شوہر کا نام جوڑنا کیسا ہے؟

سوال: السلام علیکم! جو عورتیں اپنے والد کا نام ہٹا کر اس کی جگہ اپنے شوہر کا نام اپناتی ہیں، وہ غور کریں کہ یہ حرام ہے، مان لو کسی عورت کا شادی سے پہلے نام ''فاطمہ مقصود علی'' تھا، اور شادی کے بعد اپنے شوہر کے نام کے ساتھ جوڑ کر ''فاطمہ ساجد'' رکھ دیا، یہ حرام ہے، اس کی اجازت نہیں کہ کوئی

اپنے باپ کا نام ہٹا کر اپنے شوہر کا نام اپنے نام کے آگے لگائے، یہ کفار کا طریقہ ہے، ہمیں اس کو اپنانے سے بچنا چاہیے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث کی روشنی میں دیکھیں:

رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے اپنے نام میں اپنے والد کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کا نام جوڑا (جو اس کا باپ نہیں) اس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی لعنت ہے'' (ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۵۹۹) حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالی عنہ نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی آدمی نے اپنے والد کے سوا اپنی شناخت کسی اور کے ساتھ ملائی، اس نے کفر کیا، جس نے اس شخص سے اپنے نام کو جوڑا جو اس کا باپ نہیں، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے'' (بخاری شریف: ۳۵۰۸) حضرت سعد بن ابی وقاص یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو یہ کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، اور وہ کسی کے ساتھ خود کو جوڑتا ہے جو اس کا باپ نہیں، یہ جان کر کہ وہ اس کا حقیقی باپ نہیں، جنت اس کے لیے حرام ہے'' (بخاری شریف: ۴۰۷۲)

اس سے زیادہ اور کیا وارننگ ہوسکتی ہے کہ یہ کفار کا طریقہ ہے، حضرات! یہ کفار کا طریقہ تھا، اور آج ہماری بہنیں بڑے شوق سے اس کو اپناتی ہیں، یاد رہے! باپ کا رشتہ کسی بھی نئے رشتے کی وجہ سے نہیں ٹوٹتا، اور اولاد کی شناخت اور پہچان اس کے والد کے نام سے ہوگی، اگر شوہر کا نام لگانا جائز اور صحیح ہوتا، تو حضور علیہ السلام کی بیویوں نے بھی اپنا نام بدلا ہوتا؛ کیوں کہ اُن کے شوہر تو دنیا کے افضل ترین شخص تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ خدیجہ بنت خویلد رہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہمیشہ تا عمر عائشہ صدیقہ رہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کی بیٹی تھیں، یہاں تک کہ حضور علیہ السلام کی وہ بیویاں جن کے والد کفار تھے، آپ علیہ السلام نے ان کے نام کا لقب بھی کبھی تبدیل نہیں کیا، حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ تعالی عنہا کا باپ یہودی تھا، اور حضور علیہ السلام کا جانی دشمن بھی تھا، حضور علیہ السلام نے اپنی بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اُن کے لقب کو بدلنے کے بجائے ویسے ہی برقرار رکھا، جنت میں عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا ہمیشہ فاطمہ بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رہیں، اُنھوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے نام کے ساتھ اپنے نام کو کبھی نہیں جوڑا۔

گزارش: جس بہن نے غلطی سے ایسا کیا ہے، یا کسی شوہر نے لاعلمی میں ایسا کیا ہو، وہ اللہ تعالی کے حضور سچی توبہ کرے، اور اپنے والد کا نام واپس اپنے نام کے ساتھ جوڑے، ہمیں اپنے

اعمال کا حساب اللہ عز وجل کو دینا ہے، اور یہ سراسر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی ہے، حضرات! اس پوسٹ کو پڑھنے کے بعد زیادہ سے زیادہ شیئر کریں؛ تا کہ یہ بات ہر مسلمان تک پہنچے، اور وہ اس پر عمل کرے، اور آپ کو بھی نیتِ خیر کا ثواب ملے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: شادی شدہ عورت؛ جو اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگا لیتی ہے، اس کا مقصد؛ نسب اور خاندان کا بدلنا نہیں ہوتا؛ بل کہ محض از قبیلِ تعارف ایک صورت ہوتی ہے، اس پر نسب تبدیل کرنے والی احادیث میں وعیدوں کو چسپاں کرنا درست نہیں ہے، اگرچہ بلا ضرورت شوہر کا نام؛ اپنے نام سے ملا کر ظاہر کرنا اچھا بھی نہیں ہے، نہ ہی شریف وباعزت اور احتیاط برتنے والے خاندانوں کی بہن، بیٹیوں میں اس کا رواج ہے؛ اس لیے بغیر کسی ضرورت کے استعمال سے بچنا ہی بہتر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۴/۷/۱۴۳۸ھ الموافق: ۲/۴/۲۰۱۷ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۲۷/تتمہ/ھ، ۹۱۴/ھ، ۱۴۳۸ھ)

ویڈیو کالنگ کے ذریعے نکاح وطلاق کا حکم

سوال: ویڈیو کالنگ کے ذریعے؛ میں نے نکاح کیا تھا، اور شادی ہوئے؛ پانچ مہینے گذر چکے ہیں، اور ہمارے درمیان اب تک کوئی جسمانی تعلق قائم نہیں ہوا ہے، وہ کبھی مجھ سے ملاقات کے لیے نہیں آئے، اور اُنھوں نے مجھے ویڈیو کالنگ کے ذریعے طلاق دے دی، بہ راہِ کرم جواب دیں، میں مشکل میں ہوں، میری مدد کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: بہت سے علماء کی رائے یہ ہے کہ ویڈیو کالنگ کے ذریعے؛ بہ راہِ راست نکاح کرنے سے نکاح درست نہیں ہوتا، نیز جب اُنھوں نے آپ کو طلاق بھی دے دی ہے، تو اب آپ کی آزادی میں کوئی شبہ نہیں رہا،

آپ دوسری جگہ؛ جہاں نکاح کرنا چاہیں کرسکتی ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۶۸/ل، ۶۵۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

حکمتِ طلاق اور اسلامی تعلیم

سوال: میں ایک طالب علم ہوں، یہاں بہت سارے غیر مسلم طلبہ ہیں، یونیفارم سول کوڈ سے متعلق؛ مسلم پرسنل لا بورڈ اور مرکزی حکومت کے درمیان جاری بحث کے سلسلے میں ہمارے درمیان بات چیت ہوتی رہتی ہے، میرا سوال مساوات سے متعلق ہے، بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی سے سلوک کیا جاتا ہے، اور تین الفاظ بول کر ان کی زندگی تباہ کردی جاتی ہے، اس موضوع پر گرم بحث جاری ہے، اور میں اس بارے میں جواب چاہتا ہوں کہ اسلام نے مرد کو اتنا اختیار کیوں دیا ہے؟ اور پھر اگر مرد نشے کی حالت میں ہو، تو بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے، تین طلاق کے بعد سمجھوتے کی غالباً کوئی گنجایش نہیں رہ جاتی ہے۔ بہ راہِ کرم جواب دیں؛ تاکہ میں غیر مسلموں کو بھی جواب دے سکوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: شریعتِ اسلام میں جس درجہ عورتوں کے حقوق پر زور دیا گیا ہے، اُس کی نظیر دنیا کے کسی اور قانون میں نہیں ملتی، اسلام کے نظامِ طلاق کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہورہی ہے کہ اسلام میں عورت کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ نہیں کیا جاتا، لوگ سمجھتے ہیں کہ شریعتِ اسلامی میں صرف تین طلاق ہی سے طلاق واقع ہوتی ہے، حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے، طلاق کے اقدام سے پہلے شریعت کی جو تعلیمات ہیں، اگر اُن پر عمل کیا جائے، تو تین طلاق کے اقدام کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی؛ بل کہ مطلق طلاق کی نوبت کم ہی آئے گی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نکاح ایک شرعی پائے دار معاہدہ ہے، جس کو سخت ضرورت کے بغیر توڑنا، یا توڑنے کا مطالبہ کرنا اسلام میں ناجائز وممنوع، اور نکاح کے بنیادی مقصد اور اسلامی منشا کے خلاف ہے، احادیث میں بلاضرورت طلاق کے استعمال پر سخت وعیدیں آئی ہیں، ایک حدیث میں ہے: اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے، دوسری جگہ ارشاد نبوی ہے:

تزوَّجُوا، ولا تُطلِّقوا،فإن الطَّلاقَ يهتزُّ له عرشُ الرَّحمٰن. (كنز العمّال، الفصل الثاني في الترهيب من الطلاق، رقم: ۲۷۸۷٤)، (نکاح کرو؛ مگر طلاق نہ دو؛ اس لیے کہ طلاق سے اللہ کا عرش ہل جاتا ہے)

ایک روایت میں ہے: **أيُّما امرأةٍ سألت زوجها طلاقاً في غير ما بأسٍ، فحرامٌ عليها رائحةُ الجنَّة.** (أبوداؤد، رقم: ۲۲۲٦)، (جو عورت سخت مجبوری کے بغیر خود طلاق طلب کرے، اُس پر جنت کی خوش بو حرام ہے)

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بسا اوقات میاں بیوی کے درمیان حالات خوش گوار نہیں رہتے، آپسی نااتفاقیاں پیدا ہوجاتی ہیں، دونوں میں نباہ مشکل ہوتا ہے، ایسی صورت میں بھی اسلام نے جذبات سے کام لے کر جلد بازی میں فوراً ہی اس پاکیزہ رشتے کو بالکلیہ ختم کرنے کی اجازت نہیں دی؛ بل کہ میاں بیوی دونوں کو مکلّف بنایا کہ وہ حتی الامکان اس بندھن کو ٹوٹنے سے بچائیں، اگر خود اُن سے معاملہ حل نہ ہو، اور خدانہ خواستہ آپس کے تعلقات بہت ہی خراب ہوجائیں، تو پھر بھی شریعت نے رشتۂ نکاح کو توڑنے کی اجازت نہیں دی؛ بل کہ یہ حکم دیا کہ میاں بیوی دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایسا حکَم (پنچ) اور ثالث مقرر کرلیں، جو مخلص اور خیر خواہ ہوں، اور اُن کا مقصد اختلاف کو ختم کرانا ہو؛ اس لیے دونوں حکَم پوری ایمان داری اور انصاف کے ساتھ اختلاف کا جائزہ لیں، اور دونوں کے لیے ضابطہ طے کریں، جن باتوں کی وجہ سے اختلاف ہوا ہے، اُن باتوں کو یا تو بند کرائیں، یا اُن کے حدود مقرر کردیں، ارشاد باری ہے: ﴿**وَإِنْ خِفتُم شِقَاقَ بَينِهِمَا فَابعَثُوا حَكَماً مِّن أَهلِهِ وَحَكَماً مِّن أَهلِهَا.**﴾ (النساء: ۳۵)

مذکورہ تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ میاں بیوی کے درمیان نا اتفاقی اور ناخوش گوار حالات کے مسئلے کا ابتدائی حل؛ طلاق دینا نہیں ہے؛ بل کہ اختلاف کے اسباب کو تلاش کرکے اُس پر روک لگانا ہے، صلح وصفائی کی مذکورہ تمام صورتوں کو اختیار کرنے کے بعد بھی ممکن ہے کہ حالات قابو میں نہ آئیں، اور دونوں میں موافقت اور نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہ جائے، زوجین میں باہم اعتماد ختم ہوجائے، اور اللہ تعالے کے قائم کردہ حدود واحکام کو پورا کرنا مشکل ہوجائے، تو ایسی آخری صورت میں بھی معاہدۂ نکاح کو لازم قرار دینا ظاہر ہے کہ دونوں پر ظلم ہے، ایسی صورت میں اُن کی زندگی تنگی وپریشانی کا بدترین نمونہ بن جائے گی، جس کے نتیجے میں قابلِ نفرت گھناؤنی اور ناپسندیدہ حرکتوں کے صادر ہونے کا امکان ہے، نیز اس میں خاندانی فوائد کے بجائے سیکڑوں مصیبتیں اور مضرتیں ہیں۔

اسلام کی نظر میں طلاق اگر چہ ایک ناگوار اور ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن ایسے حالات میں بھی اگر طلاق کی بالکل ممانعت کر دی جائے، تو یہ نکاح دونوں کے لیے سخت فتنے اور پریشانی کا سبب بن جائے گا؛ لہٰذا ایسی مجبوری میں شریعت اسلامی نے طلاق کی گنجایش دی ہے؛ کیوں کہ نکاح کے بعد پیدا ہونے والی مشکلات، اور سخت ضیق وتنگی کی حالت سے نکلنے کا پرامن اور پرسکون راستہ صرف طلاق ہے، اس کا کوئی متبادل نہیں ہے، شریعت اسلامی کی طرف سے ایسے حالات میں طلاق؛ رحمت پر مبنی ایک قانون ہے، جس میں مرد کو اجازت ہے کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرلے، اسی طرح عورت بھی نکاح سے آزاد ہوکر چاہے، تو دوسری جگہ اپنا نکاح کرلے: لیکن ایسی آخری حالت میں بھی شریعتِ اسلام نے مرد کو یک بارگی تین طلاق دینے کی اجازت نہیں دی؛ بل کہ یہ حکم دیا کہ وہ عورت کی پاکی کی حالت میں، جس میں اُس کے ساتھ ہم بستری نہ کی گئی ہو، ایک طلاق دے کر اُس کو اپنے نکاح سے آزاد کردے، یہ طلاق کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔

تین طلاق دینا شریعت میں حد درجہ مبغوض اور گناہ ہے، جو شخص یک بارگی تین طلاق کا ارتکاب کرے گا، وہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سخت گناہ گار ہوگا؛ لیکن اگر کسی نے تین طلاق دے دی، تو اُس کا واقع ہوکر عورت کا مغلظہ بائنہ ہوجانا بھی قرآن وحدیث سے ثابت، اور جمہورِ امت کے نزدیک متفق علیہ مسئلہ ہے۔

اسلام کے قانونِ طلاق سے متعلق یہ چند ضروری باتیں تشفی کے لیے لکھ دی گئی ہیں؛ ورنہ ایک مسلمان کی بندگی اور عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے دیے ہوئے ہر حکم کو بغیر کسی تردد اور شبہے کے قبول کرے، خواہ اُس کی ناقص عقل؛ حکم کی مصلحت اور حکمت کو سمجھ سکے یا نہ سمجھے، اللہ کا ہر حکم بندوں کے مصالح اور نظامِ عالم کے صلاح اور درستگی کے مطابق ہے۔

نوٹ: نشے کی حالت میں طلاق واقع ہونے سے متعلق دارالعلوم دیوبند کا ایک تفصیلی فتویٰ ہے، ملاحظہ فرمالیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم (تفصیلی فتویٰ ذیل میں درج کر دیا گیا ہے۔حبان)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۵ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۰ رتتمہ رد، ۱۶۳ ارد، ۱۴۳۸ھ)

==

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے متعلق:

(۱) اگر کوئی شخص نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو تین طلاق دے دے، تو کیا طلاق پڑ جائے گی؟ اگر پڑ جائے گی، تو اسی بیوی سے دوبارہ نکاح کی کیا صورت ہوگی؟ اس سلسلے میں راجح اور صحیح قول کیا ہے؟ اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ جو لوگ حالتِ نشہ میں طلاق کے عدم وقوع کے قائل ہیں، وہ بھی اپنے قول کے دلائل پیش کرتے ہیں، اور خاص طور پر وہ موجودہ زمانے کے حالات کا بھی دلائل کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں، اُن کے دلائل شریعت کی روشنی میں کہاں تک صحیح ہیں؟ جمہور کی طرف سے ان کے دلائل کا کیا جواب ہے؟ واضح رہے کہ مشہور عالم دین حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' کے اندر صورتِ مذکورہ میں طلاق واقع نہ ہونے کے دلائل بیان فرمائے ہیں، اور اسی طرح دیگر فقہ اکیڈمی والے؛ مثلاً: قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ وغیرہ بھی اسی کے قائل تھے۔

(۲) اگر مذکورہ میاں بیوی فقہ اکیڈمی سے منسلک؛ بعض مفتیان کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے، آپس میں تعلق رکھیں، تو اُن کا یہ تعلق رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

ہر سوال کا جواب مکمل ومدلل، نیز نہایت تسلی بخش عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدا ومصلیا ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) اگر کسی نے اپنی رضامندی سے بالقصد کسی حرام نشہ آور چیز کا استعمال کیا، اور اسے نشہ طاری ہوگیا، پھر نشے ہی کی حالت میں اُس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، تو بلا شبہ طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ تین طلاق دی گئی ہو، جمہور علمائے امت کا یہی مسلک ہے؛ چناں چہ حضرت عمر فاروق، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم، حضرت سعید بن المسیب، حضرت عطاء، حضرت مجاہد، حضرت حسن بصری، محمد بن سیرین، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت شعبی، حضرت میمون بن مہران، حضرت حکم، حضرت سفیان ثوری، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت امام اوزاعی، حضرت سلیمان بن حرب، حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام ابو یوسف، حضرت امام محمد بن حسن رحمہم اللہ وغیرہ سے صراحتاً یہی منقول ہے کہ نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، اور اکابر مفتیانِ کرام کی بھی یہی رائے ہے؛ چناں چہ حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحبؒ، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ، حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ، حضرت مفتی یوسف صاحب لدھیانویؒ کے اقوال؛ اُن کے فتاوی کی کتابوں میں مذکور ہیں، نیز اس زمانے میں بھی؛ اکابر مفتیان کرام نے اس مسئلے پر کافی

غور وغوض کرنے کے بعد جمہور کے فیصلے ہی کو راجح قرار دیا ہے، جو لوگ نشے کی حالت میں طلاق کے واقع نہ ہونے کے قائل ہیں، اُن کا قول؛ دلائل کے اعتبار سے نہایت کمزور ہے۔

قال العُثماني التّهانوي: وأمّا طلاقُ السَّكران فأخرج ابنُ أبي شَيبة أنّ عُمر رضي اللّٰه عنه أجاز طلاق السَّكران بشهادة نسوةٍ اهـ. و أخرج عن عطاء، ومجاهد، والحسن، وابن سيرين، وابن المُسيّب، وعُمر بن عبد العزيز، وسُليمان بن يسار، والنَّخعي، والزُّهري، والشّعبي قالوا: يجُوز طلاقُه. وأخرج عن الحاكم قال: من طلَّق في سكر من اللّٰه، فليس طلاقُه بشيءٍ، ومن طلَّق في سكر من الشَّيطان، فطلاقُه جائزٌ. وأخرج مالك في المُوطّا (بسندٍ صحيح) عن سعيد بن المُسيّب و سُليمان بن يسار سُئلا عن طلاق السَّكران، فقالا: إذا طلَّق السَّكرانُ، جاز طلاقُه، وإن قتل قتل. قال مالكؒ: وذلك الأمر عندنا. (إعلاء السُّنن: ۱۱/۱۷۹، باب عدم صحة طلاق الصبي والمجنون والمعتوه وصحته من المكره و السكران والهازل، ط: أشرفية، ديوبند، مصنّف ابن أبي شيبة: ٤/٧٥-٧٦، باب من أجاز طلاق السكران، رقم: من: ١٧٩٥٧ إلى: ١٧٩٧٢، ط: الرشد، الرياض)

وقال ابنُ الهُمام: فقال بوقوعه من التَّابعين سعيد بن المُسيّب و عطاء، والحسن البصري، وابراهيم النَّخعي، وابن سيرين، و مُجاهد، وبه قال مالك والثّوري ، والأوزاعي، والشَّافعي في الأصح، وأحمد في رواية. (فتح القدير: ٣/٤٧٢، باب طلاق السنة، ط: زكريا، ديوبند)

وقال ابنُ قُدامة: في المسألة روايتان: أحدُهما: يقع طلاقُه، اختارها أبوبكر الخلال، والقاضي، وهو مذهب سعيد بن المُسيّب، وعطاء، ومجاهد، والحسن، وابن سيرين، والشّعبي، والنَّخعي، وميمُون بن مهران، والحَكم، ومالك، والثّوري، والأوزاعي، والشَّافعي في أحد قوله، وابن شبرمة، وأبي حنيفة، وصاحبَيه، وسُليمان بن حرب؛ لقول النّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم: كلُّ الطَّلاق جائزٌ؛ إلا طلاق المعتُوه، ومثل هذا عن علي ومُعاوية وابن عبَّاس. قال ابنُ عبَّاس: طلاقُ السَّكران جائزٌ، إن ركب معصيةً من معاصي اللّٰه، نفعه ذلك. (المغني لابن قدامة: ٧/٣٧٩، مسألة طلاق السكران، ط: مكتبة القاهرة، فتاویٰ دارالعلوم: ۹/۶۹، بہ عنوان: حالتِ نشہ میں تین طلاق دی تو کیا حکم ہے؟، کفایت المفتی: ۶/۹۱-۹۳، کتاب الطلاق، فصل سیزدہم: حالتِ نشہ میں طلاق دینا، ط: دارالاشاعت، کراچی، احسن الفتاوی: ۵/۱۸۲، کتاب الطلاق، بہ عنوان: حالتِ نشہ میں طلاق واقع ہوجاتی ہے،

ط: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، فتاوی محمودیہ: ۲۸۴/۱۲، کتاب الطلاق، باب وقوع الطلاق وعدم وقوعہ، الفصل الثالث فی طلاق السکران والمجنون، ط: دارالافتاء جامعہ فاروقیہ، کراچی، فتاوی رحیمیہ: ۲۶۸/۸-۲۷۳، کتاب الطلاق، ط: دارالاشاعت، کراچی، آپ کے مسائل اور اُن کا حل: ۶۴۲/۶، بہ عنوان: نشے کی حالت میں طلاق واقع ہوجاتی ہے، ط: مکتبہ لدھیانوی، کراچی)

ذیل میں جمہور کے مسلک کے دلائل ذکر کیے جاتیں ہیں:

۱۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَان، فَإمسَاكٌ بِمَعرُوفٍ أَو تَسرِيحٌ بِإحسَان﴾ **إلی قوله:** ﴿حتّٰی تَنكِحَ زَوجاً غَيرَه﴾ (البقرة: ۲۲۹ - ۲۳۰)، طلاق کے سلسلے میں قرآن کریم کی یہ آیت اصل کی حیثیت رکھتی ہے، اِس آیت میں نشے اور غیر نشے کی طلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح غیر نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، اسی طرح نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو؛ چناں چہ علامہ کاسانیؒ نے نشے کی حالت میں طلاق کے واقع ہونے پر اسی آیت کے عموم سے استدلال کیا ہے۔

واضح رہے کہ فقہائے کرام نے جن مخصوص صورتوں میں طلاق کے عدم وقوع کا حکم لگایا ہے، مثلاً: مجنون، بے ہوش، نابالغ اور اضطرار کی بعض صورتوں کی طلاق؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں خاص طور پر دوسری نصوص وارد ہوئی ہیں، ان مخصوص نصوص کی وجہ سے مذکورہ آیت کے عموم میں تخصیص کر لی گئی؛ لیکن نشے کی حالت میں طلاق کے عدم وقوع پر کوئی نص نہیں ہے؛ اس لیے نشے کی حالت کی طلاق؛ مذکورہ آیت کے عموم میں داخل ہوکر واقع ہوجائے گی۔

قال الكاسانيؒ: ولنا عمُوم قوله عزّ وجلّ: ﴿الطَّلاقُ مَرَّتَان﴾ إلى قوله تعالى: ﴿فإن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَه مِن بَعدُ حَتّٰى تَنكِحَ زَوجاً غَيرَه﴾ من غير فصل بين السَّكران و غيره؛ إلا من خصَّ بدليل. (البدائع: ۱۵۹/۳، فصل: شرائط ركن الطلاق، ط: زكريا، ديوبند)

قال عليٌّ رضي اللّٰه عنه: وكُلُّ الطَّلاق جائزٌ؛ إلا طلاق المعتوه. (البخاري تعليقاً: ۷۹۳/۲ - ۷۹٤، باب الطلاق في الإغلاق والكره والسكران، ط: مكتبة بلال، ديوبند، والترمذي: ۵۲۳/۱، باب ما جاء في طلاق المعتوه، ط: مكتبة شيخ الإسلام، ديوبند)

رُفِع القلمُ عن ثلاثة: عن النَّائم حتّٰى يستيقظ، عن الصَّبي حتّٰى يبلُغ، عن المعتُوه حتّٰى يعقل، وفي رواية: عن المجنُون حتّٰى يفيق. (البخاري تعليقاً: ۷۹۳-۷۹٤، باب الطلاق في الإغلاق والكره والسكران، ط: مكتبة بلال، ديوبند، وأبوداؤد: ۶۰٤/۲، كتاب الحدود، باب في المجنون يسرق أو يصيب حداً، ط: دار الكتاب، ديوبند)

۲۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لا تَقرَبُوا الصَّلاةَ وَ أَنتُم سُکَاریٰ﴾ (النساء: ٤٣) علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ اِس آیت میں نشہ کرنے والوں کو خطاب کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ نشہ کرنے والے؛ احکام خداوندی کے مخاطب ہیں، اور شریعت میں وہ احکام کے مکلّف ہیں؛ لہٰذا اُن کے تصرفات نافذ ہوں گے، اور اُن کی دی ہوئی طلاق واقع ہوگی؛ اس لیے کہ مذکورہ آیت میں اگر خطاب حالتِ سکر میں ہے، تو یہ نص ہے، اور اگر خطاب حالتِ سکر سے پہلے ہے، تو ضروری ہوگا کہ وہ حالتِ سکر میں اللہ کے فرمان کے مخاطب ہوں؛ ورنہ تو خطابِ خداوندی کا لغو ہونا لازم آئے گا۔

قال ابنُ الهُمام قُلنا: لمَّا خاطبه الشَّرعُ في حال سكره بالأمر والنَّهي بحُكمٍ فَرعيٍّ، عرفنا أنَّه اعتبره كقائم العقل؛ تشديداً عليه في الأحكام الفرعيَّة، وعقلنا أن ذلك يناسب كونه تسبّب في زوَال عقله بسببٍ محظُورٍ، وهو مُختارٌ فيه، فأدرنا عليه، واعتبرنا اقواله. وعلى هذا اتَّفق فتاوى مشايخ المذهبين من الشَّافعيَّة والحنفيَّة بوقُوع طلاق من غاب عقلُه بأكل الحشيش............ أمَّا ذلك الخطاب فقولُه تعالى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقرَبُوا الصَّلاةَ وَأَنتُم سُكَارىٰ﴾؛ لأنَّه إن كان خطاباً له حال سكره فنصٌّ، وإن كان قبل سكره، يستلزم أن يكون مُخاطباً في حال سكره؛ إذ لا يقال: إذا جننت، فلا تفعل كذا. (فتح القدير: ٣/ ٤٧٢–٤٧٣، كتاب الطلاق، باب طلاق السنة، ط: زكريا، ديوبند، وكذا في البحر الرائق: ٣/ ٤٣١، كتاب الطلاق، ط: زكريا، ديوبند)

وقال ابنُ نُجَيم نقلاً عن الخانية من كتاب الخلع: سائرُ تصرُّفات السَّكران جائزةٌ؛ إلا الرِّدة والإقرار بالحُدود والإشهاد على شهادة نفسه. (البحر الرائق: ٣/ ٤٣٢، كتاب الطلاق، ط: زكريا، ديوبند)

۳۔ حضرت علی رضی اللہ فرماتے ہیں: كلُّ الطَّلاق جائزٌ إلا طلاق المعتُوه. (مجنون کے علاوہ ساری طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں) اس حدیث کو بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے، اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ سے مرفوعاً ذکر کیا ہے، یہ حدیث بھی عام ہے، جس میں سوائے اُن لوگوں کے جن کو کسی دوسری دلیل سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، ہر شخص کی طلاق کے وقوع کا حکم لگایا گیا ہے، جس میں حالتِ نشہ کی طلاق بھی داخل ہے۔ (البخاري تعليقاً: ٢/ ٧٩٣–٧٩٤، باب الطلاق في الإغلاق والكره والسكران، ط: مكتبة بلال، ديوبند، والترمذي عن أبي هريرة مرفوعاً: ١/ ٥٢٣، باب ما جاء في طلاق المعتوه)

۴۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہے ہی؛ اُن میں دل لگی کے طور پر کہی ہوئی بات بھی حقیقت میں سنجیدگی ہی سمجھی جاتی ہے، وہ تین چیزیں: نکاح، طلاق اور رجعت ہیں۔

عن أبي هُريرة رضي اللّٰه عنه قال: قال رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: ثلاثٌ جِدُّهنَّ جِدٌّ، وهَزلُهنَّ جِدٌّ: النِّكاح، والطَّلاقُ، والرَّجعة. (الترمذي: ۵۲۱/۱، باب ما جاء في الجد والهزل في الطلاق، ط: مكتبة شيخ الإسلام، ديوبند، أبوداؤد: ۲۹۸/۱، باب في الطلاق على الهزل، ط: دار الكتاب، ديوبند)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر طلاق کا صدور؛ اُس کے اہل کی طرف سے ہو، تو محض الفاظ کے تکلم سے طلاق کا وقوع ہوجاتا ہے، خواہ طلاق کا تکلم کرنے والا طلاق کا حقیقی مفہوم مراد نہ لے، اور جو شخص اپنے اختیار سے کوئی حرام نشہ آور چیز استعمال کرتا ہے، تو شریعت میں وہ مکلّف رہتا ہے (جیسا کہ ماقبل میں علامہ ابن الہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ کا قول مذکور ہوا ہے) لہٰذا اُس کی دی ہوئی طلاق واقع ہوگی، خواہ حقیقت میں اُس کا ارادہ طلاق دینے کا نہ ہو۔

۵۔ تمام فقہاء متفق ہیں کہ حدود وقصاص کے حکم میں نشہ کرنے والا شخص؛ صاحی (باہوش) آدمی کی طرح ہے، یعنی: اگر وہ کسی پر تہمت لگاتا ہے یا کسی کو قتل کرتا ہے، تو اُس پر حد جاری کی جائے گی؛ پس جب حدود وقصاص کے باب میں ...... جو شبہات کی وجہ سے ساقط ہوجاتے ہیں..... نشہ کرنے والے کو مکلّف قرار دیا گیا ہے، تو طلاق کے باب میں ...... جس کا حکم شبہے سے ساقط نہیں ہوتا ...... بہ درجۂ اولی اُس کو باہوش کے درجے میں مان کر مکلّف قرار دیا جائے گا، اور اُس کی دی ہوئی طلاق واقع ہوجائے گی۔

روى أبو وبرة الكلبي قال: أرسلني خالد إلى عُمر، فأتيتُه في المسجد، ومعه عثمان، وعلي، وطلحة، والزُّبير، فقلتُ: إنّ خالداً يقُول: إنّ النَّاس انهمكوا في الخمر، وتحاقروا العقُوبة، فقال عُمر: هولاء عندك، فسَلهُم، فقال عليٌّ: نراه إذا سَكِرَ هَذَى، وإذا هَذَى افترى، وعلى المُفتري ثمانُون، فقال عُمر: أبلغ صاحبك ما قال، قال ابنُ قُدامة: فجعلُوه كالصَّاحي؛ ولأنَّه إيقاعٌ للطَّلاق من مُكلّف غير مُكره صادف ملكه، فوجب أن يقع، كطلاق الصَّاحي، ويدُلُّ على تكليفه أنَّه يُقتل بالقتل، وتُقطع بالسّرقة، وبهذا فارق المجنون.

(المغني لابن قدامة: ۳۷۹/۷، مسألة طلاق السكران، ط: مكتبة القاهرة)

وقال ابنُ الهُمام: وبدلالات النُّصوص والإجماع؛ فإنَّه لما ألحق بالصَّاحي فيما لا يثبت مع الشُّبهة، وهو الحدُّ والقِصاص، حتّٰى حد و قتل إذا قذف وقتل، فلأن يلحق به فيما يثبتُ مع الشُّبهة، كالطَّلاق والعتاق أولى. (فتح القدير: ٤٧٢/٣-٤٧٣، كتاب الطلاق، باب طلاق السنة، ط: زكريا، ديوبند)

و في حاشية المُوطَّا للإمام مالك: واستدلُّوا بقول الصَّحابة في قصَّة الاتفاق على أن حدّ السّكر حد المُفتري؛ لأنَّه إذا سكر افترى، فلو لا أنَّه يُواخذُ بافترائه، لم يحدُّوه حدّ المُفتري. (حاشية الموطا للإمام مالك، ص: ٢١٦، ط: ياسر نديم، ديوبند)

۶۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک شخص نے نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نشے کی وجہ سے اُس پر حد جاری کی اور اُس کی طلاق کو نافذ قرار دیا۔

عن سُليمان بن يَسار يقُول: إن رجُلاً من آل البختري طلّق امرأته وهو سكران، فضربه عُمر الحدَّ، وأجاز عليه طلاقه. (سنن سعيد ابن منصور: ٢٧٠/١، باب ماجاء في طلاق السكران، رقم: ١١٠٦)

۷۔ مسئلہ حلت وحرمت کا ہے، یعنی: عدم وقوعِ طلاق کا مطلب ہے کہ عورت شوہر کے لیے حلال ہے، اور وقوعِ طلاق کا مطلب ہے کہ عورت شوہر کے لیے حرام ہوگئی، ایسے موقع پر فقہاء احتیاطاً حرمت کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں؛ لہٰذا اس کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سکران کی دی ہوئی طلاق واقع قرار دی جائے۔

قال ابنُ نُجيم: إذا اجتمع الحلالُ والحرامُ، غُلِّب الحرامُ. (الأشباه والنظائر لابن نجيم، ص: ٧٠، النوع الثاني من الفن الاول، القاعدة الثانية، ط: مكتبة دار العلوم، ديوبند)

جو حضرات حالتِ نشہ کی طلاق کو واقع نہیں مانتے ہیں، وہ عموماً مندرجہ ذیل دلائل سے استدلال کرتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے سکران کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ کیا کہہ رہا ہے؛ چناں چہ ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُم سُكَارىٰ حَتّٰى تَعلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (النساء: ٤٣) گویا اُس کے اندر فہم کی صلاحیت نہیں ہوتی؛ لہٰذا سکران شرعاً مکلّف نہیں ہوگا؛ اس لیے کہ جو شخص سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، وہ احکام شرع کا مکلّف کیسے ہوسکتا ہے؟ مکلّف ہونے کے لیے عقل وفہم کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے، اور سکران کے اندر یہ صلاحیت مفقود ہے؛ لہٰذا اُس کی طلاق واقع نہیں ہوگی؛ اس لیے کہ غیر مکلّف کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

اس استدلال کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے، تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالی نے غیر مکلّف کو خطاب کیا ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالی کا غیر مکلّف کو خطاب کرنا محال ہے؛ پس یہ استدلال؛ صحیح نہیں ہے، صحیح بات یہ ہے کہ سکران کے اندر فہم کی صلاحیت تو ہے؛ لیکن سکر کی وجہ سے اُس پر ایک قسم کا پردہ پڑ جاتا ہے، جس کا شریعت نے مکلّف قرار دینے میں کوئی اعتبار نہیں کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدود وقصاص کے باب میں سکران کے مکلّف ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اگر یہ کہا جائے کہ سکران اگر مکلّف ہے، تو اُس کا ارتداد بھی معتبر ہونا چاہیے، حالاں کہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ احتیاط؛ کافر قرار نہ دینے میں ہے، نیز ایمان اور ارتداد کا رکن اعتقاد ہے، اور حالتِ سکر میں یہ نہیں پایا جاتا؛ لہٰذا اُس کا ارتداد غیر معتبر قرار دیا جائے گا۔ علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

وعدم صحَّة ردَّته؛ لأن صريح النَّص ما اعتبر عقله باقياً؛ إلا فيما هو من فُروع الدِّين...... ولأن الإكفار والحالةُ هذه إنَّما يكون احتياطاً، ولا يُحتاط في الإكفار؛ بل يُحتاط في عدمه؛ ولأن رُكنَها الاعتقادُ، وهو مُنتف. (فتح القدير: ۳/ ۴۷۲-۴۷۳، كتاب الطلاق، باب طلاق السنة، ط: زكريا، ديوبند)

۲۔ حالتِ نشہ میں طلاق کے عدم وقوع پر یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ ہر عمل کا مدار؛ نیت وارادے پر ہے؛ پس وقوعِ طلاق کا مدار بھی نیت وارادے پر ہوگا، اور نشے کی حالت میں چوں کہ ارادہ نہیں ہوتا؛ اس لیے سکران کی طلاق واقع نہیں ہوگی؛ یہ دلیل بھی صحیح نہیں ہے؛ اس لیے کہ طلاق کا وقوع؛ نیت پر موقوف نہیں ہے، جیسا کہ صراحتاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: **ثلاثٌ جِدُّهنَّ جِدٌّ، وهزلُهنَّ جِدٌّ** إلخ کی تفصیل ماقبل میں گذر چکی ہے؛ لہٰذا یہ کہنا کہ طلاق کا مدار؛ نیت پر ہے، صحیح نہیں ہے۔

۳۔ حالتِ نشہ میں طلاق کے عدم وقوع پر یہ دلیل بھی بہت اہمیت سے پیش کی جاتی ہے کہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ عقل نہ ہونے کی وجہ سے صبی (بچہ)، بے ہوش، معتوہ اور سونے والے کی طلاق واقع نہیں ہوتی؛ لہٰذا ان پر قیاس کرتے ہوئے حالتِ نشہ کی بھی طلاق واقع نہیں ہونی چاہیے؛ اس لیے کہ سکران کی بھی عقل زائل ہوجاتی ہے۔

حالتِ نشہ میں طلاق کے عدم وقوع کے قائلین کی یہ دلیل اُن کی دوسری ساری دلیلوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے؛ اس لیے کہ ساری دلیلوں کا بنیادی نکتہ؛ زائل العقل ہونا ہی ہے۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے انسان کی جان ومال، عزت وآبرو اور عقل وخرد کی حفاظت

پر بہت زور دیا ہے، اگر کوئی شخص اپنے ہاتھوں ان چیزوں کو زائل کرتا ہے، تو شریعت کی نگاہ میں وہ مجرم کہلائے گا، اور قیامت کے دن وہ ماخوذ ہوگا؛ لہٰذا اگر کوئی شخص حرام اور ناجائز اشیاء کا استعمال کرکے اپنی عقل ضائع کرتا ہے، تو اگر چہ وہ حقیقتاً زائل العقل ہے؛ لیکن زجر اور توبیخ کے طور پر اسے حکماً عاقل ہی کے درجے میں مانا جائے گا، اور نشے کی حالت میں بھی اس کو احکام شرع کا مکلّف قرار دیا جائے گا، اس حالت میں صادر ہونے والے اُس کے اقوال وافعال کو شرعاً معتبر قرار دیا جائے گا، لہٰذا حالتِ نشہ میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے، تو زجراً اُس کی طلاق واقع ہوگی۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: **ولأن عقلـه زال بسببٍ هو معصيةٌ، فينزل قائماً عقوبةً عليه، وزجراً له عن ارتكاب المعصية؛ ولهذا لو قذف انساناً أو قتل، يجب عليه الحدُّ والقِصاصُ، وأنَّهُما لا يجبان على غير العاقل، دلَّ أن عقله جعل قائماً، وقد يُعطىٰ للزَّائل حقيقةً حكمُ القائم تقديراً.** (بدائع الصنائع: ۱۵۹/۳، كتاب الطلاق، فصل: شرائط ركن الطلاق، ط: زكريا، ديوبند)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **قولُه: (أو أفيون أو بنج) وصرّح في البدائع وغيرها بعدم وقُوع الطَّلاق بأكله؛ معلّلاً بأنّ زوال عقله لم يكن بسببٍ هو معصيةٌ، والحقُّ التَّفصيل، وهو إن كان للتَّداوي، لم يقع؛ لعدم المعصية، وإن للّهو وإدخال الآفة قصداً، فينبغي أن لا يتردّد في الوقوع، وفي تصحيح القُدوري عن الجواهر: وفي هذا الزّمان إذا سكر من البنج و الأفيون، يقع زجراً، وعليه الفتوى.** (رد المحتار مع الدر المختار: ٤٤٦/٤، كتاب الطلاق، مطلب في الحشيشة والأفيون والبنج، ط: دار الفكر، بيروت)

۴۔ بعض حضرات نے حالتِ نشہ میں طلاق کے واقع نہ ہونے کی وجہ؛ موجودہ زمانے کے حالات کو قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جن فقہائے کرام نے طلاقِ سکران کو نافذ قرار دیا ہے، بنیادی طور پر اُن کے پیشِ نظر شوہر کی تعزیر ہے؛ مگر موجودہ حالات میں؛ خصوصاً ہندوستان میں یہ طلاق شوہر کے لیے تعزیر کے بجائے عورت کے لیے ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے، صورتِ حال یہ ہے کہ نشہ کرنے والا شخص طلاق دے کر دوسری شادی آسانی سے کر لیتا ہے؛ مگر مطلقہ غریب عورتیں عمر بھر شوہر کے جرم کا کفارہ ادا کرتی رہتی ہیں؛ اس لیے ان حالات کا تقاضا یہی ہے کہ طلاقِ سکران کو واقع قرار نہ دیا جائے؛ کیوں کہ اس کی علت شوہر کی تعزیر؛ اس زمانے میں مفقود ہوچکی ہے، اور حکم اپنی علت ہی کے ساتھ دائر رہتا ہے۔

حالتِ نشہ میں طلاق کے عدمِ وقوع کے قائلین کے نزدیک: یہ دلیل نہایت اہمیت کی حامل ہے، جو لوگ اس حالت میں دی ہوئی طلاق کو واقع نہیں مانتے ہیں، اُنھوں نے اپنی تحریروں میں اس وجہ کو

بہت اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے؛ چناں چہ جدید فقہی مسائل میں ہے:

مسئلہ صرف دلائل کے قوی اور کمزور ہونے کا نہیں ہے؛ ...... بل کہ حالات و زمانے کے تغیر اور اخلاقی و سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے تقاضوں کا ہے، ...... ہندوستان اور اس جیسے ممالک میں جہاں نہ اسلامی قانون نافذ ہے، نہ شراب کوئی جرم ہے، نہ اُس کی شناعت وقباحت کماحقہ لوگوں پر عیاں ہے، اُس کے کاروبار کی کھلی اجازت ہے، اور مطلقہ عورتوں کا نکاحِ ثانی؛ ہندو رسم و رواج کے اثر سے ایک گمبھیر مسئلہ ہے، مناسب ہوگا کہ حالتِ نشہ کی طلاق واقع قرار نہ دی جائے۔ (جدید فقہی مسائل: ۲۲۰/۳)

اس دلیل کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ طلاقِ سکران کے وقوع کی علت شوہر کی تعزیر نہیں ہے، شوہر کی تعزیر تو اس حکم کی حکمت اور مصلحت ہے، اور حکم کا مدار؛ حکمت اور مصلحت پر نہیں ہوتا، اور یہ کہنا کہ طلاقِ سکران موجودہ وقت میں شوہر کی تعزیر کے بجائے عورت کے لیے عذاب بن کر رہ گئی ہے؛ محل غور ہے؛ اس لیے کہ عموماً طلاقِ سکران کے وقوع ہی کی وجہ سے عورتوں کو شرابی مردوں سے نجات ملتی ہے، مہذب اور شریف عورتیں شرابی اور نشہ کرنے والے شخص کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتیں، اگر طلاقِ سکران کو واقع قرار نہ دیا جائے، تو اس میں عورت کو اور زیادہ ضیق اور تنگی میں مبتلا کرنا ہے، عورت کے لیے تو یہ عذر ہوسکتا ہے کہ وہ شریف تھی، مہذب تھی، شرابی اور نشہ کرنے والے شخص کے ساتھ اُس کا رہنا بالکل مناسب نہیں تھا؛ لہٰذا مصلحت اسی میں تھی کہ اُس کے اور شوہر کے درمیان تفریق کی کوئی صورت نکل آئے، اور جب شوہر نے اُس کو طلاق دے دی، تو یہ طلاق معاشرے میں عورت کا جرم نہیں سمجھا جائے گا؛ بل کہ معاشرے میں ایسی عورت پر ہم دردی ہوگی، اور اُس کے دوسرے نکاح میں دشواری نہیں ہوگی؛ لیکن طلاق دینے والے شوہر کے لیے معاشرے میں کوئی ہم دردی نہیں ہوگی، لوگوں میں اس کی رسوائی ہی رسوائی ہوگی، اور آیندہ لوگ اُس سے اپنی لڑکی یا خاندان کو منسوب کرنے میں غور وفکر کریں گے، اس طرح شوہر؛ آج کے بگڑے ہوئے معاشرے میں بھی مردود سمجھا جائے گا، اور اپنے کیے کی سزا بہ ہرحال بھگتے گا؛ لہٰذا یہ کہنا کہ طلاقِ سکران اس زمانے میں عورت کے لیے عذاب بن گئی ہے، اس میں شوہر کی تعزیر کی وجہ ختم ہوگئی ہے؛ صحیح نہیں، آج بھی اس طلاق کے واقع ہونے میں شوہر کی تعزیر ہے۔

اور اگر بالفرض اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ طلاقِ سکران؛ شوہر کی تعزیر کے بجائے عورت کے لیے سزا بن کر رہ گئی ہے، تو واضح رہے کہ طلاق خواہ کسی حالت میں دی جائے، وہ تو عموماً عورتوں کے لیے کچھ نا کچھ دشواری اور مشکلات کا سبب بنتی ہی ہے، ہمارے ملک میں کم ہی ایسے واقعات ملتے ہیں، جن میں

طلاق کے حوالے سے شریعت کی حدود کی رعایت کی جاتی ہو؛ ورنہ طلاق کے اکثر واقعات؛ غصے، جذبات، آپسی لڑائی جھگڑے کی وجہ سے پیش آتے ہیں، تو کیا ان صورتوں میں بھی محض مشکلات اور دشواریوں کی وجہ سے طلاق کو واقع قرار نہیں دیا جائے گا؟

نیز اگر طلاقِ سکران کو واقع قرار نہ دیا جائے، تو اس کی وجہ سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوجائیں گی، اس طلاق کے وقوع میں جو تعزیر کا پہلو تھا، جب اس کو ختم کردیا جائے گا، تو ظاہر ہے کہ اُس کے منفی اثرات معاشرے پر ظاہر ہوں گے، طلاق دینے والوں کے لیے وقوعِ طلاق سے بچنے کا ایک بہانہ اور حیلہ ہاتھ آجائے گا، لوگوں میں شراب اور نشہ آور اشیاء کا استعمال مزید عام ہوجائے گا، اورعورتوں کے لیے مزید مشکلات کھڑی ہوجائیں گی؛ اس لیے اس زمانے میں بھی راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ حرام چیز سے نشہ کرنے کی صورت میں اگر طلاق دی جائے گی، تو شرعاً وہ طلاق واقع ہوگی، اس زمانے میں کوئی ایسی شرعی ضرورت نہیں پائی جاتی کہ جس کی وجہ سے اس مسئلے میں ضعیف اور غیر مفتی بہ قول کو اختیار کیا جائے؛ چناں چہ ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیت علمائے ہند کے تحت (۲۶-۲۷/رجب، ۱۴۲۱ھ، مطابق: ۲۵-۲۶/اکتوبر، ۲۰۰۰ء، بہ مقام: شیخ الہند ہال، دیوبند میں منعقدہ) فقہی اجتماع میں؛ متفقہ طور پر طلاقِ سکران کے وقوع کا فیصلہ کیا گیا تھا، اُس اجتماع کی تجویز ملاحظہ فرمائیں:

ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیت علمائے ہند کا ساتواں فقہی اجتماع (منعقدہ: ۲۶-۲۷/رجب، ۱۴۲۱ھ، مطابق: ۲۵-۲۶/اکتوبر، ۲۰۰۰ء) یہ اعلان کرتا ہے کہ بلا عذرِ شرعی اختیاری طور پر ناجائز نشیلی اشیاء سے پیدا شدہ نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجائے گی، یہی احادیث شریفہ سے مستنبط، نیز آثارِ صحابہ وتابعین سے ثابت، اور حضرات ائمہ اربعہ کا مفتی بہ ومعمول بہ مسلک ہے، اور اس زمانے میں کہیں بھی کوئی ایسی شرعی ضرورت نہیں پائی جاتی کہ اس مفتی بہ اور راجح قول سے عدول کرکے؛ مرجوح اور ضعیف قول کو اختیار کیا جائے، یہ فقہی اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ دور میں نشے کی طلاق کے عدم وقوع کا قول اختیار کرنے کی صورت میں طلاق دینے والوں کو طلاق کے وقوع سے بچنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجائے گا، اورعورتوں کے لیے مزید مشکلات کا باعث ہوگا۔ (فقہی اجتماعات کے اہم فقہی فیصلے اورتجاویز، ص: ۶۲)

ماقبل کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حالتِ نشہ کی طلاق واقع ہوجاتی ہے، یہی قول راجح اور مفتی بہ ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص نے کسی حرام نشہ آور چیز استعمال کرنے کے بعد نشے کی حالت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں، تو بلا شبہ اُس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اور بیوی مغلظہ بائنہ ہوگئی، اب حلالۂ شرعی کے بغیر شوہر کے لیے مطلقہ کے ساتھ دوبارہ نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔

طلاقِ سکران کے واقع ہونے کے سلسلے میں فقہائے کرام کے چند اہم اقوال ملاحظہ فرمائیں:

امام مالکؒ فرماتے ہیں: **أنَّه بلغه أن سعيد بن المُسيِّب وسُليمان بن يسار سئلا عن طلاق السَّكران، فقالا: إذا طلَّق السَّكران جاز طلاقُه، وإن قتل قتل، قال مالك: وذلك الأمرُ عندنا.** (الموطا للإمام مالك، ص: ۲۱٦، جامع الطلاق، ط: ياسرنديم، ديوبند)

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں: **ويقعُ طلاقُ كلِّ زوج بالغ عاقل ولو تقديراً؛ ليدخل السَّكران ولو عبداً أو مُكرهاً أو هازلاً أو سفيهاً خفيف العقل أو سكران ولو بنبيذ أو حشيش أو أفيون أو بنج زجراً، وبه يفتى.** (الدر المختار مع رد المحتار: ٤/٤٣٨-٤٤٦، كتاب الطلاق، ط:زكريا، ديوبند)

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں: **حكمُه أنَّه إن كان سكره بطريق محرَّم، لا يبطُل تكليفُه، فتلزمُه الأحكام، و تصحّ عباراتُه من الطَّلاق والعِتاق ...... وفي البحر عن البزَّازية: المُختارُ في زماننا لُزوم الحدِّ ووقُوع الطَّلاق.اهـ. وما في الخانية من تصحيح عدم الوقُوع، فهو مبنيٌّ على قولهما من أنّ النَّبيذ حلالٌ، والمفتى به خلافُه، وفي النَّهر عن الجوهرة: إنّ الخلاف مقيَّدٌ بما إذا شربه للتَّداوي، فلو للَّهو والطَّرب، فيقع بالإجماع.** (رد المحتار مع الدر المختار: ٤/٤٤٤-٤٤٥، كتاب الطلاق، مطلب في تعريف السكران و حكمه، ط: زكريا، ديوبند)

علامہ شامیؒ مزید فرماتے ہیں: **وفي تصحيح القُدوري عن الجوهر: وفي هذا الزَّمان إذا سكر من البنج والأفيون يقع زجراً، وعليه الفتوى ...... وقال نقلاً عن التَّاتارخانية: طلاقُ السَّكرن واقعٌ إذا سكر من الخمر أو النَّبيذ وهو مذهبُ أصحابنا.** (رد المحتار مع الدر المختار: ٤/٤٤٦-٤٤٨، كتاب الطلاق، مطلب في الحشيشة والأفيون والبنج، ط: زكريا، ديوبند)

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: **وأمَّا السَّكران إذا طلَّق امرأته، فإن كان سكره بسببٍ محظُورٍ بأن شرب الخمر أو النَّبيذ طوعاً حتّٰى سكر، وزال عقلُه، فطلاقُه واقعٌ عند عامَّة العُلماء وعامَّة الصَّحابة رضي اللّٰه عنهم.** (بدائع الصنائع: ۳/۱۵۸، فصل شرائط ركن الطلاق، ط: زكريا، ديوبند)

علامہ ابراہیم الحلبیؒ فرماتے ہیں: **ويقعُ طلاقُ كلِّ زوج عاقل بالغ ولو مكرهاً أو سكران.** (ملتقى الأبحر مع مجمع الأنهر: ۲/۹-۱۰، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

علامہ علاء الحصکفیؒ فرماتے ہیں: **وكذا يقعُ طلاقُ من غيب عقلُه بأكل الحشيش أو البنج أو الأفيون؛ لأنّ كلَّ ذلك حرامٌ.** (الدر المنتقى مع مجمع الانهر: ۲/۱۰، كتاب الطلاق، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

فتاوی ہندیہ میں ہے: وطلاقُ السَّكران واقعٌ إذا سكر من الخمر أو النَّبيذ، وهو مذهبُ أصحابنا رحمهم الله. (الفتاوى الهندية: ١/ ٤٢٠، كتاب الطلاق، الباب الأول، فصل في من يقع طلاقه وفي من لايقع طلاقه، ط: مكتبة الاتحاد، ديوبند)

الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے: وإن كان مُتعدِّياً بسكره كأن شرب الخمرة طائعاً بدون حاجةٍ، وقع طلاقُه عند الجمهُور رغم غياب عقلِه بالسّكر، وذلك عقاباً له. (الموسوعة الفقهية، مادة: طلاق)

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے: أما السَّكران بطريق مُحرَّم ...... وهو الغالبُ ...... بأن شرب الخمر عالماً به مُختاراً لشُربه ...... فيقع طلاقُه في الرَّاجح في المذاهب الأربعة عقوبةً و زجراً له عن ارتكاب المعصية. (الفقه الاسلامي وأدلته: ٣٦٦/٧، المبحث الثاني من الباب الثاني، ط: دار الفكر، دمشق)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ومن شرب خمراً أو نبيذاً، فأسكره، فطلّق، لزمه الطّلاقُ والحُدود كلُّها. (كتاب الأم: ٥/ ٢٧٠، طلاق السكران، ط: دار المعرفة، بيروت)

علامہ ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں: وأمَّا طلاقُ السَّكران فالجمهُور من الفقهاء على وقُوعه. (بداية المجتهد: ٢/ ٦١-٦٢)

(۲) حالتِ نشہ میں تین طلاق دینے کے بعد جمہور کے نزدیک؛ شوہر کا مطلقہ بیوی کے ساتھ رہنا جائز نہیں ہے، اس مسئلے میں اگرچہ بعض لوگوں کا قول؛ طلاق کے عدم وقوع کا ہے؛ لیکن جمہور صحابہ، تابعین، اور ائمہ اربعہ کا راجح اور صحیح قول طلاق کے وقوع ہی کا ہے، متون کی روایت بھی یہی ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص حالتِ نشہ میں تین طلاق دے کر اُن لوگوں کے قول کے مطابق عمل کرنا چاہے، جن کے نزدیک اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی ہے، تو جمہور کے نزدیک اُس کے لیے ضعیف اور مرجوح قول پر عمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۷/۳/۱۶ھ

الجواب صحیح: ابوالقاسم نعمانی غفرلہٗ، مہتمم دارالعلوم دیوبند

محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - زین الاسلام قاسمی

وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۸۱/تتمہ/ص، ۱۸۱/ص، ۱۴۳۷ھ)

==

محض طلاق کے وسوسے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال: اگرکوئی دل میں یا خیال میں وسوسہ آنے سے؛ دل میں ہی اپنی بیوی کوطلاق دیتا ہے، جب کہ منہ سے نہیں کہتا ہے، نہ ہی اسے لکھتا ہے، کیا طلاق ہو جائے گی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: زبان سے تلفظ کیے بغیر؛ محض دل دل میں طلاق دینے، یا طلاق کا دل میں وسوسہ آنے سے کسی بھی قسم کی کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔

وركنُه لفظٌ مخصُوصٌ: وهو ما جُعِل دلالةً على معنى الطَّلاق من صريح أو كناية، وأراد اللَّفظ ولو حُكماً؛ ليدخُل الكتابة المُستبينة. (الدر المختار مع الرد: ٤/٤٣٠، ط: زكريا، ديوبند)

وأمَّا الطَّلاقُ والعتاقُ: فلا يقعان بالنِّية؛ بل لا بُدَّ من التَّلفُّظ. (الأشباه والنظائر، الفن الأول في القواعد الكليّة، النوع الأول، القاعدة الثانية: الأمور بمقاصدها: ١/١٦٥، ط: زكريا، ديوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقارعلی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۴۲/ب، ۲۹۳/ب، ۱۴۳۸ھ)

تین بار لفظِ طلاق کہہ کر ایک کی نیت کا دعویٰ کرنا کیسا ہے؟

سوال: میری بہن مہناز کی اُن کے شوہر سے لڑائی ہوئی، غصے میں اُن کے شوہر نے مہناز کے بھائی سے جو وہاں موجود تھے، یہ کہا کہ آپ کی بہن نہ میرے ساتھ رہ سکتی، اور نہ میں اُن کے ساتھ رہ سکتا ہوں؛ اس لیے میں طلاق دیتا ہوں، طلاق، طلاق، طلاق؛ لیکن بعد میں ان کا کہنا یہ ہے کہ میری نیت ایک طلاق کی ہی تھی؛ مگر میں یہ سمجھتا تھا کہ ''طلاق، طلاق، طلاق'' ایک جملہ ہے، اوراس سے ایک بار ہی طلاق ہوتی ہے، اورنو بار کہنے سے تین بار ہوتی ہے، اُن کی بیوی مہناز نے مسلم پرسنل لا ہیلپ لائن پرفون کرکے واقعہ بتایا، تو اُنھوں نے کہا کہ طلاق شوہر کا حق ہے، اگر وہ اس طرح کہہ رہے ہیں کہ نیت ایک ہی تھی، تو مان لیا جائے گا، آپ اپنے شہر کے قاضیوں سے کہیں کہ نیت پرفتویٰ دیں، نیز اُنھوں نے کسی عالم کے بیان میں بھی سنا کہ اگر طریقہ نہیں معلوم؛ مگر نیت ایک کی ہی تھی، تو ایک ہی

طلاق ہوگی، میری بہن مہناز نے پہلے تو اسے طلاقِ مغلظہ ہی سمجھا؛ مگر پرسنل لا اور اُن عالم کے بیان کے بعد وہ چاہ رہی ہیں کہ کسی طرح رجوع ہو جائے، خود اُن کے شوہر بھی رجوع کے لیے جگہ جگہ جا کر اپنا مسئلہ دریافت کررہے ہیں۔ برائے کرم یہ بتائیں کہ ان کی کون سی طلاق ہوئی ہے؟ کیا اس طرح طلاق دینے کے بعد رجوع کیا جاسکتا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ:الجواب وباللّٰہ التوفیق: ''میں طلاق دیتا ہوں، طلاق، طلاق، طلاق'' میں تین سے زائد طلاق کے الفاظ استعمال ہوئے؛ اس لیے بیوی پر تین طلاقِ مغلظہ واقع ہوگئیں، شوہر کا یہ کہنا کہ میری نیت ایک طلاق کی تھی قضاءً معتبر نہ ہوگی؛ کیوں کہ مکرر الفاظِ طلاق کے اندر عدم تعدد کی نیت خلافِ اصل ہے؛ اس لیے شوہر کی ایک کی نیت قضاءً غیر معتبر ہے؛ البتہ دیانۃً معتبر ہونے کی گنجایش تھی؛ لیکن یہ اسی وقت تک ہے، جب معاملہ قاضی یا شرعی پنچایت تک نہ پہنچا ہو، اگر قاضی یا شرعی پنچایت تک معاملہ پہنچ گیا، تو دیانت سے نکل گیا۔

اسی طرح اگر خود عورت (بیوی) نے سن لیا، یا کسی ذریعے سے اس تک بات پہنچ گئی، تو بھی دیانت سے معاملہ نکل گیا؛ کیوں کہ بیوی خود اپنے حق میں قاضی ہوتی ہے۔ **المرأة كالقاضي**؛ لہٰذا بیوی تک پہنچ جانے سے معاملہ؛ قضاء میں داخل ہوگیا، اس سے پہلے تک دیانت کے دائرے میں تھا، **إذا نوى التّأكيد دُيِّن** کا محل یہی ہے کہ نہ عورت کو معلوم ہو، نہ قاضی اور شرعی پنچایت تک معاملہ پہنچا ہو؛ بل کہ غائبانہ جہاں بیوی نہ ہو؛ شوہر نے ''طلاق، طلاق، طلاق'' کے الفاظ کہہ دیے، پھر بہ حلف کہے کہ میری نیت صرف ایک طلاق دینے کی تھی، دو مرتبہ طلاق کا لفظ محض تاکید کے طور پر کہہ دیا تھا، تو اس صورت میں فیما بینہ وبین اللہ تصدیق کرلی جائے گی، اور شوہر کی رجعت صحیح قرار دی جائے گی۔

صورتِ مسئولہ میں شوہر کی اپنی بیوی مہناز سے لڑائی ہوئی، اور اسی دوران مہناز کے بھائی سے یہ کہہ کر کہ تمھاری بہن میرے ساتھ نہیں رہ سکتی، میں طلاق دیتا ہوں، طلاق، طلاق، طلاق، اس مکالمہ کے وقت بیوی موجود تھی؛ لہٰذا یہ معاملہ دیانت سے نکل گیا، اور شوہر کا ایک کی نیت کرنا غیر معتبر ہوگیا، اور بیوی پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئیں، تنقیح فتاوی حامدیہ (ص:۳۸) میں ہے:

لاتصدّق في ذلك قضاءً؛ لأنّه مأمورٌ باتّباع الظّاهر، والله يتولّى السّرائر ...... لايصدَّق أنّه قصد التّأكيد؛ إلا بيمينه؛ لأن كلَّ موضع كان القول فيه قوله، إنما يُصدَّق

مع اليمين – ثُمّ إلیٰ قوله: – إنّ المرأة كالقاضي، فلا يحلّ لها أن تمكنه إذا سمعت منه ذلك، أوعلمت به؛ لأنَّها لاتعلم إلا الظَّاهر.

حضرت مفتی نظام الدین علیہ الرحمہ، سابق مفتی دارالعلوم دیوبند کا؛ اسی مسئلے پر بہت مفصل جواب منتخبات نظام الفتاویٰ (۱۶۹/۲) میں چھپا ہوا ہے، یہ مجموعہ ایفا پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے، اسے بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۹/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ – محمد مصعب عفی عنہ

(۳۹/۷/د، ۸۵۴/د، ۱۴۳۸ھ)

محض لفظ ''طلا'' کہنے کی صورت میں طلاق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیانِ شرع مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) میری شادی دو مہینے پہلے ہوئی، اور مجھے اپنی بیوی کے کچھ غلط تعلق کی بنا پر غصہ آیا؛ مگر بیوی اپنے ہی گھر تھی، تو میں نے اسے فون پر جب پہلی طلاق دینا چاہی، تو لفظِ طلاق پورا ادا نہیں ہوا، یعنی: لفظِ ''طلا'' ادا ہوا، اور اس نے فون کاٹ دیا، جب کہ میں اس لفظ پر خاموش ہوگیا، آپ اس کا صحیح جواب تفصیل سے عنایت فرمائیں کہ طلاق ہوئی یا نہیں؟

(۲) اس دن کے بعد میرا اور اس کے گھر والوں کا سامنا ہوا، تو تکرار ہونے لگا؛ مگر زیادہ تکرار ہونے کی وجہ سے میں نے پھر یہ کہا کہ میں اس کو طلاق دے رہا ہوں، دوسری بار پھر کہا: میں طلاق دے رہا ہوں، یہ الفاظ میری زبان سے بیان ہوتے ہیں؛ مگر اب میں اپنی بیوی کو رکھنا چاہتا ہوں، آپ اس کی صحیح صورت بیان کریں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: **(۱-۲)** اگر آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کی زبان سے صرف ''طلا'' نکلا تھا، لفظ قاف ادا نہیں ہوا تھا، تو صرف اتنے ہی لفظ سے طلاق واقع نہیں ہوگی؛ البتہ بعد میں آپ نے جو دو مرتبہ طلاق دی، اس سے دو طلاق رجعی واقع ہوگئیں، اب اگر آپ چاہیں، تو عدت گذرنے سے پہلے پہلے رجوع کرسکتے ہیں، تجدید نکاح کی ضرورت نہیں، اور اگر

آپ عدت میں رجوع نہیں کریں گے، تو عدت گذرنے پر دونوں کا نکاح بالکلیہ ختم ہو جائے گا، اس کے بعد اگر دونوں رضامندی سے ساتھ رہنا چاہیں، تو نکاح کرنا ضروری ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۶/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۰۲/د، ۵۱۶/د، ۱۴۳۸ھ)

طلاق دینے کی نیت سے میسج کیا اور لفظ ''طلق'' لکھ دیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل میں کہ ایس، ایم، ایس کے ذریعے تین مرتبہ طلاق لکھ کر بھیجا، تو عورت نے اس ایس، ایم، ایس کو دیکھا نہیں، اس کے شوہر نے آ کر کہا کہ میں نے تم کو طلاق کا ایس، ایم، ایس کیا ہے، اور وہ طلاق کی جگہ ''طُلُق'' لکھ دیا غلطی سے، کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگئی، یا کچھ گنجایش ہے؟ مدلل جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وبالله التوفيق: صورتِ مسئولہ میں اگر شوہر کو اقرار ہو کہ اس نے ایس، ایم، ایس میں طلاق دینے کی نیت سے تین مرتبہ ''طلق'' کا لفظ لکھ کر بیوی کے موبائل پر بھیج دیا تھا، جیسا کہ اس نے بعد میں بیوی سے کہا بھی کہ میں نے تم کو طلاق کا ایس، ایم، ایس کیا ہے، تو ایسی صورت میں بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اور بیوی مغلظہ بائنہ ہوگئی، اب حلالۂ شرعی کے بغیر دوبارہ نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے۔

يُستفاد: و يدخل نحو طلاغ وتلاغ وطلاك وتلاك أو ''ط ل ق'' .... قال ابنُ عابدين: (قولُه: أو ط ل ق) ظاهرُما هُنا ومثلُه في الفتح والبحر أن يأتي بمُسمّى أحرف الهجاء، والظّاهر عدمُ الفرق بينها وبين أسمائها، وهذا بمنزلة الكناية؛ لأنّ هذه الحُروف يُفهم منها ماهو المفهُوم من صريح الكلام، إلا أنّها تُستعمل كذلك فصارت كالكناية في الافتقار إلى النية اهـ. وأنت خبيرٌ بأنّه إذا افتقر إلى النِّية لايناسب ذكره هنا؛ لأنّ الكلام فيما يقعُ به الرّجعية وإن لم ينو، وسيُصرِّح الشّارحُ أيضاً بعد صفحةٍ بافتقاره إلى النِّية، وذكره أيضا في باب الكناية، وقدّمناه أيضاً أوّل الطّلاق عن الفتح.

وفي البحر: يقع بالتَّهجي كـ أنت ط ل ق، وكذا لوقيل له: طلَّقتها، فقال: ن ع م أو ب ل ى بالهجاء وإن لم يتكلَّم به، أطلقه في الخانية ولم يشترط النِّية، وشرطها في البدائع اهـ، قلتُ: عدمُ التَّصريح بالاشتراط لايُنافي الاشتراط، على أنّ الذي في الخانية هو مسألةُ الجواب بالتَّهجي، والسُّؤال بقول القائل طلَّقتها قرينةٌ على إرادة جوابه فيقعُ بلانية، بخلاف قوله ابتداءً: أنت طالقٌ بالتَّهجي تأمّل. (الدر مع رد المحتار: ۲۴۹/۳، ط: دارالفکر، بیروت) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۲۷ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفااللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۲۳۱/تتمہ/ص، ۱۲۸۳/ص، ۱۴۳۸ھ)

بیوی کے مطالبۂ طلاق کے جواب میں ”دی، دی، دی“ کہہ دیا تو کیا حکم ہے؟

سوال: بندے کا چندروز قبل اپنی بیوی سے جھگڑا ہوا، اس دوران میری اہلیہ نے مجھ سے طلاق دینے پر اصرار کیا کہ مجھے طلاق دو، مجھے طلاق دو، میں نے دورانِ جھگڑا اُس کے اصرار پر صرف اتنا کہا کہ ”دی، دی، دی“ اور یہ کہتا ہوا میں مکان کے نیچے ہی دکان پر آکر بیٹھ گیا، صورتِ مسئولہ میں میری اہلیہ کو طلاق ہوئی یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ لفظ ”دی، دی، دی“ اپنی اہلیہ کے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ مجھے طلاق دے دو؛ اس لیے اس سے طلاق دینا مراد ہوگا۔ (مستفاد از: نظام الفتاویٰ: ۱۷۵/۲)، نیز اگر یہ لفظ ”دی، دی، دی“ محض تاکید کے لیے کہا ہے، تو ایک طلاق پڑی، اور اگر تکرار وتعدد کے لیے کہا ہے، تو تینوں پڑ کر؛ حرمتِ مغلظہ ہوگئی، شوہر کا قول؛ قسم کے ساتھ معتبر ہوگا۔ (مستفاد از: نظام الفتاویٰ: ۲۱۹/۲) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۲۴ھ

الجواب صحیح: محمد مصعب عفی عنہ

(۷۸۶/د، ۹۷۱/د، ۱۴۳۸ھ)

مطالبۂ طلاق یا خلع کے بعد یا نامرد قرار دے کر عورت کا میکے چلے جانا اور مہر و نفقے کا مطالبہ کرنا کیسا ہے؟

سوال: عرض یہ ہے کہ مسلم شادی شدہ عورت؛ جس سے اس کے شوہر نے ہم بستری نہیں کی ہے؛ کیوں کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دو دن سے زیادہ نہیں رہی، اور پھر وہ اپنے میکے واپس آ گئی، اس کے بعد اس نے اپنے شوہر سے طلاق یا خلع کے لیے متعلقہ عدالت میں عرضی داخل کر دی ہے، بہ راہِ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں مناسب اور قانونی رائے کو یقینی بنانے کے لیے درج ذیل مسائل پر فتویٰ جاری کریں:

(۱) کیا مسلم شادی شدہ عورت کو؛ جس کے ساتھ اس کے شوہر نے ہم بستری نہ کی ہو، اپنے شوہر سے مہر کی رقم لینے کا حق حاصل ہے؟

(۲) کیا مسلم شادی شدہ عورت کو اپنے شوہر سے مہر کی رقم لینے کا حق حاصل ہے، جس نے اپنے شوہر سے طلاق یا خلع لینے کے لیے کورٹ میں عرضی داخل کی ہو؟

(۳) کیا مسلم شادی شدہ عورت کو اپنے شوہر سے مہر کی رقم لینے کا حق حاصل ہے، جب کہ اس نے اپنے شوہر کو نامرد قرار دیا ہو، اپنی شادی کے تین دن بعد اپنے شوہر کی رفاقت چھوڑ کر اپنے میکے واپس آ گئی ہو، اور پھر کبھی اپنے شوہر کے پاس جانے کی کوشش نہ کی ہو؛ بل کہ اپنے شوہر سے طلاق یا خلع لینے کے لیے عدالت میں عرضی داخل کر دی ہو؟

(۴) کیا مذکورہ بالا مسلم شادی شدہ عورت کو اپنے شوہر سے کوئی خرچ لینے کا حق حاصل ہے، جب کہ اس نے اس کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا ہو، اور اس بارے میں اس عورت نے پنچایت یا معاشرے کے ذمے داران اور بڑوں کی موجودگی میں تحریر دے دی ہو۔

(۵) کیا مذکورہ بالا مسلم شادی شدہ عورت کو اپنے شوہر سے کوئی خرچ یا مہر کی رقم لینے کا حق حاصل ہے، جب کہ اس کا شوہر اس کو رکھنے کے لیے راضی ہے، نیز شوہر کے اندر اپنی بیوی کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنے میں کوئی نقص نہیں ہے؛ مگر چوں کہ اس کا معاملہ کسی اور کے ساتھ چل رہا ہے، جس کا علم شادی سے پہلے شوہر کو نہیں تھا۔

بہ راہِ کرم اس بارے میں شریعت کے مطابق فتویٰ جاری کریں؛ تا کہ ان مسائل پر درست اور صحیح فیصلہ لیا جاسکے، جو کہ دہلی کی عدالت میں معاملہ زیرِ سماعت ہے۔ شکریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) شوہر اور بیوی کے درمیان اگر خلوتِ صحیحہ (یعنی: ایسی تنہائی جس میں ہم بستری سے کوئی رکاوٹ نہ ہو) کے بعد طلاق ہوئی، تو بیوی پورے مقررہ مہر کی حق دار ہوگی، اور اگر خلوتِ صحیحہ بھی نہیں ہوئی، تو مقررہ مہر کے آدھے کی حق دار ہوگی، خلاصہ یہ کہ پورے مہرِ مقررہ کے مستحق ہونے کے لیے خلوتِ صحیحہ کافی ہے، ہم بستری کا پایا جانا ضروری نہیں۔

قال تعالی: ﴿وَإِن طَلَّقتُمُوهُنَّ مِن قَبلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَد فَرَضتُم لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصفُ مَا فَرَضتُم إِلَّآ أَن يَعفُونَ أَو يَعفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقدَةُ النِّكَاحِ وَأَن تَعفُوا أَقرَبُ لِلتَّقوَى وَلاَ تَنسَوُا الفَضلَ بَينَكُم إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ (البقرة: ۲۳۷)

وتجب العشرة إن سمّاها أو دونها، ويجب الأكثر منها إن سمّى الأكثر، ويتأكّد عند وطءٍ أو خلوةٍ صحّت من الزّوج أو موت أحدهما .... ويجبُ نصفُه بطلاقٍ قبل وطءٍ أو خلوة. (الدر المختار مع الشامي: ۲۳٦/٤، ط: زكريا، ديوبند)

(۲) (الف) مسلم شادی شدہ خاتون کا اپنے شوہر سے خلع کے مطالبے کی صورت میں اگر شوہر اس خلع کو منظور کر لیتا ہے، تو اس سے عورت پر طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے، اور عورت کا حقِ مہر ختم ہو جاتا ہے، یعنی: مہر معاف ہو جاتا ہے۔

والواقعُ به أي بالخُلع وبالطَّلاق على مال بائنٌ. (مجمع الأنهر: ۱۰۲/۲-۱۰۳، ط: فقيه الأمت، ديوبند)

فهي طلاقٌ بائنٌ يعوض بلا نية. (سكب الأنهر على هامش مجمع الأنهر: ۱۰۹/۲، ط: فقيه الأمت، ديوبند)

و يسقط الخُلع والمُباراة كلّ حق ثابت وقتهما لكلٍّ منهما على الآخر ممّا يتعلّق بذلك النكاح. (الدر المختار مع الشامي: ۱۰۵/۵، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

(ب) مسلم خاتون کے طرف سے طلاق کا مطالبہ کیے جانے کی صورت میں اگر اس نے مہر کی معافی یا الگ سے کچھ رقم دینے کا ذکر کیا ہے، تو شوہر کے طلاق منظور کر لینے پر طلاق واقع ہو جائے گی، اور مہر معاف ہو جائے گا، یا بیوی پر مقررہ رقم لازم ہو جائے گی۔

والواقعُ بالخُلع وبالطَّلاق علی مال بائنٌ، ویلزم المُسمّٰی. (مجمع الأنهر: ۲/۱۰۳، ط: فقیه الأمت، دیوبند)

اور اگر عورت نے اپنے مطالبۂ طلاق میں مہر کی معافی کا ذکر نہیں کیا، صرف طلاق کا مطالبہ کیا، تو شوہر کے طلاق دے دینے کی صورت میں طلاق واقع ہوجائے گی، اور عورت مہر کی حق دار برقرار رہے گی، خلوتِ صحیحہ ہوجانے کی صورت میں پورے مہر کی، اور بغیر خلوتِ صحیحہ کی صورت میں آدھے مہر کی، جیسا کہ (۱) میں وضاحت آچکی۔

نوٹ: واضح رہے کہ عورت کی جانب سے طلاق یا خلع کا مطالبہ کیے جانے کی صورت میں طلاق واقع ہونے؛ یعنی: رشتۂ نکاح ختم ہونے کے لیے، شوہر کا اس طلاق یا خلع کو منظور کرنا ضروری ہے۔

و أمَّا رکنُه فهُو کما في البدائع: إذا کان بعوض الإیجاب والقبول؛ لأنَّه عقدٌ علی الطَّلاق بعوض، فلا تقعُ الفُرقة ولا یستحقّ العوض بدون القبول. (شامي: ۵/۸۸، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

(۳) عورت کی جانب سے شوہر کو نامرد قرار دینے، اور اس سے دوری اختیار کرلینے کی صورت میں اس کا حق مہر ختم نہیں ہوتا؛ بل کہ اگر خلوتِ صحیحہ پائی گئی؛ خواہ شوہر نامرد ہی کیوں نہ ہو، عورت پورے مہر کی مستحق ہوگی۔

فالمهر یتأکَّدُ بأحد معان ثلاثةٍ: الدُّخُول، والخلوةُ الصَّحیحةُ، وموتُ أحد الزَّوجین، حتّٰی لا یسقُط شيءٌ منه بعد ذلك؛ إلا بالإبراء من صاحب الحق. (بدائع الصنائع: ۳/۴۹۳، ط: دار المعارف، دیوبند)

والخلوةُ کالوطءِ ولو کان الزَّوجُ مجبوباً أو عنِّیناً .... في تأکُّد المهر إلخ.

(الدر المختار مع الشامي: ۴/۲۵۴-۲۵۵، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

(۴) شادی شدہ عورت اپنے شوہر سے نفقہ؛ یعنی: کھانے کپڑے کا خرچ لینے کی حق دار اُس وقت تک رہتی ہے، جب تک وہ ناشزہ؛ یعنی: شوہر کی خلاف ورزی کرنے والی نہ ہو؛ چناں چہ اگر بیوی شوہر کی مرضی کے بغیر اس کے گھر سے چلی جائے، یا شوہر کی مرضی کے خلاف میکے میں رہ جائے، اور اس کے بلانے پر بھی نہ آئے، تو ان دونوں صورتوں میں عورت ناشزہ ہوجاتی ہے، اور اس کا نفقے کا

حق ختم ہوجاتا ہے؛ لہٰذا سوال میں مذکورصورت میں اگرعورت اپنے شوہر کی ناشزہ ہوچکی ہے، تو جب تک وہ ناشزہ رہے گی، نفقے کی حق دار نہ ہوگی۔

تجبُ علی الرَّجُل نفقةُ إمرأته المُسلمة ...... دخل بها أو لم یدخُل ...... وإن نشزت فلا نفقة لها، حتّٰی تعُود إلی منزله، والنَّاشزةُ هي الخارجةُ عن منزل زوجها المانعة نفسها منه. (الفتاویٰ الهندیة: ۱/ ۵۴۵، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

(۵) عورت کے پورے یا آدھے مہر کی حق دار ہونے کی تفصیل **(۱)** میں لکھی جاچکی، اور ناشزہ ہونے اور نہ ہونے کی صورت میں نفقے کی حق دار ہونے اور نہ ہونے کا حکم **(۴)** میں لکھ دیا گیا؛ پس اسی کے مطابق مہر اور نفقے کے استحقاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/۱/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۲۱۴/ تتمہ/ د، ۹۴۱/ د، ۱۴۳۷ھ)

سابقہ عدت گذرنے سے پہلے نکاح کر لینے کے بعد تین طلاق کا حکم

سوال: بعد سلام عرض ہے کہ احقر کے ایک دوست کے ساتھ ایک مسئلہ پیش آیا ہے، اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں مفتیانِ کرام وعلمائے عظام:

ایک شادی شدہ لڑکی کا شوہر بیمار تھا، بیماری کے درمیان لڑکی اپنے شوہر سے پریشان ہوکر میرے دوست محمد نوشاد کے ساتھ بھاگ کر کہیں پر رہنے لگی، اس دوران لڑکی کے شوہر کا انتقال ہوگیا، پھر اس کے بعد نوشاد اور اس لڑکی نے ایک دوسرے سے نکاح کر لیا بغیر عدت، اور اب ان دونوں کا ایک بیٹا بھی ہے، اب پانچ سال بعد غصے میں تین طلاق دے دی، لڑکی اپنے گھر؛ یعنی: میکے پر ہے، اور نوشاد کو اس بات پر افسوس ہے، اور دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اور دوسری بات اُن دونوں کا جو بیٹا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ شریعت کی روشنی میں جواب عطا فرمائیں، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: بغیر عدت پوری کیے نکاح کرنے کا قول؛

زوجین کا یا ان میں سے کسی ایک کا ہے، تو وہ اپنے قول میں متہم ہے؛ لہٰذا اُن کا قول نا قابلِ اعتبار ہوگا، اوراس وقت تین طلاق کے وقوع کا حکم کیا جائے گا۔

قال في الدُّر في باب الرَّجعة: قولُه: بعد أي بعد طلاقه ثلاثاً كان قبلها طلقةٌ واحدةٌ وانقضت عدَّتها وصدقته المرأةُ في ذلك لا يصدقان على المذهب المُفتى به.

(الدر مع الرد: ۵/۵۷، ط: زکریا، دیوبند)

اگرشوہرِاول کی وفات سے چار ماہ دس دن گذرنے کے بعد نکاح کیا، تو نکاح درست ہوگیا، اوراس وقت تین طلاق واقع ہوکر مغلظہ بائنہ ہوگئی، اوراگر چار ماہ دس دن گذرنے سے پہلے نکاح کیا، اور یہ بات متعلقین پاس پڑوس کے لوگوں کومعلوم ہے، تو نکاح صحیح نہیں ہوا؛ لہٰذا اس وقت کی دی ہوئی تین طلاق واقع نہیں ہوئی۔

قال في الدُّر في باب العدة: طلَّقها ثلاثاً ويقُول: كنتُ طلَّقتُها واحدة ومضت عدَّتُها، فلو مُضيُّها معلُوماً عند النَّاس لم يقع الثَّلاث؛ وإلا يقع. (الدر مع الرد، باب العدة: ۵/۲۱٤، ط: زکریا، دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۲۱ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۴۹/د، ۲۲۷/د، ۱۴۳۸ھ)

ماں باپ کی ناراضگی کی وجہ سے بیوی کوطلاق دینا کیسا ہے؟

سوال: ماں باپ کہتے ہیں کہ بیوی کوطلاق دے دو، اور دوسری شادی کرلو، بیوی نے اپنی عمر چھپا کر شادی کی تھی، جس کی وجہ سے ماں باپ تین سال سے ناراض ہیں، ایسی صورت میں؛ میں کیا کروں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: اگر بیوی میں بہ ظاہر کوئی خرابی نہیں ہے، تو آپ کے والدین کوطلاق دلوانے پر مجبور نہ کرنا چاہیے، اگر وہ بلاوجہ طلاق دلوانے پر مجبور کریں، تو اس میں اُن کی اطاعت لازم نہیں، آپ خود یا کسی بڑے سے کہہ دیں؛ تا کہ وہ

آپ کے والدین کو سمجھا دیں، طلاق؛ اللہ رب العزت کے نزدیک مباح چیزوں میں سب سے مبغوض وناپسندیدہ ہے، اس پر اقدام حد درجہ مجبوری میں کرنا چاہیے، طلاق کے بعد بسا اوقات دیگر مسائل بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۵۶/ تتمہ/ ل، ۶۵۸/ ل، ۱۴۳۸ھ)

حلالے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: میرے ایک غیر مسلم دوست نے مجھ سے ایک سوال کیا، جس کا جواب میرے پاس نہیں، میں آپ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس سوال کا تفصیل سے جواب دیں:

حلالہ کیا ہے؟ یہ کب کیا جاتا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: حلالے کی حقیقت یہ ہے کہ شوہر کے بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد شوہر کے لیے مطلقہ ثلاثہ کے حلال ہونے کی شریعت نے جو ترتیب بتلائی ہے؛ یعنی: عدت گذار کر عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرلے، اور دوسرا شوہر ہم بستری بھی کرلے، پھر کسی وجہ سے طلاق دے دے، یا انتقال کر جائے، اور عورت عدتِ طلاق یا عدتِ وفات گذار لے، تو اب یہ پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے، پہلے شوہر کے لیے عورت کے حلال ہونے کے اس شرعی ضابطے کو ’’تحلیل‘‘ کہتے ہیں، جس کو اردو میں ’’حلالۂ شرعیہ‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں، حلالے کا ذکر قرآن پاک کی اس آیت کریمہ میں ہے:

﴿فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىَ تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ﴾ (البقرة: ۲۳۰)

واضح رہے کہ اگر کوئی شخص مطلقۂ ثلاثہ سے تحلیل اور حلالے کی شرط پر ہی نکاح کر رہا ہے، تو یہ فعل مکروہِ تحریمی ہے، حدیث شریف میں اس پر لعنت وارد ہوئی ہے:

إنّ رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم لعن المُحلِّل والمُحلَّل له. (ترمذي: ۱۳/۱، أبواب النكاح)

ہاں اگر کوئی شخص عقد میں حلالے کی شرط کے بغیر؛ اپنے دل میں یہ سوچ کر کہ اس کا گھر ویران ہوگیا، کیا اچھا ہو کہ اس کا گھر آباد ہو جائے، اور پریشانی دور ہو جائے؛ مطلقۂ ثلاثہ سے نکاح کر لیتا ہے، اور ہم بستری کے بعد طلاق دے دیتا ہے، پھر وہ عورت عدت گذار کر سابق شوہر سے نکاح کر لیتی ہے، تو اس صورت میں کوئی گناہ نہیں ہے؛ بل کہ اس حسنِ نیت پر ثواب ملنے کی امید ہے۔

قال في الدُّر: أمَّا إذا أضمر ذلك لا يُكره، وكان الرَّجُل مأجُورا؛ لقصد الإصلاح. (الدر مع الرد: ٥/٤٨، ط: زکریا) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۱۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۸۲۱/تتمہ/ص، ۸۴۴/ص، ۱۴۳۸ھ)

مدتِ رضاعت مکمل ہوجانے کے بعد بکری کے دودھ کے ساتھ عورت کا دودھ ملا کر پلانا کیسا ہے؟

سوال: کیا بچہ دودھ پینے کی عمر تجاوز کرلے، تو بکری کے دودھ کے غالب ہونے کے ساتھ عورت کا دودھ ہو، جائز اور حلال ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: مدتِ رضاعت مکمل ہوجانے کے بعد عورت کے دودھ سے انتفاع جائز وحلال نہیں، خواہ بکری کے دودھ میں ملا کر ہو، اور خواہ بکری کا دودھ غالب بھی ہو۔

ولم يُبح الإرضاع بعد مدَّته؛ لأنَّه جزءٌ آدميٌّ والانتفاع به لغير ضرورة حرامٌ على الصَّحيح شرح الوهبانية اهـ. (درمختار علی هامش الفتاوی رد المحتار: ٢/٤٠٤، باب الرضاع، ط: نعمانية) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۲۲ھ الموافق: ۲۰۱۷/۸/۱۵ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۲۶۵/ھ، ۱۳۶۲/ھ، ۱۴۳۸ھ)

بچے نے دودھ پیا مگر فوراً قے کردی تو رضاعت کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ زید جب پیدا ہوا، تو چار پانچ روز میں بیمار ہوگیا کہ جو بھی غذا؛ یعنی: ماں کا دودھ وغیرہ پیتا، تو وہ غذا اُس کے پیٹ میں نہ پہنچ پاتی؛ چناں چہ زید فوراً الٹی کردیتا، تو زید کی نانی نے سوچا کہ شاید زید کی ماں کے دودھ میں خرابی ہے، جس کی وجہ سے وہ قے کررہا ہے، تو زید کی نانی نے زید کی خالہ زاہدہ کا دودھ پلایا؛ لیکن زید نے فوراً دودھ قے کردیا، اور پورا دودھ نکال دیا، تو زید کو دواخانے لے جایا گیا، تو ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد بتلایا کہ زید کے کھانے کی نلی کا سوراخ بند ہوگیا ہے؛ لہٰذا اس کا آپریشن کرنا پڑے گا۔

زید کا دودھ پینا یقینی ہے، اور اُس وقت زید کی ماں اور نانی موجود تھے گواہی کے طور پر، مسئلہ دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا ایسی صورت میں رضاعت ثابت ہوگئی؟ جب کہ زید نے ایک ہی چسکی میں دودھ پیا، اور قے کردی۔ (**لاتثبت الحُرمة لمصَّة ولمصَّتان**) کی بھی وضاحت کریں۔

مسئلہ: اب صورتِ حال یہ ہے کہ زید کی خالہ زاہدہ کی ایک لڑکی فاطمہ اور زید دونوں آپس میں بے انتہا محبت کرتے ہیں، اور دونوں یہ چاہتے ہیں کہ آپس میں نکاح کریں، اور وہ ضد پر آچکے ہیں کہ اگر ہماری شادی آپس میں نہ ہوئی، تو ہم مرجائیں گے، یہاں تک کہ زید نے گھر میں زہر لاکر رکھ دیا ہے، ایسی صورتِ حال میں ہم کیا کریں؟ زید اور فاطمہ کا نکاح کرادیں، یا پھر دونوں کو مرنے دیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: حرمتِ رضاعت کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ دودھ حلق سے نیچے چلا جائے، خواہ تھوڑا جائے یا زیادہ، اگر دودھ پینے کے بعد بچہ قے کردے، تب بھی حرمتِ رضاعت ثابت ہوجاتی ہے؛ اس لیے صورتِ مسئولہ میں زید کی خالہ زاہدہ؛ زید کی رضاعی ماں بن گئیں، اور اُن کی بیٹی زید کی رضاعی بہن ہوگئی، زید کا اپنی رضاعی ماں (زاہدہ) کی بیٹی فاطمہ سے نکاح کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، اُن دونوں کو اللہ سے ڈر کر اس ارادے سے باز آجانا چاہیے، شرعی حکم کو جانتے ہوئے اس پر اصرار کرنا بڑی بد دینی کی بات ہے، کسی مسلمان کے لیے ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں ہے۔

ویثبتُ به وإن قلَّ إن علم وصُولُه لجوفه من فمه أو أنفه إلخ. (رد المحتار مع الشامي: ۴/۳۹۹، ط: زکریا) نیز دیکھیں: (خیر الفتاوی: ۴/۴۸۵، ط: ملتان)

''**لاتحرم المصَّة والمصَّتان**'' اوراسی جیسی دیگر بعض روایتوں کا علامہ شامی نے یہ جواب دیا کہ یہ منسوخ ہیں، اس کی تصریح حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے کی ہے۔

والجوابُ أنّ التَّقدير منسُوخٌ، صرَّح بنسخه ابنُ عبَّاس وابنُ مسعُود إلخ . (ردالمحتار علی الدر المختار: ۴/۳۹۸، ط: زکریا) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ: محمد اسداللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱/۹ھ، سہ شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۵۷/تتمہ/س، ۳۷/س، ۱۴۳۸ھ)

لاوارث کے والد کی جگہ؛ پرورش کرنے والے کا اپنا نام لکھوانا کیسا ہے؟ نیز پرورش کرنے والے مرد اور عورت کا؛ بچّے سے شرعاً کیسا رشتہ ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

ایک بچہ جس کی ولادت ہسپتال میں ہوئی، اور ماں باپ فرار ہوگئے، اور کسی کو معلوم بھی نہیں، نیز یہ کہ جو ایڈریس لکھا، وہ ایڈریس بھی غلط ہے، اب ایسے میں ایک شخص انسانیت کے ناطے، اور ثواب کی امید سے اس بچے کو اپنا لیتا ہے، مسئلہ آتا ہے اس بچے کی تعلیم کا، تعلیم خواہ عصری ہو یا دینی ہو، اسی طریقے سے سرکاری پہچان پتر وغیرہ، ایسے میں کیا مربی اس بچّے کے والد کی جگہ اپنا نام لکھوا سکتا ہے؟ یا اس کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟

نیز یہ کہ اس بچے نے جب ہوش سنبھالا، تو اُنھی مربی اور مربیہ کو پایا، اُنھی کو ابو، امی کہنے لگا، اب کیا اس معصوم بچے سے جب یہ مربی کو ابو اور مربیہ کو امی کہتا ہے، یہ کہہ دیا جائے گا کہ ہم تمھارے ابو امی نہیں ہیں؟ بہ راہِ کرم اس مسئلے میں تفصیلی تحقیقی اور تسلی بخش جواب دے کر ہماری راہ نمائی فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ فقط والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: نوزائیدہ بچہ؛ جس کے والدین چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اور کوئی پرورش کرنے والا نہیں ہے، اس کو لے کر پرورش کرنا، اس کی تعلیم وتربیت اور شادی بیاہ کا انتظام کرنا بہت باعثِ ثواب کام ہے؛ لیکن اس کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنا منع ہے، حدیث شریف میں ہے:

من ادّعی إلی غیر أبیه وهو یعلم أنّه غیر أبیه فالجنّة علیه حرامٌ. (صحیح البخاري، رقم الحدیث: ٦٧٦٦)

(جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف اپنے کو منسوب کرے، جب کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میرا باپ نہیں ہے، تو اس پر جنت حرام ہے)؛ البتہ اگر بغیر ولدیت کے پہچان پتر بنانے میں؛ اسی طرح تعلیم وغیرہ کا انتظام کرنے میں دشواری ہو، تو کاغذات میں مجازاً مربی کی طرف اس کی ولدیت منسوب کرنے کی گنجایش ہے۔

نیز بچہ ابھی سمجھ دار نہیں ہوا، تو مربی ومربیہ کو ابو امی کہنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ جب سمجھ آنے لگے، تو دھیرے دھیرے اُسے دوسرا لفظ بولنے کی عادت ڈلوائی جائے۔

قال ابنُ بطّال في شرح الحدیث المذکور: ومن لم یعرف له أبٌ ولا نسبٌ، عرف مولاه الذي أعتقه، والحقُّ ولائه عنه .... وإنّما لعن النّبي صلّی اللّٰه علیه وسلّم المبترئ من أبیه والمدعي غیر نسبه، فمن فعل ذلك فقد رکب من الإثم عظیما.

(شرح بخاري: ٨/٣٨٣-٣٨٤)

واضح رہے کہ چوں کہ یہ بچہ مربی مربیہ کا حقیقی لڑکا نہیں ہے؛ اس لیے بالغ ہونے پر مربیہ کا اس سے پردہ ضروری ہے، اسی طرح شادی کے بعد اس کی بیوی سے مربی کا، نیز وہ بچہ مربی ومربیہ کی میراث کا حق دار نہ ہوگا؛ البتہ وہ زندگی میں ہی کچھ دے دیں، یا مرنے کے بعد اس کے لیے ایک تہائی کی وصیت کر جائیں، تو وہی حصہ اس کو ملے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۳/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۳۵۴/د، ۴۴۲/د، ۱۴۳۸ھ)

لڑکیوں کو تحفے تحائف دے کر اصل وراثت سے محروم کرنا کیسا ہے؟ نیز اگر وہ اپنے حق سے خود دست بردار ہو جائیں تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مندرجہ ذیل مسئلے میں:

(۱) زید چھ بھائی ہیں، ہر ایک بھائی کے حصّے میں چوبیس چوبیس بیگھا زمین آتی ہے؛ یعنی: والدین کے انتقال کے بعد، اور زید کی دو بہنیں ہیں، ان کو وراثت میں حصہ نہیں دیا، جیسا کہ اس علاقے کا ماحول یہی ہے کہ بہنوں کو دیگر ذرائع ودیگر طریقوں سے؛ مثلاً: عیدین کے موقع پر کچھ دے دیا، ان بہنوں کی اولاد کی شادیوں میں اچھا خاصا دے دیا، اور بہنیں اسی پر خوش بھی ہیں، یا مثلاً: کسی بہن نے کہہ دیا کہ بس مجھے حج کرادینا، مجھے زمین میں سے کچھ نہیں چاہیے، یا کسی بہن نے اپنے شوہر کی بدمزاجی کی وجہ سے اپنا حصۂ زمین اپنے بھائیوں پر چھوڑ دیا، تو کیا یہ شکل درست ہے؟ یا ہر صورت میں بہنوں کو میراث میں حصہ دینا ضروری ہے؟

(۲) اگر کوئی بہن بہ خوشی اپنا حصہ اپنے بھائی کے لیے ہبہ کردے، تو کیا درست ہے؟

(۳) گھر کی رہایش کی جو زمین ومکان ہے، والدین کے انتقال کے بعد کیا اس میں بھی لڑکیوں کا حصہ ہوتا ہے؟ مکان اور زمین دونوں کو مدِنظر رکھ کر جواب مطلوب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملہم الصواب: **(۱)** بہنوں کو حصہ نہ دینا؛ اسلامی قانونِ وراثت کے خلاف ہے، معاشرے میں جو طریقہ رائج ہے، وہ غلط ہے، عیدین کے موقع پر تحفے تحائف دینے، یا شادی بیاہ کے موقع پر جہیز وغیرہ دینے سے اُن کا حقِ میراث ادا نہیں ہوتا، بہنیں بھی بھائیوں کی طرح مستقل وارث ہیں، اگرچہ بہنوں کا حصہ بھائیوں سے کم ہے؛ لیکن وارث ہونے کی حیثیت میں دونوں برابر ہیں، اگر بہنیں کسی وجہ سے اپنے حصّے کا مطالبہ نہ کریں، تو اس کی وجہ سے ان کا حق ساقط نہیں ہوتا، ہاں اگر کوئی بہن اپنے بھائی سے یہ معاملہ طے کرلے کہ میرا جس قدر حصہ میراث میں نکلتا ہے، اس کے بدلے مجھے حج کرادیا جائے، اور بھائی اس کے حصّے کو بیچ کر یا خود خرید کر اس پیسے سے بہن کو حج کرادے، تو اس صورت میں بہن کا حصہ؛ متروکہ جائیداد سے ختم ہو جائے گا۔

(۲) میراث کی شرعی تقسیم ہوجانے کے بعد بہن اپنا حصہ لے کر؛ اپنے بھائی کو ہبہ کردے، تو ایسا کرنا درست ہے۔

(۳) والدین کی متروکہ جائیداد؛ خواہ رہائشی مکان کی شکل میں ہو، یا زرعی یا غیر زرعی زمین خالی پڑی ہو، ہر ایک میں لڑکیوں کا حصہ متعلق ہوتا ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۸؍رجب؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- فخر الاسلام عفی عنہ

(۹۰۳؍تتمہ؍م، ۹۴۶؍م، ۱۴۳۸ھ)

جہیز کو میراث کا بدل سمجھ کر دینا اور اصل وراثت سے محروم کردینا ظلم ہے

سوال: بعض لوگ جہیز کو میراث کا بدل سمجھ کر بیٹی یا بہن کو جہیز دیتے ہیں، اور بعد میں میراث سے بیٹی یا بہن کو محروم کردیا جاتا ہے، کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: شادی کے موقع پر ہر لڑکی کو جو کچھ بھی دیا جاتا ہے، یہ محض تحفہ ہے، یہ میراث کا بدل نہیں ہے؛ لہٰذا جہیز دے کر بہن یا بیٹی کو وراثت سے محروم کردینا سراسر جہالت اور صریح ظلم ہے، احادیثِ شریفہ میں میراث کے حق دار کو حق نہ دینے پر سخت وعیدیں وارد ہیں۔

عن سعید بن زید رضي اللّٰه عنه سمعتُ رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم یقُول: من أخذ من حقِّ امرئ من المُسلمین شِبرًا بغیر حقٍّ طوَّقه اللّٰه تعالی یوم القیامة سبع أربعین. (صحیح مسلم: ۳۳/۲، صحیح البخاري: ۳۳۱/۱، معجم الأوسط: ۱٦۷/٦) **عن أنس بن مالك رضي اللّٰه عنه قال: قال رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: من فرَّ من میراث وارثه قطع اللّٰه میراثه من الجنَّة یوم القیامة.** (سنن ابن ماجه: ۱۹٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۲۷ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی

(۵۲۲؍ص، ٦۲۸؍ص، ۱۴۳۸ھ)

پیٹ میں بچہ مرگیا اور صفائی کروادی تو کیا عدت پوری ہوجائے گی؟

سوال: ہمارے یہاں ایک عورت کو عدت بیٹھے ہوئے ۷۵/دن ہوچکے تھے، اور وہ حمل سے تھی، تو اچانک پیٹ میں درد ہوا، الٹراساؤنڈ کرایا گیا، تو اس میں بچہ مرا ہوا آیا، سپٹک (septic) کا حساب بن چکا تھا؛ اس وجہ سے صفائی کرائی گئی، کیا عورت کے جو دن باقی ہیں، اُن کو پورا کرنا ہے، یا عدت پوری ہوچکی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر مذکورہ مدت میں بچے کے بعض اعضاء کی تخلیق ہوگئی تھی، مثلاً: ہاتھ، پیر، انگلی، ناخن وغیرہ میں سے کوئی عضو بن گیا تھا، تو اسقاط (صفائی) کروانے سے عدت پوری ہوگئی؛ ورنہ عدت کی تکمیل لازم ہے۔

وإذا اسقطت سقطاً استبان بعضُ خلقه انقضت به العدَّة؛ لأنَّه ولدٌ، وإن لم يستبن بعضُ خلقه لم تنقض إلخ. (البحر الرائق: ۴/۲۹۹)

والمُرادُ به الحمل الذي استبان بعضُ خلقه أو كلُّه، فإن لم يستبن بعضه لم تنقض العدة؛ لأنّ الحمل اسمٌ لنُطفةٍ متغيّرةٍ، فإذا كان مُضغةً أو علقةً لم تتغيَّر، فلا يعرف كونها متغيّرة بيقينٍ إلا باستبانة بعض الخلق. بحر عن المحيط. (رد المحتار: ۳/۵۱۱) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۸/ذی الحجہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۳۷۲/م، ۱۳۹۳/م، ۱۴۳۸ھ)
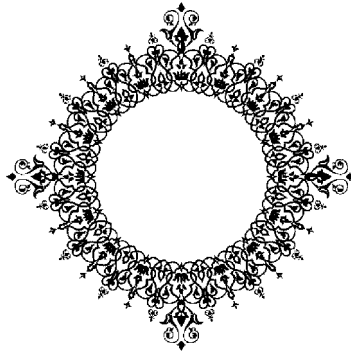
بیع، اجارہ، شرکت وملازمت اور کمپنیوں سے متعلق مسائل

مشتری کا سامان خرید کر واپس بائع کو بیچ دینے سے متعلق تفصیلی حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں:

بہت سے تجارتی ادارے ہیں، جن میں بیع کی ایک صورت رائج ہے کہ مشتری آ کر بائع سے کوئی چیز ادھار خرید لیتا ہے، پھر قبضے کے بعد اُسی بائع کو کم قیمت پر فروخت کرتا ہے، غرض قرض کے حصول کے لیے یہ طریقہ مروج ہے، جس کے بارے میں فیصلہ عدم جواز کا ہے؛ لیکن اگر کوئی تیسرا آدمی حائل ہو جائے، یعنی: کوئی اجنبی جو بائعِ اول کے علاوہ ہو؛ آ کر اُس مشتری اول سے، جس نے شوروم سے کوئی چیز ادھار خریدی ہے، اُسی چیز کو کم قیمت؛ نقد خرید لے، تو اُس کا جواز منقول ہے۔

اس تمہید کے بعد اب چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) اگر مشتری ثانی اتفاقاً وہی چیز کم قیمت پر بائع اول کو فروخت کر دے؟

(۲) مشتری ثانی کو حائل کر کے وہ چیز بائعِ اول کی طرف لوٹانے کا حیلہ پہلے ہی سے مقصود ہو؟

(۳) بائعِ اول کی طرف لوٹنے کا کوئی باقاعدہ حیلہ تو نہ ہو؛ لیکن عرفاً بائعِ اول ہی کی طرف لوٹنا متیقن ہو؟

(۴) کسی دوسرے عقدِ مشروع کے ضمن میں وہ چیز بائعِ اول کی طرف کم قیمت پر لوٹ رہی ہو؟

بائعِ اول کی طرف اُس چیز کے (یقیناً، اتفاقاً، عرفاً، ضمناً) لوٹنے کی ہر ایک صورت کا حکم الگ الگ مفصل اور مدلل تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: (۱) اگر مشتری ثانی وہی چیز کم قیمت پر بائعِ اول کو فروخت کردے، تو اس میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں ربا کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

(۲،۳) اگر مشتری ثانی مستقل شخص ہو، بائعِ اول کا وکیل وغیرہ نہ ہو، اگر وہ اُس چیز کو دوسری جگہ بیچنا چاہے، تو بیچ سکے، تو ان دونوں صورتوں میں بھی یہ معاملہ شرعاً درست ہے، اگر مشتری ثانی بائعِ اول کا وکیل ہو، یا مشتری اول اور بائع کے درمیان اس طرح کا معاہدہ ہوا ہو، جس کے نتیجے میں وہ (بیع) لازماً بائعِ اول کے ہاتھ آئے، تو شرعاً ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

(۴) اس کی جو صورت آپ کے ذہن میں ہے، اُسے کھول کر لکھیں، پھر ان شاء اللہ اس کا جواب تحریر کیا جائے گا۔

مستفاد از: **من اشتریٰ جاریةً بألف درهم حالّة أو نسيئة فقبضها، ثُمَّ باعها من البائع بخمس مأة قبل أن ينقد الثَّمن الأوَّل لايجُوز البيع الثَّاني ...... و لو باعه المُشتري من رجُل أو وهبه ثُمَّ اشتراه البائع من ذلك الرَّجُل يجُوز؛ لاختلاف الأسباب بلا شُبهةٍ، و به تختلفُ المُسبَّبات، وبقولنا قال مالك وأحمد إلخ.** (هداية مع فتح القدير: ۶/۴۳۳، ط: دارالفكر) نیز دیکھیں: (فقه البيوع: ۱/۵۴۷ - ۵۵۶، ط: دارالمعارف، ديوبند) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۸ھ، سہ شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۶۵/تتمہ/س، ۵۸۲/س، ۱۴۳۸ھ)

کیا آٹا گندم وغیرہ کی بیع میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر عمل کی گنجایش ہے؟

سوال: ہمارے یہاں یہ رواج ہے کہ گندم کے بدلے آٹا فروخت کرتے ہیں، تقریباً تمام فقہائے کرام نے اس کو علی الاطلاق ناجائز لکھا ہے؛ کیوں کہ دونوں کی جنس وقدر ایک ہے، جس کی وجہ سے مساوات ضروری ہے، جب کہ یہاں مساوات ممکن نہیں، انھی عبارات کے بنیاد پر کچھ عرصے پہلے اس ناکارہ نے عدم جواز کا جواب بھی لکھا تھا، اور ساتھ متبادل صورت بھی لکھی تھی، اب دوبارہ یہی مسئلہ

سامنے آیا، تو غور کرنے سے ایک بات ذہن میں آئی کہ جس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے آپ کو تکلیف دینا گوارا کیا، امید ہے آپ حضرات راہ نمائی فرمائیں گے۔

اس مسئلے پر غور کرنے سے بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد؛ حضراتِ طرفین اور حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے اختلاف پر ہے، طرفین کے نزدیک جو چیز دورِ رسالت علی صاحبہا الصلاۃ والسلام میں کیلی یا وزنی تھی، وہ قیامت تک اُسی حالت میں رہے گی؛ اگر چہ لوگوں کا طرز وعمل بدل بھی جائے، جب کہ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک نص کی بنیاد اُس وقت لوگوں کے تعامل پر تھی؛ لہٰذا تعامل کے بدلنے سے چیز کی حیثیت بھی بدل جائے گی، آٹا اور گندم دونوں اُس زمانے میں کیلی تھے؛ اس لیے حضرات طرفین کے نزدیک اب بھی کیلی ہی شمار ہوں گے، اور تبادلے میں مساوات فی الکیل ضروری ہے، جو کہ گندم کے تخلخل کی وجہ سے ممکن نہیں؛ لہٰذا یہ بیع مطلقاً ممنوع ہے، جب کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک؛ چوں کہ لوگوں کے تعامل کی وجہ سے اب گندم وزنی بن چکا ہے، اور وزن میں مساوات بالکل آسان ہے؛ اس لیے تساوی فی الوزن کی شرط پر بیع جائز ہے۔

اس اختلاف میں عام فقہائے کرام کے طرز سے معلوم ہوتا ہے کہ راجح قول؛ حضراتِ طرفین کا ہے؛ لیکن پوچھنا یہ ہے کہ کیا لوگوں کے تعامل کی وجہ سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

نیز بعض اوقات یہ توجیہ بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں بھوسا قیمتاً فروخت ہوتا ہو، وہاں اس معاملے کی تکییف: **بیعُ الزَّیت بالزَّیتُون** اور **بیعُ السّمسم بالشّیرج** کی طرح ہوگی، اور اگر خالص آٹا؛ گیہوں سے نکلنے والے آٹے سے یقیناً زیادہ ہو، نیز معاملہ بھی نقد ہو، تو اس کی گنجایش ہوگی، اس توجیہ کی بنا پر طرفین کے مذہب میں بھی اس معاملے کی گنجایش پیدا ہوگی، نیز فقہائے کرام کے کلام پر بھی بہ ظاہر کوئی اشکال لازم نہیں آئے گا، کیا یہ توجیہ فقہی اصول کی روشنی میں درست ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: موجودہ زمانے میں چوں کہ گندم وغیرہ کی بیع وزن کے ذریعے سے ہی ہوتی ہے؛ اس لیے اس سلسلے میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول اختیار کرتے ہوئے، ان کو موزونات میں شمار کیا جاسکتا ہے، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ کی ایک عبارت سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے؛ چناں چہ ایک استفتاء کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

عرف کا اگر لحاظ کر لیا جائے، جیسا کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول ہے، اور محقق ابن ہمام نے اس کو ترجیح دی ہے، اور کافی میں کہا: و الفتویٰ علی عادۃ النّاس، تو جیسا مکئی وغیرہ عرفاً وزنی ہیں، گندم وجو وغیرہ وزنی ہیں۔ (فتاوی دارالعلوم: ۱۴/ ۴۴۷)

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۹/ ۵/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۰/ تتمہ/ د، ۱۰۲/ د، ۱۴۳۸ھ)

بیع تام ہو جانے کے بعد مشتری اگر قیمت ادا نہ کرے تو وصول یابی کا کیا طریقہ ہے؟

سوال: حضرات مفتیانِ عظام دامت برکاتکم العالیہ! درج ذیل مسئلے کا شرعی حکم دریافت کرنا ہے، آپ عنایت فرما کر ممنون فرمائیں:

مسئلہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے ایک فریق کو زمین فروخت کر کے؛ متعاقدین کے درمیان یہ طے پایا کہ قیمت ایک سال کے اندر ادا کر دی جائے گی، اب اتفاق سے ایک تیسرے فریق نے بائع پر دعویٰ کر دیا کہ فروخت کردہ زمین میری ہے، ایک سال تک مقدمہ چلتا رہا، جس میں مدعی کو شکست ہوئی، اور عدالت نے اس کے دعوے کو غلط قرار دے کر بائع کی ملکیت کی تصدیق کی، بہ ہر حال! مقدمہ ختم ہوئے بھی ایک سال سے زائد ہو چکا ہے، اور مشتری حضرات نے تا حال؛ قیمت ادا نہیں کی ہے، اب آپ یہ بتائیں کہ مشتری کی اس خلاف ورزی کی وجہ سے؛ کیا بائع کے لیے شرعاً یہ بھی گنجایش ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کر دے، اگر اجازت ہے، تو فسخ کی شرعی صورت تحریر کر دیں، یا بائع یہ چاہے کہ معاملہ فسخ نہ کر کے زمین کی قیمت میں اضافہ کر دے، پہلے جس قیمت پر زمین فروخت کی تھی، اب اس پر مزید اضافہ کر کے زائد قیمت کا مطالبہ؛ موجودہ قیمت کے اعتبار سے کرے، کیا شرعاً اس کے لیے اجازت ہے؟ جو بھی صورت صحیح ہو؛ آپ مدلل اور با حوالہ تحریر فرما دیں، کرم ہوگا، واضح رہے کہ مشتری حضرات خرید کردہ زمین کے ایک حصّے کو فروخت کر کے نفع بھی کما چکے ہیں، اس کے باوجود ادائیگی قیمت کو تیار نہیں۔ جزاکم اللہ احسن ما یجزیہ عبادہ الصالحین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: عاقدین کے درمیان جب ایجاب وقبول ہوگیا، تو بیع تام ہوگئی، اور بائع کے ذمے مبیع، اور مشتری کے ذمے رقم کی ادائیگی واجب ہوگی، اور دونوں میں سے کسی کو بھی یک طرفہ بیع فسخ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، اور جب بیع ہوگئی، تو مشتری کے لیے اس کا آگے بیچنا بھی جائز ہوگیا، اب اگر مشتری رقم ادا نہ کرے، تو بائع کو اختیار ہوگا کہ وہ جس طرح بھی رقم حاصل کر سکے کر لے، خواہ زمین کو اپنے قبضے میں لے کر یا کسی اور کے ہاتھ بیچ کر اپنی رقم وصول کرے، یا کسی اور طریقے سے دباؤ بنا کر وصول کر لے۔

وفي الهندية: و إذا حصل الإيجابُ و القبولُ لزم البيعُ، فلا خيار لواحدٍ منهما؛ إلا من عيبٍ أوعدم رُؤيةٍ. (الفتاوى الهندية: ۹/۳، ط: مكتبة زكريا، قديم)

وفيه أيضاً: وإن كان مُؤجَّلاً فليس للبائع أن يحبس المبيع قبل حلُول الأجل، ولا بعده. (الفتاوى الهندية: ۱۵/۳، ط: مكتبة زكريا، قديم)

و من أحكام البيع المُؤجَّل والمقسط أنّ التَّأجيل حقٌّ للمُشتري، فلا يحقُّ للبائع أن يُطالب بالثَّمن قبل حلُول الأجل، ولا يحقُّ أن يحبس المبيع من أجل استيفاء الثَّمن.

(فقه البيوع: ۵۳۹/۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۹ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۵۱/د، ۳۶/د، ۱۴۳۸ھ)

تجارت میں جھوٹ بولنا اور باسی کو تازہ بتا کر فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال: (۱) کیا جھوٹ بول کر تجارت کرنا حرام ہے؟

(۲) اگر میری دکان پر کوئی گاہک آکر یوں کہے کہ فلاں سامان اگر تازہ ہے، تو مجھے دو، اور میں اُسے باسی سامان یہ کہہ کر دوں کہ ہاں! یہ تازہ ہے؛ اگرچہ وہ سامان خراب نہ تھا، تو کیا اس طرح کی کمائی حرام ہوگی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جی ہاں! تجارت میں جھوٹ بولنا اور دھوکا دینا حرام ہے، احادیث میں جھوٹ بولنے اور دھوکا دہی پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

عن ابن عُمر رضي اللّٰه عنهما أن النَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم قال: إذا كذب العبدُ تباعد عنه الملَكُ ميلاً؛ من نتن ما جاء به إلخ. (سنن الترمذي، رقم: ١٩٧٢)

عن عبد اللّٰه بن مسعُود رضي اللّٰه عنه قال: قال رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: إيّاكُم والكِذب؛ فإنّ الكِذب يهدي إلى الفُجور، وإنّ الفُجور يهدي إلى النّار، وما يزال الرَّجُل يكذِبُ ويتحرَّى الكذب، حتى يُكتَب عند اللّٰه كذَّابًا. (الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة، باب قُبح الكذب وحسن الصدق وفضله: ٣٣٦/٢، رقم: ٢٦٠٧، ط: بيت الأفكار الدولية، سنن الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في الصدق والكذب: ٨/٢)

عن أبي هُريرة رضي اللّٰه عنه أنّ رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم مرَّ على صبرةٍ من طعام، فأدخل يده فيها، فنالت أصابعه بللاً، فقال: يا صاحب الطَّعام! ما هٰذا؟ قال: أصابته الماءُ يا رسُول اللّٰه! قال: أ فلا جعلته فوق الطَّعام حتّٰى يراه النَّاس، ثُمَّ قال: من غشَّ فليس مِنَّا. (سنن الترمذي، أبواب البيوع، باب ما جاء في كراهية الغش في البيوع: ٤٥/١، رقم: ١٣١٥)

عن ابن عُمر رضي اللّٰه عنهما قال: سمعتُ رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يقُول: إنّ الغادر ينصب له لواءٌ يوم القيامة. (سنن الترمذي، أبواب السير، باب ما جاء أن لكل غادر لواءً يوم القيامة: ٢٨٧/١، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

(۲) باسی سامان کو تازہ بتا کر فروخت کرنا ناجائز ہے، اس میں جھوٹ اور دھوکا دہی دونوں ہیں؛ البتہ تازہ اور باسی میں مالیت کا کوئی فرق نہ ہو، تو آمدنی حرام نہیں کہلائے گی؛ کیوں کہ یہاں محض جھوٹ اور دھوکا دہی پائی گئی، مالی نقصان نہیں ہوا، اور اگر دونوں میں مالیت کا فرق ہو، تو بہ قدرِ فرق پیسہ ناجائز ہوگا، جیسے: تازہ مال سو روپے میں فروخت ہوتا ہے، اور باسی ۹۰/روپے میں، تو دس روپے ناجائز ہوں گے۔

لأنّ الوصف المرغُوب بمنزلة جُزءٍ من المبيع، فيقابلُه جُزءٌ من الثّمن حيثُ كان الوصفُ مشرُوطاً، فإذا فات يسقُط ما يُقابلُه، كخيار العيب، وليس في التَّغرير شيءٌ

من ذلك؛ بل هو مُجرَّد خيار لا يقابلُه شيءٌ من الثَّمن، مثل خيار الخيانة في المرابحة .
(رد المحتار، كتاب البيوع، باب خيار الشرط: ۷/ ۱۳۳، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۶/۴ھ = ۲۰۱۷/۳/۴ء، شنبہ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ
(۵۱۷/ن، ۵۶۳/ن، ۱۴۳۸ھ)

گاہک بڑھانے کے لیے دکان میں ٹی وی چلانا کیسا ہے؟

سوال: چائے کی دکان میں ٹی وی چلاکر چائے بیچنا؛ تاکہ لوگ زیادہ آئیں، ایسا کرنا کیسا ہے؟ اور اس کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: ٹی وی چلاکر چائے بیچنا، تو جائز نہیں ہے؛ البتہ اس کی وجہ سے چائے وغیرہ کی جو قیمت وصول کی گئی ہو، وہ ناجائز نہ کہلائے گی؛ بل کہ وہ حلال رہے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۶/۲۳ھ، پنج شنبہ
الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ
(۲۵/تتمہ/س، ۶۹۲/س، ۱۴۳۸ھ)

غیر مسلم علاقے میں گاہک بڑھانے کے لیے دکان میں شراب رکھنا اور اُسے فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال: میرا نام جنید ہے، اور میں امریکہ میں رہتا ہوں، میری پنساری کی دکان ہے، میرے سارے گاہک غیر مسلم ہیں، وہ شراب مانگتے ہیں، شراب نہ ہونے کی وجہ سے میرے بزنس پر اثر پڑ رہا ہے، تو کیا میرے لیے اپنے اسٹور میں شراب رکھنا جائز ہے؟ بہ راہِ کرم جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق: مذہبِ اسلام میں شراب حرام و ناجائز ہے، مسلمان کے لیے

اس کا بیچنا یا خریدنا بھی حرام ہے؛ اگر چہ سامنے والا شخص؛ خرید نے والا یا بیچنے والا غیر مسلم ہو؛ اس لیے آپ اپنے اسٹور میں شراب نہیں رکھ سکتے، آپ صرف جائز چیزیں ہی بیچیں؛ اگر چہ اس میں نفع کم ہو، یا گاہک کچھ کم ہو جائیں، اسی میں ان شاء اللہ برکت ہوگی، حرام مال بہ ہر حال گندا ہوتا ہے؛ اگر چہ زیادہ ہو، اللہ تعالی آپ کے کاروبار میں برکت فرمائیں۔

قال اللّٰـه تعالی: ﴿قُل لَایَستَوِي الخَبِیثُ وَالطَّیِّبُ وَلَو أَعجَبَكَ كَثرَةُ الخَبِیثِ﴾ **الآیة.** (سورة المائدة، رقم الآیة: ۱۰۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۶/۴/۱۴۳۸ھ = ۱۵/۱/۲۰۱۷ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۸۱/ن، ۲۸۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

ڈائمنڈ کا بزنس کرنا کیسا ہے؟

سوال: (۱) میرا سوال ڈائمنڈ کے بزنس کے بارے میں ہے، کیا اس کی تجارت کرنا حلال ہے؟ اس کا مطلب اس کو مسلم یا غیر مسلم کے ذریعے کچے ڈائمنڈ کو خریدنا یا خریدنے میں مدد کرنا، پھر اُس کی پولشنگ کر کے اُس کو انٹرنیشنل مارکیٹ یا کسی مقامی خریدار کو فروخت کرنا درست ہے؟

(۲) کیا غیر مسلموں کے ذریعے جیسے: کسی ہندو یا یہودی کمپنی جیسے: دی بیئرس (the beers) (لندن، ساؤتھ افریقہ اور بیلجیم (انٹروپ) یا کسی دوسرے ہندو کمپنی کے ذریعے سے، جیسا کہ گجرات (سورت) میں ڈائمنڈ پولشنگ کی فرم ہیں، کچا ڈائمنڈ خریدنا، اور اس کو پولش کر کے بیچنا جائز ہے؛ کیوں کہ یہی دونوں قومیں زیادہ تر ڈائمنڈ کا بزنس کر رہی ہیں؟ بہ راہِ کرم جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: (۱،۲) ڈائمنڈ کی تجارت؛ یعنی: اُس کی خرید وفروخت جائز ہے، غیر مسلم سے بھی خرید کر بیچنا جائز ہے، اور جھوٹ اور دھوکا دہی سے احتراز لازم ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۶/ذی قعدہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۳۳۵/م، ۱۳۵۶/م، ۱۴۳۸ھ)

فلٹر پانی کا کاروبار کرنا کیسا ہے؟

سوال: آج کے آلودہ ماحول میں لوگ فلٹر پانی استعمال کرتے ہیں، اس طرح پانی کا فلٹر کر کے بیچنا، فلٹر کرنے کے لیے مشین اور دیگر چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، جس میں تین چار لاکھ کا خرچ آتا ہے، اور پھر اسی پانی کا برف بنا کر بیچا جاتا ہے، بوتل بند پانی یا آر و (فلٹر) پانی کو بیچنا کیسا ہے؟ اس کی پوری معلومات شریعت کی روشنی میں عنایت فرمائیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: پانی اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے، جسے ہر شخص بلا روک ٹوک استعمال کرسکتا ہے؛ لیکن جب کوئی شخص پانی کی خاص مقدار؛ کسی ذریعے سے حاصل کر کے اپنی تحویل میں لے لیتا ہے، اپنے خاص برتن میں اسٹاک کرلیتا ہے، تو وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس کے لینے سے دوسرے کو روک بھی سکتا ہے، اور دوسرے کے ہاتھ مناسب دام میں فروخت بھی کرسکتا ہے۔

صورتِ مسئولہ میں پانی صرف اسٹور ہی نہیں کیا جاتا؛ بل کہ مشین کے ذریعے اُسے فلٹر کر کے بوتلوں میں اُسے پیک بھی کیا جاتا ہے، پھر اُسے بازار اور ضرورت کی جگہوں میں پہنچایا بھی جاتا ہے، ان سب چیزوں پر آنے والے اخراجات مع مناسب منفعت شامل کر کے؛ اس طرح کے پانی کا بیچنا جائز ہے، کسی قسم کی کراہت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۱۶ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۷۰/د، ۵۷۷/د، ۱۴۳۸ھ)

گٹکھا بنانا، کھانا اور اس کی خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال: آج کل گٹکھا پیکنگ میں آتا ہے، جیسے: (پان پراگ اور راجنی گندھا) وغیرہ، اس طرح کا گٹکھا بنانا کیسا ہے؟ اور اس کی خرید وفروخت کیسی ہے؟ اور اس کا کھانا کیسا ہے؟ اسی طرح وہ چلیا جس میں تمباکو نہ ہو، اُس کے متعلق مذکورہ صورتوں کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: اگر گٹکھا وغیرہ ایسا نہ ہو، جس کے کھانے سے نشہ ہوتا ہو، تو اس طرح گٹکھا بنانے، کھانے اور اس کے خرید وفروخت کی گنجایش ہے؛ البتہ احتیاط اولیٰ وبہتر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۵/۲۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۵۷/ل، ۷۶۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

کیکڑے اور جھینگے کی تجارت کا حکم

سوال: میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرے لیے کیکڑے، جھینگے کی تجارت (خرید وفروخت) کرنا کیسا رہے گا؟ کیا یہ میرے لیے جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: کیکڑے اور جھینگے کی خرید وفروخت میں مضائقہ نہیں۔

وكذلك يجُوز بيعُ الحيَّات؛ لاستخدامها في الأدوية، وبيعُ الفِيل وكلُّ حيوان يُنتفع بجلده أو عظمه، كما ذكره الحصكفيُّ في الدُّر المُختار، ثُمَّ قال: و الحاصل أن جواز البيع يدُور مع حلّ الانتفاع، وقال ابنُ عابدين – رحمه اللّٰه تعالى – : ونقل السَّائحاني عن الهندية: ويجُوز بيعُ سائر الحيوانات سوى الخنزير، و هو المُختار، وعليه مشى في الهندية وغيرها من باب المُتفرقات. (فقه البيوع: ۱/ ۲۹۰)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۳/۲۱ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۹۸/ل، ۳۹۱/ل، ۱۴۳۸ھ)

دودھیا اور بھینس والے کے درمیان ہونے والے معاہدے کی چند شکلیں اور ان کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں دودھیا؛ جو بھینس والے سے دودھ لیتا ہے، اور ڈیری پر جا کر فروخت کرتا ہے:

(۱) بھینس والے اُس سے بھینس کے دودھ پر کچھ رقم پہلے لے لیتے ہیں۔

(۲) یا وہ اُنھیں بھینس دلا دیتا ہے، اس شرط پر کہ دودھ اُنھی کے ہاتھ فروخت کرنا ہوگا، پھر وہ اُن سے من مانے دام پر دودھ خریدتا ہے، اور اُنھیں مجبوراً اسی کے ہاتھ دودھ فروخت کرنا ہوتا ہے۔

(۳) تو دودھیا کا دودھ خریدنا۔

(۴) اور بھینس والے کا اسی کے ہاتھ فروخت کرنا، اور اس سے پیسے لینا یہ جائز ہے یا نہیں؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) صورتِ مسئولہ میں بھینس والے کا؛ دودھیا سے بھینس کے دودھ پر کچھ رقم پہلے لے لینا؛ فقہاء نے اس کو مکروہ لکھا ہے۔ (امدادالفتاویٰ: ۲۰/۳)

(۲) دودھیا کا بھینس والے کو بھینس دلانا؛ اس شرط پر کہ دودھ اسی کے ہاتھ فروخت کرنا ہوگا من مانے دام پر، تو یہ ناجائز ہے؛ کیوں کہ اگر دودھیا بھینس والے کو بھینس دلاتا ہے بہ طور قرض، تو یہ قرض سے منفعت حاصل کرنا ہے، جو کہ حدیثِ پاک: **كُلُّ قرضٍ جَرَّ منفعةً فهو وجهٌ من وجُوه الرِّبا.** (بيهقي: ۱٦٩/۸، إعلاء السنن: ٤٩٨/١٤) کے تحت داخل ہے اور شبہۂ ربا سے خالی نہیں ہے، اسی طرح بھینس والے کو دودھ اس کے ہاتھ فروخت کرنے پر مجبور کرنا، اور دودھیا کا من مانے دام پر خریدنا، یہ بھینس والے پر ظلم ہے۔

(۳) دودھیا کا دودھ خریدنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں بھی قرض سے منفعت حاصل کرنا پایا جاتا ہے۔

(۴) بھینس والے کا دودھیا کے ہاتھ دودھ فروخت کرنا، اور پیسہ لینا بہ ہرصورت جائز ہے۔
فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۸ھ
الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ۔محمد مصعب عفی عنہ
(۱۳۱/د، ۱۷۷/د، ۱۴۳۸ھ)

انجکشن کے ذریعے بھینس کا دودھ نکال کر اس کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: صورتِ مسئولہ یہ ہے کہ بھینس جب گابھن ہوتی ہے، تو بچہ جننے سے کچھ دن پہلے دودھ دینا بند کردیتی ہے، تو لوگ انجکشن کے ذریعے اُس سے دودھ نکالتے ہیں، اور بعض بھینس ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بغیر کسی عذر کے بھی دودھ دینا چھوڑ دیتی ہیں، تو پھر مجبوراً انجکشن کے ذریعے دودھ نکالا جاتا ہے، یہ صورت جائز ہے کہ نہیں؟ نیز اس دودھ کو لینا، فروخت کرنا، اور دیگر اشیاء میں استعمال کرنا کیسا ہے؟ جواب مرحمت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: انجکشن کے ذریعے دودھ نکالنا تو غیر معتاد طریقہ ہے؛ اس لیے اس سے بچنا چاہیے، تاہم اگر دودھ تھن سے ہی نکالا جاتا ہے، تو اس کا استعمال اور خرید وفروخت ناجائز نہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۹/صفر/۱۴۳۸ھ
الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری
(۱۹۴/م، ۲۰۱/م، ۱۴۳۸ھ)

عقدِ مزارعہ کی ایک فاسد شکل

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

خالد زمین کا مالک ہے، اس نے زید کے ساتھ مل کر یہ معاملہ طے کیا کہ میں پورا خرچ لگاؤں گا، اور تم دیکھ بھال کے ساتھ تھوڑا کام بھی کروگے، تو آپ کے لیے کھیتی میں سے ۲۰/فی صد ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا زید پورے مال کے ۲۰/ فی صد کا حق دار ہوگا، یا صرف نفع کے ۲۰/ فی صد کا، جب کہ زید کہتا ہے کہ مجھے پورے مال کا ۲۰/ فی صد ملنا چاہیے، تمھیں نفع ہو یا نہ ہو؛ مجھے اس سے کوئی لین دین نہیں، حالاں کہ اس صورت میں اصل مال (رأس المال) سے بہت سا روپیہ دینا لازم آئے گا، اور نہ دینے پر زید خالد کو حرام خور کہتا ہے، نیز ابتدا میں کوئی اس طرح کی بات طے نہیں ہوئی تھی کہ زید کا حصہ؛ پورے مال سے ہوگا، یا صرف نفع سے، جب کہ خالد جو زمین کا مالک ہے، اس نے کل نفع ۱۲/ ہزار میں سے پانچ ہزار روپے جو کہ نفع کا ۴۲/ فی صد ہے، زید کو دے دیا؛ لیکن اس کے باوجود وہ اس پر راضی نہیں ہے، اور مالک کو حرام خور کہتا ہے، بہ راہِ کرم جواب عنایت فرمائیں کہ اس مسئلے میں حکم شرعی کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: سوال نامے میں مذکور معاملہ فاسد ہے؛ کیوں کہ اگر اس کو عقدِ مزارعت مانیں؛ یعنی: خالد نے زید کو اپنی زمین؛ کھیتی کے لیے دی تھی، تو چوں کہ عقدِ مزارعت میں ہل وغیرہ کام کرنے والے کے ذمے ہوتا ہے، جب کہ صورتِ مسئولہ میں یہ خالد؛ یعنی: مالکِ زمین کے ذمے میں ہے؛ اس لیے یہ معاملہ فاسد ہے، اور اگر اس کو عقدِ اجارہ مانیں، یعنی: خالد نے زید کو کھیتی کی دیکھ ریکھ کرنے کے لیے اجیر بنایا تھا، تو بھی فاسد ہے؛ کیوں کہ جو پیداوار زید کو بہ طور اجرت دی جا رہی ہے، وہ اُسی کی محنت سے حاصل ہوئی ہے، اور ایسی چیز کو بہ طور اجرت کسی کو دینا جائز نہیں ہے، جو اسی کی محنت سے حاصل ہوئی ہو، یہ مسئلہ قفیز طحان کہلاتا ہے؛ حدیث میں جس سے ممانعت آئی ہے، نیز اجیر زید کی اجرت مجہول ہے؛ اس لیے بہ ہر صورت خالد پر زید کے لیے اجرتِ مثل؛ یعنی: ان دنوں میں جتنا کام کیا ہے، اس کی جتنی اجرت عرف میں بنتی ہے، اتنی اجرت لازم ہے۔

وبَطلت في أربعة أوجُهٍ: لو كان الأرضُ والبقرُ لزيدٍ والآخران للآخر. (رد المحتار: ۹/ ۴۰۲، ط: مکتبۃ زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۵/۲۵ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۳۹۰/د، ۴۸۳/د، ۱۴۳۸ھ)

عورت کے ٹوٹے یا کٹے ہوئے بالوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: گاؤں، دیہات میں عورت کے ٹوٹے ہوئے بال یا کٹے ہوئے بالوں کے بدلے؛ بچے اور عورتیں چورن اور امرود وغیرہ خریدتی ہیں، کیا یہ درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: انسانی بالوں کی خرید وفروخت حرام ہے؛ اس لیے عورت کے ٹوٹے ہوئے یا کٹے ہوئے بالوں کے عوض بچے اور عورتیں جو امرود وغیرہ خریدتی ہیں، یہ ہرگز جائز نہیں؛ بل کہ عورت کے بال کسی ایسی جگہ ڈالنا بھی درست نہیں، جہاں کسی اجنبی مرد کی نظر پڑے۔

(بطل بيعُ) .... (شعر الإنسان)؛ لكرامة الآدميِّ إلخ. (الدّرالمختار مع ردّالمحتار، كتاب البيوع، باب البيع الفاسد: ۷/ ۲٤٤– ۲٤٥، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۱٤/ ٥٦۲–٥٦۳، ت: الفرفور، ط: دمشق)

(وكلُّ عُضوٍ لايجُوز النَّظرُ إليه قبل الانفصال لايجُوز بعده) ولو بعد الموت، كشعر عانة وشعر رأسها إلخ. (المصدر السابق، كتاب الحظر والإباحة، فصل في النظر والمس: ۹/ ٥۳٤) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲/۶/۱۴۳۸ھ = ۲/۳/۲۰۱۷ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری-محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

تعلیمی مقاصد کے لیے انسانی لاشوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: میں میڈیکل کا طالب علم ہوں، ہر میڈیکل طالب علم کو تعلیمی مقاصد کے لیے انسانی لاش کی ضرورت پڑتی ہے؛ اس لیے میں نے تین سال پہلے ایک انسانی لاش خریدی تھی ۶۵۰۰/ ٹاکا میں، اب مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے؛ لہٰذا میں اپنے کالج کے دوسرے طالب علم کو، اس کو ۷۰۰۰/ میں بیچ دوں، تو کیا میں اس رقم کو اپنے لیے استعمال کرسکتا ہوں یا نہیں؟ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: انسانی لاش کا کوئی مالک نہیں ہوسکتا؛

اس لیے اُس کا بیچنا اور خریدنا ناجائز وحرام ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں لاش کے بدلے ملی ہوئی رقم کا استعمال آپ کے لیے جائز نہیں ہے، آپ اس رقم کو مشتری کو واپس کرکے لاش وصول کرلیں، پھر جس سے آپ نے لاش خریدی تھی، لاش اس کے حوالے کرکے اپنی رقم واپس لے لیں، اگر یہ صورت ممکن نہ ہو، تو لاش ورثہ کے حوالے کردیں، اور ورثہ کا علم نہ ہو، تو اس کو دفنا دیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۴ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۴۲/ص،۸۲/ص، ۱۴۳۸)

کتے کی خرید وفروخت اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ کتے کا ایک بچہ؛ جس کی عمر بیس دن تھی، ہم نے شوق میں پالنے کے لیے تین ہزار روپے میں خریدا تھا، اب اس کو فروخت کرنا چاہتے ہیں، جب کہ اس کی عمر چھ مہینے کی ہوگئی ہے، اب اُس کو فروخت کرکے جو رقم آئے گی، ہمارے لیے وہ جائز ہے یا نہیں؟ اور ہماری جو اصل رقم ہے، اس کو استعمال کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اور نفع سے فروخت ہو جائے، تو نفع کی رقم کا کیا جواز ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: مذکورہ صورت میں کتے کو بیچنا، اسی طرح بیچنے سے جو نفع حاصل ہو، اس رقم کو استعمال کرنا جائز ہے؛ البتہ کتے کی خرید وفروخت مناسب نہیں ہے۔

قال العلامة الحصكفي: وصحَّ بيعُ الكلب ولو عقُورًا والفَهد والفِيل والقِرد والسِّباع بسائر أنواعها حتّٰى الهِرَّة. (شامي: ٤٧٨/٧، كتاب البيوع، باب المتفرقات، ط: زكريا)

وفي المرقاة: وهو محمُولٌ عندنا على ما كان في زمنه صلّى اللّٰه عليه وسلّم حين أمر بقتله، وكان الإنتفاعُ به يومئذ مُحرَّماً، ثُمَّ رخّص في الإنتفاع به، حتى روي أنَّه قضىٰ في كلب صيدٍ قتلَه رجلٌ بأربعين درهماً، وقضى في كلب ماشية بكبشٍ.

(حاشية جامع الترمذي: ٢٤١/١، كتاب البيوع، ط: دار الكتاب)

وفي البحر الرَّائق: وصحَّ بيعُ الكلب والفَهد والسِّباع والطُّيور؛ لما رواه أبو حنيفة رحمة اللّٰه عليه أنَّه صلّى اللّٰه عليه وسلّم رخّص في ثمن كلب الصَّيد؛ ولأنَّه مالٌ متقوّمٌ آلة الإصطياد فصحَّ بيعُه كالبازي؛ بدليل أن الشَّافعي أباح الإنتفاع به حراسةً واصطياداً فكذا بيعاً، وهذا على القول المفتىٰ به من طهارة عينه، بخلاف الخنزير؛ فإنَّه نجسُ العين. (البحر الرائق: ٢٨٦/٦، كتاب البيوع، باب المتفرقات، ط:زكريا)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۱۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۲/ل، ۴۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

تصویر والی چیزوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

میں جان دار شکل کی چیزوں کی تجارت کرتا ہوں، جیسے: گڑیا، مورتی، مچھلی، شیر، کتا، بلی وغیرہ، دوسری ریاست سے تجارت کے لیے مال لاتا ہوں، اور اُسے یہاں فروخت کرتا ہوں، کیا ایسی چیزوں کی تجارت جائز ہے یا ناجائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: بچوں کی گڑیوں کی تجارت، جس میں تصویر ہی اصل مقصود ہو؛ مکروہِ تحریمی وناجائز ہے۔

اشترى ثوراً أو فرساً من خزف؛ لأجل استيناس الصَّبي لا يصحُّ، ولا قيمة له، فلا يضمنُ مُتلفٌ، وقيل بخلافه: يصحُّ ويضمنُ .... (الدر المختار: ٤٧٨/٧)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۲۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۳۸/ل، ۴۱۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

بچوں کے لیے تصویر والے کھلونے خریدنا ناجائز ہے

سوال: کیا ہم بچوں کے لیے کھلونے؛ جیسے: ٹیڈی بیئر (teddy bear) اور جانوروں کی شکل کی؛ شکل وصورت والے کھلونے وغیرہ خرید سکتے ہیں؟ بہ راہِ کرم بتائیں کہ کیا میں اس قسم کے کھلونے خرید سکتا ہوں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: بچوں کے لیے ایسے کھلونے خریدنا، جس میں تصویریں موجود ہوں؛ مکروہِ تحریمی و ناجائز ہے، اس طرح کے کھلونے کا خریدنا جائز نہیں۔

وكذا بطل مع مال مُتقوّم كالخمر والخنزير، ويدخُل فيه فرسٌ أو ثورٌ من خزف؛ لاستيناس الصَّبي؛ لأنَّه لا قيمة له ولا يضمنُ مُتلفُه. (الدّر المنتقى: ۲/ ٥٤)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۰۸۷/ل، ۱۴۱۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

انعامی پرچیوں والے لفافے کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: کیا ایک دکان دار کچھ بچوں کے پیپر وغیرہ لے کر اور لفافے بنا کر، اس میں کھلونے اور مختلف قسم کی بچوں کے کھانے، اور استعمال میں آنے والی اشیاء کی پرچیاں ڈال کر اگر لفافے تیار کرے، اور اس پر انعامی پرچیاں یا انعامی لاٹری لکھ کر بیچے، تو کیا یہ کاروبار کرنا شرعی لحاظ سے جائز ہے یا ناجائز؟ (اس میں کسی بھی بچے کو خالی پرچیاں نہیں ملتیں، ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے) برائے مہربانی راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر مقصود لفافے کی خرید وفروخت ہو، تو مضائقہ نہیں،

جائز ہے؛ لیکن اگر مقصود محض انعام کا حصول ہو، تو اس میں احتمال اس کا ہوسکتا ہے کہ کچھ بھی نہ نکلے؛ ایسی صورت میں یہ معاملہ لاٹری میں داخل ہوکر ناجائز ہوگا، اس لیے انعامی پرچیوں والے لفافے کی خرید وفروخت سے احتراز کیا جائے۔ **الأمور بمقاصدها** (الأشباه)

القِمارُ من القمر الذي يزدَادُ تارةً وينقُص أخرىٰ وسُمِّي القِمارُ قماراً؛ لأنّ كلَّ واحدٍ من المُقامرين ممَّن يجُوز أن يذهب ماله إلى صاحبه ويجُوز أن يستفيد مال صاحبه وهو حرامٌ بالنَّص. (شامي) (کتاب النوازل، ۱۱/۴۳۲) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۹/ربیع الثانی/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۶۰۳/م، ۴۲۸/م، ۱۴۳۸ھ)

راکھی بیچنا کیسا ہے؟

سوال: ایک مسلمان شخص ہندو کے تیوہار رکشابندھن میں راکھی بیچتا ہے، تو کیا اس کی فروخت جائز ہے؟ اور اس کی کمائی جائز ہے؟ اور اگر ناجائز ہے، اور اسے پتا نہیں تھا کہ بیچنا کیسا ہے، اور وہ سامان لا چکا ہے، اور اب واپس بھی نہیں ہوگا، تو ایسی صورت میں کیا کرے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: راکھی میں جو چیز لگائی جاتی ہے، چوں کہ وہ فی نفسہ نجس اور حرام نہیں ہوتی؛ اس لیے اس کی بیع اور آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا، تاہم بہتر یہی ہے کہ مسلمان ایسی چیزوں کے فروخت کرنے سے اجتناب کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۱۷ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی

(۱۱۷۶/ص، ۱۲۶۸/ص، ۱۴۳۸ھ)

گیم ڈیولپمنٹ (گیم بنانے) کا کاروبار کرنا کیسا ہے؟

سوال: میں ایک موبائل گیم ڈیولپر ہوں، گیم ڈیولپمنٹ کی فیلڈ اِن ہے، بہت سے لوگ

اس فیلڈ سے وابستہ ہیں، جو گیمز بنتی ہیں اس میں کسی قسم کی فحاشی نہیں ہوتی، گیم میں میوزک ہوتا ہے، ہم جو گیمز بناتے ہیں، اس میں کسی قسم کی کوئی شرط اور جوا بھی نہیں ہوتا، اس گیم میں اشتہار لگائے جاتے ہیں، جو گوگل دیتا ہے، ہم ان اشتہاروں سے پیسے کماتے ہیں، اصل پیسے اشتہاروں سے آتے ہیں، مجھے پوچھنا تھا کہ اسلام میں گیم بنانا جائز ہے یا نہیں؟ براہِ مہربانی قرآن و حدیث کا حوالہ دیجیے گا؛ تاکہ میں اور اپنے بھائیوں کو بھی بتا سکوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: اسلام لہو ولعب اور اس طرح کی چیزوں کی اجازت نہیں دیتا، جو تضییع اوقات کا باعث ہوں۔ **من حُسن إسلام المرأ تركُه مالا يعنيه.** (اسلام کی خوبی میں سے لایعنی باتوں کا ترک کرنا ہے)، نیز اگر اس میں میوزک ڈالا جاتا ہو، تو یہ ایک مستقل ناجائز کام ہے، جس کی مذمت بہت سی احادیث میں آئی ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۹/۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۲۵۵/ل، ۱۳۰۱/ل، ۱۴۳۸ھ)

آن لائن گیمز کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتی صاحبان اس مسئلے کے بارے میں:

آج کل آن لائن گیمز کا بہت زیادہ شوق لگا ہوا ہے، اور ان کی خرید وفروخت بھی زوروں پر ہو رہی ہے، کچھ گیمز کی آئی ڈیز بکتی ہیں، تو کچھ کے کوائنس یا پوائنٹس یا نمبر، مثال کے طور پر: ایک گیم ہے ''کلیش آف کلیم''، اس کی آئی ڈی یا یوزر ایک لاکھ تک بک رہا ہے، اس گیم کی ٹاپ لیول تک پہنچنے کے لیے، یا اس گیم کا جو مکمل ٹول مہیا کیا گیا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے ڈیڑھ سے ایک سال تک مدت درکار ہوتی ہے، تب یہ ایک لاکھ تک فروخت ہوتی ہے، اگر اس کا لیول کم ہے، تو اس کے حساب سے رقم ہوگی، اسی طرح ایک اور گیم ہے ''۸/ بال پول''، یہاں پر بھی کچھ اسی طرح ہے، یہاں یوزر کی فروخت ۱۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰ ہزار تک ہے، پر یہاں مدت کم ہے، چھ سے آٹھ ماہ تک، یہاں پر کچھ یوں بھی

ہوتا ہے کہ بھروسے والے بندے سے کہا گیا کہ یہ میرا یوزر ہے، اس گیم میں مجھے کوائنس بڑھا کر دو، میں آپ کو اتنے پیسے دوں گا۔

اب آپ بتائیں کہ ان کی خرید وفروخت یا کوائنس بڑھا کر دینا جائز ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: آن لائن گیمز میں ضیاعِ وقت اور ضیاعِ مال دونوں ہوتا ہے، نیز اگر تصاویر کے ساتھ گیمز تیار کیے جارہے ہوں، تو یہ مستقل ایک ناجائز امر ہے، بہ ایں وجوہ ان کی خرید وفروخت یا کوائنس بڑھا کر دینا جائز نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۹/۱/۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۵۱۸/ل، ۱۵۰۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

آن لائن شیئرز کاروبار کا حکم

سوال: آن لائن شیئرز کاروبار کا کیا حکم ہے؟ اگر جائز ہے، تو کن کن صورتوں کے ساتھ؟ تفصیل سے جواب دیجیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: شیئرز کی خرید وفروخت مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ جائز ہے:

(۱) شیئرز ایسی کمپنی کے ہوں جو حرام کاروبار میں ملوث نہ ہوں۔

(۲) اس کمپنی کے پاس منجمد اثاثے بھی ہوں، محض نقدی شکل میں روپے نہ ہوں۔

(۳) اگر اس کمپنی کا حرام کاروبار میں ملوث ہونا؛ شیئرز خریدنے کے بعد معلوم ہو، تو اس کی سالانہ میٹنگ میں اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔

(۴) نفع کا جتنا حصہ حرام کاروبار کے نتیجے میں حاصل ہو، اس کو بلانیتِ ثواب؛ فقراء، مساکین وغیرہ پر صدقہ کردیا جائے۔

(۵) محض نفع نقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود نہ ہو؛ کیوں کہ یہ سٹے بازی کی شکل ہے، جو حرام ہے۔

(۶) اگر شیئرز کو آگے فروخت کرنا ہو، تو شیئرز پر قبضہ؛ یعنی: رسک (ضمان) کی منتقلی کے بعد اس کو آگے فروخت کیا جائے، رسک کی منتقلی سے پہلے اس کو آگے فروخت کرنا؛ بیع قبل القبض کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۵/۲۱ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۸ ۷/ل، ۶۵ ۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

آن لائن یا آف لائن ٹور پیکج فروخت کرنے کا حکم

سوال: میں مسلمان ہوں، تو کیا میں آن لائن یا آف لائن؛ غیر مسلمین کے ٹور پیکج بیچ سکتا ہوں؟ جیسے: دیوی پیکج، ٹیمپل پیکج وغیرہ، اور کچھ اسلامی ٹور پیکج؛ جیسے: اجمیر زیارت پیکج، نظام الدین درگاہ وغیرہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: اگر غیر مسلموں کے مذہبی ٹور پیکج میں، ان کے مذہبی امور میں آپ کو شرکت نہ کرنا پڑے، اور محض سفر کرانا آپ کے ذمے ہو، تو آپ ایسے پیکج فروخت کر سکتے ہیں، خواہ آف لائن ہو یا آن لائن، اسی طرح اسلامی ٹور پیکج میں اگر بدعات اور شرکیہ کاموں میں شرکت نہ کرنا پڑے، صرف سفر کرانا آپ کے ذمے ہو، تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

وإنَّما المعصيةُ بفعل المُستأجر وهو مُختارٌ، فينقطعُ نسبتُه عنه. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره: ۹/۵۶۲، ط: زكريا، ديوبند) لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ گناہوں کی جگہوں میں ظلمات ہوتی ہیں، جن سے بچنا بہتر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱/۱۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۲ ۷/د، ۲ ۷/د، ۱۴۳۸ھ)

بینکنگ نظام سے متعلق سافٹ ویئر تیار کر کے ان کو بیچنے کا حکم

سوال: ہمارے پاس بزنس سے متعلق سافٹ ویئر ہیں، کیا ہم بینکوں کو اپنا سافٹ ویئر بیچ سکتے ہیں؟ اور اس میں مدد کر سکتے ہیں؟ سافٹ ویئر اور آن لائن چیٹ اپلی کیشن سافٹ ویئر میں ویب سائٹ دیکھنے والے بینک کے اسٹاف سے بات کر سکتے ہیں؟ اور مطلوبہ جان کاری یا وضاحت حاصل کر سکتے ہیں؟ نیز اس سافٹ ویئر سے برانچ والے بھی ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کا بنیادی نظام سودی لین دین کا ہوتا ہے، اور اسلام میں سودی لین دین حرام وناجائز ہے، احادیث میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں؛ اس لیے جو سافٹ ویئر خاص طور پر بینکنگ نظام میں استعمال ہوتے ہیں، اور اس میں سودی لین دین کا اندراج وغیرہ ہوتا ہے، ایسے سافٹ ویئرس تیار کرنا، اور اُنھیں فروخت کرنا سودی کام اور نظام میں تعاون کرنا ہے؛ اس لیے کسی مسلمان کے لیے ایسے سافٹ ویئر بنانا، اور اُنھیں فروخت کرنا جائز نہیں۔

عن جابر بن عبداللّٰه رضي اللّٰه عنهما قال: لعن رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم آكل الرِّبوا و مُؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواءٌ. (الصحيح لمسلم: ۲/۷۲، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند) **وقال اللّٰه تعالى: ﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالعُدوَان﴾** (سورة المائدة، رقم الآية: ۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۲ء، چہار شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۱۴/ن، ۴۹۳/ن، ۱۴۳۸ھ)

سافٹ ویئر یا کتابوں کے محفوظ حقوق کاپی کر کے بیچنے یا استعمال کرنے کا حکم

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ آج کل بہت سے لوگ مختلف قسم کے سافٹ ویئر (software) اصل کمپنی سے نہیں خرید تے؛ کیوں کہ وہ بہت مہنگے ہوا کرتے ہیں؛ بل کہ اُسے

copy یا crack کرکے اپنے استعمال میں لاتے ہیں؛ اگرچہ کمپنی کی طرف سے اس طرح copy یا crack کرنے پر ممانعت جاری ہے، جیسے: ہم اپنی کمپنی میں windows 7 کا cd install کرتے ہیں؛ لیکن میرے علم کے مطابق بنگلا دیش کا دینی اور غیر دینی کوئی بھی ادارہ microsoft company سے وہ software نہیں خریدتا؛ مہنگا ہونے کی وجہ سے؛ بل کہ بازار سے وہ copy شدہ cd صرف ۵۰ ٹاکا سے خرید کر install کر لیتے ہیں، پھر اُن copy کرنے والوں میں سے بعض تو خود copy کردہ cd فروخت کرکے پیسہ کماتے ہیں، اور بعض copy کردہ cd خرید کر، یا تو اور سے copy کرکے اس سے ذریعۂ معاش کا انتظام کر رہے ہیں، جیسے: adobe photoshop اور adobe illustrator cs6 software کے ذریعے logo flayer وغیرہ تیار کرکے بہ طور freelancer (خود سے کاروبار کرنے والا) پیسہ کما رہے ہیں، اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ:

(۱) اس جیسے software (جس کی copy یا crack کرنا؛ اصل company کی طرف سے ممنوع ہے) کو بہ طور تجارت فروخت کرنا اور اُسے خریدنا، یا اس copy شدہ software سے اپنے لیے ذریعۂ معاش کا انتظام کرنا (جیسے: اس software سے logo وغیرہ تیار کرنا، اس سے پیسہ کمانا) جائز ہے یا نہیں؟ اور دونوں صورت میں کمائے ہوئے پیسے کا کیا حکم ہے؟ اور بازار سے اس copy شدہ software کو خریدنے کا کیا حکم ہے؟

(۲) اور ملک غریب ہونے کی وجہ سے یا تو original software خریدنے کی قدرت رکھنے یا نہ رکھنے کی وجہ سے کیا حکم میں کوئی فرق آئے گا؟ درآں حال یہ کہ software company کو معلوم ہے کہ غریب ملکوں کے لوگ اسے copy یا crack کر کے استعمال کرتے ہیں، پھر بھی company کسی action میں نہیں جاتی۔

(۳) اسی طرح بیرونی کتاب کو photocopy کرانا کیسا ہے؟ جس کے حقوق الطبع محفوظ ہیں، اور photocopy بھی ممنوع ہے، اکثر دینی ادارے ندرت یا مہنگی ہونے کی وجہ سے بہت سی کتاب photocopy کرکے اُس سے استفادہ کرتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ سوال کے تمام شق کے حل کی سخت ضرورت ہے، اور جواب مدلل ہونا مطلوب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱،۲) حقوقِ طبع یا حقوقِ ایجاد واختراع کے سلسلے میں علماء

کا اختلاف ہے؛ اکثر اکابر علمائے دیوبند (جیسے: حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ وغیرہ) ان حقوق کو شریعت کی نظر میں غیر معتبر قرار دیتے ہیں، یعنی: اگر کوئی شخص کسی کتاب کا مثل تیار کرتا ہے، تو اس میں شرعاً کوئی گناہ نہیں، اور دورِ حاضر میں بہت سے علماء ان حقوق کو شریعت کی نظر میں بھی معتبر قرار دیتے ہیں؛ لیکن ذاتی ضرورت کے لیے یا کسی کو بلا عوض ہبہ کرنے کے لیے سبھی علماء اس کا مثل تیار کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (دیکھیے: فقہ البیوع، ص: ۲۸۶، مطبوعہ: مکتبہ معارف القرآن، کراچی) اور کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ وغیرہ میں چلنے والے پروگرامس کے اصل سافٹ ویئر بہت مہنگے ہوتے ہیں، ہر شخص اصل سافٹ ویئر نہیں خرید سکتا، اور جو لوگ اصل سافٹ ویئر کا مثل تیار کر کے فروخت کرتے ہیں، ان پر عملی طور پر کمپنی کی طرف سے کوئی ایکشن بھی نہیں کیا جاتا، جو کسی درجے میں حکماً اجازت کی دلیل ہے، نیز اصل سافٹ ویئر اور اس کی نقل میں کارکردگی کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے، اور عام طور پر اصل سافٹ ویئر کی گارنٹی بھی ہوتی ہے؛ اس لیے کاپی شدہ سافٹ ویئرس کا ذاتی استعمال یا کاروبار کے لیے خریدنا یا اُنھیں فروخت کرنا شرعاً جائز ہے، اور کاروبار کی صورت میں حاصل ہونے والی آمدنی بھی جائز ہوگی، اس پر حرام ہونے کا حکم نہ ہوگا، اور اس مسئلے میں غریب اور مال دار ممالک سب کا حکم یک ساں ہے۔

(۳) دینی ادارے یا اہلِ علم حضرات جو دوسرے ملک کی چھپی ہوئی بعض اہم کتابیں ذاتی ضرورت کے لیے، یا مدرسے میں عام اساتذہ وطلبہ کے لیے فوٹو کاپی کراتے ہیں، اور ان سے استفادہ کرتے ہیں، تو اس میں تمام علماء کے نزدیک شرعاً کچھ حرج نہیں ہے، یہ بلا شبہ جائز ودرست ہے۔

أمَّا إذا صوَّره لاستعماله الشَّخصي أو ليهبه إلى بعض أصدقائه بدُون عوض، فإنّ ذلك ليس من التَّعدي على حقِّ الابتكار، فما توغل فيه نشرة الكُتب ومُنتجو برامج الكمبيُوتر من منع النَّاس من تصوير الكتاب أو قرص الكمبيُوتر أو جزء منه؛ لاستفادة شخصيَّة وليس للتِّجارة، فإنَّه لا مبرر له أصلاً. (فقه البيوع، ص: ٢٨٦، ط: مكتبة معارف القرآن، كراتشي) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۵ے/تتمہ/ن، ۰۷۴/ن، ۱۴۳۸ھ)

کمپنی کے ڈیزل کو بچا کر بیچ دینا اور رقم آپس میں بانٹ لینا کیسا ہے؟

سوال: میں شِپ (پانی کا جہاز) پر نوکری کرتا ہوں، اور شِپ کو چلانے کے لیے جو تیل (ڈیزل) ہمیں کمپنی دیتی ہے، اس میں سے ہم لوگ بچا لیتے ہیں، اور اس کو دوسرے کے ہاتھ بیچ کر آپس میں پیسہ بانٹ لیتے ہیں، اور یہ بات کمپنی کے مالک کو بھی پتا ہوتی ہے، اب بات یہ ہے کہ اگر میں بچے ہوئے تیل کا پیسہ نہ لوں، تو میری نوکری کا ڈر ہے کہ کہیں کیپٹن کو یہ شک نہ ہو کہ میں نے پیسہ نہیں لیا؛ اس لیے کہیں میں سمندر کی پولیس یا پورٹ کنٹرول یا کمپنی کے مالک کو نہ بتادوں، اس وجہ سے وہ مجھے نوکری سے نکال سکتا ہے، اور یہ چیز ہر جگہ ہوتی ہے، مطلب کمپنی کا تیل بچا کر بیچا جاتا ہے، اور اس کو سارے لوگ آپس میں بانٹ لیتے ہیں، اب مجھے یہ بتائیں کہ یہ پیسہ میرے لیے حرام ہوگا یا حلال؟ اور اگر میں یہ پیسہ نہیں لیتا ہوں، تو میری نوکری جانے کا بھی خطرہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللہ التوفیق: صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ طریقے پر تیل بچا کر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرنا؛ کمپنی کی نظر میں جرم ہو، تو یہ چوری کہلائے گی، اور اس سے حاصل شدہ رقم کا استعمال جائز نہیں ہوگا؛ لیکن اگر رقم نہ لینے کی صورت میں ملازمت کا خطرہ ہو، تو آپ رقم لے کر کسی ذریعے سے کمپنی کو واپس کردیں، اگر واپس کرنے کی صورت ممکن نہ ہو، تو غریب مسکین کو دے دیں، خود استعمال نہ کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۲/۲۹ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی

(۱۳۷۳/ص، ۱۴۴/ص، ۱۴۳۸ھ)

چوری چھپے یا رشوت دے کر ہندوستان کا سامان بنگلا دیش میں یا وہاں کا سامان یہاں بیچنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے جو لوگ سرحد کے قریب رہتے ہیں، اُن میں سے بہت سے لوگ چوری چھپے ہندوستان کا سامان بنگلا دیش میں،

اور بنگلا دیش کا سامان ہندوستان میں لاکر بیچتے ہیں، تو کیا اس چوری چھپے یا رشوت دے کر ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں لے جا کر خرید وفروخت کرسکتے ہیں؟ جب کہ ایسی صورت میں سرکار کو ٹیکس بھی نہیں دیا جارہا ہے، مذکورہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں ہے، تو جواز کی کوئی صورت ہو تو وہ ضرور بتائیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: جو لوگ ہندوستان کا سامان بنگلا دیش اور بنگلا دیش کا سامان ہندوستان لاکر بیچتے ہیں، اور یہ کام وہ چوری چھپے یا رشوت دے کر کرتے ہیں، تو اگر وہ جائز اشیاء کی خرید وفروخت کرتے ہیں، تو آمدنی پر حرام وناجائز کا حکم نہیں؛ لیکن قانون کی خلاف ورزی کر کے خود کو ہلاکت میں ڈالنا درست نہیں، اور رشوت دینا بھی صحیح نہیں۔

﴿وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ، الآية﴾ (البقرة: ۱۹۵) **لعن رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم الرَّاشِي والمُرتَشِي.** (الحديث) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفر لہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۹/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔محمود حسن غفر لہٗ بلند شہری

(۱۹۳/م، ۲۱۱/م، ۱۴۳۸ھ)

سرکاری اجازت کے بغیر سرکاری زمینوں کی خرید وفروخت کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ ذیل کے بارے میں:

مسئلہ یہ ہے کہ سرکار کی کچھ زمین شہروں کے ارد گرد ہوتی ہے، جس پر لوگ قبضہ کرتے ہیں، اور چند سالوں کے بعد سرکار؛ مقبوضین کے نام معمولی رقم لے کر کاغذات جاری کردیتی ہے، کاغذات سے قبل اُسی زمین کی بیع وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ حالاں کہ بہت سی مرتبہ لوگ زمین پر قبضہ کرلیتے ہیں، اور سرکار کی طرف سے وہ زمین؛ کسی متعین کام کے لیے مختص ہوتی ہے، تو قبضہ کرنے کے بعد بھی سرکار؛ کاغذات جاری نہیں کرتی، اور وہ زمین چھین لیتی ہے، اور اس طرح کی زمین کی بیع وفروخت عام طور پر رائج ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللہ التوفیق: جو زمینیں سرکار کی تحویل میں ہوتی ہیں، اُن کی خرید وفروخت سرکار کی اجازت کے بغیر شرعاً جائز نہیں ہے، صورتِ مسئولہ میں سرکاری زمینوں پر جولوگ قبضہ کرلیتے ہیں، اور قبضے کے بعد سرکار؛ معمولی رقم لے کر کاغذات دیتی ہے، اُن کاغذات سے اگر سرکار کی نظر میں مقبوضین مالک بن جاتے ہیں، اور اُن کو زمین میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہوجاتا ہے، وہ سرکاری قانون کے مطابق زمین فروخت بھی کرسکتے ہیں، تو ایسی زمین کا خریدنا یا فروخت کرنا جائز ہوگا، حاصل یہ ہے کہ سرکاری زمینوں کی خرید وفروخت میں سرکاری قانون کے مطابق ہی عمل کرنا شریعت کی رو سے جائز ہوگا، ایسی زمینوں کی خرید وفروخت سے پہلے کسی سمجھ دار وکیل سے قانون معلوم کرکے اُس کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۲۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- زین الاسلام قاسمی

(۴۳۷/تتمہ/ص، ۵۰۱/ص، ۱۴۳۸ھ)

انٹرڈے ٹریڈنگ کا شرعی حکم

سوال: کموڈیٹی ٹریڈنگ میں کیا انٹرڈے ٹریڈنگ (جیسے: ہم تیل، سونا، چاندی، دھات؛ صبح خریدیں، شام کو ضرور بیچ دیں) حلال ہے؟ مارکیٹ ریٹ کی بنیاد پر نفع ونقصان کا اعتبار ہوتا ہے، نیز لین دین حسی نہیں ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: کموڈیٹی ٹریڈنگ میں جو انٹرڈے ٹریڈنگ ہوتی ہے، اُس میں چوں کہ عام طور پر اشیاء کی خرید وفروخت؛ شرعی قبضے کے بغیر ہوتی ہے، نیز اس میں مبیع کا موجود ہونا، بائع کی ملکیت وقبضے میں ہونا، اور اس کا معلوم ومتعین وغیرہ ہونا ضروری نہیں ہوتا، جب کہ شریعتِ اسلامیہ کی رو سے تیل، سونا، چاندی وغیرہ کی خرید وفروخت میں ان سب چیزوں کی رعایت ضروری ہوتی ہے؛ اس لیے خرید وفروخت کا یہ طریقہ؛ شرعاً درست نہیں، اس میں سٹے بازی کا پہلو پایا جاتا ہے۔

وشرط المعقُود عليه ستَّةٌ: كونُه موجُودًا، مالاً مُتقوّماً، مملُوكًا في نفسه، وكونُ الـمِلك لـلبائع فيما يبيعُه لنفسه، فلم ينعقد بيعُ المعدُوم، ولا بيعُ ما ليس مملُوكاً له وإن مـلـكـه بعده، إلخ، وأمَّا الثَّالثُ وهو شرائط الصِّحة فخمسةٌ وعشرون: منها عامَّةٌ ومنها خـاصَّةٌ، فـالعامَّة لكل بيع: شُـروطُ الانـعـقـاد الـمـارَّة؛ لأن ما لا ينعقد لا يصحّ، وعدمُ التَّـوقيـت، ومـعـلُـوميَّةُ المبيع، ومعلُوميَّة الثَّمن بما يرفع المُنازعة، فلا يصحُّ بيعُ شاةٍ من هـذا الـقطيع، نعم يُزادُ في شُروط المعقُود عليه إذا لم يرياه الإشارة إليه أو إلى مكانه. (رد الـمـحتار: ۷/ ۱۵-۱۶، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) والـذي يـظهر من كلامهم تفريعًا وتعليلاً أن المُراد بمعرفة القدر والوصف ما ينفي الجهالة الفاحشة، وذلك بما يخصّص المبيع عن أنـظـاره، وذلك بـالإشـارة إليه لو حاضرًا في مجلس العقد؛ وإلا فبيان مقداره مع بيان وصـفـه لـو من المُقدَّرات، كبعتُك كر حنطة بلدية مثلاً بشرط كونه في ملكه أو ببيان مكانه الخاصّ إلخ. (رد المحتار: ۷/ ۵۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۳/۱۹ھ = ۲۰۱۶/۱۲/۱۹ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۱۹/ن، ۹۵/ن، ۱۴۳۸ھ)

فاریکس ٹریڈنگ اور کموڈیٹی ٹریڈنگ سے حاصل شدہ آمدنی کا حکم

سوال: میرا سوال آن لائن فاریکس ٹریڈنگ کے حوالے سے ہے، اس کام میں انٹرنیٹ پر مختلف اشیاء کی خرید وفروخت کی جاتی ہے، فاریکس ٹریڈنگ کرنے کے لیے بروکر (دلال) کے پاس آن لائن ڈالر اکاؤنٹ کھلوانا پڑتا ہے، ڈالر اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے شہر میں موجود ڈیجیٹل کرنسی ڈیلر سے پاکستانی کاغذی رقم کو ڈیجیٹل کرنسی میں تبدیل کروایا جاتا ہے، کرنسی ڈیلر ڈیجیٹل کرنسی انٹرنیٹ پہ موجود ہمارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیتا ہے، پھر اس ڈیجیٹل کرنسی سے اکاؤنٹ کھلوا کر ٹریڈنگ کی جاتی ہے، بروکر کے پاس ٹریڈنگ کے لیے جو اکاؤنٹ کھلوایا جاتا ہے، بروکر اپنے پاس سے کچھ ڈالر ملا کر اکاؤنٹ کو بڑا کر دیتا ہے؛ تاکہ ٹریڈنگ میں آسانی رہے، اس کے عوض وہ ہر ٹریڈ پر ۱۷% منافع یا چارجز کے طور پر لیتا ہے، بروکر جو رقم بڑھا کر اکاؤنٹ میں شامل کرتا ہے، وہ قابلِ واپسی ہوتی ہے،

اس سے ہم صرف ٹریڈنگ اور منافع کما سکتے ہیں؛ لیکن وہ رقم ہماری نہیں ہوتی، اس رقم کو ٹریڈنگ کی زبان میں لیوریج کہتے ہیں، فاریکس ٹریڈنگ میں آئل (تیل)، سونا، چاندی، تانبا، لوہا اور دوسری بہت ساری اشیاء شامل ہیں، اس کے علاوہ کرنسی پیئرز پر بھی ٹریڈنگ کی جاتی ہے، کرنسی پیئرز والی ٹریڈنگ میں زیادہ چلنے والے کرنسی پیئرز ریٹ کم ہونے پر خریدے جاتے ہیں، اور ریٹ زیادہ ہونے پر بیچ دیے جاتے ہیں، اس طرح یہ عمل جاری رہتا ہے، اس میں منافع بھی ہوتا ہے، اور نقصان بھی ہوتا ہے، اس سارے عمل میں کوئی بھی خریدی گئی چیز فزیکلی ہاتھ نہیں آتی، کرنسی پیئرز والی اور دوسری فاریکس ٹریڈنگ، جس میں سونا چاندی اور آئل وغیرہ ٹریڈ کیے جاتے ہیں، اُن سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: مروجہ فاریکس ٹریڈنگ (کرنسی کی آن لائن تجارت) اور کموڈیٹی ٹریڈنگ (سونا چاندی اور دیگر اشیاء واجناس کی آن لائن تجارت) مختلف وجوہات مثلاً: بیع قبل القبض، اور بعض صورتوں میں مبیع معدوم ہونے کی بنا پر ناجائز ہے۔

(تجویز فقہی سیمینار، ادارۃ المباحث الفقہیہ، منعقدہ: ۱۰-۱۲/ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ)

لہٰذا اس طریقے سے حاصل شدہ آمدنی ناجائز ہے۔

عن ابن عبَّاس رضي الله عنه قال: قال النَّبي صلّى الله عليه وسلّم: من ابتاع طعامًا فلا يبعه حتّٰى يستوفيه، قال ابنُ عبَّاس: وأحسب كلَّ شيءٍ مثله. (صحيح مسلم: ۲/۵، ط: ديوبند) **لا يصحُّ اتفاقا بيعُ منقُول قبل قبضه ولو من بائعه.** (الدر مع الرد: ۷/۳۶۹، ط: زكريا، ديوبند) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۱۲ھ الموافق: ۲۰۱۷/۳/۱۲ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۷۴/تتمہ/ھ، ۱۵۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

سرکار کی طرف سے غریبوں کو مفت ملنے والے گیہوں کی خرید وفروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال: السلام علیکم! ہمارے یہاں گیہوں کی فصل نہیں ہوتی ہے، سرکار غریبوں کو گیہوں

بانٹتی ہے، تو وہ لوگ چھوٹے بیوپاریوں کو گیہوں بیچ دیتے ہیں، اور وہ بیوپاری ہمیں بیچتے ہیں، تو کیا ہم وہ گیہوں لے سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری غلّے کی دکان سے غریبوں کے درمیان مفت یا معمولی قیمت پر گیہوں تقسیم ہوا، تو غریب شخص جب گیہوں کا مالک ہوگیا، تو وہ اس میں ہر طرح کا مالکانہ تصرف کرسکتا ہے، اگر وہ خود استعمال نہ کرے؛ بل کہ کسی دکان دار کے ہاتھ فروخت کردے، تو اس میں شرعاً کچھ مضائقہ نہیں، اور وہ دکان دار آپ کے ہاتھ فروخت کردے، اور آپ خرید لیں، تو اس میں آپ کے لیے بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

المِلك ما من شانه أن يتصرَّف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار، أول كتاب البيوع: ۱۰/۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

كُلّ يتصرَّف في ملكه كيف شاء . (شرح المجلّة لسليم رستم باز: ۱/۶۵۴، رقم المادة: ۱۱۹۲) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۶/۳/۱۴۳۸ھ = ۶/۱۲/۲۰۱۶ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۰۴/ن، ۲۳۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

پبلشرز کی طرف سے بہ طور سیمپل دی گئی کتابیں فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال: میری کتابوں کی دکان ہے، ہمیں پبلشرز کچھ کتابیں بہ طور سیمپل کے مفت دیتے ہیں، کیا وہ کتب؛ میں سیل (بیچنا) کرسکتا ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: پبلشرز آپ کو بہ طور سیمپل مفت جو کتابیں دیتے ہیں، اگر وہ آپ کو اُن کتابوں کا مالک بنادیتے ہیں، اور آپ کو یہ اختیار دے دیتے ہیں کہ آپ اپنی مرضی سے اُن کتابوں کا جو چاہیں کریں، خواہ کسی کو بہ طور ہدیہ دیں، اپنے استعمال میں لائیں، یا فروخت کریں، تو ایسی صورت میں آپ وہ کتابیں گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرسکتے ہیں، شرعاً جائز ہے۔

اعلـم أن أسباب المِلك ثلاثةٌ: ناقلٌ، كبيع وهبة، وخلافةٌ، كإرث، وأصالةٌ إلخ . (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الصيد: ۱۰/ ٤٧، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **وتتمُّ الهبةُ بالقبض الكامل إلخ.** (المصدر السابق، كتاب الهبة: ۸/ ٤٩٣) **و حكمُها – حكمُ الهبة – ثبوت المِلك للموهُوب له إلخ.** (المصدر السابق، ص: ٤٩٠)

قال رسُول اللّٰه صلّى الله عليه وسلّم: كلُّ واحدٍ أحقُّ بماله من والده وولده والنَّاس أجمعين. (السنن الكبرى للبيهقي: ٧/ ٧٩٠)

المِلكُ ما من شانه أن يتصرَّف فيه بوصف الاختصاص. (رد المحتار، أوّل كتاب البيوع: ٧/ ١٠)

كُلّ يتصرَّف في ملكه كيف شاء . (شرح المجلّة لسليم رستم باز : ١/ ٦٥٤، رقم المادة: ١١٩٢) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۹/۲۱ھ = ۲۰۱۷/۶/۱۷ء، شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۰۶۱/ن، ۱۰۷۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

درزی کے پاس بچے ہوئے کپڑے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

زید ایک درزی ہے، اور کپڑا سیتا ہے، جو کپڑا سیتا ہے، اس میں سے کپڑا بچتا بھی ہے؛ لیکن کبھی زید قصداً اور کبھی غیر ارادۃً وہ کپڑا واپس نہیں کرتا، تو کیا اس صورتِ حال میں زید وہ کپڑا استعمال کرسکتا ہے؟ اور کبھی ایسا موقع ہوتا ہے کہ کپڑا سلوانے والا شخص اتنے وقفے کے بعد آتا ہے کہ زید کو یاد نہیں رہتا کہ اس کا کپڑا بچا ہے، جو اس کو واپس کرنا ہے، اور سلوانے والا بھی بچے ہوئے کپڑے کا مطالبہ نہیں کرتا، تو ایسا کپڑا ابھی رہ جاتا ہے زید کے پاس، یا سلوانے والا مطالبہ کرتا بھی ہے بچے کپڑے کا، تو چوں کہ کافی وقفے کے بعد آیا ہے کپڑا لینے، تو تلاش کرنے میں دشواری کی وجہ سے، یا وقت کی قلت کی وجہ سے زید اس کا کپڑا واپس نہیں کرتا، تو ایسی صورتوں میں کیا مسئلہ ہوگا؟ برائے کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلے کا حل بتا کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں، مہربانی ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: درزی (سلائی کرنے والے) کے پاس کٹنگ اور سلائی کے لیے جو کپڑے آتے ہیں، وہ اس کے پاس امانت ہوتے ہیں، وہ اُن کپڑوں کا مالک نہیں ہوتا؛ اس لیے کٹنگ میں جو کپڑا بچ جائے، یا تجربے ومہارتِ فن سے بچالیا جائے، اُس کی واپسی ضروری ہے، اُسے رکھ لینا، اور اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں؛ البتہ اگر کترن کی قسم کا معمولی کپڑا ہو، جسے مالک لوگ عام طور پر بے کار سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں، اور دلالۃً اسے رکھ لینے کی اجازت ہوتی ہے، تو اسے واپس کرنا واجب وضروری نہیں۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۷/۳۹۷-۳۹۸، سوال: ۱۸۶۵-۱۸۶۶، مع حاشیہ بہ حوالہ: امداد المفتین اور فتاوی رحیمیہ)

ہر گاہک کا بچا ہوا کپڑا اس کے تیار شدہ کپڑے کے ساتھ رکھ دیا جائے، اس صورت میں اگر گاہک دیر سے آتا ہے، تب بھی اس کا بچا ہوا کپڑا تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، مالک کا پورا کپڑا بہ آسانی واپس کرنا ممکن ہوگا، اور اگر کپڑے کا مالک؛ بچا ہوا کپڑا درزی کو دے دے کہ یہ آپ ہی رکھ لیں، تو اس صورت میں درزی کے لیے وہ کپڑا بلا شبہ جائز ہوگا، وہ اپنی جس ضرورت میں چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۹/۱۵ھ = ۲۰۱۷/۶/۱۱ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی- وقار علی غفرلہٗ

(۱۰۵۳/ن، ۱۰۶۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

سیمنٹ کے بزنس میں ایڈوانس پیمنٹ لے کر بکنگ کرنے کا حکم

سوال: میرا سیمنٹ کا بزنس ہے، اکثر گاہک سیمنٹ کی ایڈوانس پیمنٹ (پیشگی ادائیگی) کرکے ایک ہی ریٹ، قیمت پر بکنگ کرتے ہیں، جب کہ آنے والے دنوں میں ریٹ کم زیادہ ہوتا ہے، فکس ریٹ شدہ آنے والے دنوں میں مارکیٹنگ ریٹ میں اگر کمی آئی ہو، تو میرا فائدہ ہوگا، اور اگر زیادتی ہوئی، تو میرا نقصان، تو اس صورت میں کیا ہم بکنگ کرسکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اگر سیمنٹ کی مقدار، اس کی نوعیت، اُس کے تمام

ضروری اوصاف، اور ادائیگی کا دن، اور تاریخ وغیرہ متعین ہوجائے، اور دوٹوک طریقے پر خریدی جانے والی سیمنٹ کی قیمت بھی متعین کرلی جائے، مثلاً: خریدار کہے کہ میں نے فلاں قسم کی سیمنٹ کے ۵۰/کلو والے اتنے کٹے؛ فی کٹا ۵۰۰/روپے پر خریدے، جس کی ادائیگی فلاں مہینے کی فلاں تاریخ اور دن میں ہوگی، اور بیچنے والا منظور کرلے، اور خریدار اُسی وقت بیچنے والے کو پورا پیسہ حوالے کردے، تو یہ معاملہ بیعِ سلم کے طور پر شرعاً جائز ودرست ہوگا، اب ادائیگی کی متعینہ تاریخ میں سیمنٹ کی قیمت؛ خواہ کچھ بھی ہو، بیچنے والا خریدار کو حسبِ معاملہ طے شدہ متعینہ سیمنٹ کی ادائیگی کرے گا۔

اور اگر معاملہ اس طرح ہو کہ فلاں تاریخ میں اگر سیمنٹ کا ریٹ گھٹ گیا، تو اُس وقت کے ریٹ سے لیں گے، اور اگر بڑھ گیا، تو موجودہ ریٹ سے لیں گے، جیسا کہ بہت سے لوگ اسی طرح معاملہ کرتے ہیں، تو یہ شرعاً جائز نہ ہوگا؛ کیوں کہ ریٹ کا گھٹنا یا بڑھنا، نیز کم گھٹنا یا بڑھنا، یا زیادہ گھٹنا یا بڑھنا، ابھی کچھ معلوم نہیں؛ پس اس معاملے میں کوئی ایک ریٹ واضح طور پر متعین نہیں کیا گیا۔

هو– أي: السَّلم – شرعاً: بيعُ آجلٍ و هو المُسلَم فيه بعاجلٍ وهو رأسُ المال، ورُكنُه ركنُ البيع، حتّٰى ينعقد بلفظ بيع في الأصحّ –إلى قوله– ويصحّ فيما أمكن ضبطُ صفته، كجودته ورداءته ومعرفة قدره، كمكيلٍ وموزون إلخ. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب البيوع، باب السلم: ۷/ ٤٥٤–٤٥٥، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **وأمَّا الثَّالث: وهو شرائطُ الصِّحة فخمسةٌ وعشرُون، منها معلُوميَّة الثَّمن.** (رد المحتار، أول كتاب البيوع: ۷/ ۱۵) **فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۴/۷/۱۴۳۸ھ = ۲۲/۴/۲۰۱۷ء، شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ، محمد مصعب عفی عنہ

(۸۴۵/ن، ۸۳۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

فلیٹ تیار ہونے سے پہلے ہی اس کو خرید لینا پھر اس کو بیچنا کیسا ہے؟

سوال: حضرات مفتیانِ کرام دارالعلوم دیوبند! زیدت عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

(۱) عرض یہ ہے کہ ایک فلیٹ کا صرف نقشہ بنا ہے، فلیٹ نہیں بنا ہے، اس سے پہلے ہی وہ فروخت ہوجاتا ہے۔

(۲) اور اس کی رجسٹری کروا کر مشتری دوسرے کو بھی مذکورہ طریقے سے فروخت کر دیتا ہے، اس طرح بیع کرنا کیسا ہے؟ مدلل جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(۳) نیز فلیٹ فروخت کرنے کی رائج صورتوں میں سے کون سی صورت جائز ہے؟ مثلاً: ایک منزلہ بن گیا، میرا فلیٹ دوسرے منزلے پر ہے، اور وہ ابھی بنا نہیں، ایسی صورت میں خریدنا کیسا ہے؟ یا اس کے علاوہ کوئی اور بھی صورت ہو، تو راہ نمائی فرما کر احسان عظیم فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱،۲)** جو شخص زمین کا مالک ہے، اور بلڈنگ بنا کر اس کے فلیٹ لوگوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے، تو ایسے شخص سے فلیٹ کی تعمیر سے پہلے فلیٹ کی تمام چیزوں کی واضح اور دوٹوک تعیین کے ساتھ فلیٹ کی خریداری؛ بہ طور استصناع جائز ہے؛ کیوں کہ عمارت اور بلڈنگ میں بھی فقہی جزئیات کی رو سے استصناع کا معاملہ جائز ہے؛ البتہ اس خریدار کا فلیٹ ہونے سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فلیٹ فروخت کرنا، اور خریدنے والوں کا خریدنا جائز نہیں؛ کیوں کہ بیعِ استصناع میں خریدار آرڈر کی ہوئی چیز کا اس کی تیاری اور وجود میں آنے سے پہلے مالک نہیں ہوتا ہے۔

وكذلك جَرى العَملُ اليوم بالاستصناع في المَباني الكبيرة وغيرها من غير إنكار العُلماء. (فقه البيوع للمفتي محمد تقي العثماني، ص: ۵۹۸) **فالمُكتتبُون يعقدُون مع صاحب الأرض استصناع الشُّقة أو المكتب أو محل تجاري بمُواصفات معلُومة حسب التَّصميم فيجوز ذلك بشروط الاستصناع؛ ولكن مايفعلُه بعضُ النَّاس من بيع الشُّقة أو المكتب قبل اكتمال بنائه وقبل أن يقع التّسليم فإنَّه لايجُوز؛ لما ذكرنا من أن المصنُوع ليس مِلكاً للمُستصنع قبل التَّسليم فهو بيعٌ لما لايملكه الإنسان، وهو ممنُوعٌ بنصِّ الحديث.** (المصدر السابق، ص: ٦٠٤)

(۳) آپ نے جو صورت ذکر کی ہے، اس کا جواب اوپر آ گیا، باقی اور جو صورتیں آپ کے ذہن میں ہوں، بہ راہِ کرم اُنھیں خود تحریر فرما کر سوال کریں، فتوے میں تمام رائج صورتوں کی تفصیل مشکل ہے؛ البتہ اوپر اصولی طور پر جو بات ذکر کی گئی، اُسے بہ طور خاص مدنظر رکھا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہ ۱۱/۶/۱۴۳۸ھ = ۱۱/۳/۲۰۱۷ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۷۲/ن، ۵۸۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

شوروم میں ایڈوانس (پیشگی) رقم جمع کرکے ٹریکٹر خریدنا کیسا ہے؟

سوال: ٹریکٹر کے شوروم والے کے پاس مال؛ یعنی: ٹریکٹر موجود نہیں ہوتا، لوگ اُس سے سودا طے کرکے؛ مکمل یا کچھ پیسے دے کر ٹریکٹر بک کروا لیتے ہیں، جیسے ہی مال آتا ہے، تو بقایا پیسے دے کر ٹریکٹر لیتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ کیا یہ اس طرح قبل القبض بیچنا نہیں؟ (ٹریکٹر کے شوروم والوں کو شاید کمپنی سے ڈیلرشپ ملی ہوتی ہے، اُن کے پیسے بھی کمپنی کے پاس شروع سے ایڈوانس میں رکھے ہوئے بھی ہوتے ہیں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: شوروم والے کے پاس عقد کے وقت ٹریکٹر چاہے موجود نہ ہو؛ لیکن اگر مارکیٹ (بازار) میں دست یاب ہو، اور سودا طے کرتے وقت ٹریکٹر کے تمام اوصاف متعین ہوجائیں، اور ایسی کوئی جہالت باقی نہ رہے، جو موجب نزاع ہو، یعنی: گاڑی کی کوالیٹی، سائز، رنگ وغیرہ تمام چیزیں متعین ہوجائیں، اور ثمن مکمل یا کچھ حصہ ادا کردیا جائے، تو اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے، یہ بیع سلم ہے، جس میں مبیع ادھار ہوتی ہے، اور ثمن نقد ہوتا ہے۔

ويصحُّ فيما أمكن ضبطُ صفته ومعرفةُ قدره إلخ. (تنوير الأبصار) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۸؍ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - فخر الاسلام عفی عنہ

(۴۸۱؍م، ۴۵۵؍م، ۱۴۳۸ھ)

لکڑی ادھار لے کر استعمال کرلی تو لوٹاتے وقت کس زمانے کی قیمت کا اعتبار ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ مسئولہ کے بارے میں:

آج سے تقریباً بیس یا پچیس سال پہلے؛ ہمارے دادا مرحوم نے اپنے بھائی عبد الغنی سے

جنگل کے درختوں کی لکڑی ادھار لی تھی، جو شہتیر اور چھت میں استعمال کی جانے والی دیگر لکڑی کے لیے ضرورت تھی، آج عبدالغنی دادا کے ورثہ سے لکڑی مانگتا ہے، اور اس بات پر مصر ہے کہ مجھے لکڑی ہی چاہیے یا اس کی قیمت؛ بہ لحاظِ زمانۂ موجودہ، اور ورثہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ قرض ادا کریں؛ مگر بات یہ ہے کہ آج کے زمانے میں جنگل سے لکڑی لانا قانوناً جرم ہے، مجبوری میں قیمت دے کر رقم کی ادائیگی کے بعد محدود لکڑی دی جاتی ہے، اب وہ چاہتے ہیں کہ ہم بیس یا پچیس سال پہلے جو لکڑی کی قیمت بنتی ہے، وہ ہم کو چاہیے، آج وہ لکڑی انتہائی مہنگی ہے۔

الغرض عبدالغنی کی طرف سے ورثہ پر لکڑی یا آج کل کے وقت کے مطابق اس لکڑی کی قیمت لازم کرنا عقلاً زیادتی معلوم ہوتی ہے، شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: لکڑی اُن چیزوں میں سے ہے کہ اس کے استعمال کر لینے کے بعد اُس کی قیمت واجب ہے، نہ کہ اُس جیسی لکڑی؛ لہٰذا یہ قیمتی چیزوں میں سے شمار ہوگی، اور ادھار کا معاملہ مثلی چیزوں میں درست ہے، نہ کہ قیمتی چیزوں میں؛ لہٰذا اگر کوئی اشیائے قیمیہ میں ادھار کا معاملہ کر لے، تو قیمت دینا واجب ہوگا، اور معاملے کو توڑنا، اور ادھار لی ہوئی چیز کو لوٹانا ضروری ہوگا، اگر کوئی معاملہ نہ توڑے، اور اشیائے قیمیہ پر قبضہ کر لے، تو اس کے لیے ضمان ثابت ہو جائے گا، اور اس پر قیمت واجب ہوگی؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ کے دادا کا؛ اپنے بھائی سے لکڑی ادھار لینے کا معاملہ درست نہ تھا؛ یعنی: فاسد تھا، اور معاملہ توڑ دینا چاہیے تھا؛ لیکن جب اُنھوں نے لکڑی پر قبضہ کر لیا، تو اس کے مالک ہو گئے، اور لکڑی کی قیمت اُن پر واجب ہوگئی، اور اگر وہ لکڑیاں ابھی موجود ہیں، تو مرحوم عبدالغنی کے ورثہ کو واپس کر دیں، اور اگر موجود نہیں ہیں، تو معاملے کے وقت کی قیمت ادا کر دیں، عبدالغنی کے ورثہ کو زمانۂ موجودہ کی قیمت کے مطالبے کا حق نہیں ہے۔

قال في الدُّر: وصحَّ القرضُ في مثلي .... لا في غيره من القيميَّات، كحيوان و حطبٍ .... قال العلامة الشَّامي: وفي جامع الفُصولين: القرضُ الفاسدُ يُفيدُ المِلك حتّٰى لو استقرض بيتًا فقبضه ملكه، وكذا سائر الأعيان، ويجبُ القيمةُ على المستقرض .... و قال: عند أبي يوسف تجبُ قيمتُها يوم القبض أيضًا، و عليه الفتوى، كما في البزَّازية، وفي الذّخيرة و الخُلاصة .... وحُكمُ

البیع کالقرض. (ردالمحتار: ۷/۳۸۸ - ۳۹۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۲۱۶/د، ۱۱۳/د، ۱۴۳۸ھ)

زمین کی بیع وشراء مکمل ہوجانے کے بعد قیمت گھٹ جانے پر بیع کو فسخ کرنے کا حکم

سوال: حضرات مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ ایک پلاٹ کی قیمت دس لاکھ روپے ہے، دس لاکھ روپے ہی میں مالک نے اُس کو فروخت کیا، پچاس ہزار روپے بیعانہ دیا، باقی قیمت تین مہینے بعد دینے کا وعدہ کیا، تین مہینے پورا ہونے سے قبل اُس پلاٹ کی قیمت گھٹ کر ۷/لاکھ ہوگئی، اُس مشتری نے خریدنے سے انکار کردیا، اور جب سودا ہوا، تو یہ بات طے ہوئی تھی کہ بیعانہ واپس نہیں کیا جائے گا، اب اس صورت میں وہ بیعانے کا حق دار ہوگا یا نہیں؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟ مطلع فرما کر احسان فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: مبیع (یعنی: پلاٹ) متعین ہوکر اُس کا ریٹ باہم طے ہو چکا ہو، اور بائع مشتری کے درمیان ایجاب وقبول ہوکر خریداری کا معاملہ مکمل ہوگیا ہو، تو مشتری پلاٹ کا حق دار، اور بائع مقررہ رقم کا مستحق شرعاً ہوگیا، اب بغیر دونوں کی رضا مندی کے معاملہ فسخ؛ یعنی: ختم نہیں کیا جاسکتا؛ پس پلاٹ کی قیمت میں گراوٹ آنے کی وجہ سے نقصان مشتری کو برداشت کرنا ہوگا، اور بائع طے شدہ قیمت کے مابقیہ کا حق دار ہوگا۔

الإقالةُ رفعُ البیع .... وتتوقَّف علی قبُول الآخر. (رد المحتار: ۷/۳۳۲)

البتہ ایسے وقت میں جب کہ کسی ایک فریق کو صریح نقصان لاحق ہو رہا ہو؛ معاملے کے ختم کردینے پر دوسرے فریق کا راضی ہوجانا بہتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اُس شخص کے معاملے کو ختم کردیا، جو اپنے کیے ہوئے معاملے پر نادم ہو رہا ہو، تو کل قیامت کے دن

میں اللہ تعالی اُس کے گناہوں کو اسی طرح ختم کر دیں گے، جس طرح اس نے اس کے معاملے کو ختم کر دیا۔ (مسند بزار، رقم: ۸۹۶۷)؛ لیکن کسی فریق کو معاملہ ختم کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا؛ البتہ اگر باہمی رضامندی سے معاملہ ختم کیا جاتا ہے، تو بیعانے کی رقم واپس کرنی ہوگی، بائع کے لیے رکھنا جائز نہیں۔

فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۱۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۵۱/د، ۳۱۴/د، ۱۴۳۸ھ)

قسطوں پر گاڑی خریدنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

قسطوں پر گاڑی لے سکتے ہیں یا نہیں؟ جیسے: ایک کار چھ لاکھ کی ہے نقد میں، قسطوں میں ساڑھے چھ لاکھ کی ہے، اور گاڑی کی ضرورت بھی ہے، اور نقد روپے بھی نہیں ہیں، اس صورت میں کیا کریں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: خود کمپنی سے گاڑی خریدتے وقت قسطوں کا معاملہ کرنا درست ہے؛ اگرچہ نقد کے مقابلے میں قسطوں پر خریدنے میں کچھ زائد رقم ادا کرنی پڑے؛ بہ شرطے کہ مجلسِ عقد ہی میں ثمن اور مدت کی تعیین کر لی جائے؛ البتہ بینک کے توسط سے کمپنی سے گاڑی خریدنا، جس میں بینک خریدار کی طرف سے رقم ادا کر دے، اور بعد میں خریدار سے زائد رقم وصول کرے، یہ جائز نہیں؛ کیوں کہ اس صورت میں یہ سودی معاملہ ہو جائے گا۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۳/ل، ۲۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

ماہانہ قسط دے کر اخیر سال میں کچھ زائد سونا لینے کی رائج شکل کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں:

آج کل سونے چاندی کی فروخت کا یہ طریقہ چل رہا ہے کہ ہر مہینے دس ہزار روپے؛ دکان دار کے پاس جمع کرا دو، ایک سال پر؛ ایک لاکھ بیس ہزار جمع ہونے پر دکان دار (بائع) ایک لاکھ تیس ہزار کا سونا دے گا، کیا اس طرح کا عقد کرنا درست ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ : اگر شروع ہی سے یہ پختہ عقد کی شکل ہوتی ہے، یعنی: جمع شدہ رقم واپس نہیں ملتی؛ بل کہ طے شدہ سونا ہی لینا پڑتا ہے، تو یہ بیع الکالی بالکالی (یعنی: ادھار کی بیع ادھار کے بدلے میں) ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اگر پختہ عقد کی شکل نہیں ہوتی؛ بل کہ محض وعدہ ہوتا ہے، جمع کرنے والا اپنی رقم جب چاہے لے سکتا ہے، نیز سونے کی کوالیٹی اور وزن وغیرہ بہ وقت پختہ عقد طے ہوتی ہے، تو پھر اس طرح معاملہ کرنے کی گنجایش ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۷۹۲/س، ۱۴۳۸ھ)

سرکاری ادارے کے تحت ویلفیئر اسکیم سے قسطوں پر پلاٹ خریدنے کا حکم

سوال: میں ایک سرکاری ادارے میں ملازمت کرتا ہوں، ہمارے ادارے نے حال ہی میں ایک ویلفیئر اسکیم شروع کی ہے، جس کے تحت ہم ملازمین؛ قسطوں پر پلاٹ حاصل کر سکتے ہیں، شرائط میں لکھا ہے کہ اگر دورانِ اسکیم آپ کی وفات واقع ہو جائے، تو کمپنی آپ کی جمع شدہ رقم اور پلاٹ آپ کی فیملی کو (بہ طور ہدیہ) واپس کرے گی، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح کی اسکیم میں حصہ لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ بھی انشورنس کی طرح حرام و ناجائز ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ بہ راہِ کرم اس سارے معاملے پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈال کر عنداللہ ماجور ہوں، مزید برآں اس کی بھی وضاحت فرمادیں کہ کیا اس طرح قسطوں پر پلاٹ کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے؟ جہاں زمین کی لوکیشن (جائے وقوع) اور آپ کا پلاٹ تین سے پانچ سال تک الاٹ ہوتا ہے، جب کہ قسط تین سال پہلے سے شروع ہو جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: مذکور فی السوال اسکیم کے تحت پلاٹ کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہاں معاملے کے وقت مبیع ؛ یعنی: پلاٹ مجہول؛ بل کہ معدوم ہے؛ اس لیے کہ پلاٹ کی تعیین قسط شروع ہونے کے کافی بعد ہوگی، جب کہ حدیث میں شے معدوم کی خرید وفروخت کی ممانعت آئی ہے، نیز یہ معاملہ سود پر بھی مشتمل ہے؛ اس لیے کہ معاہدے میں یہ بھی طے ہوتا ہے کہ اگر معاہدہ کرنے والا ملازم دورانِ اسکیم وفات پا جائے، تو اُسے جمع کردہ پوری رقم؛ نیز پلاٹ بھی کمپنی واپس کرے گی، ظاہر ہے کہ یہ سود ہے؛ اگرچہ نام اس کا ہدیہ رکھا جائے، اسی طرح اس اسکیم میں غرر کا پہلو بھی ہے۔

الغرض! اس اسکیم میں متعدد قباحتیں ہیں؛ اس لیے اس کے تحت پلاٹ کی خرید وفروخت کا معاملہ کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۲۹ھ، چہارشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۶۶/س، ۱۵۵/س، ۱۴۳۸ھ)

اجارے کے ساتھ تنخواہ طے کرنے کا حکم

سوال: کسی مدرسے کی دو (maruti) ماروتی گاڑی ہیں، مہتمم صاحب نے ایک ڈرائیور سے طے کیا کہ یہ دونوں گاڑیاں؛ تم کو بہ طور اجارہ دیتے ہیں، ان کی مرمت اور پٹرول وغیرہ تمھارے ذمے ہے، اس کی آمدنی میں سے ہر ماہ تمھیں چار ہزار روپے مدرسے کو دینا ہے، اس سے زیادہ جو آمدنی ہوگی، وہ تمھارے لیے ہے، اور تم کو مدرسے سے ہر ماہ چار ہزار روپے تنخواہ ملے گی، سوال یہ ہے کہ اجارے کے ساتھ تنخواہ طے کرنا درست ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرما کر شکریے کا موقع دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: گاڑی کسی کو اگر چار ہزار روپے کرایے پر دی، تو یہ اجارہ درست ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کو چار ہزار روپے تنخواہ دینا یہ درست نہیں، گاڑی سے وہ جس قدر کمائے اُس کا ہوگا، صرف مدرسے کو گاڑی کا کرایہ؛ ماہانہ چار ہزار روپے دیتا رہے گا۔

فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - وقار علی غفرلہٗ

(۳۱۹/ب، ۳۶۱/ب، ۱۴۳۸ھ)

رقم گروی رکھوانے کی صورت میں معتاد کرایے میں تخفیف کرنا ورنہ پورا کرایہ وصول کرنا کیسا ہے؟

سوال: رقم کی صورت میں گروی رکھوانے پر مکان کا کرایہ کم کرنا، صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے گھر میں رہتا ہے، جس کا کرایہ ۱۰۰۰۰/روپے ہیں، اور کرایے دار مالکِ مکان کو ۵/لاکھ روپے رہن کے طور سے رکھواتا ہے، جس سے مالکِ مکان کرایے میں تخفیف کرکے ۵۰۰۰/روپے کردیتا ہے، یعنی: اگر کرایے دار رقم گروی رکھوائے گا، تو اس کے کرایے میں تخفیف کی جائے گی، اور اگر رقم گروی نہیں رکھوائے گا، تو پورا ۱۰۰۰۰/روپے کرایہ لیا جائے گا، کیا ایسا کرنا ٹھیک ہے؟

چناں چہ مندرجہ ذیل سوال کا جواب مطلوب ہے:

رقم کی صورت میں گروی رکھوانے پر مالک کا کرایے میں تخفیف کرنا، اور نہ رکھوانے کی صورت میں پورا کرایہ وصول کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: دکان یا مکان کے مالک کو قرض دے کر معتاد کرایے میں تخفیف کرنا؛ انتفاع بالمرہون کی صورت ہے، اور مرتہن کو شئ مرہونہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں، یہ فائدہ اٹھانا؛ سود کے حکم میں ہے، فتاوی شامی

وغیرہ میں اسی طرح ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۶ھ الموافق: ۲۰۱۷/۱/۲۵ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی-فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۵۴/ھ،۵۸۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

زیادہ ڈپازٹ دے کر اجرتِ مثل سے کم پر کرایے داری کا معاملہ کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنا گھر؛ ماہانہ سو روپے پر دے دے (جب کہ گھر کی اجرتِ مثل؛ مثلاً: دس ہزار ہو) اور تقریباً دس لاکھ کی رقم بہ طور ڈپازٹ بھی مستاجر سے علاحدہ لے لے، اور مستاجر کی اجازت سے اس رقم میں تصرف بھی کرتا ہو، تو کیا شرعاً یہ معاملہ جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دکان یا مکان وغیرہ کی کرایے داری میں ڈپازٹ کے طور پر زیادہ سے زیادہ رقم دے کر؛ اجرتِ مثل سے کم پر کرایے داری کا معاملہ ناجائز ہے؛ کیوں کہ مکان یا دکان مالک کو ڈپازٹ کے طور پر جو رقم دی جاتی ہے، وہ شرعاً بہ حکم قرض ہوتی ہے، گویا کرایے داری کے ساتھ قرض کا معاملہ ہوا، اور کرایے میں کمی قرض ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے؛ پس یہ قرض کی بنیاد پر کرایے میں کمی کا نفع اٹھایا گیا، جو از روئے شرع سود اور ناجائز وحرام ہے؛ اس لیے ڈپازٹ دے کر اجرتِ مثل سے کم پر کرایے داری کا معاملہ؛ شریعت کی نظر میں جائز نہ ہوگا۔

أنواعُ الرِّبا، وأمَّا الرِّبا فهو على ثلاثة أوجُه: أحدُها في القروض، والثَّاني في الدُّيون، و الثَّالث في الرُّهون. الرِّبا في القُروض، فأمَّا في القُروض فهو على وجهين: أحدُهما أن يقرض عشرة دراهم بأحد عشر درهمًا أو بإثني عشر ونحوها. والآخرُ أن يجر إلى نفسه منفعة بذلك القرض أو تجر إليه، وهو أن يبيعه المستقرضُ شيئًا بأرخص ممَّا يُباع أو يؤجره أو يهبه ....، ولو لم يكن سببُ ذلك (هذا) القرض

لما كان (ذلك) الفعل؛ فإن ذلك ربًا، وعلى ذلك قولُ إبراهيم النَّخعي: كلُّ دينٍ جرَّ منفعةً لاخَير فيه. (النتف في الفتاوى، ص: ٤٨٤-٤٨٥) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۵/۶/۱۴۳۸ھ = ۵/۳/۲۰۱۷ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۷۵/ن، ۵۶۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

گوگل ایڈسینس پر دینی باتوں کو شائع کر کے پیسہ کمانا کیسا ہے؟

سوال: گوگل ایڈسینس (adsense) پر پیسہ کمانا حلال ہے یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر آپ قرآن کو یا دینی باتوں کو یا علمائے کرام کے خطابات کو؛ گوگل ایڈسینس میں شائع کرتے ہیں، تو جیسا کہ آپ کے دوسرے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن اور دینی باتوں کی توہین ہے، ایسا کرنا درست نہیں، اس کی کمائی بھی مالِ طیب نہیں ہے؛ اس لیے اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۸۲/ب، ۳۰۸/ب، ۱۴۳۸ھ)

کمپیوٹر میں فلم گانا یا نعت وغیرہ ڈاؤن لوڈ کر کے پیسہ کمانا کیسا ہے؟

سوال: کمپیوٹر میں فلم گانا وغیرہ ڈاؤن لوڈ کر کے جو پیسہ کمایا جاتا ہے، اُس کا کیا حکم ہے؟ اگر صرف بیانات اور نعت پاک ڈاؤن لوڈ کر کے پیسہ لیتا ہو، تو اس کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: فلم، گانا اور دیگر معصیت کی چیزیں ڈاؤن لوڈ کر کے پیسے کمانا جائز نہیں ہے؛ ہاں! اگر کوئی شخص اہلِ حق اور صحیح العقیدہ علماء کے بیانات اور صالح مضامین پر مشتمل نعت (جو آڈیو کی شکل میں ہو، اور اس میں میوزک نہ ہو)

ڈاؤن لوڈ کر کے پیسہ لے، تو اس میں مضائقہ نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۳ھ، پنج شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۷۲۵/تتمہ/س، ۶۹۲/س، ۱۴۳۸ھ)

یوٹیوب پر ویڈیو اپلوڈ کر کے اجرت لینا کیسا ہے؟

سوال: یوٹیوب؛ یعنی: سافٹ ویئر پر میں ویڈیو بنا کر ڈالتا ہوں، اُس پر یوٹیوب والے ایڈورٹائز (یعنی: اشتہار دینا) بناتے ہیں، جیسا کہ ہر ویڈیو پر ایڈورٹائز بناتے ہیں، اور اس ایڈورٹائز کا مجھے پیسہ ملتا ہے، تو اس پیسے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ حلال ہے یا حرام؟

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: ویڈیو بنا کر ڈالنا، اور اس پر اجرت لینا شرعاً جائز نہیں، آپ اس کام کو ترک کر دیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۷/۱ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۸۴/ل، ۱۰۰۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

لوگوں کے لیے ضروری معلومات اور اشتہارات وغیرہ کے لیے یوٹیوب چینل بنانا اور اس پر اجرت لینا کیسا ہے؟

سوال: میں ایک یوٹیوب چینل شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں، جس کے اندر کی ویڈیوز لوگوں کے لیے دنیا کی نئی تکنیکی ترقی کو پیش کریں گی، جس سے کہ لوگوں کو نئی تکنیکوں کے بارے میں جان کاری ملے گی، جسے وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں استعمال کر سکیں گے، اور نئے سافٹ ویئر اور موبائل اپلی کیشن سے شروع کرتے ہوئے، جو لوگوں کے لیے فائدے مند ثابت ہوسکتی ہیں؛ دیگر مختلف فائدے مند تکنیکوں تک رسائی ہوگی، جو لوگوں کو اپنے اہم کاموں کو آسان بنانے میں مدد کر سکتی ہیں، یا اُنھیں اپنے ذاتی زندگی میں مدد کر سکتی ہیں، اب اس چینل کے تحت یہ چننے کا اختیار ہے کہ کیا ہمارا آن لائن چینل پروگرام دکھائے گا؟ یہ پروگرام اگر چینل پر دکھایا جاتا ہے، تو ہمیں ہمارے کام

میں کچھ کمائی کرنے میں مدد کرے گا، لوگوں کے ذریعے اُن پروگراموں کو کتنی مرتبہ دیکھا جاتا ہے، اس کے حساب سے چینل کے میزبان کچھ پیسہ کماتے ہیں، جو بدلے میں ہر ایک پروگرام کے لیے دیے گئے منافع پر منحصر کرتا ہے، یہاں اہم بات یہ ہے کہ مختلف قسم کے پروگرام یہاں دکھائے جاسکتے ہیں، جن میں سے کچھ؛ لوگوں کے لیے اچھے اور کافی فائدے مند ہو سکتے ہیں، اور کچھ؛ نقصان دہ ہو سکتے ہیں، نقصان دہ پروگرام لوگوں کو نہیں دکھایا جانا چاہیے، اور اس کے لیے بھی ایک دوسرا اختیار دیا جاتا ہے، میزبان کو چننے کا موقع دیا جاتا ہے کہ اس کے چینل پر کون سے پروگرام دکھائے جائیں گے، جو کہ اس کی پسند کے مطابق ہی ہوں گے؛ اس لیے نامناسب پروگرام اس طرح آسانی سے روکے جاسکتے ہیں۔

میرے سوالات یہ ہیں:

(۱) کیا مذکورہ بالا تفصیل کے ساتھ اس چینل کو آن لائن بنانا اسلام میں ناجائز مانا جاتا ہے؟

(۲) کیا اس طرح لوگوں کے لیے صرف نفع بخش اور اہم پروگراموں کے ذریعے سے میزبان کے لیے کمائی اسلام میں ناجائز مانا جاتا ہے؟ اگر نہیں تو کیا اس کے ساتھ کوئی شرطیں ہیں؟ اگر اس کے متعلق کچھ مزید شرطوں کو ماننا ضروری ہے، تو امید ہے کہ ان کو تفصیل سے سمجھایا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰه التوفیق والعصمة: (۱-۲) لوگوں کو مختلف تکنیکوں اور دیگر ضروری امور کی معلومات پہنچانے کے مقصد سے یوٹیوب چینل بنانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے؛ البتہ ایک اہم اور بنیادی شرط ہے، وہ یہ ہے کہ جو ویڈیوز تیار کر کے اُس میں ڈالی جائیں، وہ ذی روح کی تصویروں سے پاک ہوں؛ کیوں کہ ذی روح چیزوں کی تصویر یا ویڈیوز بنانا شرعاً جائز نہیں ہے، حدیث میں تصویر بنانے والوں سے متعلق سخت وعیدیں آئی ہیں، ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز تصویر بنانے والوں کو سخت ترین عذاب دیا جائے گا۔

إن أشدَّ النَّاس عذابًا عند اللّٰه يوم القِيامة المُصوِّرُون. (بخاري، رقم: ٥٩٥٠)

جہاں تک اشتہارات کے ذریعے سے کمانے کی بات ہے، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر جائز اور مباح چیزوں کے اشتہارات کمپنی دے، اور لوگوں کی طرف سے دیکھنے پر یوٹیوب والے آپ کو کچھ دیں، تو اُسے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، آپ کمپنی کو منع کر دیں کہ آپ کے ویڈیوز پر

ناجائز کاروبار اورحرام چیزوں؛ مثلاً: سود پر مبنی فائنانس، شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کے اشتہارات بالکل نہ دیا کرے؛ بل کہ آپ مقامی کسی معتبر مفتی کے ساتھ بیٹھ کر: ناجائز اور جائز چیزوں کی ایک فہرست تیار کر کے بھی کمپنی کو پیش کردیں؛ تاکہ اشتہارات دینے میں ان کا لحاظ کرے۔

فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۹/۷/۱۴۳۸ھ، شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۰۵۵/تتمہ/س، ۹۹۴/س، ۱۴۳۸ھ)

اشتہار کرنے پر اجرت لینے اور ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازمت کرنے کا حکم

سوال: حضرت مفتی صاحب! ریڈیو کی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں مینیجر کی نوکری حلال ہے یا حرام؟ اشتہار؛ خواہ وہ مصنوعات کے ہوں یا ڈرامے یا فلم کے، زیادہ تر مصنوعات اور بینک یا انشورنس کے اشتہار ہوتے ہیں، عموماً ریڈیو چینل پر۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: ڈرامے، فلم اور بینک یا انشورنس کی ایڈورٹائزنگ؛ یعنی: تشہیر کرنا جائز نہیں، اس کے علاوہ دیگر مصنوعات کے تشہیر کی اجازت ہے؛ بہ شرطے کہ شرعی حدود میں ہوں، ویڈیوگرافی نہ کی جائے، اور نہ ہی اس کے لیے میوزک یا دوسرے آلاتِ لہو ولعب یا دیگر محظوراتِ شرعیہ کا ارتکاب کیا جائے، اگر ریڈیو ایڈورٹائزنگ میں اکثر اشتہارات؛ ناجائز امور سے متعلق ہوتے ہیں، تو اس میں مینیجر کی حیثیت سے ملازمت کرنا جائز نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۲۱/۱۰/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۱۳۱/ل، ۱۱۳۶/ل، و۱۳۰۶/ل، ۱۲۷۳/ل، ۱۴۳۸ھ)

ناجائز اموراورعورتوں کی تصاویر ڈالنے والی اشتہار کی کمپنی سے متعلق بعض اہم سوالات کے جوابات

سوال: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ بندے کی ایک اشتہار کی کمپنی ہے، جس کا نام (comp online advertisement company) ہے، اوراس کمپنی کی ایک آفیشل ویب سائٹ اورایک اینڈرائڈ ایپ ہے، جس کے ذریعے ہم اشتہار کی کمپنی کو چلاتے ہیں، جس میں کسی بھی چیز کے اشتہارات دیے جاتے ہیں۔

(۱) تو اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا اشتہار دینا جائز ہے، جس میں عورت کی تصویر ہو؟ یعنی: کیا اس میں جواز کی کوئی گنجایش ہے؟

(۲) اگرنہیں، تو کیا ایسے ہوسکتا ہے کہ کسی کافر کو ویب سائٹ اور کمپنی کے بعض رأس المال میں شریک کرلیا جائے، اور پھر مذکورہ اشتہار دیے جائیں، تو کیا یہ جائز ہے؟ یعنی: کیا پھر ایسا اشتہار دینا جائز ہوسکتا ہے؟

(۳) اگر یہ بھی نہیں، تو کیا مضاربت کے طریقے سے جائز قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۴) المختصر مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی صورت میں عورت کی تصویر ڈال کر اشتہار دینا جائز ہوسکتا ہے؟ اگر کوئی جواز والی صورت ہو، تو مودبانہ درخواست ہے کہ وہ صورت بیان کی جائے۔

(۵) اس سلسلے میں ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی لیڈی ڈاکٹر، لیڈی لکچرر یا لیڈی وکیل کے تعارف وغیرہ کے لیے ویب سائٹ پر اُس کے بائیو ڈیٹا کے ساتھ؛ اس کی تصویر ڈالنا، اور تصویر کے ذریعے اُس کا ایڈ کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) اسلام میں انسان یا کسی بھی جان دار کی تصویر کشی اور تصویر سازی حرام ہے، احادیث میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں؛ اس لیے آپ اپنی اشتہار کی ویب سائٹ پر کوئی ایسا اشتہار نہیں دے سکتے، جس میں کسی عورت، لڑکی یا جان دار کی تصویر ہو؛ بل کہ عورت یا لڑکی کی تصویر والا اشتہار دینے میں فحاشی وبے حیائی کو فروغ دینا، اوراس میں تعاون کرنا بھی پایا جاتا ہے، جس سے بچنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے؛ لہٰذا آپ اپنی ویب سائٹ پر صرف وہ اشتہار

دیں، جن میں کسی عورت، لڑکی یا جان دار کی تصویر نہ ہو، نیز جس کاروبار کا اشتہار دیا جائے، وہ شریعت کی نظر میں بھی جائز ہونا چاہیے؛ کیوں کہ ناجائز کاروبار کا اشتہار دینا بھی شریعت میں جائز نہیں ہے۔

عن عبدالله بن مسعود رضي الله عنه قال: سمعتُ رسُول الله صلّى الله عليه وسلّم يقُول: أشدّ النَّاس عذابًا عند الله المُصوِّرُون، متَّفقٌ عليه، و عن ابن عبَّاس رضي الله عنهما قال: سمعتُ رسُول الله صلّى الله عليه وسلّم يقُول: كلُّ مُصوِّر في النَّار، يُجعل له بكلِّ صورةٍ صوَّرها نفسًا فيعذّبه في جهنَّم، قال ابنُ عبَّاس: فإن كُنتَ لابُدَّ فاعلاً فاصنع الشَّجر و ما لا رُوح فيه، مُتَّفقٌ عليه. (مشكاة المصابيح، باب التصاوير، الفصل الأول، ص: ۳۸۵-۳۸٦، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

وعن أبي هُريرة رضي الله عنه قال: قال رسُول الله صلّى الله عليه وسلّم: يخرج عنق من النَّار يوم القيامة، لها عينان تبصران، وأذنان تسمعان، ولسانٌ ينطق، يقُول: إنِّي وكلت بثلاثة: بكلِّ جبَّارٍ عنيد، وكلّ من دعا مع الله إلٰها آخر، وبالمُصوِّرين، رواه التِّرمذي. (المصدر السابق، الفصل الثاني، ص: ۳۸٦)

وعن سعيد بن أبي الحسن قال: كنتُ عند ابن عبَّاس إذ جاءه رجلٌ فقال: يا ابن عبَّاس! إنِّي رجلٌ إنَّما معيشتي من صنعة يدي، وإنِّي أصنعُ هذه التَّصاوير، فقال ابنُ عبَّاس: لا أحدِّثُك إلا ما سمعتُ من رسُول الله صلّى الله عليه وسلّم، سمعتُه يقُول: من صوَّرصُورةً فإن الله مُعذِّبه حتّٰى ينفخ فيه الرُّوح، وليس بنافخ فيها أبدًا، فربا الرَّجل ربوةً شديدةً، واصفرَّ وجهُه، فقال: ويحك إن أبَيت إلا أن تصنع فعليك بهذا الشَّجر وكل شيءٍ ليس فيه روحٌ، رواه البخاري. (المصدر السابق، الفصل الثالث)

قال الله تعالى: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُم عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنيَا وَالآخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعلَمُ وَأَنتُم لَاتعلَمُونَ﴾ (سورة النور، رقم الآية: ١٩)

وقال تعالى أيضاً في مقام آخر: ﴿وَلَاتَعَاوَنُوا عَلَى الإِثمِ وَالعُدوَانِ﴾ (سورة المائدة، رقم الآية: ٢)

(۲) شرکت کے کاروبار میں ہر شریک کی شرکت؛ کاروبار کے ہر جزو میں ہوتی ہے، اور ہر شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے؛ اس لیے اگر آپ اپنے ساتھ کاروبار میں کسی غیر مسلم کو شریک کرتے ہیں،

تو جائز کاموں کی طرح ناجائز کاموں میں بھی آپ کی، اور آپ کے پارٹنر دونوں کی شرکت ہوگی، یعنی: آپ بھی اپنے حصّے کے بہ قدر ناجائز کام کرنے والے، اور اس کے منافع لینے والے ہوں گے، اور شریعت میں ناجائز کام اور اس کا نفع؛ بہ ہرحال ناجائز ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ؛ اس لیے عورت، لڑکی یا جان دار کی تصاویر والے اشتہار، یا ناجائز کاروبار کے اشتہار کا کام آپ کسی غیر مسلم کی شرکت میں بھی نہیں کر سکتے۔

(وشرطُها) – أي: شركة العقد – (كونُ المعقُود عليه قابلاً للوكالة).

(الدُّرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الشركة: ٦/ ٤٧٤، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ١٣/ ٢٧٦، ت: الفرفور، ط: دمشق) قولُه: (وشرطُها إلخ:) أفاد أنّ كل صُور عقُود الشِّركة تتضمَّن الوكالة، و ذلك ليكون ما يُستفاد بالتَّصرف مُشتركاً بينهما، فيتحقَّق حُكم عقد الشِّركة المطلُوب منه، وهُو الاشتراكُ في الرِّبح؛ إذ لو لم يكُن كلٌّ منهما وكيلاً عن صاحبه في النِّصف وأصيلاً في الآخر لايكون المُستفاد مُشتركاً؛ لاختصاص المُشتري بالمُشتري، فتح. (ردالمحتار)

(و) إمَّا (تقبل) – هذا ثالثُ وجُوه شركة العقد –، و تسمّٰى شركة صنائع وأعمال وأبدان (إن اتَّفق) صانعان (خيَّاطان أو خيَّاطٌ وصبَّاغ)....(على أن يتقبَّلا الأعمال) التي يُمكن استحقاقُها، ومنه تعليمُ كتابةٍ وقرآن وفقهٍ على المفتى به .... (ويكون الكسبُ بينهما) على ما شرطا إلخ، (و كل ما تقبَّله أحدُهما يلزمهما) إلخ، (ويكُون كلٌّ منهُما) من التَّقبُّل والوُجُوه (عناناً ومُفاوضةً) أيضاً (بشرطه السَّابق)، وإذا أطلقت كانت عناناً، (و تتضمَّن) شركة كل من التَّقبُّل والوُجوه (الوكالة)؛ لاعتبارها في جميع أنواع الشِّركة إلخ. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الشركة: ٦/ ٤٩٧–٥٠٠، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ١٣/ ٣٢٦–٣٣٢، ت: الفرفور، ط: دمشق)

(۳) مضاربت میں مضارب، رب المال کا وکیل ہوتا ہے، اور وکیل کا عمل؛ شرعاً موکل ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے؛ اگرچہ معاملات میں حقوقِ عقد کا تعلق وکیل سے ہوتا ہے؛ اس لیے عورت، لڑکی یا جان دار کی تصاویر والے اشتہارات، یا ناجائز کاروبار کے اشتہارات کا کام کسی غیر مسلم کے ساتھ مضاربت کے طور پر بھی جائز نہیں۔

(هي) – المُضاربةُ –........ شرعاً: (عقدُ شركةٍ في الرِّبح بمالٍ من جانبٍ) ربِّ المال (وعملٍ من جانبٍ) المُضارب .... (وتَوكيلٍ مع العمل)؛ لتصرُّفه بأمره. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب المضاربة: ۸/ ۴۳۰–۴۳۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۱۸/ ۲۱۵– ۲۱۷، ت: الفرفور، ط: دمشق) قولُه: (و تَوكيل مع العمل:) فيرجعُ بما لحِقه من العُهدة على ربِّ المال. درر. (ردّ المحتار)

(۴) میرے علم کے مطابق شریعت میں عورت، لڑکی یا کسی جان دار کی تصویر والے اشتہار، یا ناجائز کاروبار کے اشتہار کے کام کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے۔

(۵) آپ اپنی تشہیر کی ویب سائٹ پر کسی لیڈی ڈاکٹر، لیڈی لکچرر یا لیڈی وکیل کے تعارف وغیرہ کے لیے، اس کا بایوڈاٹا وغیرہ تصویر کے بغیر ڈال سکتے ہیں، تصویر کے ساتھ ڈالنا شرعاً جائز نہیں؛ کیوں کہ اسلام میں جان دار کی تصویر ناجائز ہے، اور عورت یا لڑکی کی تصویر میں فحاشی و بے حیائی کو فروغ دینا بھی پایا جاتا ہے، جو شریعت میں جائز نہیں، جیسا کہ اوپر؛ نمبر ایک میں بھی ذکر کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۹/ ۶/ ۱۴۳۸ھ = ۱۹/ ۳/ ۲۰۱۷ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۹۹/تتمہ/ن، ۱۷۵/ن، ۱۴۳۸ھ)

سافٹ ویئر اور ویب سائٹ بنانے کے سلسلے میں شرعی ضابطہ کیا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری ایک کمپنی ہے، جس میں ہم سافٹ ویئر، ویب سائٹ وغیرہ مختلف کمپنیوں کے لیے بناتے ہیں، الحمدللہ! ہماری کمپنی کا یہ ذہن بنا ہوا ہے کہ جو کمانا ہے؛ حلال کمانا ہے، حرام سے ہر حال میں بچنا ہے، اب مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ بہت سی کمپنی جن کا کام جائز نہیں ہوتا (مثلاً: بینک، سینما، شراب کی کمپنی، انشورنس، بیوٹی پارلر، گانے اور فلموں کے آلات، اور اُن کی کیسٹوں کی دکان، تصویروں کی دکان، ایسی دکان جو سود کے ساتھ قسطوں پر چیزیں فروخت کرتی ہیں، نائی کی دکان، ایسی کمپنی جو چیزوں پر قبضہ کرنے سے پہلے ہی فروخت کردیتی ہے، ٹی وی بنانے والی کمپنی، نشہ آور چیزیں بنانے والی کمپنی) اور بھی اس قسم کی بہت سی

کمپنی یا دکانیں ہوتی ہیں، جن کا کام جائز نہیں ہو، اس قسم کے کاروبار کرنے والے حضرات ہم سے سافٹ ویئر، ویب سائٹ وغیرہ بنوانا چاہتے ہیں، اس صورت میں ہمیں پتا نہیں چل پاتا کہ ہم اُن کے لیے کام کرسکتے ہیں یا نہیں؟ اب پوچھنا یہ ہے کہ آپ ہمیں کوئی ایسا ضابطہ بتادیں، جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ کس قسم کی کمپنیوں کے لیے ہم کام کرسکتے ہیں، اور کس قسم کی کمپنیوں کے لیے نہیں کرسکتے ؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: سافٹ ویئر یا ویب سائٹ بناتے وقت؛ اس اصول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ اگر پروگرام سے اعانت علی المعصیۃ کا قصد کیا جائے، یا وہ پروگرام ایسا ہو جس کو صرف ناجائز کام میں استعمال کیا جاتا ہو، تو ایسا پروگرام بنانا جائز نہیں؛ البتہ اگر وہ پروگرام ایسا نہ ہو؛ یعنی: جس کا استعمال جائز وناجائز دونوں امور میں ہوسکتا ہو، خالص حرام وناجائز کام میں استعمال نہ ہوتا ہو، اور نہ ہی اس کے بناتے وقت اعانت علی المعصیۃ کا قصد کیا جائے، تو ایسا پروگرام بنانے کی گنجایش ہوگی، احتیاط کرنا بہتر ہوگا۔

وكذا الحُكم في برنامجه (الحاسبُ الآلي، الكمبيُوتر) لبنك ربويٍّ، فإن قَصَد بذلك الإعانة، أو كان البرنامجُ مُشتملاً على ما لا يصلح إلا في الأعمال الرِّبويَّة، أو الأعمال المُحرَّمة الأخرى، فإن العقد حرامٌ وباطلٌ، أمَّا إذا لم يقصد الإعانةَ وليس في البرنامج ما يتمحَّض للأعمال المُحرَّمة صحَّ العقدُ وكُره تنزيهاً. (فقه البيوع: ۱/ ۱۹٤)

اگر کسی سافٹ ویئر، اور اُس کے ذریعے ہونے والے کام کی تفصیل لکھ کر؛ سوال کریں، تو ان شاء اللہ اس کے متعلق حکم لکھ دیا جائے گا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۱۲ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۰۸/تتمہ/ل،۸۰۲/ل، ۱۴۳۸ھ)

تقریبات کے لیے ویب سائٹ بنانا جن میں ناجائز تقریبات بھی شامل ہوں اور اس پر اجرت لینا کیسا ہے؟

سوال: ہم لوگ ایک ویب سائٹ بنانے کا پلان بنارہے ہیں، جس کے ذریعے کوئی بھی

شادی، پارٹی، پروگرام وغیرہ کا پلان بناسکتے ہیں، یہ ویب سائٹ مکمل طریقے پر؛ تقریبات سے متعلق ہوگی، دراصل یہ ویب سائٹ مسلمان اور غیرمسلمان دونوں کے لیے ہے؛ اس لیے ہمیں اس ویب سائٹ میں کسٹمر کے لیے کچھ غیراسلامی چیزیں شامل کرنا پڑیں گی، جیسے: تفریحی مواد، ڈانس گروپ، ڈی جے، شادی کی فوٹوگرافی وغیرہ اور بکنگ سروس، تو کیا اس ویب سائٹ میں اس طرح کے کسٹمر کو شامل کرنا، اور اُن سے پیسہ لینا جائز ہے؛ کیوں کہ وہ ہماری ویب سائٹ کو استعمال کریں گے؟

ہم اس طرح کی چیزوں میں بہ راہِ راست ملوث نہیں ہوں گے؛ بل کہ ہم صرف بہ طور واسطہ کام کریں گے، جو کسٹمر اس ویب سائٹ کو دیکھے گا، تو وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی سروس بک کرسکتا ہے، اور ہم اس ویب سائٹ سے کسٹمر سے کچھ چارج لیں گے؛ بکنگ کمیشن کے طور پر، اس ویب سائٹ میں دوسری خدمات بھی ہیں، جیسے: کیٹرنگ (کھانے پینے سے متعلق) ہال بکنگ، مہندی ڈیزائنر، کپڑے کے ڈیزائنرس، شادی کارڈ، سفری خدمات، لائٹ اور ساونڈ سروسز، اسٹیج سجانا وغیرہ۔

فرض کریں کہ ہمارے پاس ایک بلڈنگ ہے (اور یہ ویب سائٹ ہے) سوال یہ ہے کہ اس کو ڈانس گروپ، ڈی جے، فوٹوگرافی اسٹوڈیو، کیٹرنگ ہال، مہندی، ڈیزائنرس، اسٹیج سجانا، بس سروس، کپڑا ڈیزائنرس، لائٹ اینڈ ساونڈ وغیرہ کے لیے کرایے پر دینا جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اپنی ویب سائٹ پر ناجائز پروگراموں کی سروس مہیا کرانا، اور اس کام پر کمیشن (روپے) لینا درست نہیں، یہ تعاون علی الاثم کی وجہ سے مکروہ ہے، اس سے بچنا چاہیے۔ لقوله تعالیٰ: ﴿وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَان، الآية﴾ (المائدة: ۲) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۴؍ذی الحجہ؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۳۶۲؍م، ۱۳۵۷؍م، ۱۴۳۸ھ)

آدھار سینٹر کھولنا اور اس میں فوٹو لینا اور اس کی آمدنی کا حکم

سوال: میں آدھار سینٹر شروع کرنا چاہتا ہوں، اس سینٹر میں مجھے لوگوں کا فوٹو لینا پڑے گا؛ اس لیے کیا یہ مناسب ہے؟ اور آمدنی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: ملکی قوانین اور حالات کی وجہ سے آدھار کارڈ بنوانا ضروری ہے، اور اس میں فوٹو لازمی جزو ہے؛ اس لیے آپ بہ طور ذریعۂ معاش آدھار سینٹر قائم کر سکتے ہیں، گنجایش ہے، اور اس میں بہ وجہِ ضرورت؛ فوٹو لینے کی بھی گنجایش ہوگی، اور آمدنی پر حرام ہونے کا حکم نہ ہوگا؛ بل کہ جائز ہی ہوگی۔ (مستفاد: جواہر الفقہ جدید: ۷/۲۶۳، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم، کراچی) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۵/۵/۱۴۳۸ھ = ۱۳/۲/۲۰۱۷ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری- محمد مصعب عفی عنہ

(۴۲۹/ن، ۴۴۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

آدھار کارڈ بنانے پر اجرت لینا اور آدھار کارڈ بنانے کی ایجنسی میں کام کرنا کیسا ہے؟

سوال: میں ایک آدھار کارڈ ایجنسی میں کام کر رہا ہوں، یہاں ہم پبلک کو آدھار کارڈ سروس فراہم کرتے ہیں، سرکاری ضابطے کے مطابق آدھار کارڈ ایجنسی کو کوئی پیسہ لیے بغیر؛ ہندوستانی شہری کا آدھار اندراج کرنا چاہیے (میرے خیال میں حکومت پیسہ دے گی)؛ لیکن میرے ایجنسی مالک فی شخص سو روپے لیتے ہیں، بہ راہِ کرم مجھے مشورہ دیں کہ میرے لیے مالک کے ماتحت رہ کر یہ کام کرنا حلال ہے یا نہیں؟ میرے مالک نے دکان کے لیے ایک لاکھ روپے ایڈوانس دیے ہیں، چار ہزار روپے مہینہ؛ کرایہ دیتے ہیں، اور تنخواہ نو ہزار روپے دیتے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے اخراجات بھی ہیں، واضح رہے کہ آدھار کارڈ کے ساتھ ہم پین کارڈ اور دیگر کام بھی کرتے ہیں؛ مگر زیادہ تر آدھار کارڈ کا ہے۔ جزاک اللہ خیرا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: **حامداً ومصلّیا ومسلّما**: جب حکومت کی طرف سے یہ پابندی ہے کہ آدھار کارڈ بنانے پر کوئی رقم نہ لی جائے، حکومت خود اس کا معاوضہ دے گی، تو آدھار کارڈ بنانے پر الگ سے رقم لینا صحیح نہیں ہے، اس کے علاوہ اگر دیگر کارڈ وغیرہ کے

بنانے پر رقم لینا؛ قانونی اعتبار سے ممنوع نہ ہو، تو اس پر رقم لینا جائز ہوگا، اگر آپ کی ایجنسی کا زیادہ تر کام آدھار کارڈ بنوانا ہے، تو آپ کو چاہیے کہ وہاں آپ کام نہ کریں، کسی اور حلال ملازمت کو تلاش کر کے وہاں چلے جائیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۹۶ رتتمہ رل، ۸۰۷رل، ۱۴۳۸ھ)

بیوٹی پارلر اور اس کی آمدنی کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل میں:

(۱) بیوٹی پارلر کا کیا حکم ہے؟ بیوٹی پارلر کا مطلب وہ کام ہے، جو حدیث شریف میں آئے ہیں:

لعَن اللّٰه الوَاشِمَات والمُستوشِمات والمُتنمِّصات والمُتفلِّجات للحسن.

تو ایسے بیوٹی پارلر میں کام کرنے والوں اور اُن کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

(۲) ایسا آدمی جو بیوٹی پارلر چلاتا ہو، اور اُس کی آمدنی کے دوسرے ذرائع بھی ہوں، اگر وہ مسجد میں کوئی امداد دے، تو اس کا لینا درست ہے یا نہیں؟ جب کہ اہلِ محلّہ کے اندر دو جماعت ہوگئیں: ایک جماعت کہتی ہے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، مشتبہ چیزوں سے بھی بچنا چاہیے، جب کہ دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ بیوٹی پارلر کے ساتھ؛ آمدنی کے دوسرے ذرائع بھی ہیں، تو اس میں قباحت کیا ہے؟ بہ راہِ کرم شرعی فیصلہ فرمادیجیے؛ تاکہ اختلاف بھی ختم ہوجائے، اور مسئلہ بھی واضح ہوجائے۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّما: آج کل رائج بیوٹی پارلر میں بالعموم ناجائز؛ بل کہ حرام امور انجام دیے جاتے ہیں، مثلاً: مردوں کا عورتوں کو سنوارنا، اُن کے بدن کی مالش کرنا، بھوؤں کا باریک بنوانا، عورتوں کا بالوں کو کٹوانا، فیشن کرانے کے لیے اس درجہ غلو سے کام لینا کہ تغیر لخلق اللہ لازم آئے وغیرہ؛ اس لیے بیوٹی پارلر قائم کرنے سے احتراز ضروری ہے؛ البتہ اگر حدودِ شرعیہ میں رہتے ہوئے عورتوں کی تزئین کی جائے، اور کام کرنے والی عورتیں ہوں، تو ان حدود و قیود کے ساتھ گنجایش ہوگی؛ لیکن جس بیوٹی پارلر میں خلافِ شرع؛ بل کہ ناجائز امور انجام

دیے جاتے ہوں، ایسے بیوٹی پارلر قائم کرنا ناجائز اور گناہ ہوگا، اور حاصل آمدنی بھی مکروہ ہوگی، جہاں تک ایسے شخص کی آمدنی کو مسجد میں لگانے کا مسئلہ ہے، تو اگر اس کے پاس؛ آمدنی کے دیگر حلال ذرائع ہیں، اور وہ خالص حلال آمدنی سے مسجد کی امداد کرتا ہے، تو اس کی رقم لینے اور مسجد میں استعمال کرنے کی گنجایش ہوگی، اور اگر وہ مخلوط آمدنی سے دیتا ہے، تو غالب کا اعتبار ہوگا، اور بہ ہر صورت لینے سے احتراز کرنا بہتر ہوگا کہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اُس میں مشتبہ چیز کا لگانا مناسب نہیں۔

قال في رد المحتار: أمَّا لو أنفق في ذلك مالاً خبيثاً و مالاً سببُه الخبيثُ و الطَّيبُ فيكره؛ لأن اللّٰه تعالىٰ لا يقبل إلا الطَّيب، فيكره تلويثُ بيته كما لا يقبله. (شامي: ۴۳۱/۲)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۷/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۳/ل، ۱۲۸/ل، ۱۴۳۸ھ)

انٹرنیٹ کیفے کی دکان کھولنا اور اس پر اجرت لینے کا حکم

سوال: انٹرنیٹ کیفے کی دکان کھولنا کیسا ہے؟ اس دکان میں بہت سارے کمپیوٹر لاکر؛ اور اس میں انٹرنیٹ کنکشن چالو رہتا ہے، اور کوئی بھی شخص آکر کمپیوٹر آن کر کے اپنا کام کرتا ہے، اور اس کی اجرت دیتا ہے؛ دکان والے کے کہنے کے مطابق۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس میں چوں کہ عام طور پر بے حیائی، عریانیت اور غیر مذہبی معصیت کی چیزیں دیکھی دکھائی جاتی ہیں، ان منکرات کے ہوتے ہوئے اُس کو دیکھنا، دکھانا، اُس کی اجرت لینا شرعاً پاکیزہ نہیں، مسلمان کے لیے اس طرح کی دکان کھولنا مناسب نہیں، ہاں! اگر یہ اعلان لگادے کہ یہاں عریانیت اور بے حیائی کا پروگرام نہ دیکھا جائے، اور اس پر کڑی نظر رکھے، تو اس کے بعد اجرت لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لاتصحُّ الإجارةُ لعسب التّيس و لا لأجل المعاصي، مثل الغناء و النَّوح و الملاهي. (الدرالمختار، كتاب الإجارة، باب الإجارة الفاسدة: ۷۵/۱، ط: زكريا، ديوبند)

لا تجُوز الإجارةُ على شيءٍ من الغناء والنَّوح والمزامير والطَّبل وشيءٍ من اللَّهو، وعلى هذا الحداء وقراءة الشِّعر وغيره، ولا أجر في ذلك. (الهندية، كتاب الإجارة: ٤/٤٨٦، ط: اتحاد، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۳۵۹/ب، ۳۰۹/ب، ۱۴۳۸ھ)

انٹرنیٹ کے ذریعے اشتہار کرنے پر ملنے والی اجرت کا حکم

سوال: آج کل انٹرنیٹ پر ایک کام آن لائن بہت چل رہا ہے، اس میں آپ کو ایک ویب سائٹ؛ جیسا کہ (www. theads team. com) ہے، ان پر آپ کو پرچار (تشہیر) خریدنے ہوتے ہیں، پھر اُن پرچار کو دیکھنا ہوتا ہے، اور جتنا آپ پرچار پیسوں سے خریدتے ہیں، اس کا دو یا ڈھائی فی صد آپ کو ملتا ہے، یہ دو یا ڈھائی فی صد فکس نہیں ہے، جس دن ویب سائٹ کے مالک کو زیادہ پرچار کے آڈر ملتے ہیں، اس دن زیادہ فی صد ملتا ہے، اور اسی طرح کام پر کام، اور اس میں فحاشی، جواخانہ، شرط لگانا اور جوے والے پرچار نہیں ہوتے، سادہ پرچار ہوتے ہیں، آپ کو روز دس پرچار دیکھنے ہوتے ہیں، اور اس کے بدلے جتنی سرمایہ کاری کی ہوگی، اس کا دو یا ڈھائی فی صد ملتا ہے، میرا سوال یہ ہے کہ کیا یہ حرام تو نہیں؟

اگر کچھ تفصیل رہ گئی ہو، تو میں دوبارہ جواب میں مزید بتا دوں گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں! یہ صورت جائز نہیں، پرچار کو پیسوں سے خریدنا؛ یہ ایک ایسا عمل ہے، جو عوض بننے کے قابل نہیں، اس کی خرید وفروخت شرعاً درست نہیں، پھر پرچار میں بے حیائی اور عریانیت، اشتہارات اور تصویریں جان دار کی ہوتی ہیں، یہ گناہ کی چیزیں ہیں، ان حالات میں اس کے جواز کا حکم لگانا درست نہیں۔

لاتصحُّ الإجارةُ لعسب التّيس و لا لأجل المعاصي، مثل الغناء والنَّوح

والملاهي. (الدرالمختار، کتاب الإجارۃ، باب الإجارۃ الفاسدۃ: ۷۵/۱، ط: زکریا، دیوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقارعلی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۳۵۵/ب، ۳۳۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

منی ٹرانسفر کرنے کا پیشہ اور اس پر اجرت لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین مسئلۂ ذیل کے بارے میں کہ منی ٹرانسفر؛ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی شخص کو کہیں دوسری جگہ؛ مثلاً: پندرہ یا بیس ہزار بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے؛ مگر بینک کے بند رہنے کی وجہ سے، یا کسی اور وجہ سے اُن لوگوں کے توسط سے بھجواتا ہے، جو یہ کام ایک پیشے کی حیثیت سے کرتے ہیں، اور وہ ان پیسوں کے بھیجنے کے عوض میں کچھ رقم کاٹ لیتے ہیں، مثلاً: پانچ ہزار میں سے سو روپے کاٹ لیتے ہیں، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس کا یہ رقم لینا ازروئے شرع جائز ہے، یا سود میں داخل ہوکر ناجائز ہے؟ جواب باصواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: منی ٹرانسفر کرنے والا اگر شرعاً اجیر بن جائے، اور اپنے عمل کی اجرت؛ متعین طور پر مالک سے وصول کرے، تو یہ معاملہ منی آرڈر کے حکم میں ہوکر گنجایش کے دائرے میں آجائے گا، حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں:

''منی آرڈر مرکب ہے دو معاملوں سے: ایک قرض؛ جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ؛ جو فارم کے لکھنے اور روانہ کرنے پر بہ نام فیس کے دی جاتی ہے، اور دونوں معاملے جائز ہیں؛ پس دونوں کا مجموعہ بھی جائز ہے، اور چوں کہ اس میں ابتلائے عام ہے؛ اس لیے یہ تاویل کرکے جواز کا فتویٰ مناسب ہے''۔ (امدادالفتاوی: ۱۴۶/۳، تحقیق منی آرڈر، کتاب الربا) البتہ قانونی طور پر اگر یہ کام ممنوع ہو، تو احتیاط چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقارعلی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۰/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۸۴/م، ۱۰۶/م، ۱۴۳۸ھ)

موبائل سے منی ٹرانسفر کی اجرت لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا موبائل کمپنی کے ریچارج سے روپے بھیجنے کا منافع لینا جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں! موبائل کمپنی کے ریچارج سے روپے بھیجنے کا حسبِ طے؛ متعینہ منافع لینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ ایک ایسے عمل وکارکردگی کا عوض ہے، جس پر شریعت میں عوض لینا جائز ہے، اور یہ معاملہ حسبِ اصولِ اجارہ صحیح ہے۔

هي – الإجارةُ – شرعاً تمليكُ نفع بعوضٍ. (تنوير الأبصار مع الدر والرد، أول كتاب الإجارة: ۹/ ٤–٥، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۳/۱۱/۱۴۳۸ھ = ۱۶/۸/۲۰۱۷ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۲۹۲/ن، ۱۳۲۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

موبائل ریچارج کرنے کا پیشہ کرنا درست ہے اور ریچارج کی رقم سے زیادہ ملنے والا ٹاک ٹائم سود نہیں ہے

سوال: موبائل کے ذریعے ریچارج کرنے کا پیشہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بعض اوقات میں چالیس روپے بھرنے پر ۴۵/ روپے کی سہولت ملتی ہے، یہ سود میں شمار ہوگا یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرما کر شکریے کا موقع دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: یہ پیشہ جائز ہے، اور ۴۰/ روپے بھرنے پر جو ۴۵/ روپے کی سہولت ملتی ہے، یہ شرعاً سود نہیں ہے؛ بل کہ حقِ گفتگو میں ایک طرح کا تبرع اور احسان ہے۔ **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/ ربیع الاول/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - وقار علی غفرلہٗ

(۳۱۹/ب، ۳۶۱/ب، ۱۴۳۸ھ)

موبائل سے پیسہ منتقل کرنے کا معاوضہ لینا اور بہ طور لون ٹاک ٹائم لینے کا حکم

سوال: (۱) ایک موبائل سے دوسرے موبائل میں رقم منتقل کرنے کی جو سہولیات کمپنیاں فراہم کرتی ہیں، اُن کا شرعی حکم کیا ہے؟ واضح رہے کہ اس رقم منتقلی کے لیے مذکورہ کمپنیاں کچھ معاوضہ بھی مقرر کرتی ہیں، مثلاً: ۵۰۰ روپے منتقل کرنے کے؛ تین روپے بہ طور معاوضہ۔

(۲) ایک سہولت کمپنی یہ فراہم کرتی ہے کہ اگر آپ کے موبائل میں پیسے نہیں ہیں، اور آپ کو کسی سے موبائل کے ذریعے رابطہ کرنا ہے، تو آپ کمپنی سے لون (قرض) لے سکتے ہیں؛ مگر پھر جب کبھی آپ اپنے موبائل میں پیسے ڈلواتے ہیں، تو وہ کمپنی اپنا قرض مع کچھ زائد رقم خود بہ خود وصول کر لیتی ہے، تو کیا یہ صورت درست ہے؟ زحمت فرما کر قدرے وضاحت سے جواب مرحمت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: (۱) کمپنی؛ رقم منتقل کرنے کی جو سہولت دیتی ہے، اگر اس کے عوض کچھ رقم لے، تو اس کی گنجایش ہے۔

(۲) اس صورت میں چوں کہ روپے کا تبادلہ روپے سے نہیں ہوتا؛ بل کہ روپے کا تبادلہ اُس منافع سے ہوتا ہے، جو کمپنی ٹاک ٹائم کی شکل میں دیتی ہے، یہ سودی اسکیم نہیں ہے؛ اس لیے بہ وقتِ ضرورت اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے میں مضائقہ نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہ - محمد اسد اللہ غفرلہ

(۸۵۴/ل، ۸۸۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

مدارس میں تعطیلِ کلاں کی تنخواہ کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

بکر ایک مدرسے میں مدرس ہے، اور از پندرہ شوال تا پندرہ شعبان؛ کارِ درس و تدریس انجام دیتا ہے، اور دو مہینے تک چھٹی رہتی ہے، اب اشکال یہ ہے کہ جس طرح ایک مزدور کو اُس کی مزدوری

کے بہ قدر عوض دیا جاتا ہے، اسی طرح بکر کو بھی دس مہینے کی تنخواہ دی جانی چاہیے، مزید دو مہینے جو چھٹی ہوتی ہے، اس کی تنخواہ کیوں دی جاتی ہے؟ آیا ان دو مہینوں کی تنخواہ کا دینا اور لینا جائز ہے یا نہیں؟ مفصل و مدلل جواب تحریر فرما کر منتِ بے کراں فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس طرح ہر ماہ مدارس میں جمعے کو، اور اسکول، کالج اور سرکاری وغیر سرکاری دفاتر وغیرہ میں اتوار کو، اسی طرح سال میں ایک مرتبہ ۲۶/جنوری، اور ایک مرتبہ ۱۵/اگست کو تعطیل ہوتی ہے، اور مدرس وملازم حسبِ معاہدہ و اصولِ ادارہ؛ جمعہ اور اتوار وغیرہ سمیت پورے مہینے کی تنخواہ کا مستحق ہوتا ہے، اسی طرح ان سب اداروں وغیرہ میں؛ سال کے اختتام پر جو تعطیلِ کلاں ہوتی ہے، اُس میں بھی مدرس و ملازم حسبِ معاہدہ و اصولِ ادارہ؛ چھٹی کے ایام کی تنخواہ کا حق دار ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ تعطیلات: مدرسہ، مدرسین، طلبہ، ملازمین اور دفاتر وغیرہ کی مصالح ومفادات میں ہوتی ہیں، یہ سب ملازم پورے سال کے لیے اجیرِ خاص ہوتے ہیں، اجیرِ عام نہیں ہوتے کہ جب چاہیں، اور جتنی چاہیں اپنی مرضی سے چھٹی کرلیں، اور بہت سے اہم اور بڑے کام تعطیلِ کلاں کے لیے چھوڑے جاتے ہیں، اگر اُن کے لیے تعطیلِ کلاں کا نظام نہیں رکھا جائے گا، تو اچھے مدرسین وملازمین کا ملنا مشکل و دشوار ہوگا، جب کہ عام مزدور اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں، وہ جب چاہتے ہیں کام کرتے ہیں، اور جب نہیں چاہتے؛ نہیں کرتے؛ اس لیے مدارسِ اسلامیہ میں تعطیلِ کلاں کے موقع پر مدرسین کو حسبِ معاہدہ واصولِ مدرسہ؛ جو دو ماہ کی تنخواہ دی جاتی ہے، یہ شرعاً بلاشبہ جائز ہے، اِس میں کچھ شک شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

ومنها البطالةُ في المَدارس، كأيَّام الأعيادِ ويوم عاشُوراء وشهرِ رمضان في درس الفِقه، لم أرَها صريحاً في كلامهم، و المسألةُ على وجهين، فإن كانت مشرُوطةً لم يسقط من المعلُوم شيءٌ إلخ. (الأشباه والنظائر مع شرح الحموي، الفن الأول، القاعدة السادسة: العادة محكمة: ۱/ ۳۳۰، ط: دارالكتب العلمية، بيروت) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۰/۹/۱۴۳۸ھ = ۶/۶/۲۰۱۷ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - زین الاسلام قاسمی

(۹۸۵/ن، ۲،۹۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

علمائے کرام کا بیانات کے عوض رقم لینا کیسا ہے؟

سوال: (۱) کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عظام اُن علمائے کرام کے بارے میں، جو اپنے بیان وتقریر کا خرچ لیتے ہیں؟ کیا اس طرح کا کوئی نظام آپ علیہ السلام کے دور میں، یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں ملتا ہے؟ اگر ایسا ہے، تو مدلل جواب عنایت فرمائیں۔

(۲) عام طور پر جو انجمن اور تنظیم؛ جلسہ وجلوس کراتی ہے، وہ جن علمائے کرام کو اپنے یہاں اجلاس میں بیان وتقریر کا موقع دیتے ہیں، اور اُنھی عوام سے چندہ اکٹھا کر کے جو بڑی بڑی رقوم دیتے ہیں، وہ علمائے کرام اپنے یہاں بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں، اور پھر اُن کا بھی اس سے بہتر استقبال کیا جاتا ہے، گویا کہ یہ علمائے کرام کی ایک تجارت ہو رہی ہے، کیا ایسی تجارت کرنا جائز ہے؟

(۳) اگر یہ رقوم کرایے کے نام پر لی جارہی ہیں، تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ علمائے کرام جو اپنے کام کے لیے اگر سفر کرتے ہیں، تو ٹرین کے سلیپر کلاس سے کرتے ہیں، اور کسی جلسے میں اُنھیں مدعو کیا جاتا ہے، تو ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، ایسا کرنا شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

(۴) کیا مقامی علمائے کرام اس جلسے وجلوس کے لیے کافی نہیں ہیں؟

(۵) ان تنظیم وانجمن سے عوام جلسے وجلوس کے حساب وکتاب کا مطالبہ کرسکتی ہے یا نہیں؟

(۶) کیا اس طرح کے جلسے وجلوس کا انعقاد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتا تھا؟ ہر ایک سوال کا جواب مدلل ومفصل عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: (۱) وعظ پر اجرت لینے کو متاخرین علماء نے جائز لکھا ہے؛ اس لیے وعظ پر متعارف اجرت لینے میں مضائقہ نہیں، اور چوں کہ خیر القرون میں علماء، قراء، واعظین وغیرہ کے وظائف؛ بیت المال سے مقرر ہوتے تھے؛ اس لیے خاص اس سلسلے میں خیر القرون میں کسی فنڈ کا ہونا ضروری نہیں؛ البتہ عموم سے استدلال کیا جاسکتا ہے، اسی بنا پر فقہائے متاخرین نے دیگر طاعات: امامت، اذان، تعلیم کی اجرت کو جائز لکھا ہے۔

(۲) اگر آنے جانے سے؛ ایک دوسرے میں ربط اور محبت پیدا ہو جانے کی وجہ سے اجلاسوں میں ایک دوسرے کو اپنے یہاں مدعو کرتے ہوں، تو مضائقہ نہیں؛ البتہ محض روپے کے حصول، یا دیگر اغراضِ فاسدہ کی بنا پر؛ ایک دوسرے کو مدعو کرنا نامناسب ہے، اس سے احتراز ضروری ہے، **والأمور بمقاصدها۔**

(۳) اگر کسی خاص وجہ سے جانے والا؛ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کا مطالبہ کرتا ہے، مثلاً: وقت کی تنگی ہے وغیرہ، تو اس میں حرج نہیں؛ ورنہ بلا ضرورت اس کا مطالبہ مناسب نہیں، چندے کی رقمیں قوم کی امانت ہوتی ہیں، جن میں احتیاط سے کام لینا ہر ایک پر ضروری ہے۔

(۴) کیوں نہیں! مقامی علماء بھی اس کے لیے کافی ہو سکتے ہیں؛ البتہ بالعموم مقامی علماء کی قدر وہاں کے عوام کے دلوں میں نہیں ہوتی ہے؛ اس لیے باہر سے علماء کے بلانے کا رواج ہے۔

(۵) ہر ایک کو تو حساب و کتاب کے مطالبے کا حق نہیں؛ البتہ وہاں کے مقتدیٰ اور بڑے حضرات مطالبہ کر سکتے ہیں، اور بہتر یہی ہے کہ چندہ وصول کرنے والے حضرات ہی چندے کا پورا حساب تیار کر کے رکھیں؛ تا کہ ہر ایک کو دکھایا جا سکے۔

(۶) مروجہ طرز پر جلسہ جلوس کا انعقاد؛ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہیں تھا؛ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہ وقتِ ضرورت وحسب احوال؛ وقتاً فوقتاً اپنے اصحاب کو نصائح فرمایا کرتے تھے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱/۲۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۳۸/ل، ۱۶/ل، ۱۴۳۸ھ)

حکومت یا وقف بورڈ کے ذریعے ائمہ وموذنین کی تنخواہوں کا انتظام کروانا کیسا ہے؟

سوال: بہ خدمتِ اقدس عرض یہ ہے کہ ہمارے علاقے صوبۂ آندھرا پردیش میں حکومت اور وقف بورڈ؛ ائمہ وموذنین کی تنخواہ کی پیش کش کر رہی ہے، اس کے لیے فارم بھی جمع کیے جا رہے ہیں،

بعض ذمے دارانِ مسجد اس کے قبول کرنے نہ کرنے میں ابھی پس وپیش میں ہیں، اس پر بعض جگہ اختلافات بھی ہورہے ہیں؛ چوں کہ دارالعلوم امت کی ہر موڑ پر راہ بری کرتا رہا ہے؛ اس لیے جواز وعدم جواز کے ساتھ اس کے کچھ مفاسد ہوں، تو واضح فرمائیں، نیز حکومت سے اس بات کا معاہدہ کروالیں گے کہ حکومت؛ مساجد کے کسی بھی مسئلے میں مداخلت نہیں کرے گی، تو اب کیا حکم ہے؟ آج کل یہ ہمارے علاقے کا ایک حساس مسئلہ بن چکا ہے؛ اس لیے بہ عجلتِ ممکنہ مدلل ومفصل جواب مرحمت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ:الجواب وباللہ التوفیق: حکومت سے مسجد مدرسے کے لیے بہ طور امداد، یا ائمہ وموذنین کے لیے بہ طور تنخواہ رقم لینا، اور حکومت کے تعاون کو قبول کرنا فی نفسہ جائز اور مباح ہے؛ لیکن بعض مصالح کے پیشِ نظر، اور مفاسد کے اندیشے سے ہمارے اکابر دارالعلوم دیوبند رحمہم اللہ نے اسے کبھی پسند نہیں فرمایا، اور اس طرح کے تعاون قبول کرنے کو کبھی استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔

چناں چہ حالات کے تجربے سے ان حضرات کی رائے اور عمل کا راجح اور بہتر ہونا ثابت ہوا، اور ہر جگہ مسلمانوں نے دینی مکاتب ومدارس کا قیام، اور مساجد کی تعمیر، اور ان سب چیزوں کی آبادی اور فروغ کے لیے ضروری انتظامات؛ مسلمانوں کے ہی باہمی چندے اور تعاون سے کرنے کی کوشش کی، مذکورہ امور کی تکمیل اور فروغ کو مسلمان ہمیشہ اپنی دینی ذمے داری سمجھتے ہوئے؛ خود ہی اس کی کفالت کرتے رہے، یہی طریقہ بہتر اور بے ضرر ہے؛ لہٰذا موذنین اور ائمہ کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافے کی ہمت کرتے ہوئے؛ مذکورہ دینی اور ملی ضرورت کو ذمے دارانہ طور پر خود ہی باہمی تعاون سے پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کے برخلاف محلے کی مسجدوں کے ائمہ اور موذنین کے سرکاری ملازم ہونے کی صورت میں اُن کا مقتدیوں کے ساتھ دینی اور اسلامی خیرخواہانہ رشتہ بہ ہر حال کمزور پڑ جائے گا، جہاں سرکاری ضابطے سے عزل اور نصب ہوگا، اور ترجیحات کی بنیاد بھی اس طرح کی ہوں گی؛ پس مسلمان بہ دستور اپنے ائمہ وموذنین کا انتظام خود کریں، اور تنخواہوں میں اضافے کی ہمت کے ساتھ خود ہی اس کے کفیل بنیں، بہتر اور بے ضرر طریقہ یہی ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۳ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ – محمد مصعب عفی عنہ

(۳۱۵/د، ۴۱۲/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا بینک کو بلڈنگ کرایے پر دے سکتے ہیں؟

سوال: کیا ہندوستان جیسے ملک میں جہاں پر صرف بینک کا سودی نظام چل رہا ہے، بینک کو بلڈنگ یا زمین کرایے پر دینا جائز ہے؟ کیا اس سے ہونے والی آمدنی جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: بینک کی اصل بنیاد تو سود پر ہے؛ مگر موجودہ وقت میں ہر انسان کی کاروباری اور ذاتی ضروریات اس سے وابستہ ہوگئی ہیں؛ اس لیے بینک کو زمین یا مکان کرایے پر دینے کی گنجائش ہے، اور ملنے والے کرایے کو اپنے استعمال میں لانا بھی جائز ہے؛ کیوں کہ بینک کی آمدنی صرف سود پر ہی منحصر نہیں ہے؛ بل کہ اور بھی ذرائع ہیں، پھر غیر مسلم کے سود کی آمدنی سے اپنی اجرت لینا؛ کسی مسلمان کے لیے جائز ہے، ان احکامات کے باوجود؛ کوئی شخص ذاتی طور پر محتاط رہے، تو وہ اُس کے لیے افضل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/۱۰/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۸۶۰/د، ۱۰۵۱/د، ۱۴۳۸ھ)

بینک یا اے ٹی ایم کے لیے دکان یا مکان کرایے پر دینے کا حکم

سوال: کیا میں اپنے مکان یا دکان کو؛ بینک کے یا اے ٹی ایم کے لیے کرایے پر دے سکتا ہوں؟ اور اُس کا کرایہ میرے لیے جائز ہوگا یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: بینک یا اے ٹی ایم (atm) کے لیے اپنا مکان یا دکان کرایے پر دینا شرعاً جائز ہے؛ لیکن نہ دینا بہتر ہے، بینک کی بہ نسبت اے ٹی ایم (atm) کو کرایے پر دینے کا حکم اخف ہے، آمدنی بہ ہر صورت جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۹/۴/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۴۷۳/س، ۵۱۵/س، ۱۴۳۸ھ)

بینک یا اے ٹی ایم کے لیے اپنی پروپرٹی دینا کیسا ہے؟

سوال: بینک، اے ٹی ایم کو اپنی پروپرٹی دینا؛ قرآن وحدیث کی روشنی میں کیسا ہے؟ حلال، حرام یا مکروہ؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: بینک یا اے ٹی ایم کو پروپرٹی دینے کی گنجایش ہے؛ البتہ نہ دینا بہتر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۱۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۵۹۶/ل، ۵۷۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

کیا مسجد کی دکان نائی کو دی جاسکتی ہے جو غیر شرعی کام بھی کرتا ہو؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

مسجد کی دکان نائی کو کرایے پر دینا کیسا ہے؟ جب کہ اس میں غیر شرعی کام بھی ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: نائی بالعموم جائز وناجائز دونوں کام کرتے ہیں؛ اس لیے نائی کو دکان کرایے پر دینا جائز ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۷/۱۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۵۳/ل، ۹۷۱/ل، ۱۴۳۸ھ)

کسی کمپنی میں شرکت کے بعد نفع ونقصان کا تناسب شرعاً کیا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

زید نے ایک کمپنی میں اس معاہدے کے ساتھ روپیہ لگایا ہے (یعنی: انویسٹ کیا ہے) کہ

نفع اور نقصان دونوں میں ۴۰٪ فی صد زید کا، اور ۶۰٪ فی صد کمپنی کا حصہ رہے گا، کمپنی جو زید کو منافع کا ۴۰٪ فی صد حصہ دیتی ہے، وہ ہمارے تخمینے کے حساب سے رأس المال کا تین فی صد، ساڑھے تین فی صد اور کبھی چار فی صد ہوتا ہے، اور کہتی ہے کہ یہ تمھارے فائدے کا ۴۰٪ فی صد حصہ ہے، متعین تو نہیں ہے؛ لیکن کمپنی رأس المال کے تین فی صد سے کم اور چار فی صد سے زیادہ نہیں دیتی ہے، تین فی صد اور چار فی صد کے درمیان ہوتا ہے، اس طرح کی شراکت جائز ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔ جزاکم اللہ الخیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: زید جس کمپنی میں پیسہ لگا رہا ہے، پیسہ لگاتے وقت کمپنی کی مجموعی مالیت اگر معلوم ہے؛ تاکہ زید کی بہ اعتبار جزو کے کمپنی میں شرکت متعین کی جاسکے، اور نفع ونقصان کا حساب ہوسکے، تو ایسی صورت میں کمپنی میں شرکت کی رقم لگانا جائز ہوگا؛ لیکن نقصان ہر ایک شریک پر اس کی لگائی ہوئی رقم کے تناسب سے ہوگا؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں نفع ۴۰٪ فی صد شریک کو، اور ۶۰٪ فی صد کمپنی کو ملنا سمجھ میں آتا ہے؛ لیکن نقصان کا ۴۰٪ فی صد اور ۶۰٪ فی صد طے کرنا صحیح نہیں ہے، وہ تو مالیت کے تناسب سے ہوگا، معاملے کے ایک ایک جزو کی وضاحت کرکے سوال کرنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴/د، ۲۲/د، ۱۴۳۸ھ)

جو کمپنی بینک سے لون لیتی ہو اس میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟

سوال: عرض ہے کہ میں چاول کی کمپنی میں کام کرتا ہوں، جو چاول ایکسپورٹ کرتے ہیں، کمپنی مالکان بینکوں سے سود پر لون لے کر کمپنی چلا رہے ہیں، اور کمپنی میں بینک پلیج میں چاول کا اسٹاک پڑا رہتا ہے۔

(۱) مجھے بینک پلیج کا آڈٹ کرنا ہوتا ہے، مالکان کو رپورٹ دینی ہوتی ہے، بینک والوں سے ڈیلنگ اور انکو مطمئن کرنا ہوتا ہے، تمام رپورٹیں بنانی ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کیا میرے لیے یہ تمام کام کرنا شرعاً جائز اور حلال ہے؟

(۲) جولوگ کمپنی میں مزدوری کرتے ہیں، اور آفس میں کام کرتے ہیں، ان کا بینک پلیج اسٹاک اور بینک معاملات سے واسطہ نہیں، کیا اُن کا کام کرنا جائز اور حلال ہے؟ برائے مہربانی دونوں پوائنٹ پر مکمل تفصیلی جواب دیں۔ جزاک اللہ خیراً

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: **(۱،۲)** کمپنی کے مالکان کا؛ کاروبار کو بڑھانے اور ترقی دینے کے لیے بینکوں سے سودی لون لینا جائز نہیں، آپ سے متعلق کام میں اگر تمام لین دین کی صرف رپورٹ تیار کرنی ہوتی ہے، اس میں کذب بیانی اور سودی حساب وکتاب شامل نہیں، اور نہ کسی خلافِ شرع امر کا ارتکاب لازم آتا ہے، تو آپ کے کام پر ناجائز کا حکم نہیں، اسی طرح جو لوگ آفس میں کام کرتے ہیں، یا مزدوری کرتے ہیں، اور ان کا سودی معاملات کے لکھنے پڑھنے سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں، تو اُن کے کام پر بھی ناجائز کا حکم نہیں۔

أمَّا إذا كانت الوظيفةُ ليس لها علامةٌ مباشرةٌ بالعمليَّات الرِّبويَّة، مثل وظيفة الحارس أو سائق السيَّارة .... فلا يحرم قبولُها .... و لايحكم في راتبه بالحُرمة. (فقه البيوع)

لیکن اگر کسی مرحلے میں جھوٹ، دھوکا دہی، غلط بیانی اور سودی حساب وکتاب کی نوبت آتی ہو، تو اس کام سے احتراز کیا جائے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۶؍جمادی الثانیہ؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۵۷۷؍م،۲۴۷؍م، ۱۴۳۸ھ)

کمپنی میں کام کرنے کے لیے نام تبدیل کرنے کا حکم

سوال: میں ایک بی پی او کمپنی میں ملازمت کرنا چاہتا ہوں، جو مکمل طور پر قانونی طریقے پر ہے؛ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ غیر مسلموں سے بات کرنے کے لیے مجھے اپنا نام بدلنا پڑے گا، کیا یہ میرے لیے درست ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: نام ہی تو انسان کے مذہب، خاندان اور وطن کی پہچان ہے، اپنی خصوصی پہچان کو مٹانا اچھی بات نہیں ہے، اور اگر نام غیر قوموں کے مذہب سے تعلق رکھتا ہے، تو ایمان کے لیے سخت خطرہ ہے، اور اگر صرف زبان اور تہذیب سے تعلق رکھتا ہے، تو بھی پسندیدہ نہیں ہے، اور یہ ہر صورت اپنی اسلامیت کو گم کرنے اور کھو بیٹھنے کے برابر ہے؛ پس ایسا نہ کریں، کوئی بے ضرر ذریعۂ معاش اختیار کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/۳/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمد مصعب عفی عنہ

نوٹ: نام بدل کر کیا رکھیں گے؟ اس کی وضاحت کر کے سوال کیا جاتا، تو بہتر ہوتا۔ فخر الاسلام عفی عنہ

(۲۲۱/د، ۲۸۲/د، ۱۴۳۸ھ)

ایم وے کمپنی کے ساتھ جڑنا جائز نہیں

سوال: السلام علیکم! محترم جناب! میں ایم وے بزنس کر رہا ہوں، اس بارے میں آپ سے راہ نمائی چاہتا ہوں؛ کیوں کہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ زیادہ تر لوگ جو اس بزنس میں ہیں، وہ اس کو صحیح شکل میں پیش نہیں کر پاتے، جناب! میں اس بزنس میں ۲/سال ۷/مہینے سے ہوں، اور اس کی باریکیوں اور پورے سسٹم سے بہت اچھے سے واقفیت رکھتا ہوں، ایم وے کمپنی پچھلے ۵۸/سالوں سے ۱۱۰/دیشوں میں کام کر رہی ہے، یہ کمپنی برٹ ورلڈ وائیڈ کمپنی کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے، جہاں ایم وے لوگوں کو بزنس کرنے کا موقع دیتی ہے، وہیں برٹ ورلڈ وائیڈ کمپنی؛ لوگوں کو یہ سکھاتی ہے کہ ایم وے بزنس ایمان داری سے کیسے کیا جائے۔

ایم وے کمپنی مندرجہ ذیل طریقے سے کام کرتی ہے:

۱۔ ایم وے کمپنی ڈائریکٹ سیلنگ کمپنی ہے، جو معیاری قسم کے سامان تیار کرتی ہے (جیسے: ہیلتھ، بیوٹی، پرسنل کیئر؛ مثلاً: صابن، تیل، شیمپو، پاؤڈر، کپڑے دھونے کے لکوڈ، برتن دھونے کے لکوڈ، وغیرہ وغیرہ) یہ پروڈکٹ بہت ہی عمدہ کوالیٹی کے ہوتے ہیں، کیمیکل فری ہوتے ہیں، کمپنی اسے مارکیٹ میں دکان داروں کو نہیں بیچتی ہے، یہ سیدھے کمپنی سے کسٹمر کو آتا ہے۔

۲۔ کمپنی کا کہنا یہ ہے کہ دکان دار، ہول سیلر، سی اینڈ ایف ایجنٹ، ڈسٹری بیوٹر، اور اشتہارات وغیرہ (بچولیوں) پر جو پیسہ خرچ ہوتا ہے، وہ کمپنی اپنے گراہک کو دے دیتی ہے۔

۳۔ اگر کسی شخص کو ایم وے سے سامان خریدنا ہے، تو وہ سیدھے کمپنی سے لے سکتا ہے، جس کے دو طریقے ہیں: (۱) یا تو آپ کمپنی کے ڈسٹری بیوٹر بن کر سامان لے سکتے ہیں۔ (۲) یا کمپنی کے گراہک بن کر۔ غور طلب ہے کہ اگر آپ گراہک ہیں، تو آپ کسی کو سامان بیچ نہیں سکتے، اس کے لیے ڈسٹری بیوٹر بننا پڑے گا، ڈسٹری بیوٹر یا گراہک بننے میں کوئی پیسہ نہیں لگتا، یہ کام فری میں ہوتا ہے۔ غور طلب ہے کہ پہلے کمپنی میں صرف ڈسٹری بیوٹر بنتے تھے، جس کی فیس تقریباً ۴۲۰۰/روپے ہوتی تھی؛ لیکن اس وجہ سے زیادہ تر لوگوں نے اس پروڈکٹ بیس کمپنی کو اسکیم بنا لیا، اور لوگوں کے ساتھ دھوکا دھڑی کی، پھر کمپنی نے اپنی پالیسی چینج کردی، اور جوائننگ فری کردی، تو دھوکا دھڑی کا یہ طریقہ بھی جاتا رہا۔

۴۔ اب اگر کوئی شخص اس کمپنی کے ساتھ مل کر بزنس کرتا ہے، تو وہ اس کمپنی کا سامان بیچ کر پیسہ کما سکتا ہے، اور وہ اپنی سیلس ٹیم بھی تیار کرسکتا ہے۔

ایم وے میں پیسہ کمانے کے تین طریقے ہیں:

۱۔ ایک شخص ''اے'' اس کمپنی کا ڈسٹری بیوٹر بن کر سامان خریدتا ہے، تو اسے کمپنی ۱۰/ فی صدی کیش ڈسکاؤنٹ، اور ۱۰/ فی صدی کھاتے میں؛ کل ۲۰/ فی صدی ڈسکاؤنٹ دیتی ہے، اب اگر ''اے'' اپنی جانب سے ''بی''، ''سی''، ''ڈی''، ''ای''، ''ایف'' اور ''جی'' چھ الگ الگ لوگوں کو ڈسٹری بیوٹر بناتا ہے، تو وہ جو بھی سیلس کریں گے، یہ ''اے'' کا کل بزنس کہلائے گی، مثلاً: ''اے'' نے ۱۰۰۰۰/ کا سامان لیا، اور ''بی''، ''سی''، ''ڈی''، ''ای''، ''ایف'' اور ''جی'' نے بھی دس دس ہزار کا سامان لیا، تو ''اے'' کا کل بزنس ۷۰۰۰۰/ کا ہوا، کمپنی ۲۰/ فی صدی کے علاوہ ۱۰۰۰۰/ کی خریدی پر ۶/ فی صدی، ۵۰۰۰۰/ کی خریدی پر ۹/ فی صدی، ڈیڑھ لاکھ کی خریدی پر ۱۲/ فی صدی، ۴/ لاکھ کی خریدی پر ۱۵/ فی صدی، ۷/ لاکھ کی خریدی پر ۱۸/ فی صدی، اور ۱۰/ لاکھ کی خریدی پر ۲۱/ فی صدی بونس دیتی ہے، اوپر دی گئی مثال پر ''بی''، ''سی''، ''ڈی''، ''ای''، ''ایف'' و ''جی'' نے دس دس ہزار کا سامان لیا، تو اُنھیں ۲۰/ فی صدی کے علاوہ ۶/ فی صدی بونس اور ملا؛ لیکن ''اے'' نے ''بی''، ''سی''، ''ڈی''، ''ای''، ''ایف'' و ''جی'' کے ذریعے، اور خود ۷۰۰۰۰/ کا بزنس کیا، تو ''اے'' ۹/ فی صدی پر ہوا، اب اس کی سیلس ٹیم کا ۶/ فی صدی گھٹا کر؛ ''اے'' کو ۷۰۰۰۰/ کا کل ۳/ فی صدی منافع ہوگا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ''اے'' کو

اپنا بزنس بڑھانے کے لیے ''بی''، ''سی''، ''ڈی''، ''ای''، ''ایف'' و ''جی'' کو یہ بزنس سکھانے کے لیے محنت کرنا پڑی، ٹائم خرچ کرنا پڑا، اور پیسہ بھی، مثلاً: پٹرول وغیرہ۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص کسی کو ڈسٹری بیوٹر بنائے، اور بنا محنت، ٹائم اور پیسہ خرچ کرے، وہ شخص یہ بزنس کرنے لگے؛ بل کہ میرے تجربے سے؛ زیادہ تر بار ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کسی شخص کے ساتھ محنت پیسہ اور ٹائم لگایا، سالوں محنت کی، اور وہ شخص کچھ دن کام کرکے پھر چلا گیا، میرے ساتھ بارہا ایسا ہوا ہے۔ یہ بات بھی غورطلب ہے کہ ایم وے کہتا ہے کہ پہلے آپ؛ خود سامان استعمال کریں، اور اگر آپ کو پسند آئے، تو دوسروں کو شیئر کریں، اور اس کے لیے ایم وے ۳۰؍دن کی سیٹسفکشن گارنٹی بھی دیتا ہے، اگر آپ کوئی سامان ایم وے سے لے کر استعمال کرتے ہیں، تو ۳۰؍دن تک، اور ۳۰/ فی صدی تک استعمال کرنے کے بعد آپ کو سامان پسند نہیں آتا، تو آپ سامان ایم وے کو واپس کرسکتے ہیں، ۱۰؍فی صدی ویٹ ٹیکس کاٹ کر ۹۰/ فی صدی پیسہ واپس ہو جاتا ہے۔ اس طرح کل ۲۱/ فی صدی تک منافع بٹتا ہے، نیچے کی ٹیم کی محنت کا پیسہ اُنھیں دے کر؛ اوپر کی ٹیم کی محنت کا پیسہ اُنھیں دیا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی ٹیم کو ۱۰؍لاکھ کا بزنس کرنا سکھانے میں مدد کرو، جب آپ کی کوئی ٹیم ۱۰؍لاکھ کا بزنس کرنا سیکھ جاتی ہے، مثلاً: ''اے'' نے ''بی'' یا ''سی'' کو ۱۰؍لاکھ کا بزنس کرنا سکھایا، تو ''اے'' بھی ۲۱/ فی صدی کا حصّے دار ہوا، اور ''بی'' یا ''سی'' بھی ۲۱/ فی صدی کا، اب ۲۱ میں سے ۲۱ گئے، تو زیرو (۰) بچا، اب کمپنی ''اے'' کو ''بی'' کے ۱۰؍لاکھ کے بزنس کا ۴/ فی صدی؛ یعنی: ۴۰۰۰۰؍روپے لیڈر شپ بونس دے گا، غورطلب ہے کہ ''بی'' کو ۱۰؍لاکھ کے بزنس پر ۸۰۰۰۰؍کی آمدنی ہوگی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ''بی'' کا بزنس ۱۰؍لاکھ سے کتنا بھی بڑھ جائے، چاہے کروڑوں میں ہو جائے، ''اے'' کو صرف ۱۰؍لاکھ کا ۴/ فی صدی؛ یعنی: ۴۰۰۰۰؍ہی ملے گا، جس مہینے سامان نہیں بکے گا، اس مہینے منافع نہیں ملے گا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی کو ۱۰؍لاکھ کا بزنس کرنا سکھانے کے لیے اس کے ساتھ سالوں محنت کرنا پڑتی ہے، پیسہ بھی خرچہ کرنا پڑتا ہے، اور ٹائم بھی ڈالنا پڑتا ہے، چاہے وہ بزنس ۱۰؍لاکھ سے بڑھ کر ۱۰؍کروڑ کا کیوں نہ ہو جائے، آپ کو صرف ۴۰۰۰۰؍ہی ملیں گے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر میں کسی کے ساتھ بزنس کررہا ہوں، اور وہ شخص میری کوششوں کے باوجود بھی کام نہیں کرپاتا، تو مجھے گھاٹا ہوگا؛ کیوں کہ میں نے اس کے ساتھ محنت کی، ٹائم لگایا اور پیسہ بھی خرچہ کیا، اور زیادہ تر بار ایسا ہی ہوتا ہے کہ میں کسی کے ساتھ کام کرتا ہوں، اور وہ کام نہیں کرپاتا، یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

ایک بات اور؛ کسی شخص کو ۱۰/لاکھ کا بزنس سکھانے کے بعد آپ کا کام وہاں ختم نہیں ہوتا؛ بل کہ آپ کو ہمیشہ وہاں کام کرنا پڑتا ہے، اور ''بی'' یا ''سی'' کے نیچے جاکر کام کرنا ہوتا ہے، ہاں! کام کی نوعیت بدل جاتی ہے؛ پر کام کرنا ہوتا ہے۔

ایم وے کمپنی یہ کبھی نہیں کہتی کہ ایک بار کام کرو، بار بار پیسہ آئے گا؛ بل کہ ایم وے کمپنی کا کہنا ہے کہ جتنا کام کروگے اُتنا پیسہ آئے گا۔

ایم وے بزنس کرنے کے لیے برٹ ورلڈ وائیڈ کمپنی (برٹ اسکول) بھی آپ کی مدد کرتی ہے، برٹ اسکول آپ کے پازیٹو مینٹل ایٹی ٹیوڈ کی کتابیں، سی ڈی اور سیمینار میں حصہ لینے کو کہتی ہے، جہاں آپ کا پیسہ خرچ ہوتا ہے، برٹ اسکول آپ کو سچائی اور ایمان داری سے کام کرنا سکھاتی ہے، مثلاً: یہ بات میں نے برٹ اسکول سے سیکھی کہ کوئی آپ کو گالی دے، تو آپ اُسے دعا دیتے ہوئے آگے نکل جاؤ۔ ایک بات قابل غور ہے کہ برٹ اسکول کے بغیر کوئی بھی شخص ایم وے بزنس نہیں کرسکتا ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص برٹ اسکول سے سیکھے بغیر ایم وے بزنس کرسکے۔ برٹ ایمان داری سے کام کرنا سکھاتا ہے۔ غور طلب ہے کہ پہلے جو لوگ برٹ اسکول سے نہیں جڑے، اور ایم وے کیا، اُنھوں نے لوگوں کے ساتھ دھوکا دھڑی کی، ایم وے کو بدنام کیا، اور آج ایم وے بزنس میں نہیں ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جو لوگ برٹ اسکول سے جڑے بغیر ایم وے کرتے تھے، اُنھوں نے لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا، اور یہاں تک کہا کہ ایک بار پیسہ لگاؤ؛ زندگی بھر پیسہ آئے گا، جب کہ ایم وے ایسا کبھی نہیں کہتا، ایم وے کا کہنا ہے کہ جتنی محنت کروگے اُتنا پیسہ آئے گا۔

ایم وے کے مالکوں کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے بزنس کا یہ سسٹم اس لیے ایجاد کیا ہے کہ ہر انسان؛ چاہے وہ غریب ہو یا امیر اس بزنس کو کرسکے، وہ شخص جس کے پاس پیسہ نہیں ہے؛ لیکن صلاحیت یا محنت کرنے کا جذبہ ہے، وہ بھی یہ بزنس کرسکتا ہے؛ کیوں کہ اس بزنس کو کرنے میں بہت کم پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، کمپنی جوائن کرنے میں تو کوئی پیسہ نہیں لگتا۔

محترم جناب! یہ تھی وہ تفصیل جو ایم وے کے بارے میں میں نے آپ کو بتائی، کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بزنس کرنا جائز نہیں ہے۔ جناب! میں نے فقہ اکیڈمی کا فتویٰ پڑھا، جس سے میں مطمئن نہیں ہوں؛ کیوں کہ اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ صحیح طریقے سے پیش نہیں کی گئیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:

فقہ اکیڈمی کی جانب سے اس تعلق سے کچھ سوالوں کے جواب دیے گئے ہیں، مجھے ان جوابوں پر کچھ تشویش ہے، مثلاً: اُس میں کہا گیا کہ نیچے کے خریداروں کی خریداری پر؛ اوّلین نیچے والوں کو جو نفع تقسیم کیا جا رہا ہے، اس کی شریعت میں کوئی نظیر نہیں ہے؛ کیوں کہ بعد والوں کے عمل اور محنت میں؛ پہلے خریدار کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، جب کہ بعد والے جتنے بھی لوگ محنت کر رہے ہیں، اُن کو سکھانے میں پہلے والے کا عمل دخل (محنت، وقت اور پیسہ) ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ بعد والوں کو سکھائے بغیر پہلے والا منافع کمائے؛ بل کہ میرے ذاتی تجربے سے تو ٹھیک اس کا الٹا ہوتا ہے کہ میں نے کئی لوگوں کے ساتھ محنت کی، کئی کلومیٹر تک موٹر سائیکل سے، ٹرین سے سفر کیا، اور مہینوں کی محنت کے بعد بھی اُس شخص نے بزنس چھوڑ دیا، جس سے مجھے نقصان ہوا۔

فقہ اکیڈمی نے یہ بھی کہا کہ مفت کے نفع کی امید میں اپنی اصل رقم بھی گنوا بیٹھتے ہیں، جب کہ اس میں پیسہ لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس میں تو سامان خریدنا ہوتا ہے، اور اگر وہ سامان پسند نہ آئے، تو کمپنی ۳۰؍دن کے اندر ۳۰/ فی صدی تک استعمال کیا ہوا سامان واپس لے کر ۱۰/ فی صدی ویٹ ٹیکس کاٹ کر باقی پیسہ لوٹا دیتی ہے۔

فقہ اکیڈمی نے یہ بھی کہا کہ ضرورت کی اشیاء بازار ریٹ سے مہنگی قیمت پر؛ مذکورہ کمپنی سے خرید کر دھوکا کھاتے ہیں، جب کہ دھوکا تو تب ہوتا ہے کہ کسی کو اندھیرے میں رکھا جائے، اس کمپنی کا سامان بے حد معیاری اور عمدہ قسم کا ہوتا ہے، جسے تیار کرنے میں کئی سائنٹسٹ؛ کئی سالوں تک ریسرچ کرتے ہیں، جس طرح دوسری دوائی بھی ریسرچ کرکے بازار میں اتارتے ہیں، اس کمپنی کے زیادہ تر سامان گاڑھے قسم کے ہوتے ہیں، جنھیں یا تو پتلا کرکے استعمال کرنا ہوتا ہے، یا پھر بہت کم تھوڑا استعمال کرنا ہوتا ہے۔

اگر کمپنی کے بتائے طریقے سے سامان استعمال کیا جائے، تو وہ آپ کو مارکیٹ سے بھی سستا یا کچھ اشیاء مارکیٹ ریٹ پر ہی پڑتی ہیں۔ (مثلاً: اس کا پوچھا لگانے کا لکوڈ ۴۵۰؍روپے کا ایک لیٹر ہے؛ لیکن وہ ایک لیٹر سے ۱۶۷؍لیٹر بن جاتا ہے، جو کہ ۲؍روپے ۷۰؍پیسے لیٹر ہوا، اتنا سستا پوچھا لگانے کا لکوڈ پورے مارکیٹ میں نہیں مل سکتا، اور کپڑے دھونے کا لکوڈ ایک لیٹر میں کیول ایک ملی لیٹر ڈلتا ہے، جو کہ مارکیٹ سے بھی سستا پڑتا ہے) ہمیں کمپنی یہ ٹریننگ دیتی ہے کہ گھر پر جاکر؛ لوگوں کو سامان استعمال کرنے کا صحیح طریقہ سکھائیں۔

جناب! ایک مسلمان کے لیے دنیا امتحان گاہ ہے، اور آخرت ہی اصل ہے، ظاہر ہے کہ میرے نزدیک بھی آخرت ہی اصل ہے، میرا یہ بزنس کرنے کی وجہ بھی یہ تھی کہ حلال رزق کما کر؛ خدا کی راہ میں خرچ کروں، اور آخرت بناؤں، میں اس بزنس کی طرف اس لیے مائل ہوا کہ یہ بہت ہی کم؛ نہ کے برابر پیسوں میں شروع ہو جاتا ہے، اور برٹ اسکول کے ذریعے اچھے اخلاق اور ایمان داری سے کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔

جناب! اگر یہ بزنس جائز نہیں ہے، تو میں آج ہی یہ کام بند کرنے کو تیار ہوں؛ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، اور جہاں تک میں ایم وے کی باریکیوں کو سمجھا ہوں، مجھے یہ ناجائز نہیں لگتا۔

برائے کرم میری راہ نمائی فرمائیں۔ جزاک اللہ خیرا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: ایم وے کمپنی کے ساتھ بزنس کی جو تفصیل آپ نے ذکر کی ہے، اور دیگر ذرائع سے اس کی جو صورتِ حال ہمارے سامنے آئی ہے، اس کے مطابق؛ عرض ہے کہ اس کمپنی کا طریقۂ کار؛ شرعی اصولوں پر قائم نہیں؛ لہٰذا مسلمانوں کو ایسی کمپنی کے ساتھ جڑنے اور دوسروں کو جوڑنے سے احتراز لازم ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۳ / رمضان / ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۸۵ / تتمہ رم، ۸ / ۱۱ / ۱۴۳۸م، ۱۴۳۸ھ)

اپلی کیشنز تیار کرنے والی کمپنی میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟

سوال: میرے بڑے بھائی سعودی عرب کے شہر ریاض میں ایک کمپنی میں HR (ایچ آر) کی پوسٹ پر کام کرتے ہیں، اس کا نام وصیل اپلی کیشنز ہے، یہ کمپنی درج ذیل سہولیات دیتی ہے:

health care provider\mobile applications\cloud solution\application development\maintain

(ہیلتھ کیئر پُروائیڈر، موبائل اپلی کیشنز، کلاوڈ سولوشن، اپلی کیشن ڈیولپمنٹ اور مینٹین)

اور یہ ہسپتال اور اِنشورنس کمپنی کے درمیان اپنی درخواست کے ذریعے سہولیات فراہم کرتی ہے،

تو کیا اب اس کمپنی میں میرے بھائی کو کام کرنا چاہیے یا نہیں؟ آپ سے گزارش ہے کہ آپ تحقیق فرما کر تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو اپیلی کیشنز صرف جائز کاموں میں استعمال ہوتے ہیں، یا تیار ہونے کے بعد وہ جائز وناجائز دونوں کاموں میں استعمال ہو سکتے ہیں؛ لیکن بعض لوگ اُن کا جائز استعمال کرتے ہیں، اور بعض لوگ ناجائز کاموں میں، تیاری میں کوئی ناجائز پہلو متعین نہیں، اور نہ ہی صرف اُس ناجائز استعمال کے مدنظر بنائے گئے، تو ایسے اپیلی کیشنز تیار کرنا، اور اُنھیں ڈیولپمنٹ کرنا، اور مینٹین وغیرہ کرنا شرعاً سب جائز ہے، اور ایسے اپیلی کیشنز کا آرڈر لینے، اور ان کی فروختگی وغیرہ کے سلسلے میں لوگوں سے رابطہ کرنا، اور اس سلسلے میں کوشش وغیرہ کرنا شرعاً سب جائز ہے، اور جو لوگ ایسے اپیلی کیشنز خرید کر؛ ناجائز کاموں میں استعمال کریں گے، وہ خود اس کے ذمے دار ہوں گے، بنانے والوں پر اس کی کوئی ذمے داری یا گناہ نہ ہوگا۔ (جواہر الفقہ جدید، آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام: ۷/۲۹۵-۲۹۷، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم، کراچی، آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید، تخریج شدہ: ۷/۶۰، مطبوعہ: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند، منتخبات نظام الفتاویٰ: ۳/۹۵-۹۶، مطبوعہ: ایفا پبلی کیشنز، دہلی)

اور جو اپیلی کیشنز ناجائز کاموں میں استعمال کے لیے تیار کیے جاتے ہیں، جیسے: انشورنس کمپنی اور ہسپتال کے درمیان روابط وغیرہ کے لیے، یا بینکنگ نظام وغیرہ کے لیے تیار کیے جانے والے اپیلی کیشنز: اُن کا بنانا، تیار کرنا اور فروخت کرنا، اور ان کے آرڈر وغیرہ کے لیے لوگوں سے رابطہ کرنا وغیرہ، ناجائز کاموں میں تعاون کی وجہ سے ناجائز ہے۔ (جواہر الفقہ قدیم: ۲/۲۴۴-۲۴۷، مطبوعہ: مکتبہ سیرت النبی، سید منزل، دیوبند، مستفاد: احسن الفتاویٰ: ۷/۳۱۷، مطبوعہ: دار الاشاعت، کراچی، منتخبات نظام الفتاویٰ: ۳/۳۳۳-۳۳۴)

اور سوال میں مذکور وصیل اپیلی کیشنز کمپنی میں ناجائز کاموں میں استعمال کیے جانے والے اپیلی کیشنز بھی تیار کیے جاتے ہیں، جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا، نیز کمپنی کی ویب سائٹ پر بھی موجود ہے، اور آپ کے بھائی؛ مذکورہ کمپنی میں جس عہدے پر ہیں، اُنھیں اس عہدے کی ذمے داری کے تحت ناجائز اپیلی کیشنز کے سلسلے میں بھی لوگوں سے رابطہ کرنا ہوتا ہوگا، جب کہ یہ ناجائز کام میں تعاون کی وجہ سے درست نہیں؛ اس لیے آپ کے بھائی کو چاہیے کہ وہ کوئی دوسری جائز ملازمت یا ذریعۂ معاش اختیار کریں، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔

قال اللّٰہ تعالی: ﴿وَلَاتَعَاوَنُوْا عَلَی الإِثْمِ وَالْعُدْوَان﴾ (سورۃ المائدۃ، رقم الآیۃ: ۲)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۲ء، چہار شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری-محمد مصعب عفی عنہ

(۶۲۷/ن، ۴۳۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

کمرشیل ٹیکس، رجسٹریشن اور اسٹامپ ریونیوسروس میں ملازمت کرنا

سوال: **(۱)** جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ٹیکس جمع کرنا گناہ ہے، تو میرا سوال یہ ہے کہ مغربی بنگال میں کمرشیل ٹیکس آفیسر کے طور پر ملازمت کرنا کیسا ہے؟

(۲) رجسٹریشن اور اسٹامپ ریونیوسروس میں ملازمت کرنے کے بارے میں کیا حکم ہوگا؟ بہ راہِ کرم وضاحت فرمائیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱)** کمرشیل ٹیکس؛ مثلاً: سیل ٹیکس، ویٹ ٹیکس؛ شرعی نقطۂ نظر سے ناجائز اور ناروا ٹیکس ہے، اور ظاہر ہے کہ اس طرح کے ٹیکس وصول کرنے یا کرانے کا عمل انجام دینا بھی ناجائز کام میں تعاون ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لیے ٹیکس آفیسر کے عہدے پر ملازمت کرنا؛ اصولاً جائز نہیں ہے؛ البتہ اگر کوئی مسلمان؛ اس نیت سے یہ ملازمت اختیار کرے، یا اس پر برقرار رہے کہ اگر مسلمان اس سے الگ ہو جائیں گے، تو غیر مسلم اُن کی جگہ ملازم ہوکر مسلمانوں کو بہت تنگ کریں گے، تو اس نیت سے ایسی ملازمت کرنے پر ان شاء اللہ مواخذہ نہ ہوگا، اور امداد الاحکام میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھا گیا:

''ملازمت چنگی کے اکثر افعال خلافِ شرع اور ناجائز ہیں؛ لہٰذا فی نفسہ یہ ملازمت حرام ہے؛ لیکن اگر اس نیت سے اس کو اختیار کیا جائے کہ مسلمان اس سے الگ ہو جائیں گے، تو ان کی جگہ ہندو ملازم ہوکر مسلمانوں کو بہت تنگ کریں گے، تو اس نیت سے یہ ملازمت کرنا امید ہے کہ باعثِ مواخذہ نہ ہوگی؛ بہ شرطے کہ مسلمانوں کو نفع پہنچانے کی، اور ضرر سے بچانے کی کوشش بھی کی جائے، محض اپنا ہی نفع مقصود نہ ہو۔ واللہ اعلم''۔ (امداد الاحکام: ۵۳۱/۳، ط: کراچی)

امدادالاحکام ہی میں ایک دوسرے سوال -جو اسی نوعیت کا ہے- کے جواب میں بہ طور علت یہ تحریر فرمایا:

و هـذا داخـلٌ تحت أصلٍ كُلّي: وهو أن ضرر الخاصّ يتحمَّل؛ لدفع ضررٍ عامٍّ، وفـرَّعُـوا عليه جواز الرَّمي إلى كُفَّار تترسُوا بصِبيان المُسلمين وأُسَاراهم. (أشباه) **فالرَّميُ إلـى صِبيان المُسلمين و أُسَاراهم حرامٌ؛ و لكن جَاز؛ لإزالة الضَّرر عن عامَّة المُسلمين، فافهم.** واللہ تعالیٰ اعلم۔ (امدادالاحکام: ۵۵۳/۳، ط: کراچی)

(۲) ملکیت وغیرہ کے تحفظ کے پیشِ نظر زمینوں کی رجسٹری کا نظام شرعاً جائز؛ بل کہ مستحسن ہے، اور رجسٹری کے نام پر جو فیس وصول کی جاتی ہے، اس کی بھی شرعاً گنجایش ہے؛ کیوں کہ یہ فیس؛ ریکارڈ وغیرہ محفوظ رکھنے، اور اس سے متعلق دیگر کاموں کا معاوضہ شمار ہوگی؛ البتہ زمینوں کی خرید وفروخت پر اسٹامپ پیپر کے عنوان سے ایک بڑی رقم مشتری سے وصول کرنا؛ ایک طرح کا ظلم ہے؛ اس لیے ثانی الذکر کام؛ اصولاً ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے، اس سے بچ کر اگر ریونیو سروس میں ملازمت کی جاسکتی ہو، تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں؛ ورنہ یہ ملازمت بھی اصولاً ناجائز ہے، باقی اگر مقصود مسلمانوں کو نفع رسانی ہو، اور عملاً اس کی کوشش بھی کی جائے، تو سوالِ اول میں مذکور؛ ملازمت کی طرح اس شعبے میں بھی ملازمت کی گنجایش ہوگی؛ لیکن بہ ہر حال آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالی سے استغفار بھی کرتا رہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۱۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- فخر الاسلام عفی عنہ

محمد مصعب عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۲۸/تتمہ/د، ۱۳۳۹/د، ۱۴۳۸ھ)

ٹریفک قوانین کی پابندی نہ کرنے والے پر جرمانہ عائد کرنے والی کمپنی کے ساتھ شراکت کا حکم

سوال: حضرت! میں نے آن لائن بزنس شروع کیا ہے، یہ UK (برطانیہ) کی کمپنی ہے، جو بندہ بھی UK میں ٹریفک قوانین کی پابندی نہیں کرتا، یہ کمپنی اس پر جرمانہ لگاتی ہے، اور یہ جرمانہ

حکومت کو دیتی ہے، اور حکومت پھر اس کمپنی کو ۴۰ر فی صد اُن جرمانوں کا بدلا دیتی ہے، اور اُن میں سے پھر کمپنی مجھے ایک فی صد سے تین فی صد دیتی ہے، یہ نہ تو ایک فی صد سے کم ہوتا، اور نہ ہی تین فی صد سے زیادہ ہوتا ہے؛ بل کہ کبھی ایک فی صد، کبھی ڈیڑھ فی صد، اور کبھی پونے دو فی صد، اور کبھی پونے دو فی صد سے زیادہ؛ تین فی صد تک ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ نہیں ہوتا، اور یہ فی صد روزانہ بدلتا رہتا ہے، اور ان فی صد کے اپنے پیسے ہیں، جس دن جو فی صد ہوتا ہے، اس کے مطابق پیسہ ہوتا ہے، میں نے اس کمپنی میں ۳۰۰۰ر روپے انویسٹ کیا ہے، اور اُن پیسوں سے یہ کمپنی مشین خریدتی ہے، جو میں نے انویسٹ کیا ہے، اور پھر وہ مجھے فی صد کے حساب سے پیسہ دیتی ہے، مجھے یہ پوچھنا ہے کہ کیا اس میں سود کی کوئی شکل تو نہیں بنتی ہے؟ آپ مجھے اس کا جواب بتادیں، میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا، دوسری بات یہ ہے کہ کیا یہ جو ایک فی صد سے تین فی صد تک اُنھوں نے رکھا ہے، مینج کرنے (سنبھالنے) کے لیے؛ تاکہ زیادہ فائدہ یا نقصان نہ ہو، اور ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ ایک ہی بار میں کمپنی ڈاؤن ہو جاتی ہے، اور سارا پیسہ نقصان میں ختم ہو جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: **حامداً ومصلّیا ومسلّما**: اگر کمپنی کا کام؛ صرف ٹریفک قوانین کی پابندی نہ کرنے والے پر جرمانہ عائد کرنا ہے، تو اس کمپنی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرنا درست نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۲۸ر ل، ۸۷۱ر ل، ۱۴۳۸ھ)

تقسیمِ ترکہ سے پہلے اگر وارثین نے اس سے کاروبار کیا تو نفع حسبِ وراثت سب کا ہوگا یا صرف کاروبار کرنے والوں کا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں: اگر مالِ وراثت میں تقسیم سے پہلے؛ کسی کے قبضہ وتصرف کے توسط سے بڑھوتری ہو جائے، تو کیا یہ بڑھوتری؛ مالِ وراثت میں شامل ہوکر ہر ہر وارث کا حصہ ہوگا یا نہیں؟

صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ زید نے انتقال کیا اور اس نے وراثت میں سو روپیہ چھوڑا، اب تک یہ سو روپیہ تقسیم نہیں ہوا کہ عمرو نے اس سو روپے میں تجارت کی، جس کے سبب پچاس روپے کی بڑھوتری ہوئی، تو کیا یہ پچاس روپیہ مال وراثت میں شامل ہوکر ہر ہر وارث کا حصہ ہوگا یا نہیں؟

جب کہ فتاویٰ کی کتابوں میں کہیں مال وراثت میں شامل ہونے اور کہیں نہ ہونے کا فتویٰ ہے، آپ حضرات سے مودبانہ عرض ہے کہ مسئلہ مذکور کے مفتی بہ قول؛ معلوم کراکے شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر تقسیمِ ترکہ سے پہلے کسی وارث نے مورِث کے ترکے سے نقد رقم لے کر اُس سے کوئی کاروبار کیا تو اولاً اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کسی وارث نے مشترکہ ترکے سے نقد رقم لے کر سب وارثین کے لیے ان کی اجازت و رضامندی سے کاروبار کیا اور باقاعدہ عقدِ شرکت کے تحت کاروبار کیا، اس صورت میں کاروبار اور اس کا نفع؛ تمام وراثین کے درمیان مشترک ہوگا، کوئی ایک وارث تنہا اس کاروبار کا یا اس کے نفع کا مالک نہیں ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی وارث نے مشترکہ ترکے سے نقد رقم لے کر صرف اپنی ذمے داری پر اپنے لیے کاروبار کیا، اس کی دو شکلیں ہیں:

ایک شکل یہ ہے کہ اپنا کاروبار کرنے والے وارث نے مشترکہ ترکے کی وہ رقم دیگر وارثین کی اجازت سے لی، اور اس وضاحت کے ساتھ لی کہ میں اس سے اپنا ذاتی کاروبار کروں گا اور آپ لوگوں کو آپ کی رقمیں واپس کردی جائیں گی، اس صورت میں یہ رقم قرض ہوگی اور کاروبار اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی، صرف کاروبار کرنے والے وارث کی ہوگی، دوسرے وارثین کا کاروبار اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کوئی حق وحصہ نہ ہوگا، گویا دیگر وارثین نے اپنے اپنے حصّے کی رقم کاروبار کرنے والے ساتھی کو بہ طور قرض دی اور اس نے کاروبار محض اپنی ذمے داری پر کیا اور اپنے لیے کیا؛ البتہ اس صورت میں یہ ضروری ہوگا کہ قرض دینے والے دیگر سب وارثین عاقل و بالغ ہوں اور محض اپنی مرضی وخوشی سے قرض دیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ تقسیمِ ترکہ سے پہلے کسی وارث نے مشترکہ ترکے سے جو رقم لی، وہ دیگر وارثین کی اجازت و رضامندی کے بغیر لی، یعنی: قرض وغیرہ کا کوئی معاملہ نہیں کیا، اس شکل میں دوسرے ورا ثین کے حصّے کی رقم بہ حکم غصب ہوگی، جس کا اس وارث پر ضمان واجب ہوگا، اور اُس رقم سے جو کاروبار کیا، اور اس کا نفع؛ صرف کاروبار کرنے والے وارث ہی کا ہوگا؛ لیکن چوں کہ اس نے اپنے حصّے کے ساتھ غصب کا مال بھی کاروبار میں لگایا ہے؛ اس لیے دوسروں کے حصّے کی رقم؛ کاروبار میں لگا کر جو نفع حاصل کیا، وہ پاکیزہ نہ ہوگا؛ بل کہ خبث والا ہوگا، جو صدقہ کر دینا چاہیے، اور اگر دیگر وارثین کو ان کا اصل حصہ ادا کرنے کے بعد استعمال کرے، تو گنجایش ہوگی۔

پس صورتِ مسئولہ میں اوپر ذکر کردہ صورتوں میں سے جو صورت پیش آئی ہو، کاروبار کے نفع کا حکم اُس کے مطابق ہوگا۔

رجلٌ مات وترك الورثة، فتصرَّف أحدُ الورثة في المَال بالتِّجَارة، فتزايد المال، فـالقَاضي يقسِّم أصل المَال على فرائض اللّٰه تعالى لافرعه. (أحسن الفتاوی: ۹/۲۸۵-۲۸۶، مطبوعة: ايچ ايم سعيد، كراچي، به حواله: ذخيرة)

لـو تـصرَّف أحدُ الورثة في التَّركة المُشتركة و ربح، فالرِّبحُ للمُتصرِّف وحده، كذا في الفتاوى الغياثية. (الفتاوى الهندية، كتاب الشركة، الباب السادس في المتفرقات، مطلب: لو تصرف أحد الورثة في التركة فالربح له خاصة: ۲/۳٤٦، ط: المطبعة الكبرى الأميرية، بولاق، مصر)

تـقسـم التَّـركة ونـمـاؤها بين ورثة الأب، فما أصَاب كلُّ واحدٍ يكون لكلٍّ وارثه بعده، وما حصله الأولادُ المذكُورون بعد موت أبيهم بعملهم فيالمَال المُشترك، إن كان ذلك لأنـفُسِهـم خاصَّةً بدُون إذن باقي الورثة يكون لهم دون البَاقي، ويـكونُون ضامنين لأنـصِبـاء باقي الورثة من أصل المورُوث، وإن كان ذلك للجميع بإذن البَاقي يكون مـا تحصل مُشتركاً بين الكلِّ كأصله، وليس لأحدهم الاختصاصُ بشيءٍ من ذلك بدون مُخصِّصٍ شَرعيٍّ إلخ. (الـفتـاوى الـمهدية، كتاب الشركة، بعد مطلب: الإقرار بالمحال باطل إذا كان محالاً من كل وجه: ۲/۲۸۹-۲۹۰، ط: مصر، المكتوب في الثامن عشر من جمادى الأولى من سنة: ۱۲٦٥ الهجرية)

وفي الجواب الآخر عن مثل هذا السُّؤال:

تـقسـم التَّركة الأصليَّة بين جميع ورثة الميِّت الأوّل بالفريضة الشَّرعيَّة، وكذا

ما نـمَتـه التَّركة، وأمَّا ما حدث بتنمية بعض الورثة؛ فإن كـان لنفسه بدُون إذن باقيهم يكـون مُـختـصاً به؛ لغصبه نصيب شُركائه باستعماله بدُون إذنهم، وعليه ضِمان أنصِباء باقي الشُّركاء ممَّا تصرَّف فيه من المَال المُشترك، سواءٌ كان المنمي واحداً أو مُتعدِّداً، و إن كان بإذن البَاقي على أنَّه للجَميع يكون مُشتركاً بين الكلِّ. (المصدر السابق، ص: ٤١٠، المكتوب في الثلاثين من رجب من سنة: ١٢٧٧ الهجرية) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۱۲/۲۶ھ = ۲۰۱۷/۹/۱۸ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۴۲۳/تتمہ/ن، ۱۴۳۰/ن، ۱۴۳۸ھ)

مضارب کا کاروبار میں اپنا یا کسی دوسرے کا سرمایہ شامل کرنے اور اُس کا نفع لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

زید نے ایک شخص سے یا کئی لوگوں سے ایک لاکھ روپے بہ طور مضاربت لیے، اور دونوں فریق (رب المال اور مضارب) کا نفع پچاس، پچاس فی صد طے پایا، زید نے اس مال میں ۲/لاکھ روپے اپنے ذاتی اور ملا لیے، اور کل رأس المال؛ یعنی: تین لاکھ کی ایک زمین خرید کر ۹۰/ ہزار کے نفع کے ساتھ فروخت کردی، اور پھر دوتہائی منافع؛ یعنی: ۶۰/ ہزار اپنے رأس المال کے حساب سے لیا، اور باقی ۳۰/ ہزار کا نصف؛ یعنی: ۱۵/ ہزار بہ حیثیت مضارب لیے، اور باقی کل ایک لاکھ ۱۵/ ہزار رب المال کو اُس کے رأس المال کے ساتھ ادا کردیے، از روئے شرع اس طرح کے معاملے کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: صورتِ مسئولہ میں زید مضارب ہے، اور جس شخص نے یا جن لوگوں نے زید کو بہ طور مضاربت کاروبار کے لیے نصف نصف نفع پر پیسہ دیا ہے، وہ رب المال ہیں، اور مضاربت میں مضارب کو اپنا یا کسی دوسرے کا سرمایہ؛ کاروبار میں شامل کرنے کا حق نہیں ہوتا ہے؛ البتہ اگر رب المال اجازت دے دے، یا کہہ دے کہ تم اپنی سمجھ سے کاروبار کرو، یا تاجروں کے یہاں پیسہ شامل کرنے کا عرف ورواج ہو، تو جائز ہے؛ اس لیے صورتِ مسئولہ میں زید نے اگر رب المال کی

اجازت سے، یا رب المال کے اختیار دینے کی وجہ سے، یا عرف کی وجہ سے اپنا پیسہ کاروبار میں ملایا ہے، تو سوال میں ذکر کردہ معاملہ شرعاً بھی صحیح و درست ہے، اور دونوں فریق نے باہم جس تناسب سے نفع تقسیم کیا ہے، وہ بھی صحیح و درست ہے۔

لایملكُ المُضاربُ المُضاربة والشِّركة بمَال نفسه؛ إلا بإذن أو اعمل برأيك؛ إذ الشَّيءُ لايتضمَّن مثله. (الدرالمختار مع رد المحتار، كتاب المضاربة: ۸ / ۴۳۵–۴۳۶، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

قولُه: (والخَلطُ بمَال نفسِه:) أي: أو غيره كما في البحر؛ إلا أن تكون مُعاملة التُّجار في تلك البلاد أن المُضاربين يخلطُون ولاينهونهم، فإن غلب التَّعارُف بينهم في مثله وجب أن لايضمن كما في التَّاترخانية. (رد المحتار) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۱۲/۲۲ھ = ۲۰۱۷/۹/۱۴ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۴۴۳/ن، ۱۴۲۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

سرمایہ لگائے بغیر نفع میں شریک ہونا کیسا ہے؟

سوال: زید کا ایک تالاب ہے، عمر و بکر نے آٹھ آٹھ ہزار جمع کر کے؛ اس میں مچھلی چھوڑی ہے، تالاب کے کنارے کی مرمت اور مچھلی کی خوراک کے بابت مزید دو ہزار روپے خرچ ہوئے، عمر و بکر نے ایک ایک ہزار کر کے دیے، زید و عمر تالاب میں اترتے ہیں، کھانا کھلاتے ہیں، دیکھ بھال کرتے ہیں، بکر کوئی کام نہیں کرتا، خوشی سے ان کو چائے ناشتہ بابت پچاس روپے دیتا ہے، اور معاملہ اس طرح طے پایا کہ مچھلی بیچ کر جو رقم آئے گی، تین حصوں میں تقسیم ہو کے سب کو برابر برابر ملے گی، آیا معاملہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو صحیح صورت کی طرف راہ نمائی فرمائیں، جب کہ زید اس کو کرایے پر دینے کے لیے تیار نہیں، اور برابری کا حصہ بھی مانگنے پر مشکل سے ۲۰۰۰/روپے دے گا؛ اگر اصرار کر کے مانگا جائے، دو ہزار روپے میں اگر وہ برابر کے حصّے کا حق دار بنتا ہے، تو فبہا؛ ورنہ بکر اپنے سے اُس کو مزید رقم ہبہ کے طور پر دینے کو تیار ہے؛ مگر حلال رزق کھانا چاہتا ہے، امید ہے کہ مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: شرکت کے معاملے کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر شریک سرمایہ لگا کر شرکت کرے، سرمایہ لگائے بغیر شرکت صحیح نہیں ہوتی؛ ہاں البتہ ہر ایک کا سرمایہ برابر لگانا ضروری نہیں ہے، باہمی رضامندی سے سرمایے میں کمی وبیشی کے ساتھ بھی نفع میں برابری جائز ہے، اور صورتِ مسئولہ میں زید کا کچھ بھی سرمایہ نہیں لگا ہے؛ اس لیے وہ شریک نہیں کہلائے گا، اور نہ وہ نفع کا حق دار ہے؛ اس لیے آپ لوگ یا تو زید سے تالاب کے کرایے کا معاملہ کرلیں، اور اسے مقررہ کرایہ دے دیں، اس صورت میں زید مزید نفع کا حق دار نہیں ہوگا، یا زید نقد سرمایہ لگانے پر تیار ہو، تو سرمایہ لگانے پر شرائط کے مطابق نفع کا حق دار ہوگا۔

و تصحُّ مع التَّفاضُل في المَال، دُون الرِّبح و عكسِه. (الدر المختار: ٦/ ٤٨٤، ط: مکتبة زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/ ۸/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۵۷/ د، ۱۹/ د، ۱۴۳۸ھ)

دوسرے کی ذمے داری پر کسی کاروبار میں شرکت کی اور پیسہ ڈوب گیا تو ذمے دار کون ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ شرع متین درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

مجھے میرے ایک عزیز نے بتایا کہ فلاں صاحب؛ الیکٹرانک اشیاء کا کاروبار کرتے ہیں، آپ اُن کے ساتھ کاروبار میں پیسہ لگا سکتے ہیں، میں نے اُس عزیز کی بات پر اطمینان کیا، اور سرمایہ کاری کے لیے اُن کی ذمے داری وگواہی پر؛ میں نے فلاں صاحب کو پہلے پندرہ لاکھ روپے دیے، اُنھوں نے اُس کا ہمیں منافع دیا، اس کے بعد ساری رقم وصول کر لی گئی، اور معاملہ ختم ہوگیا، پھر دوسری مرتبہ میں نے سرمایہ کاری کے لیے بیس لاکھ روپے دیے، اور اِس میں بھی میرے عزیز نے ذمے داری لی، اور چند ماہ مجھے نفع ملا، اس کے بعد میں نے مزید تیس لاکھ روپے دیے، اس میں بھی میرے عزیز نے

ذمے داری لی، اس وقت اُن صاحب کے پاس میرے کل پچاس لاکھ روپے ہیں، اب صورتِ حال یہ ہے کہ جن کو میں نے سرمایہ کاری کے لیے پیسہ دیا تھا، وہ غائب ہیں، اور مجھے نہ کوئی نفع دے رہے ہیں، اور نہ ہی میرا پیسہ واپس کررہے ہیں۔

دریافت یہ کرنا ہے کہ کیا اس صورت میں ہم ذمے داری لینے والے عزیز کو اپنی رقم کا ذمے دار ٹھہرا سکتے ہیں، اور ان سے اپنے سرمایے کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟ کیوں کہ میں نے اُن کے اعتماد پر ہی رقم لگائی ہے، اور اُنھوں نے لگائی گئی رقم کی ذمے داری بھی لی ہے، اور وہ کاروبار کرنے والے سے کمیشن بھی لیتے رہے ہیں، جس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ ساری رقم میرے واسطے سے لگی تھی؛ اس لیے مجھے صاحبِ کاروبار کمیشن دیتا رہا۔

برائے کرم! شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جواب عنایت فرماکر ممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورتِ مسئولہ میں آپ نے کسی صاحب کے ساتھ سرمایہ کاری کا جو معاملہ کیا، وہ شریعت کی رو سے مضاربت کا معاملہ ہے، اور مضاربت میں مضارب کے پاس؛ رب المال (سرمایہ دینے والا) کا جو سرمایہ ہوتا ہے، وہ بہ حکم امانت ہوتا ہے، اور امانت کی چیز مضمون نہیں ہوتی، اور اگر کوئی دوسرا شخص اُس کی ذمے داری لے، یعنی: اصل شخص کے؛ سرمایہ واپس نہ کرنے کی صورت میں، وہ اپنی جیب سے سرمایے کے بہ قدر؛ رقم ادا کرنے کی ذمے داری لے، تو یہ ذمے داری لینا؛ شریعت کی نظر میں معتبر نہیں ہوتا؛ اس لیے صورتِ مسئولہ میں آپ مضارب کے بجائے اپنے عزیز سے سرمایے کی رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتے؛ لہٰذا آپ صرف مضارب سے اپنے سرمایے کا مطالبہ کریں، اور آدمی کو اس طرح کے معاملات میں مکمل تحقیق اور اطمینان کے بعد اپنی ذمے داری پر ہی کوئی قدم اٹھانا چاہیے، محض دوسرے کی ذمے داری اور اس کے اطمینان دلانے پر اتنا بھاری قدم نہیں اٹھانا چاہیے؛ البتہ آپ اپنے عزیز سے بہ طور درخواست یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ نے اس سرمایہ کاری میں مجھے اطمینان دلایا تھا، تو اگر آپ سرمایے کی وصول یابی میں میرا تعاون کریں، تو بہتر ہوگا۔

اور اگر آپ کے عزیز نے پوری صورتِ حال جانتے ہوئے آپ کو پھنسایا ہے، تو اُنھوں نے یقیناً آپ کے ساتھ غلط کیا، دنیا میں معافی تلافی نہ کرنے کی صورت میں؛ اُنھیں آخرت میں اِس کا انجام بھگتنا ہوگا۔

اعلم أن الأعيان إمَّا مضمُونةٌ على الأصيل أو أمانةٌ، فالثَّاني كالوديعة ومال المُضاربة و الشِّركة و العَارية و المُستأجر في يد المُستأجر، والمضمُونة إمَّا بغيرها كالمَبيع قبل القَبض و الرَّهن؛ فإنَّهما مضمُونان بالثَّمن والدَّين، وإمَّا بنفسها كالمبيع فاسداً و المقبُوض على سوم الشِّراء و المغصُوب ونحوه ممَّا تجبُ قيمتُه عند الهلاك، و هذا تصحُّ الكفالةُ به، كما يذكره المُصنِّفُ دون الأوّلين؛ لفقد شرطها، و هو أن يكون المكفُول مضمُوناً على الأصيل لا يخرج عنه إلا بدفع عينه أو بدله، هذا خلاصة ما في البحر وغيره. (رد المحتار، كتاب الكفالة: ۷/ ۵۹۰، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۹/ ۷/ ۱۴۳۸ھ = ۱۷/ ۴/ ۲۰۱۷ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۷/ تتمہ/ ن، ۸۲۸/ ن، ۱۴۳۸ھ)

آن لائن کپڑے کی خرید وفروخت میں خیارِ رؤیت کا حکم اور واپسی کی صورت میں کوریئر سروس کے چارج کا ذمے دار کون ہوگا؟

سوال: آن لائن کپڑا خریدنے کی صورت میں صرف تصویر دیکھ کر کپڑا خرید لیا جاتا ہے، جب کپڑا کوریئر سروس کے ذریعے وصول ہو جائے، اور مشتری کو پسند نہ آئے، تو کیا واپس کرنے کا اختیار ہوگا؟ نیز واپسی پر کوریئر سروس کے چارجز کس کے ذمے ہوں گے؟ بائع کے یا مشتری کے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: آن لائن کپڑے کی خریداری میں مشتری نے نیٹ پر کپڑے کی تصویر دیکھی، اور کپڑا خرید لیا، تو مشتری کو جب کوریئر سروس سے، یا بائع کے پہنچانے سے، یا کسی اور طرح کپڑا وصول ہوگا، تو اسے خیارِ رؤیت حاصل ہوگا، یعنی: مشتری کو کپڑا دیکھنے کے بعد پسند نہ آنے کی وجہ سے کپڑا واپس کرنے کا اختیار ہوگا؛ کیوں کہ کپڑے کا فوٹو وغیرہ دیکھنے سے؛ اگرچہ ایک حد تک مبیع کی کیفیت معلوم ہوجاتی ہے؛ لیکن یہ عینِ شے کا دیکھنا نہیں ہے؛ البتہ واپسی پر کوریئر سروس کا چارج مشتری کے ذمے ہوگا، بائع کے ذمے نہ ہوگا۔

لا – يكفِي– رُؤيةُ دهن في زُجاج لوجُود الحائل. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب البيوع، باب خيار الرؤية: ۱۵۹/۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) قوله: (لوجُود الحَائل) فهو لم يَر الدّهن حقيقةً، وفي التُّحفة: لو نظر في المِرآة فرأى المَبيع، قالُوا: لا يسقُط خيارُه؛ لأنّه ما رأىٰ عينَه؛ بل مثاله. (رد المحتار)

من اشترىٰ شيئًا لم يَره فله الخِيارُ إذا رآه، إن شاء أخذه بجميع الثّمن، و إن شاء ردَّه، سواءٌ رآه على الصِّفة التي وصفت له أو على خلافها، كذا في فتح القدير.
(الفتاوى الهندية، كتاب البيوع، الباب السابع في خيار الرؤية: ۵۷/۳–۵۸، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

ولو رأىٰ ما اشتراهُ من وراءِ زُجاجةٍ أو في مرآةٍ أو كان المَبيعُ على شفا حوضٍ فنظَره في المَاء فليس ذلك برؤيةٍ، و هو على خياره، كذا في السِّراج الوهَّاج.
(المصدر السابق، ص: ٦٣) و مؤونةُ ردِّ المَبيع بعيبٍ أو بخيار شرطٍ أو رُؤيةٍ على المُشتري.
(المصدر السابق، ص: ٦٣، ورد المحتار: ۱۵۱/۷، عن البحر عن جامع الفصولين) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۲/۶ھ = ۲۰۱۶/۱۱/۷ء، دوشنبہ
الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ
(۸۹/ن، ۱۰۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

ایجنٹ غلط ویزا بنادے تو ویزے اور ٹکٹ وغیرہ کی رقم کا کون ذمے دار ہوگا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایجنٹ کے ذریعے ویزا لگوایا، اور ٹکٹ وغیرہ بنوایا، مسافر اُس ٹکٹ، ویزے کے ذریعے سفر میں نکل گیا، جدہ ایئرپورٹ پر مسافر کو روک لیا کہ ویزا غلط ہے، ہمارا کمپیوٹر نہیں دکھا رہا ہے؛ چناں چہ مسافر جدہ سے ویزا غلط ہونے کی وجہ سے واپس کر دیا گیا، تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ویزے، ٹکٹ وغیرہ کا خرچ؛ از روئے شریعت کس کے ذمے ہوگا؟ مسافر کے یا ایجنٹ کے؟ جواب سے مطلع فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اس میں غلطی ایجنٹ کی ہے؛ اس لیے اُسی ایجنٹ کے ذمے ویزے، ٹکٹ وغیرہ کا خرچ ہوگا، مسافر کو چاہیے کہ وہ ایجنٹ سے وصول کرے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۶/ب، ۱۴/ب، ۱۴۳۸ھ)

ہسپتال والوں سے نقصان کا معاوضہ لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عظام مندرجہ ذیل مسئلے میں:

مریض کو ایک ہسپتال میں برائے علاج بھرتی کیا، اور جس ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے بھرتی کیا تھا، وہ ڈاکٹر موجود ہی نہ تھے، صرف کمپاؤنڈر نے مریض کو ایڈمٹ کر لیا، کچھ دیر بعد ہمارے مریض کی حالت بگڑ گئی، اور وہ انتقال کر گئے، جس پر ہمارے لوگ بگڑ گئے، ہسپتال میں توڑ پھوڑ کر دی، اُدھر ہسپتال والوں نے ہمارے خلاف پولیس کارروائی کر دی، اور ہم نے بھی ان کے خلاف کارروائی شروع کر دی تھی، بات طول پکڑ گئی، بعد میں پھر سمجھوتا ہوا، تو مالکِ ہسپتال نے دو لاکھ روپے دیے، اور اپنی غلطی تسلیم کی، ہم نے دو لاکھ روپے ایک مدرسے میں دے دیے۔

اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم پر، یا ہمارے مرحوم والد پر؛ آخرت میں اُن دو لاکھ روپے لینے کا کوئی مواخذہ تو نہ ہوگا؟ بہ راہِ کرم جواب مرحمت فرمائیں؛ تفصیل کے ساتھ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اگر واقعی ہسپتال والوں کی کوتاہی ہے، اور اُنھوں نے اپنی کوتاہی کی تلافی کے لیے دو لاکھ روپے دیے ہیں، تو اُن روپیوں کا لینا درست ہے، آپ سے، یا آپ کے والدِ مرحوم سے آخرت میں ان شاء اللہ کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۹۲/ب، ۸۹/ب، ۱۴۳۸ھ)

بینک کی ملازمت اور اس پر اجرت لینے کا حکم

سوال: ہمیں حکومت تنخواہ دیتی ہے اور ہم حکومت کے لیے کام کرتے ہیں، جو بنیادی سسٹم کے حساب سے ربا پر کام کرتی ہے، کیا اس کے لیے کام کرنا سسٹم کو فروغ دینا نہیں ہے؟ کیا ہماری تنخواہ حلال ہوتی ہے؟ مثال کے طور پر: علماء کہتے ہیں کہ بینک میں کام کرنا حرام ہے؛ اگر چہ مالک بہ راہِ راست کوئی ربا نہیں لے رہا ہے؛ کیوں کہ بینک کا سسٹم ربا پر ہے اور بینک کے ساتھ کام کرنا اس کو فروغ دینا ہے، اسی طرح حکومت کے لیے کام کرنا ایک مسئلہ بن سکتا ہے؛ اگر چہ میں بہ راہِ راست ربا میں ملوث نہیں ہوں؟ ممکن ہے کہ کسی ایسے ادارے میں کام کرنے میں بھی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے اگر اس کا بنیادی ذریعۂ آمدنی غیر حلال وغیرہ سے آئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک میں کام کرنے کو علماء مطلقاً منع نہیں کرتے ہیں؛ بل کہ سودی حساب کتاب لکھنے والے یا روپے چیک کرنے والے کے لیے نوکری کرنے کو منع فرماتے ہیں؛ کیوں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے سود کھلانے والے پر، اس کا حساب لکھنے والے پر اور اس کی گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

عن جابر رضي اللّٰه عنه قال: لعن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم آکل الربا وموکله وکاتبه وشاهدیه، وقال: هم سواء. (صحیح مسلم، کتاب الربا: ۲/۲۷، ط: اتحاد، دیوبند)

اگر کوئی چوکی داری یا صفائی وغیرہ کا کام کرتا ہے تو اس کے لیے نوکری کی اجازت ہے؛ البتہ تقویٰ یہ ہے کہ ہر قسم کی نوکری بینک میں کرنے سے احتیاط کریں۔

عن عامر قال: سمعت النعمان بن بشیر یقول: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: الحلال بیّن والحرام بیّن وبینهما مشتبهات لا یعلمها کثیر من الناس، فمن اتقی المشتبهات استبرأ لدینه وعرضه، ومن وقع في الشّبهات کراع یرعی حول الحمی یوشك أن یواقعه. (صحیح البخاري، کتاب الإیمان: ۱/۱۳، رقم الحدیث: ۵۲، ط: اتحاد، دیوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۸۵/ب، ۳۷۷/ب، ۱۴۳۸ھ)

بینک میں بہ حیثیت ایچ آر آفیسر ملازمت کرنا کیسا ہے؟

حضرت! سوال عرض ہے کہ اس این جی او (ngo) سے استعفیٰ دینے کے بعد میں سرکاری نوکری کی تیاری کرنے لگا، مجھے یکم اپریل/۱۷/۲۰۱۷ء کو ایک سرکاری بینک (جو کمرشیل بینک کی قسموں میں آتا ہے جیسے: سینٹرل بینک آف انڈیا، ایچ ڈی ایف سی بینک، کینرا بینک وغیرہ) سے مجھے نوکری کا آفر ہوا ہے؛ بہ حیثیت ایچ آر آفیسر (hr officer)، ایچ آر آفیسر کی نوکری میں ہمیں بینکنگ سے متعلق کام نہیں کرنا ہوتا ہے، جیسے کہ بینک کے کلرک یا مینیجر کرتے ہیں، ہمارا کام بینک کے ملازمین سے متعلق ہوتا ہے، بس بینکنگ کام جیسے کہ ڈپازٹ کا لینا، لون کا قرض لینا، اکاؤنٹ کی کتابوں کو برقرار رکھنا وغیرہ ایک دم نہیں ہوتا، مثال کے طور پر: ملازم کی پوسٹنگ، ٹرانسفر، ٹریننگ پروگرام کا بندوبست کرنا، پرموشنل (یعنی: ترقی) مشقوں کا انعقاد، ڈیزائننگ پارک اور اس کے فوائد، ریٹائرمنٹ فائدے کے انتظام، عملے کی کارکردگی کی نگرانی وغیرہ ہمیں کرنا ہوتا ہے۔ کیا جو کام میں کروں گا بہ حیثیت ایچ آر آفیسر؛ جائز ہے؟ اور جو تنخواہ مجھے ملے گی وہ جائز ہوگی؟ جزاک اللہ۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: ایچ آر آفیسر کی جو ذمے داری آپ نے تحریر کی ہیں اس طرح کے کام کی نوکری بینک میں کر سکتے ہیں، گنجایش ہے، اس میں سودی حساب کتاب لکھنا، دستاویز کی تیاری کرنا وغیرہ کے کام نہیں ہیں، جن کی ملازمت کرنا جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۸/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۶۰۸/د، ۴۲/۷/د، ۱۴۳۸ھ)

بینک میں کسٹمر سروس پوائنٹ کا ایجنٹ بننا کیسا ہے؟

سوال: زید کو بینک آف انڈیا نے کسٹمر سروس پوائنٹ c.s.p. (customer service point) کا ایجنٹ بنایا ہے، جس میں اس کو فی کھاتہ کھولنے پر ۲۵/روپے ملیں گے، اور ۶/ ماہ تک زید کو ۱۵۰۰/ماہانہ بینک دے گا، اور بینک زید کو اکاؤنٹ میں کسٹمر کا پیسہ جمع کرنے اور نکالنے پر ایک لاکھ

میں چار سو روپے دے گا، کیا یہ کام درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں راہ نمائی فرمائیں، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بینک کا بنیادی کاروبار سودی لین دین کا ہوتا ہے، اور اُس میں فکسڈ ڈپازٹ کا کام بہ کثرت ہوتا ہے، متوسط درجے کے غیر مسلم اور دین وشریعت سے کم تعلق رکھنے والے عام مسلمان اس میں بہ کثرت حصہ لیتے ہیں، اور جب کوئی شخص کسی بھی بینک کے کسٹمر سروس پوائنٹ کا ایجنٹ بنے گا، تو اسے فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ بھی کھولنا ہوگا، اور ان دونوں کھاتوں میں لوگوں کی رقمیں بھی جمع کرنی ہوں گی، اور اسے انھی سب کاموں پر کمیشن یا تنخواہ ملے گی؛ پس ایجنٹ کا کام مجموعی طور پر بینک کے ملازم کا کام ہوگا، اور اس کا آفس؛ کارکردگی میں بینک کی ذیلی برانچ جیسا ہوگا؛ اس لیے کسی مسلمان کے لیے کسی بھی بینک کے کسٹمر سروس پوائنٹ کا ایجنٹ بننا شرعاً جائز نہیں ہے۔

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ البَيعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (سورة البقرة، الآية: ۲۷۵) ﴿يَمحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُربِي الصَّدَقَاتِ﴾ (سورة البقرة، الآية: ۲۷۶)

﴿وَاَخذِهِمُ الرِّبَا وَقَد نُهُوا عَنهُ﴾ كان الرِّبا مُحرَّماً عليهم، كما حرّم علينا ﴿وَاَكلِهِم اَموَالَ النَّاسِ بِالبَاطِلِ﴾ بالرِّشوة وسائر الوجُوه المُحرَّمة. (مدارك التنزيل وحقائق التأويل: ۱/۲۰۲، سورة النساء، الآية: ۱۶۱)

﴿يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَأكُلُوا الرِّبَا اَضعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُم تُفلِحُونَ، وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي اُعِدَّت لِلكَافِرِينَ﴾ (سورة آل عمران، الآية: ۱۳۰-۱۳۱) كان أبو حنيفة يقول: هي أخوف آيةٍ في القُرآن حيثُ أوعد اللّٰه المُؤمنين بالنَّار المُعدَّة للكافرين، إن لم يتَّقُوه في اجتناب محارمه. (مدارك التنزيل: ۱/۲۹۱)

عن جابر بن عبد اللّٰه رضي اللّٰه عنه قال: لعَن رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم آكِل الرِّبوا ومُوكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هُم سواءٌ. (مسلم شريف: ۲/۷۲، مطبوعة: مكتبة اشرفية، ديوبند)

الرِّبا فضلٌ خالٍ عن عوضٍ بمِعيارٍ شَرعيٍّ مشرُوطٍ لأحدِ المُتعَاقدين في المُعاوضة. (تنوير الابصار مع در وشامي: ٣٩٨/٧-٤٠٠، مطبوعة: مكتبة زكريا، ديوبند)

وأمَّا ربا النَّسيئة فهو الأمر الذي كان مشهُودًا مُتعارفًا في الجاهليَّة، و ذٰلك أنَّهم كانُوا يدفعُون المال على أن يأخذُوا كلّ شهر قدرًا معيَّناً، ويكون رأسُ المال باقيًا. (تفسير كبير: ٩١/٧)

كلُّ قرضٍ جرَّ نفعًا حرامٌ، أي إذا كان مشرُوطاً، كما علم عمَّا نقله عن البحر. (شامي: ٣٩٥/٧) **الفضلُ المشرُوط في القرض ربا مُحرَّمٌ، لا يجُوز للمُسلم أخذُه من أخيه المُسلم أبدًا؛ لإجماع المُجتهدين على حُرمته، فلم يقُل أحدٌ منهم بجواز الفضل المشرُوط في القرض.** (إعلاء السنن، رسالة كشف الدجى على حرمة الربا: ٥٣٣/١٤، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراتشي) **الرِّبا هو القرضُ على أن يؤدّي إليه أكثر أو أفضل ممَّا أخذ.** (حجة اللّٰه البالغة، الربا سحت باطل: ٢٨٢/٢)

قال القُرطبي في المفهم (٥٠٠/٤، ط: دار ابن كثير، دمشق، بيروت) **: و في معنى المُعطي: المُعين عليه، و كاتبه: الذي يكتب وثيقته، و شاهداه: من يتحمَّل الشَّهادة بعقده و إن لم يؤدّها، وفي معناه: من حضر فأقرَّه. اهـ، و قال الآبي في إكمال الإكمال** (٢٨٠/٤، ط: دار الكتب العلمية، بيروت) **: و دُخول الكاتب والشَّاهد؛ لإعانتهما على هذه المعصية. (ط)، و المُراد بالكاتب كاتبُ الوثيقة وبالشَّاهد المتحمِّل وإن لم يؤدّ، وفي معناهما من حضر فأقرَّه، وقال السّنوسي في مُكمل إكمال الإكمال مع إكمال الإكمال** (٢٨١/٤) **: والمُراد بالكاتب كاتبُ الوثيقة وبالشَّاهد المتحمِّل وإن لم يؤدّ، وفي معناهما من حضر فأقرَّه (ب) اهـ، و في الكاشف عن حقائق السنن للطيبي** (ص: ٢١٢٤، ط: مكتبة نزار مصطفى الباز، مكة المكرمة) **: فيه تصريحٌ بتحريم كتابة المتبايعين المترابيين والشَّهادة عليهما، وبتحريم الإعانة على الباطل كنايةٌ. اهـ، و قال في التعليق الصبيح** (٣٠٣/٣، ط: المجلس العلمي، حيدر آباد) **: قولُه: آكِل الرِّبا أي: آخذه، و مُوكله: أي: مُعطيه، وكاتبه وشاهديه؛ للإعانة على الحَرام، قال اللّٰه تعالى: وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدوَان. اهـ، وقال المُفتي محمَّد تقي العُثماني في تكملة فتح المُلهم** (٥٧٥/١، ط:

دار إحياء التراث العربي، بيروت) قولُه: و كاتبه: لأن كتابة الرِّبا إعانةٌ عليه. اهـ. فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۷/۶/۱۴۳۸ھ = ۱۷/۳/۲۰۱۷ء، جمعہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۴۵/تتمہ/ن، ۶۲۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

بینک میں نیٹ ورک انجینئر کی حیثیت سے کام کرنا کیسا ہے؟

سوال: میں سٹی بینک میں کام کررہا ہوں، یہ سودی نظام والا بینک ہے، اوراپنے گاہکوں کو جو امریکہ اور پوری دنیا میں کے ہیں، فائنانس دیتا ہے، میں بینک کے آئی ٹی سیکشن، چنئی، انڈیا میں نیٹ ورک انجینئر نگ کی حیثیت سے ٹیکنالوجی فراہم کرنے کا کام کرتا ہوں، یعنی: میرا کام بینک کی شاخوں، اُس کے ہیڈ آفسوں، اور پوری دنیا میں قائم شاخوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کے لیے نیٹ ورک کی درستگی و اصلاح کا کام کرتا ہوں؛ تا کہ وہ گاہکوں کے لیے کام کرسکیں، سودی معاملات سے میرا کام بہ راہِ راست نہیں ہے، اکثر لوگ اور ائمہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ اسلام میں جائز نہیں ہے، آمدنی کا ذریعہ فائنانس کے سود اور کاروبار سے ہے، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا اسلام کے مطابق یہ ملازمت کرنا جائز ہے؟ بہ راہِ کرم راہ نمائی فرمائیں۔ میں نے یہ ملازمت آپ کے فتوے (۱۶۵/تتمہ/ل، ۲۵۳/ل، ۱۴۳۳ھ) کے بعد شروع کی تھی۔ (**نوٹ**: سائل نے جس فتوے کا حوالہ دیا ہے، اسے جواب کے بعد درج کر دیا گیا ہے۔ حبان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: **حامداً ومصلّیا ومسلّما**: آپ کی ملازمت جائز ہے؛ البتہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور جائز ملازمت مل جائے، تو بہتر یہ ہے کہ اس کو ترک کردیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱/۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۳۷/تتمہ/ل، ۱۶۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

==============================

سوال: میں جے پی مورگن چیس میں کام کرتا ہوں، جوایک سودی بینک ہے، اورامریکہ میں اپنے گاہکوں کو فائنانس دیتا ہے، اُس کا کال سینٹر ممبئی میں ہے، اور میں یہیں کام کرتا ہوں؛ ٹیکنالوجی مینیجر

کی حیثیت سے، میرا کام ملازمین کوٹیکنالوجی سہولیات فراہم کرنا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے گاہکوں کے لیے کام کرتے ہیں، میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا اسلام کے مطابق؛ یہ ملازمت کرنا جائز ہے؟ بہ راہِ کرم راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفيق والعصمة: **حامداً ومصلّياً ومسلّماً:** اگر آپ کا کام صرف ٹیکنالوجی سہولیات فراہم کرنا ہے، بہ راہِ راست سود پر لینے، دینے، لکھنے یا اس کی گواہی دینے پر تعاون کرنا نہیں ہے، تو آپ کی یہ ملازمت جائز ہے، اور اس کے نتیجے میں حاصل آمدنی حلال ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۳/۲/۱۳ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری – وقار علی غفرلہٗ

(۱۶۵/تتمہ/ل، ۲۵۳/ل، ۱۴۳۳ھ)

==

بینک میں گارڈ کی نوکری کرنا کیسا ہے؟

سوال: بینک میں گارڈ کی نوکری کرنا کیسا ہے؟ اور اس پر ملنے والی تنخواہ حلال ہے یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: گارڈ کا کام؛ سیکورٹی اور نگرانی کا ہوتا ہے، سودی حساب وکتاب اس سے متعلق نہیں ہوتا؛ اس لیے اس کی نوکری اور آمدنی پر حرام وناجائز کا حکم نہیں؛ البتہ احتیاط اس میں ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے۔ (مستفاد: فتاویٰ عثمانی: ۳/۳۹۵)

أمَّا إذا كانت الوظيفةُ ليس لها علاقةٌ مباشرةٌ بالعمليَّات الربويَّة، مثل وظيفة الحارس أو سائق السيَّارة ...... فلا يحرم قبولُها إن لم يكن بنيَّة الإعانة على العمليَّات المُحرَّمة، وإن كان الاجتنابُ عنها أولىٰ ولايحكم في راتبه بالحُرمة. (فقه البيوع) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۳/ربیع الثانی/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری – فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۲۴/م، ۵۵۷/م، ۱۴۳۸ھ)

اخبارات میں ٹائپنگ وغیرہ کی ملازمت اور سرکولیشن سرٹیفکٹ (circulation certificat) کے لیے جھوٹی رپورٹ دینے کا حکم

سوال: میں ایک اردو اخبار میں ٹائپنگ اور پیج میکنگ کی حیثیت سے کام کرتا ہوں، میں نے کئی لوگوں سے سنا ہے کہ اس کے ذریعے کمائی گئی رقم حلال نہیں ہے؛ کیوں کہ اخبار کا دارو مدار اشتہارات پر ہوتا ہے، اور اس میں سرکاری اشتہارات بھی ہوتے ہیں، جس کو شائع کرانے کے لیے سرکولیشن سرٹیفکٹ کی ضرورتی پڑتی ہے، اس کے لیے اخبار کا سرکولیشن؛ یعنی: آپ کا اخبار کتنے دنوں سے مارکیٹ میں آرہا ہے، اور اس کے کتنے ریڈرس ہیں وغیرہ کی تفصیل دینی ہوتی ہے، تب کہیں جا کر اشتہارات کی اشاعت کے لیے منظوری ملتی ہے۔

اس سلسلے میں؛ میں نے اس فیلڈ کے لوگوں سے سنا ہے کہ سرکولیشن وغیرہ کی غلط جان کاری رجسٹریشن آفس کو فراہم کر کے، مثلاً: آپ کے اخبار کے ریڈرس/۲۰۰۰ ہیں، اور اشتہار منظور کرانے کے لیے کم از کم ۱۰۰۰۰/ ریڈرس ہونا شرط ہے، تو وہ آفس کے سامنے ۱۰۰۰۰/ ریڈرس بتا کر اشتہار منظور کروالیتے ہیں، جو کہ غلط ہے، تو کیا ان صورتوں میں میرا اس نیوز پیپر میں کام کرنا جائز ہے؟ اور اس کے ذریعے کمائی گئی رقم حرام ہے یا حلال؟ کیوں کہ میں نیوز پیپر میں بہ حیثیت ایک اسٹاف کے کام کرتا ہوں، ان چیزوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سب کمپنی کے مینجمنٹ کا کام ہے، مجھے کمپنی کے ذریعے جو مقررہ وقت دیا گیا ہے کام کے لیے، میں اس میں کمپنی کا کام کرتا ہوں، جس کے عوض کمپنی مجھے تنخواہ دیتی ہے، میں کافی دنوں سے اس کو لے کر فکر مند ہوں۔

بہ راہِ مہربانی تفصیل کے ساتھ جواب دیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اشتہار منظور کرانے کے لیے؛ سرکولیشن کی غلط جان کاری رجسٹریشن آفس کو فراہم کرنا، یہ بہ ہر حال غلط ہے، اور ناجائز اشتہارات و غلط اخبار کو شائع کر کے اس سے آمدنی حاصل کرنا بھی ناجائز ہے، نیوز پیپر میں آپ سے متعلق جو کام ہے، اگر وہ جھوٹ، غلط بیانی اور ناجائز امور کے ارتکاب سے خالی ہے، تب تو آپ کے کام واجرت پر حرام و ناجائز

کا حکم نہیں؛ لیکن اگر معاملہ ایسا نہیں ہے، تو اس کام سے احتراز کرنا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۳؍محرم؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۶۰؍تتمہ؍م، ۵۲؍م، ۱۴۳۸ھ)

لوگوں کو ٹیکس سے بچنے کے قانونی طریقے بتانا اور اس پر اجرت لینا درست ہے؛ لیکن جھوٹی تفصیلات درج نہ کرے

سوال: میرا کام ٹیکس سے متعلق ہے، میں ٹیکس سے جڑے مسائل میں؛ لوگوں کی مدد کرتا ہوں، اور اس کا چارج لیتا ہوں، میں کئی کمپنیوں کے لیے کام کرتا ہوں، اور ان کے ٹیکس کا کام کرتا ہوں، اکثر کمپنیاں ٹیکس سے بچنے کے لیے اپنا اصلی کاروباری لین دین نہیں دکھاتی ہیں، اور اُن کمپنیوں کے بزنس کی تفصیلات؛ مجھے بھرنی پڑتی ہیں، جو وہ مجھے حکومت کو فارم بھر کر دینا پڑتا ہے؛ اس لیے بنیادی طور پر میں جھوٹی بات لکھتا ہوں، اور کبھی کبھار ان کمپنیوں کو ٹیکس سے بچانے کے لیے انتظامیہ کے سامنے بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے، میں اپنے گاہکوں کو ٹیکس دینے اور ٹیکس سے بچنے کے بارے میں دونوں طرح کے مشورے دیتا ہوں، اور آخری فیصلہ اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ ٹیکس دیں یا ٹیکس سے بچیں، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ٹیکس کے کام پر جو میں فیس لیتا ہوں، وہ حلال ہے یا حرام ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: ٹیکس دینے یا ٹیکس سے بچنے کے قانونی طریقے اور گنجائشیں بتلانا، اور اس پر اجرت لینا جائز ہے؛ لیکن اس کے لیے فارم میں جھوٹی تفصیلات نہ لکھی جائیں، اور نہ انتظامیہ کے سامنے جھوٹ بولا جائے، جھوٹ بڑا گناہ ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۲/۲۶ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۱/۲۷ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ۔ محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۹/ھ، ۵۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)

کسی سافٹ ویئر کو مشہور کرنے کے لیے جعلی ای میل بنا کر ڈاؤن لوڈ کرنے کی ملازمت کرنا کیسا ہے؟

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ میں ایک سافٹ ویئر کمپنی میں کام کر رہا ہوں، میرا کام: جعلی ای میل اکاؤنٹ بنا کر سافٹ ویئر کو ڈاؤن لوڈ کرنا ہے؛ تاکہ وہ سافٹ ویئر اپلی کیشن مشہور ہو جائے، اور آسانی سے دست یاب ہو، سافٹ ویئر اپلی کیشن کو فروغ دینے کا یہ ایک طریقہ ہے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میری ملازمت حلال ہے؟ کیا مجھے یہ ملازمت چھوڑ دینی چاہیے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: جعلی ای میل اکاؤنٹ بنا کر سافٹ ویئر کو ڈاؤن لوڈ کرنا؛ تاکہ اس کی شہرت ہو جائے، اور لوگ اس کی شہرت سے متاثر ہوں، یہ عمل جھوٹ اور دھوکے پر مشتمل ہے، جس کا گناہِ کبیرہ ہونا ظاہر ہے؛ لہٰذا دھوکا دہی کے کام کی ملازمت اختیار نہ کریں، سیدھا سچا کام کرنے کی ملازمت لیں، چاہے تنخواہ کم ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں اُن لوگوں کے بولی لگانے کو گناہ قرار دیا ہے، جن کا ارادہ خریدنے کا نہ ہو؛ بل کہ اصلی خریدار کو اپنی بولی لگا کر دھوکے میں ڈالنا، اور دام کا بڑھانا، اور سامان کی مقبولیت ظاہر کرنا؛ یہ سب گناہِ کبیرہ ہے۔

وعن ابن عبَّاس أن النَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم نهى عن بيع الغَرر. (مجمع الزوائد: ۴/ ۸۰، ط: دار الكتب العلمية، بيروت) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۲ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۵۹۲/د، ۷۴۶/د، ۱۴۳۸ھ)

ملازم کا جبری کٹوتی سے بچنے کے لیے ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ میں بلا اجازت کوئی دوسرا کاروبار کرنا کیسا ہے؟

سوال: میں ایک سرکاری ادارے میں ملازمت کرتا ہوں، مجھ سمیت کئی ملازمین کو

مہنگائی کی بڑھتی ہوئی صورتِ حال، اور اپنے خاندان کی جائز ضروریات کی بجا آوری میں سخت مشکلات کا سامنا ہے، اللہ کے فضل وکرم سے میرے اندر صلاحیت ہے کہ میں آفس کے مقرر کردہ اوقات کے بعد چھوٹا سا کاروبار یا ملازمت کرسکتا ہوں؛ تاکہ میری ضروریات کفایت سے پوری ہوسکیں، ہمارا ادارہ؛ آفس کے بعد کام کی حوصلہ شکنی کررہا ہے، یہ ادارہ اپنے ملازمین سے ملازمت کے دوران زبردستی ایک دستاویز پہ دستخط کروالیتا ہے، جس میں یہ حلف لیا جاتا ہے کہ میں آفس کے دورانیے کے بعد ادارے کی اجازت کے بغیر کسی بھی قسم کا کوئی کام نہیں کروں گا، ملحوظ رہے ایسی کوئی بات ملازمت حاصل کرتے وقت نہیں بتائی جاتی ہے۔

اگر بات صرف اجازت کی طلبی تک ہوتی تو بھی ٹھیک تھا؛ لیکن یہ ادارہ اجازت دینے کی صورت میں؛ دوسری آمدنی کا تیس فی صد حصہ؛ ملازمین کی تنخواہ سے کاٹ لیتا ہے، جو ہمارے نزدیک سراسر ظلم ہے، موجودہ حالات میں ادارے کی پالیسی کی وجہ سے ملازمین کی بہت بڑی تعداد بغیر بتائے آفس کے اوقات کے بعد ملازمت کررہی ہے۔

علمائے کرام سے اس ضمن میں کچھ سوالات کے جوابات دینے کی گزارش ہے:

(۱) کیا ملازمین تیس فی صد جبری کٹوتی سے بچنے کی خاطر؛ ادارے کو بتائے بغیر آفس کے اوقات کے بعد ملازمت یا چھوٹا کاروبار کرسکتے ہیں؟

(۲) کیا بغیر بتائے کوئی کام کرنے کی صورت میں آمدنی حلال ہوگی؟

(۳) کیا ادارے کو اپنے اوقاتِ کار کے علاوہ اپنے ملازمین کو پابند کرنے کی؛ شریعت کی رو سے اجازت ہے؟

(۴) کیا ادارے کو دین یہ اجازت دیتا ہے کہ اگر کوئی ملازم؛ آفس کے اوقات کے بعد بغیر اجازت؛ کوئی ملازمت کرتے ہوئے پایا جائے، تو اس کے خلاف؛ کسی قسم کی تادیبی کارروائی کی جائے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: سرکاری ادارے کے ملازمین؛ صرف ڈیوٹی کے متعینہ اوقات میں اجیرِ خاص ہوتے ہیں، ڈیوٹی کا وقت ختم ہوجانے کے بعد وہ کسی درجے میں بھی ادارے کے اجیر یا ملازم نہیں رہتے؛ اس لیے اگر کسی سرکاری ادارے نے فارغ اوقات میں ملازمت یا

کوئی کاروبار نہ کرنے کی شرط لگا رکھی ہے، تو شرعاً وہ شرط درست نہیں؛ بل کہ باطل وغیر معتبر ہے؛ کیوں کہ خلافِ شرع ہے۔

اور اگر ادارے نے فارغ اوقات میں کوئی ملازمت یا کاروبار کرنے کی وجہ سے؛ ملازم کی خارجی آمدنی کا تیس فی صد حصہ اُس کی تنخواہ سے وضع کیا، جب کہ ملازم نے ڈیوٹی کے متعینہ اوقات میں مفوضہ ذمے داریاں بہ حسن وخوبی انجام دیں، اُن میں اختیاری طور پر کوئی کوتاہی نہیں کی، تو یہ تنخواہ کی کٹوتی ناجائز ہوگی۔

لو استُؤجر أحدٌ هؤلاء على أن يعمل للمُستأجر إلى وقتٍ معيَّنٍ يكونُ أجيراً خاصاً في مدَّة ذلك الوقت. (مجلة الأحكام العدلية مع شرحها درر الحكام لعلي حيدر: ۱/۴۵٤، رقم المادة: ٤٢٢، ط: دار عالم الكتب للطباعة والنشر والتوزيع، الرياض)

اب اوپر کی مختصر تمہید کے بعد اصل سوالات کے جواب؛ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) جی ہاں! کر سکتے ہیں، شرعاً کوئی حرج نہیں؛ البتہ آفس کے اوقات میں آفس کے کام میں اختیاری طور پر کوئی کوتاہی نہ کی جائے، اور حلف نامے پر دستخط کر کے جو قسم ہوئی، اُس کا کفارہ ادا کر دیا جائے، اور اگر کوئی شخص از راہِ تقویٰ پرہیز کرے، تو اچھی بات ہے۔

(۲) جی ہاں! فارغ اوقات میں کی جانے والی ملازمت یا کاروبار کی آمدنی حلال ہوگی، ادارے کی ناجائز شرط کی وجہ سے آمدنی پر حرام ہونے کا حکم نہ ہوگا؛ البتہ وہ ملازمت یا کاروبار جائز ہونا چاہیے، حرام نہیں ہونا چاہیے۔

(۳) جی نہیں! جیسا کہ اوپر مختصر تمہید میں ذکر کیا گیا۔

(۴) اگر ملازم؛ آفس کے اوقات میں ادارے کے مفوضہ کام میں کوئی اختیاری کوتاہی نہیں کرتا؛ بل کہ مفوضہ ذمے داریاں بہ حسن وخوبی انجام دیتا ہے، تو محض خارج میں دوسری ملازمت یا کاروبار کی وجہ سے ملازم کو کسی طرح کی تادیب کرنا سراسر ظلم وناجائز ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۸/۶/۱۴۳۸ھ = ۲۸/۳/۲۰۱۷ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۷۹/ن، ۶۷۳/ن، ۱۴۳۸ھ)

ڈیوٹی پر تاخیر سے آنا اور ڈیوٹی کے اوقات میں دوسرے کام کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں کہ زید ایک کمپنی میں کام کرتا ہے، اور اس کی ڈیوٹی آٹھ گھنٹے کی ہے، پر وہ ڈیوٹی پہ ہمیشہ ایک گھنٹہ، کبھی تیس منٹ تاخیر سے آتا ہے، اور دورانِ ڈیوٹی؛ کبھی خبریں پڑھنے لگتا ہے، اور کمپنی کا وقت ضائع کرتا ہے، تو کیا اس طرح اُس کا پیشہ اور رزق؛ حلال ہوتا ہے یا حرام؟ اور قرآن کے مطابق؛ یہ ناپ تول کے کس زمرے میں آتا ہے؟ اور شریعت میں زید کے لیے کیا حکم ہے؟ وضاحت کے ساتھ بیان فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورتِ مسئولہ میں زید کا ڈیوٹی میں ایک آدھ گھنٹے تاخیر سے جانا، یا ڈیوٹی میں جا کر کمپنی کا وقت بلا وجہ ضائع کرنا، یہ کمپنی کے ساتھ خیانت ہے، جتنی تاخیر سے جاتا ہے، یا کمپنی کا جتنا وقت ضائع کرتا ہے، اُسی کے بہ قدر تنخواہ زید کے لیے پاکیزہ نہیں ہے؛ البتہ اتنی تاخیر سے جانا، جس پر دلالۃً مالکِ کمپنی کی رضامندی ہو، یا ڈیوٹی میں جا کر کسی عذر کی بنا پر کام نہ کرسکنا، جس کو مالکِ کمپنی گوارا کرلے؛ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔

وليس للخاصّ (الأجير الخاصّ) أن يعمل لغيره، ولو عمل ينقصُ من أجرته بقدر ما عمل. (الدر مع الرد: ۹/۹٦، ط: مكتبة زكريا)

قال العلَّامة الشَّامي: وفي فتاوى الفضلي: وإذا استأجر رجلاً يوماً بعمل كذا فعليه أن يعمل ذلك العمل إلى تمام المُدَّة، ولا يشتغل بشيءٍ آخر سوى المكتوبة. (الدر مع الرد: ۹/۹٦، ط: مكتبة زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۷ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۶/۴۷۶/د، ۵۹۴/د، ۱۴۳۸ھ)

غیر قانونی طور پر ڈگری حاصل کرنا اور ملازمت کر کے روزگار حاصل کرنا کیسا ہے؟

سوال: میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج کل پرائیویٹ کالجز میں ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم اپنا ریگولر داخلہ کرواتے ہیں، اور کلاس نہیں لیتے، کسی معاشی یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے کالج انتظامیہ اُنھیں ریگولر ظاہر کر کے امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت دیتی ہے، کیا ایسی تعلیم سے روزگار حاصل کرنا صحیح ہے؟ اور اس کی ڈگری یا سند سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال تصور ہوگی یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: اگر امتحانات میں بیٹھنا اور ڈگری حاصل کرنا؛ خلافِ قانون نہیں ہے، تو جائز ہے، اور اس طرح تعلیم حاصل کر کے کوئی روزگار حاصل کرلیا، اور مفوضہ کام کی انجام دہی صحیح کرے، تو اس سے حاصل شدہ آمدنی بہ ہر حال حلال ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۲۷/۶/۱۴۳۸ھ الموافق: ۲۷/۳/۲۰۱۷ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۱۲/ھ، ۸۸۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)
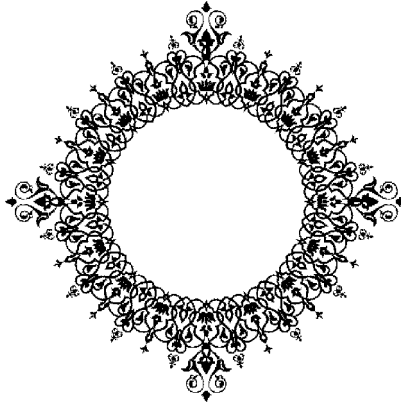
کیش بیک اور سبسڈی، نیز مختلف اسکیموں وکمیشن سے متعلق مسائل

کیا کمپنی کی طرف سے ملنے والے کیش بیک کو استعمال کیا جاسکتا ہے؟

سوال: میں موبی کوئک والیٹ اور فری ریچارج والیٹ کا استعمال کرتا ہوں، اپنے موبائل نمبر پر ریچارج کرنے کے بعد مجھے کیش بیک (واپس رقم) ملتی ہے، مثال کے طور پر: اگر میں اپنے موبائل نمبر پر سو روپے کا ریچارج کروں، تو مجھے پانچ پرسنٹ پیسے واپس ملیں گے، یعنی: پانچ روپے، اور میں یہ پیسہ اپنے موبائل نمبر پر ریچارج کرسکتا ہوں، تو کیا شریعت کی روشنی میں کیش بیک سے ریچارج کرنا درست ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: آپ کو ۱۰۰؍روپے کا ریچارج کرنے پر پانچ پرسنٹ پیسے کمپنی کی طرف سے واپس ملتے ہیں، تو یہ کمپنی کی طرف سے آپ کے لیے عطیہ اور انعام ہے، یہ سود نہیں ہے؛ لہٰذا آپ کا ریچارج کرنا بھی درست ہے، اور پانچ پرسنٹ کا لینا، اور اپنے استعمال میں لانا بھی شرعاً درست ہے۔

وجاء في ''الموسُوعة الفقهيَّة'': الأصلُ إباحةُ الجائزة على عملٍ مشرُوعٍ، سواءٌ كان دينياً أو دنيوياً؛ لأنَّه من باب الحثِّ على فعل الخير والإمالة عليه بالمَال، وهُو من قبيل الهِبة.

(قضايا فقهية معاصرة، البحث التاسع عشر، أحكام الجوائز: ۲/۵۵، ط: وزارة الشئون الإسلامية، قطر) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸؍صفر؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۶۷؍ب، ۲۴۵؍ب، ۱۴۳۸ھ)

سافٹ ویئر وغیرہ پر آنے والے کیش بیک کا شرعی حکم

سوال: آج کل ایک سافٹ ویئر آیا ہے، جس کو ٹکٹ بک کرنے اور موبائل ریچارج وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ہمارے اکاؤنٹ سے پیسہ کٹ جاتا ہے، اور پھر وہ سافٹ ویئر والے ہماری آئی ڈی پر واپس؛ کچھ پیسہ دے دیتے ہیں، کیا وہ پیسہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ بہ راہِ کرم جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: اُن پیسوں کی حیثیت تبرع وانعام کی ہے، اُن کے لینے میں مضائقہ نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۵/۲۰ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۶۷/ل، ۷۵۵/ل، ۱۴۳۸ھ)

بزنس کے لیے سرکاری سبسڈی لینے کا حکم

سوال: میں مسالہ بلائنڈنگ بزنس شروع کرنا چاہتا ہوں، اُس کے لیے مجھے پیسے کی کمی پڑ رہی ہے، ہم نے سرکاری سبسڈی لینے کا فیصلہ کیا ہے، کیا یہ حلال ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: سبسڈی میں ایک بڑی رقم قرض دے کر حکومت کچھ رقم معاف کر دیتی ہے، اور پھر بقیہ رقم کو سود کے ساتھ وصول کرتی ہے، اس سلسلے میں حکم یہ ہے کہ اگر اصل قرض کی رقم کے بہ قدر، یا اس سے کچھ کم رقم دینے تک معاملہ صاف ہو جاتا ہے، تو اس سبسڈی سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہوگی، مثلاً: اگر حکومت چھ کروڑ رقم دے کر؛ دو کروڑ معاف کر دیتی ہے، اور بقیہ چار کروڑ کی رقم کو سود کے ساتھ وصول کرتی ہے، تو اگر سبسڈی لینے والے کو یہ یقین ہو کہ سود کی رقم دو کروڑ پہنچنے سے پہلے پہلے؛ یعنی: چھ کروڑ یا اس سے کم رقم ادا کر کے بری الذمہ ہو سکتا ہے، تو اُس کے لیے سبسڈی لینے کی گنجائش ہوگی، اور اگر یقین نہ ہو کہ وہ

چھ کروڑ سے پہلے رقم ادا کر دے گا، یا ادائیگی موہوم ہو، تو اس صورت میں سبسڈی لینا جائز نہ ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۴/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۵۴/ل، ۶۳۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

گیس کنکشن کی کاپی سپلائر کو دینا اور اس پر ملنے والی سبسڈی کا حکم؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے سلسلے میں:

گورنمنٹ کی جانب سے گیس کنکشن والوں کو کاپی دی جاتی ہے، بہت سے لوگوں کی کاپیاں گیس سپلائر اپنے پاس رکھتا ہے، اور کم خرچ والوں کی طرف سے بھی وہ گیس سلنڈر ہمیشہ اٹھاتا رہتا ہے، ضرورت پر وہ گراہک کو سلنڈر دیتا رہتا ہے؛ لیکن اس کے نام پر ملنے والے بعض سلنڈروں کو وہ بلیک کرلیتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ گراہک کے خرچ سے زائد؛ سلنڈر کی سبسڈی کا مستحق کون ہوگا، گراہک یا سپلائر؟ جواب عنایت دے کر شکرگزار فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: گیس کنکشن والوں کا؛ گیس سپلائر کو اپنے کنکشن کی کاپیاں دینا؛ قانوناً جرم ہے؛ اس لیے کنکشن والوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، اور اگر کسی نے گیس سپلائر کو اپنی کاپی دے دی، اور سپلائر کو اس کاپی پر زائد سلنڈر وصول کرنے کی بھی اجازت دے دی، تو ہر سلنڈر پر ملنے والی سبسڈی کا حق دار؛ گیس خریدنے والا ہوگا، کاپی دینے والا نہ ہوگا؛ البتہ کاپی دینے والا اگر خود سلنڈر حاصل کرے، یا کسی کے ذریعے منگوائے، اس کے بعد جس مناسب قیمت پر چاہے دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے، تو اس صورت میں سبسڈی کا حق دار وہی ہوگا؛ کیوں کہ گیس سلنڈر لینے میں جو سبسڈی ملتی ہے، وہ درحقیقت ایجنسی کی طرف سے حطِ ثمن کی شکل ہے، یعنی: گیس کی قیمت کا کچھ حصہ حسبِ ضابطہ واپس کردیا گیا، یہ محض کنکشن کی بنیاد پر ایجنسی کی طرف سے ملنے والا انعام یا عطیہ نہیں ہے۔

وصحَّ الحطُّ منه – من الثَّمن – .... والزِّيادةُ والحطُّ يلتحِقان بأصل العقد بالاستناد. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب البيوع، باب المرابحة والتولية: ۷/۳۷۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالی اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۰/۲۲/۱۴۳۸ھ = ۱۷/۷/۲۰۱۷ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۱۲/ن، ۱۱۵۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

سرکاری گیس خریدنے کی صورت میں ملنے والی سبسڈی (چھوٹ) کا شرعی حکم

سوال: ہم ہر مہینے سرکاری گیس خریدتے ہیں، تو اس کے عوض میں کچھ پیسے سرکار واپس کرتی ہے، تو کیا یہ پیسہ لینا درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: گیس سلنڈر میں جو پیسے واپس ہوتے ہیں، وہ سبسڈی کے پیسے ہوتے ہیں؛ یعنی: گورنمنٹ کی طرف سے رعایت اور چھوٹ، یہ رقم پہلے کمپنی کو مل جاتی تھی؛ اس لیے عام لوگوں کو گیس اور سستی ملتی تھی؛ لیکن اب کمپنی اصل دام میں دیتی ہے، اور چھوٹ گورنمنٹ بہ راہِ راست ہر گراہک کو دیتی ہے، اس رعایت کو لینے میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　　۵/۶/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ – محمد مصعب عفی عنہ

(۴۳۸/د، ۵۴۲/د، ۱۴۳۸ھ)

پی ایف میں جمع ہونے والی رقم کا حکم

سوال: میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں کام کر رہا ہوں، جس میں ملازمین کے لیے ''پی ایف''

کی اسکیم ہے، اس میں ملازمین کی تنخواہ سے رقم وضع ہوجاتی ہے، اور اتنی ہی رقم کمپنی کی طرف سے دی جاتی ہے، اور مجموعی رقم کو انویسٹ کردیا جاتا ہے، ہمیں معلوم نہیں ہے کہ آیا یہ انویسٹمنٹ؛ اسلامی طریقے پر مل رہا ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ ریٹائرمنٹ کے وقت ملازمین کو جو یہ رقم دی جاتی ہے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ حلال ہے یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: صورتِ مسئولہ میں کمپنی؛ اپنے ملازمین کی تنخواہوں سے ہر ماہ جو حصہ وضع کرلیتی ہے، اور اتنی ہی رقم کمپنی اپنی طرف سے اُس کے فنڈ میں اضافہ کرکے جمع کردیتی ہے، پھر وہ پوری رقم ریٹائرمنٹ کے وقت ملازم کو دی جاتی ہے، تو اس کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے، اس پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، اس بابت ایک رسالہ بہ نام ''پراویڈنٹ فنڈ پر زکاۃ اور سود'' جواہر الفقہ جلد سوم میں موجود ہے، اس کا مطالعہ فرمالیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۳/ذی قعدہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۲۸۶/م، ۱۳۱۱/م، ۱۴۳۸ھ)

پینشن اسکیم میں پیسہ جمع کرنے کا حکم

سوال: (۱) میری؛ آفس میں پینشن اسکیم شروع ہوئی ہے، جس میں ہم کچھ پیسہ جمع کرسکتے ہیں، نیشنل پینشن اسکیم، ایچ ڈی ایف سی بینک میں ہماری کمپنی کا تنخواہ کا اکاؤنٹ ہے، کیا ہم پینشن میں اِنویسٹ کرسکتے ہیں؟

(۲) اسلام اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ٹیکس کیسے بچایا جاسکتا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: (۱) اگر آپ؛ رقم (تنخواہ) قبضے میں لینے کے بعد تنخواہ کا کچھ حصہ پینشن اسکیم میں انویسٹ کرتے ہیں، تو ایسا کرنا جائز نہیں، جمع کردہ رقم سے زائد ملنے والی رقم سود کہلائے گی، اور یہ معاملہ سودی ہوجائے گا۔

(۲) غیر واجبی ٹیکس سے بچنے کے لیے ہراُس طریقے کو اختیار کیا جاسکتا ہے، جس میں صراحتاً جھوٹ یا دھوکا دہی کی نوبت نہ آئے، اس کے لیے آپ کسی مسلمان دین دار وکیل سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۱۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۵۶ /تتمہ/ل، ۶۵۸/ل، ۱۴۳۸ھ)

سکنیا یوجنا سے جڑنے اور اس میں رقم جمع کرنے کا حکم

سوال: انڈین گورنمنٹ ''سکنیا یوجنا'' میں بیٹی کی پیدائش سے لے کر چودہ سال کی عمر تک؛ ہر سال کم سے کم ایک ہزار روپے جمع کرنا ہوتا ہے، اور بیٹی جب اٹھارہ سال کی ہوجاوے، تب پچاس فی صد پیسہ تعلیم کے نام پر نکال سکتے ہیں، اور جب بیٹی کی عمر اکیس سال کی ہوجاوے، یا جب اُس کی شادی کا وقت ہو، تب بینک ساری رقم واپس کردے گا، جو کہ تقریباً چھ لاکھ روپے ہوں گے، پیسے کا حساب یہ ہے کہ جمع کی ہوئی رقم پر ہر سال سرکار ایک سود متعین کرتی ہے، جو کہ اس سال شاید ۸.۵% ہے، بغیر مسئلہ جانے میں یہ ''سکنیا یوجنا'' اپنی بیٹی کے نام سے پہلے ہی کھول چکا ہوں، بہ راہِ کرم مجھے صحیح راستہ بتائیں، اب میں کیا کروں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: مذکورہ ''سکنیا یوجنا'' سودی وناجائز ہے، اگر لاعلمی میں آپ نے یہ پالیسی اختیار کرلی ہے، تو اب صحیح مسئلہ معلوم ہوجانے کے بعد توبہ استغفار کریں، اور آئندہ احتیاط رکھیں، اور موجودہ پالیسی کو ختم کرکے اپنے پیسے واپس لے لیں، اور اگر وقت سے پہلے پالیسی کو ختم کرکے رقم کی واپسی ممکن نہ ہو، تو میعاد پوری ہونے پر جب رقم ملے گی، تو اپنی جمع کردہ رقم اپنے پاس رکھ کر بقیہ (سودی رقم) کو بلا نیتِ ثواب غرباء کو صدقہ کردیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۷/ذی الحجہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۳۶۸/م، ۱۳۹۲/م، ۱۴۳۸ھ)

انٹری فیس جمع کراکے ٹورنامنٹ منعقد کرنا اور اس میں دیے جانے والے انعام کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ آج کے دور میں جو کھیل رائج ہے، جو کرکٹ اور ٹورنامنٹ کے نام سے مشہور ہے، جس میں مقابلہ ہوتا ہے، جو ٹیم اول درجہ حاصل کرتی ہے، اُس کو اول درجے کا انعام دیا جاتا ہے، اور جو ٹیم دوسرے درجے پر پہنچتی ہے، اس کو دوسرے درجے کا انعام دیا جاتا ہے، اور اس میں ہر ٹیم انٹری فیس بھی جمع کرتی ہے، اور اس میں لوگ نائٹ شو کے نام سے پوری پوری رات گذار دیتے ہیں، اور جب میچ فائنل ہوتا ہے، تو کہیں رات سے لے کر دن میں فائنل ہوتا ہے، تو کیا یہ انعام دینا اور مقابلہ آرائی درست ہے یا نہیں؟ اور اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟ جب کہ اس کے اندر شرکت کرنے والے؛ خواہ ذمے دار ہوں، یا کھلاڑی ہوں، یا تماشائی ہوں؛ سبھی نماز روزے اور دین کے کاموں سے غافل رہتے ہیں؛ لہٰذا حضورِ والا سے مودبانہ درخواست ہے کہ ان جیسے مسائل میں عوام کی شرکت کیسی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمة: **حامداً ومصلّیا ومسلّما:** کسی بھی کھیل کے جواز کے لیے چند شرطیں ہیں:

۱۔ کھیل سے مقصود؛ ورزش یا تفریحِ طبع ہو، اور اسی حد تک کھیل کھیلا جائے، کھیل کو مقصد نہ بنایا جائے۔

۲۔ کھیل فی نفسہ جائز ہو، عدم جواز کی کوئی بات نہ پائی جائے۔

۳۔ فرائضِ شرعیہ میں کوتاہی اور غفلت نہ آتی ہو، کھیل میں اس درجہ منہمک ہو جانا، جس کی تفصیل سوال میں مذکور ہے؛ مکروہِ تحریمی اور ناجائز ہے۔

وكره تحريماً اللّعبُ بالنّرد وكذا الشَّطرنج. (درمختار) **وفي الشّامي: وإنّما كره؛ لأنّ من اشتغَل به ذهب عناءُه الدُّنيويُّ وجاءه العناءُ الأخرويُّ فهو حرامٌ وكبيرةٌ عندنا، وفي إباحته إعانةُ الشَّيطان على الإسلام والمُسلمين، كما في الكافي.** (شامي: ۹/۵۶۵)

علاوہ ازیں انٹری کی شکل میں جو رقم تمام شرکت کرنے والی ٹیموں سے لی جاتی ہے، اور پھر اُسی سے انعام خرید کر جیتنے والی ٹیم کو دیا جاتا ہے، یہ قمار اور جوا ہے، جو شرعاً حرام ہے۔ (مستفاد از: جواہر الفقہ: ۵۷۲/۴) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۸۱/ل، ۱۴۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

کمیٹی ڈال کر کمی بیشی کے ساتھ ممبران کو رقم دینا جائز نہیں

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) کمیٹی ڈالنا کیسا ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چند آدمی مل کر ایک متعین مدت تک، متعین رقم، ایک متعین آدمی کے پاس جمع کرواتے ہیں، اب ان ممبران میں سے کسی کو ضرورت پڑتی ہے، تو وہ اپنی متعین رقم پیشگی لے لیتا ہے؛ لیکن اس کو وہ رقم پوری نہیں ملتی ہے؛ بل کہ اس سے کم ملتی ہے، اور دوسرے ممبران کی رقم میں اضافہ ہو جاتا ہے، تو یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اور اگر جائز نہیں ہے، تو اس کو جائز سمجھنے والا شخص؛ شریعت کی رو سے کیسا ہے؟ اور اس پر کیا حکم لگے گا؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں راہ نمائی فرمائیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: **(۱)** کمیٹی کی سوال میں مذکور شکل؛ سودی اور ناجائز ہے، اور چوں کہ پیشگی ضرورت کا واقع ہونا ممکن ہے، اور اس صورت میں اصل جمع شدہ پوری رقم بھی نہ ملے گی، اور اگر ضرورت واقع نہیں ہوئی، تو اصل سے زیادہ رقم مل سکتی ہے؛ اس لیے اس میں کسی درجے میں جوے کا بھی پہلو ہے، اور اسلام میں سود اور جوا دونوں قطعی طور پر حرام وناجائز ہیں؛ اس لیے اس طرح کی کمیٹی کا نظام چلانا، اور اس میں شرکت کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ البَيعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا. الآية﴾ (البقرة: ۲۷۵)

﴿یـاأَیُّهـا الَّذِینَ آمَنُوا إِنَّمَا الخَمرُ وَالمَیسِرُ وَالأَنصَابُ وَالأَزلَامُ رِجسٌ مِّن عَمَلِ الشَّیطَانِ فَاجتَنِبُوهُ لَعَلَّکُم تُفلِحُونَ﴾ (المائدة: ۹۰)

وقال رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: إنّ اللّٰه حرَّم علی أمَّتي الخَمر والمَیسر.

(المسند للإمام أحمد: ۳۵۱/۲، رقم الحدیث: ۶۵۱۱)

﴿وَلَا تَـأكُـلُـوا أَمـوَالَـكُـم بَیـنَـكُم بِالبَاطِلِ﴾ أي بالحرام، یعني بالرِّبا، والقِمار، والغصب، والسَّرقة. (معالم التنزیل: ۵۰/۲)

لأنّ القِمار من القمر الذي یزدادُ تارةً وینقُص أخریٰ، و سُمِّي القمارُ قماراً؛ لأنّ كلَّ واحدٍ من المُقامرین ممَّن یجُوز أن یذهب مالُه إلی صاحبه، ویجُوز أن یستفِید مال صاحبه، وهو حرامٌ بالنَّص. (رد المحتار، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء، فصل في البیع: ۵۷۷/۹، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

(۲) جو شخص سوال میں مذکور؛ کمیٹی کے طریقے کو جائز سمجھتا ہے، وہ غلط فہمی کا شکار ہے، اُسے صحیح حکمِ شرعی بتا دیا جائے، ان شاء اللہ اُس کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۶۴/ن، ۵۰۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

جھوٹ بول کر یا دھوکا دے کر اسکالرشپ لینا کیسا ہے؟

سوال: میرے والد ٹیچر ہیں، اور ہم ۸/ بھائی بہن ہیں، میں والد صاحب کے انکم سرٹیفکٹ میں؛ والد صاحب کی انکم کم لکھوا کر اسکالرشپ لیتا ہوں، تو کیا یہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر غلط ہے، تو اب مجھے اس کا ازالہ کیسے کرنا ہوگا؟ برائے کرم آپ اس کا جواب؛ قرآن اور حدیث کی روشنی میں بتائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسکالرشپ وغیرہ کے نام سے جو وظائف جاری کیے جاتے ہیں، وہ صرف مستحقین کے لیے جائز ہوتے ہیں، سب کے لیے نہیں، اور مستحق صرف وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اسکالرشپ جاری کرنے والے ادارے کی طرف سے مقررہ ومتعینہ تمام شرائط پر

پورے اترتے ہوں، اور جو لوگ شرائط پورے نہ کرتے ہوں، اُن کا جھوٹ بول کر اپنے نام اسکالرشپ جاری کرانا، اور اُن کا اسکالرشپ لینا جائز نہیں، اور ایسے لوگوں کو اسکالرشپ کے نام سے جو رقم ملے گی، وہ اُن کے لیے جائز نہ ہوگی، اور اگر کسی نے مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے غیر مستحق ہونے کے باوجود اپنے لیے اسکالرشپ جاری کرالی، تو مسئلہ معلوم ہونے کے بعد فوراً بند کرادے، اور اس وقت تک جو رقم وصول کی ہو، وہ بلا نیتِ ثواب غریبوں کو دے دے، اور اگر یک مشت ساری رقم ادا کرنے کی استطاعت نہ ہو، تو حسبِ سہولت تھوڑی تھوڑی رقم کر کے غریبوں کو دے، اور اس مد میں وصول کی ہوئی ساری رقم؛ آہستہ آہستہ بلا نیتِ ثواب غریبوں کو دے دے۔

لافَرق بين الكِذب بالكِتابة أو التَّكلُّم. (تكملة رد المحتار: ١/ ١٥٩، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۱/۱۳ھ = ۲۰۱۶/۱۰/۱۵ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۶/ن، ۲۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

جی پی فنڈ کا شرعی حکم

سوال: کیا سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے؛ جی پی فنڈ کے نام سے ہونے والی ماہانہ کٹوتی پر لگنے والا سالانہ منافع؛ ملازم کے لیے جائز ہے؟ اگر چہ:

(۱) فنڈ کی کٹوتی کی مقدار ہر اسکیل کے لیے مختلف؛ مگر طے شدہ ہو، اور اس میں ملازم اپنی خواہش سے اس کا خاتمہ؛ تبدیلی یا کمی بیشی نہ کروا سکتا ہو۔

(۲) ملازم فنڈ میں سے اگر چاہے، تو فنڈ کی جمع شدہ کل رقم کا ۸۰/فی صد اپنے استعمال کے لیے نکلوا سکتا ہے، لی ہوئی رقم؛ ملازم کی ۴۵/سال کی عمر تک لازمی قابلِ واپسی قرار پاتی ہے، جو کہ ملازم کی خواہش کے مطابق ۱۲ سے ۴۸/اقساط میں ہر ماہ کی تنخواہ سے کاٹی جاتی ہے، جب کہ ملازم کی ۴۵/سال کی عمر کے بعد قابلِ واپسی ہونا یا نہ ہونا ملازم کی مرضی پر منحصر ہے، سالانہ منافع لینے کی صورت میں لیے ہوئے قابلِ واپسی فنڈ پر؛ اقساط کی واپسی کے عرصے میں اکاؤنٹ میں پڑے ہونے کی صورت میں جو منافع لگنا تھا، وہ منافع بھی اضافی رقم (سود) کی صورت میں ہر قسط میں ادا کرنا پڑتا ہے۔

(۳) کاٹی جانے والی رقم کا مصرف (جو کہ ملازم کے دائرۂ اختیار میں نہیں ہے) اور فنڈ پر لگنے والے منافع کا ماخذ بھی معلوم نہ ہو۔

(۴) لیکن فنڈ پر لگنے والا سالانہ منافع؛ ملازم اپنی خواہش سے چاہے، تو ختم بھی کروا سکتا ہے، اس صورت میں نکلوائے جانے والے قابلِ واپسی فنڈ پر اضافی رقم ادا نہیں کرنی پڑتی۔

(۵) کچھ احباب؛ اس طرح کرتے ہیں کہ فنڈ پر منافع لیتے ہیں، پر جب نکلوانا ہوتا ہے، تو نکلوانے سے پہلے اُس پر لگنے والا منافع ختم کروا دیتے ہیں، جس سے وہ اپنی اثنا میں اضافی کٹوتی سے بچ جاتے ہیں، کٹوتی ختم ہونے کے بعد وہ اپنا سالانہ منافع بہ حال کروا دیتے ہیں، تو کیا ایسا کرنا سود کو حلال کرنے کے حیلے میں داخل نہیں ہے؟ بہ راہِ کرم جواب عنایت فرمائیں۔

اس سے پہلے کے جو فتوے دست یاب ہیں، اُن میں درج بالا تمام شرائط موجود نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ سوال کی ضرورت محسوس کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۵) سوال میں جی پی فنڈ کی جو صورت ذکر کی گئی ہے، یہ جبری (غیر اختیاری) فنڈ ہے، یعنی: ہر ملازم کی تنخواہ سے اس کے اسکیل کے حساب سے ایک متعینہ فی صد کی کٹوتی لازم وضروری ہے، اس میں ملازم کا کچھ اختیار نہیں ہوتا، نہ وہ اس کٹوتی کو بند کرا سکتا ہے، اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی (کمی بیشی) کرا سکتا ہے، اور اس طرح کے جبری فنڈ کے متعلق تمام اکابر مفتیانِ کرام کی متفقہ تحقیق یہ ہے کہ جبری فنڈ پر؛ سالانہ جو اضافے کیے جاتے ہیں، وہ شرعاً سود میں داخل نہیں ہیں، خواہ اس وجہ سے کہ فنڈ کی رقم قبضے سے پہلے ملازم کی ملک ہی نہیں ہوتی، اور وضع کردہ رقم پر طے شدہ اضافات؛ از قبیلِ تبرع ہیں (جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی یہی تحقیق ہے) یا فنڈ کی رقم قبضے سے پہلے ملازم کی ملک ہو جاتی ہے، اور اصل کی طرح اضافے بھی اجرتِ عمل اور تنخواہ کا حصہ ہوتے ہیں، اور تاجیل کی وجہ سے یہ اضافے ہوتے ہیں (جیسا کہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی یہی تحقیق ہے)؛ اس لیے سوال میں مذکور فنڈ میں جو کچھ رقم جمع ہوتی ہے، اور جو اضافے ہوتے ہیں، وہ سب از روئے شرع جائز ہیں، اس میں کچھ شک شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اور اگر کوئی شخص سالانہ اضافے بند کرا دیتا ہے، تو پہلے قول کے مطابق یہ تبرع کی قبولیت سے انکار ہے، اور دوسرے قول کے مطابق تاجیل کی صورت میں تنخواہ کا اضافی حصہ واپس کرنا ہے، یا اُسے نہ لینا ہے، اور آدمی کو شرعاً اس کا اختیار ہے کہ وہ تبرع قبول نہ کرے، یا تنخواہ کا کچھ حصہ ادارے کو واپس کردے، یا اضافہ قبول نہ کرے؛ اس لیے شرعاً منافع نہ لینے والے کا عمل بھی درست ہے۔

اور فنڈ سے ۸۰/فی صد تک جو رقم لینے کا اختیار ہے، یہ دونوں قولوں کے مطابق قرض کی شکل ہے؛ اس لیے اس پر جو مزید وصول کیا جاتا ہے، اس میں بہ ظاہر سود کا شائبہ ہے؛ اس لیے جو ملازم فنڈ نکلوانے سے پہلے اُس پر ملنے والا اضافہ بند کرا دیتے ہیں، اور اضافی کٹوتی کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے، تو وہ سالانہ اضافہ بہ حال کرا لیتے ہیں، تو اس میں شرعاً کچھ حرج نہیں، اسے سود کو حلال کرنے کا حیلہ نہیں کہہ سکتے؛ بل کہ اس کا یہ عمل بہتر ہے۔

اور ملازم کے فنڈ کی رقم ادارہ کہاں لگاتا ہے؟ اسے جاننے اور اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں؛ البتہ اگر ادارہ اضافے؛ خالص سودی رقم یا کسی اور حرام مال سے دیتا ہو، اور اس کی صحیح تحقیق ہو جائے، تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے؛ ورنہ ہمیں بلا وجہ شک شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۸ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۸ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۶۷/تتمہ/ن، ۶۹۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

جی پی فنڈ سے ملنے والی رقم کا حکم

سوال: سرکاری محکموں میں سرکاری ملازمین کے لیے جو "جی پی فنڈ" مقرر ہوتی ہے، اس کے طریقۂ کار سے تو آپ بہ خوبی آگاہ ہوں گے؛ لیکن مختصر طور پر میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس "جی پی فنڈ" پر محکمے والے انٹرسٹ دیتے ہیں، جو کہ اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، اور بعد میں اُس کو ملازم کے ریٹائر ہونے پر اُس کو دی جاتی ہے، میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس کو لینا کیسا ہے؟ اگر ٹھیک نہیں ہے، تو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟ کیوں کہ یہ کسی بھی ملازم کے لیے، اُس کی باقی زندگی کے لیے ایک سرمایہ ہوتا ہے، برائے مہربانی! اس بارے میں میری مکمل راہ نمائی کیجیے، اور مجھے پوری تصدیق کے ساتھ اپنا فتویٰ ارسال کریں؛ تاکہ میں اور دوستوں کو بھی صحیح مسئلے پر عمل کرنے کی تلقین کروں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: جی پی فنڈ کے عنوان سے سرکار جو رقم تنخواہ سے کاٹتی ہے، اور اس کے کٹوانے یا نہ کٹوانے میں ملازم کو کچھ اختیار نہیں ہوتا؛ بل کہ سرکار؛ بالا بالا کاٹ لیتی ہے، اس رقم پر ملازم کی ملکیت شرعاً متحقق نہیں ہوتی، پھر اُس رقم پر انٹرسٹ کے عنوان سے آہستہ آہستہ جو کچھ اضافہ کرتی ہے، وہ بھی ملازم کی ملکیت میں نہیں آتا، اور نہ ہی شرعی اصول کے مطابق اُس اضافی رقم پر سود کی تعریف صادق آتی ہے؛ پس یہ دونوں قسم کی رقمیں ایسی ہیں کہ جن پر ملازم کی ملکیت نہیں ہوتی؛ البتہ قانونی لحاظ سے دونوں طرح کی رقموں کا ملازم مستحق ہوتا ہے، وہ رقمیں جب ملازم کو ملیں گی، اُس وقت وہ اُن رقموں کا مالک ہوگا، اور اُن کو وصول کر لینے کے بعد اُن میں تمام تصرفات کا ملازم کو حق حاصل ہوگا، خواہ اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے، چاہے کسی کو صدقہ یا ہبہ کرے وغیرہ، سب تصرفات کا اُس کو حق ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۲/۱۴ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۱/۱۵ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۶۵/ھ، ۲۱۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

مکان کرایے پر دلوانے یا مکان کی خرید وفروخت کے عوض کمیشن لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

(۱) دہلی میں یہ عام ہے کہ کچھ لوگ مکان کرایے پر دلواتے ہیں، یا خرید وفروخت کرواتے ہیں، اور بائع ومشتری دونوں سے کمیشن وصول کرتے ہیں، عام طور پر پہلے ہی فی صد دونوں فریق سے طے کر لیتے ہیں، کیا ایسا کاروبار شرعی طور پر جائز ہے؟

(۲) اسی طرح قسط پر زمین وغیرہ بیچا اور خریدا جاتا ہے، نیز قسطوں پر خریداری کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ بائع؛ معاملے کے وقت یہ واضح کر دیتا ہے کہ اگر نقد خریدیں گے، تو کم قیمت پر؛ مثلاً: دس (۱۰) لاکھ میں یہ زمین یا فلیٹ مل جائے گا، اور اگر قسط وار خریدیں گے، تو زیادہ قیمت پر؛ مثلاً: پندرہ لاکھ میں ملے گا، تو اس طرح قسطوں پر خرید وفروخت کرنا، اور نقد وادھار کی صورت میں کمی زیادتی کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بہ راہِ کرم مدلل جواب مرحمت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: **(۱)** کرایے پر مکان دلوانے یا مکان خرید وفروخت کروانے والے کی اجرت کو؛ متاخرین فقہائے حنفیہ نے ضرورت کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے؛ بہ شرطے کہ اجرت پہلے ہی متعین ہوجائے، خواہ اجرت کی تعیین اس طرح کی ہو کہ مکان کی جو بھی قیمت لگے، میری اجرت؛ مثلاً: ایک ہزار روپے ہوں گے، یا اجرت کی تعیین فی صد کے حساب سے ہو، مثلاً: مکان کی جو قیمت طے ہوگی، اس میں فی ہزار سو روپے میری اجرت کے ہوں گے۔

و في الحاوي: سُئل محمَّد بن سَلمة عن أجرةِ السّمسار، فقال: أرجُو أنَّه لابأس به، وإن كان في الأصل فاسِداً؛ لكثرةِ التَّعامُل، وكثيرٌ من هٰذا غيرُ جائزٍ، فجوَّزُوه لحاجة النَّاس إليه كدخُول الحمام. (ردالمحتار: ۸۷/۹، مطلب في أجرة الدلال، ط: زكريا)

(۲) قسطوں پر خرید وفروخت کرنا، نیز ادھار ونقد کی صورت میں قیمت میں کمی زیادتی کرنا جائز ہے، جب کہ معاملے کے وقت یہ طے ہوگیا ہو کہ خریدار ادھار؛ یعنی: قسطوں پر خریدنا چاہتا ہے یا نقد، اور اگر عقد کے وقت ادھار یا نقد میں سے کسی ایک کی تعیین نہ کی، تو بیع درست نہ ہوگی۔

البيعُ مع تأجيل الثَّمن وتقسيطِه صحيحٌ يلزم أن تكون المُدَّةُ معلُومةً بالتَّأجيل والتَّقسيط. (المجلة للأحكام العدلية، ص: ۵۰) **و يزادُ في الثَّمن لأجله إذا ذُكر الأجلُ بمُقابلة زيادة الثّمن قصداً.** (البحر الرائق: ۱۹۱/۶، باب المرابحة والتولية، ط: زكريا، ديوبند)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۲۶ھ الموافق: ۲۰۱۶/۱۱/۲۷ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۹۹/ھ، ۲۵۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

بچوں کو مخصوص دکان پر کورس خریدنے کے لیے بھیجنا اور اس پر دکان دار سے کمیشن لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

زید نے اسکول کورس فروخت کرنے کی دکان کی ہے، جس میں وہ اسکول میں پڑھایا جانے والا نصاب بیچتا ہے، زید نے اسکول والوں سے یہ طے کرلیا ہے کہ اگر تم اپنے اسکول کے بچوں کا کورس ہماری دکان سے بکواؤ گے، تو ہم تم کو؛ مثلاً: ۳۰ر فی صد کورس کا نفع دیں گے، تو وہ اسکول والے اپنے بچوں کو زید ہی کی دکان پر بھیجتے ہیں، اور بچوں کی مجبوری ہے وہاں جانا؛ کیوں کہ وہ نصاب؛ کہیں اور نہیں ملتا ہے، یا ملتا ہے، تو بہت مشقت کے ساتھ ملتا ہے، تو کیا زید کا بچوں سے زیادہ قیمت لینا، اور اُس میں سے اسکول والوں کو بہ طور کمیشن دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز بعض مدرسے والوں نے بھی یہی کیا ہوا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسکول والوں کوتیس فی صد کمیشن لینا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اُنھوں نے اسکول کے بچوں کو لانے کے سلسلے میں کوئی محنت نہیں کی ہے، نہ ہی کوئی مشقت اٹھائی ہے، نہ کوئی بھاگ دوڑ کی ہے، جب اسکول والوں کی طرف سے کوئی عمل نہیں پایا گیا، تو وہ کمیشن لینے کے بھی حق دار نہ ہوں گے۔

في الدّر المختار: إن دلَّني على كذا فله كذا، فدلَّه فله أجرُ مثله إن مشى لأجله، قال الشَّامي تحت قوله: (إن دلَّني إلخ) ...... **رجلٌ ضلَّ له شيءٌ، فقال: من دلَّني على كذا فهُو على وجهين: إن قال ذلك على سبيل العمُوم، بأن قال: من دلَّني، فالإجارةُ باطلةٌ؛ لأنّ الدَّلالةَ والإشارةَ ليست بعملٍ يستحقُّ به الأجر، وإن قال على سبيل الخصُوص، بأن قال لرجلٍ بعينه: إن دلَّلتَني على كذا فلك كذا، إن مشى له فدلَّه فله أجرُ المثل؛ للمشي لأجله؛ لأن ذلك عملٌ يستحقُّ بعقد الإجارة؛ إلا أنَّه غير مقدَّر بقدر، فيجب أجرُ المِثل، وإن دلَّه بغير مشي فهو والأوَّل سواءٌ.** (الدر مع الرد، باب فسخ الإجارة: ۱۳۱/۹، ط: زكريا، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶ر محرم ر۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفر لہٗ- محمد نعمان سیتاپوری غفر لہٗ

(۵۸ر ب، ۱۶ر ب، ۱۴۳۸ھ)

دکان کے کسی اسٹاف کا گراہک کو دکان پر لے جانا اور اس پر کمیشن لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

بازار میں ایک چیز کی قیمت؛ مثلاً: ایک ہزار روپے عام ہے، گراہک اگر تنہا جا کر خریدتا ہے، تو ایک ہزار کا ہے، اور اگر دکان دار کے اسٹاف کو ساتھ لے جا کر خریدتا ہے، تو بھی ایک ہزار ہی کا ہے؛ مگر اس بعد والی صورت میں دکان دار؛ آنے والے اسٹاف کو چپکے سے کچھ روپے گراہک لانے کے دیتا ہے، تو کیا وہ روپے اسٹاف کے ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس صورت میں جب کہ اسکول والوں کا آدمی؛ بچوں کو آپ کی دکان پر لانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے، تو ایسی صورت میں اسکول کے آدمی اپنا حق المحنت دکان دار سے لے سکتے ہیں۔

في الدّر المختار: إن دلَّني على كذا فله كذا، فدلَّه فله أجرُ مثله إن مشى لأجله، قال الشَّامي: وإن قال على سبيل الخصُوص، بأن قال لرجلٍ بعينه: إن دلَّلتَني على كذا فلك كذا، إن مشى له فدلَّه فله أجرُ المثل؛ للمَشي لأجله؛ لأنّ ذلك عملٌ يستحقُّ بعقد الإجارة. (الدر مع الرد، باب فسخ الإجارة: ۹/ ۱۳۱، ط: زكريا، ديوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۶/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۵۸/ب، ۱۶/ب، ۱۴۳۸ھ)

مریض کو کسی ڈاکٹر کے پاس بھیجنے کے عوض کمیشن لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام، مفتیانِ عظام مسئلہ ذیل کے بارے میں:

محمد رفیق نامی ڈاکٹر نے کسی مریض کو جانچ کرانے، یا کسی بیماری کا علاج کرانے کے لیے ڈاکٹر نفیس کے پاس بھیجا، اب ڈاکٹر نفیس نے مریض سے جو رقم وصول کی ہے، وہ اس میں سے

بیس، تیس پرسنٹ ڈاکٹر رفیق کے لیے دے گا، جسے اطباء کی اصطلاح میں کمیشن کہتے ہیں، اور اس کی پہلے سے شرط لگاتے ہیں۔

نوٹ: اس میں مریض کا نہ نقصان ہوتا ہے اور نہ کچھ نفع؛ کیوں کہ ڈاکٹر نفیس؛ رفیق کے لیے کمیشن دیں یا نہ دیں، وہ مریض سے ایک ہی رقم لیتے ہیں، نہ کم لیتے ہیں، نہ زیادہ، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: ڈاکٹر محمد رفیق صاحب نے خود کوئی عملی محنت ومشقت، یا بھاگ دوڑ نہیں کی ہے؛ اس لیے اُسے کمیشن لینے کا حق نہیں ہے؛ کیوں کہ عمل ہی کے بدلے میں اجرت لی جاتی ہے؛ لہٰذا ڈاکٹر محمد رفیق صاحب کے لیے کمیشن لینا درست نہیں، جو کچھ اب تک کمیشن لیا ہے، واپس کر دینا چاہیے۔

في الدّر المختار: إن دلّني على كذا فله كذا، فدلّه فله أجرُ مثله إن مشى لأجله، قال الشّامي: وإن قال على سبيل الخصُوص، بأن قال لرجلٍ بعينه: إن دلّلتني على كذا فلك كذا، إن مشى له فدلّه فله أجرُ المثل؛ للمَشي لأجله؛ لأنّ ذلك عملٌ يستحقُّ بعقد الإجارة. (الدر مع الرد، باب فسخ الإجارة: ۹/۱۳۱، ط: زكريا، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۶۰/ب، ۵۰/ب، ۱۴۳۸ھ)

کسی کمپنی کی دوا لکھنے پر ڈاکٹر کا اُس کمپنی سے کمیشن لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا ڈاکٹر؛ دوا گولی کی مارکیٹنگ کرنے والوں سے صرف اس وجہ سے کہ وہ اُن کی کمپنی کی دوا لکھے گا، کچھ فی صد طے کر کے پیسہ لے سکتا ہے؟ خیال رہے ڈاکٹر مریضوں سے اپنی فیس وصول کرتا ہے، اس فیس میں مرض کی تشخیص کر کے دوا لکھنا شامل ہے، اس طرح کرنا کیا رشوت میں شامل ہے؟ کیوں کہ ڈاکٹر مارکیٹنگ کرنے والے سے بغیر کسی محنت کے پیسہ لے رہا ہے، یا پھر یہ تجارت یا اجرت کے زمرے میں آئے گا؟ جواب دے کر شکریے کا موقع دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: کسی کمپنی کی دوا لکھ کر کمپنی سے فی صد طے کر کے رقم لینا جائز نہیں، یہ رشوت یا شبہِ رشوت سے خالی نہیں، اور اگر ڈاکٹر محض پیسے کے لالچ میں آکر؛ اُس کمپنی سے اچھی دوائیں ہوتے ہوئے بھی اُسی مخصوص کمپنی کی دوائیاں لکھتا ہے، تو یہ خیانت بھی ہے؛ اس لیے مسلم ڈاکٹروں کو اس سے باز رہنا چاہیے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۶ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۱۱/ل، ۹۳۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

آدھار کارڈ بنانے والے کے پاس بھیجنے پر کمیشن لینا کیسا ہے؟

سوال: میرا اسکول بھی ہے، اور میری دکان بھی ہے، اسکول کے طلبہ کے آدھار بھی بنوانے کے لیے اُس کے پاس ہی بھیجتا ہوں، میرے پاس آدھار کارڈ بنانے کی مشین نہیں، تو میں گراہک کو بھیج دیتا ہوں؛ آدھار کارڈ بنانے والے کے پاس، تو وہ مجھے ایک آدھار پر پچاس روپے دیتا ہے، تو یہ روپے حلال ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: آپ اسکول کے طلبہ کو آدھار کارڈ بنوانے کے لیے مشین والے کے پاس بھیجتے ہیں، تو یہ بھیجنا؛ فقط راہ نمائی اور اراءۃ الطریق ہے، یہ کوئی قابلِ اجرت عمل نہیں، اس کے پیچھے آپ کی محنت و عمل، دوڑ دھوپ اور وقت لگانا شامل نہیں؛ اس لیے محض بھیجنے پر کمیشن کا لین دین درست نہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۴/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۷۴/م، ۱۸۷/م، ۱۴۳۸ھ)

نوٹوں کے تبادلے پر کمیشن لینے کا حکم

سوال: کیا میں کمیشن پر پیسہ چینج (تبدیل) کرسکتا ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما:الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: پیسہ چینج کرنے سے اگر آپ کی مراد؛ ہزار یا پانچ سو کے نوٹ (جنھیں غیر قانونی قرار دے دیا گیا ہے) کو لے کر قانونی نوٹ؛ مثلاً: دو ہزار کے نوٹ یا چھوٹے نوٹ دینا ہے، اور اُس پر کمیشن لینا ہے، تو شرعاً اس طرح معاملہ کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ ہزار اور پانچ سو کے نوٹ کی مالیت ختم نہیں ہوئی کہ وہ عروض اور سامان کے درجے میں ہو جائیں؛ بل کہ اُن کی اصل مالیت بہ دستور باقی ہے، گو مواقع استعمال محدود کر دیے گئے ہیں: لہٰذا کمیشن پر اُن نوٹوں کا تبادلہ؛ ربا میں داخل ہو کر ناجائز ہی رہے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۳/۱۹ھ، دوشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۳۰/س، ۲۹۸/س، ۱۴۳۸ھ)

منی ٹرانسفر کرنے کے عوض صراف کا کمیشن لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مشائخِ عظام مذکورہ مسئلے میں:

(۱) منی ٹرانسفر (رقم بھیجنے) پر صراف کا کمیشن لینا، صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص؛ مثلاً: ۲۰۰۰۰/ ہندوستانی روپے کیش کی شکل میں کابل سے حوالے کرتا ہے (رقم ٹرانسفر کرتا ہے) اور صراف سے یہ کہتا ہے کہ مذکورہ رقم مجھے ہندوستان میں چاہیے، اور صراف اس کو وہ رقم دے کر ہندوستان میں اپنا ۱۰۰۰/ روپے کمیشن لیتا ہے، کیا یہ کمیشن یا اجرت لینا جائز ہے؟

(۲) قرض پر رقم بھیجنا، اور صراف کا اس پر معاوضہ یا کمیشن لینا، صورتِ مسئلہ یوں ہے کہ کوئی شخص کابل میں کسی صراف سے کہہ دیتا ہے کہ آپ فلاں شخص کو؛ جو کہ ہندوستان میں ہے، ۲۰۰۰۰/ روپے بھیج دو، میں آپ کو رقم ایک ہفتے یا چند دن بعد دوں گا، پھر وہ صراف کو رقم ادا کرتا ہے، اور صراف اس سے کچھ مقدار اجرت کے طور پر لیتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟

(۳) صراف کا بازار کی قیمت میں سے کچھ رقم زیادہ لگانا؛ اجرت کے طور پر، صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ بازار میں؛ مثلاً: ۱۰۰۰/ر ہندوستانی روپے؛ ۱۲۰۰/ر افغانی کے برابر ہے، ایک شخص (مشتری) صراف سے کہتا ہے کہ مجھے؛ مثلاً: ۲۰۰۰۰/ر ہندوستانی روپے قرض دے دو، صراف اُس کو دے دیتا ہے، پھر جب وہ کچھ متعینہ دنوں کے بعد اُس کو واپس کرے گا؛ افغانی روپے کی شکل میں، تو صراف اس سے بازار کی قیمت کے بجائے زائد قیمت پر لیتا ہے؛ یعنی: ۱۰۰۰/ر ہندوستانی روپے کے مقابلے میں اس سے ۱۲۵۰/ر افغانی مانگتا ہے، کیا صراف کا مشتری سے یہ زائد لینا ٹھیک ہے؟

چناں چہ مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) رقم بھیجنے پر صراف کا کمیشن لینا کیسا ہے؟ (منی ٹرانسفر کرنے والے کا)

(۲) کہلوا کر صراف سے رقم ٹرانسفر کروانا، اور صراف کا اُس پر اپنا اجرت لینا کیسا ہے؟

(۳) صراف کا بازار کی قیمت سے کچھ قیمت زیادہ لگانا؛ قرض کے طور پر، اور اُس پر اپنا اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: **(۱)** اگر چہ شرعی اعتبار سے یہ کمیشن صاف طے کر لینے کی صورت میں جائز ہے؛ مگر چوں کہ قانوناً ممنوع ہے؛ اس لیے اس کو اختیار کر کے جان، مال، عزت وآبرو کو خطرے میں ڈالنا مناسب نہیں۔

(۲) جس قدر رقم نقد بھیجنے میں صراف لیتا ہے، اتنی رقم کمیشن کے طور پر ادھار کی صورت میں لیتا ہے، تو اس کا حکم وہی ہے کہ جو نمبر: ۱ کے تحت لکھا گیا، اور اگر زائد رقم کمیشن کی لیتا ہے، تو شبہِ ربا کی وجہ سے جائز نہیں۔

(۳) جب کہ بیس (۲۰) ہزار روپے قرض کا معاملہ طے ہوا ہے، تو ایسی صورت میں صراف کا افغانی کرنسی کی شکل میں ادائے قرض کا مطالبہ کرنا جائز نہیں؛ البتہ قرض دیتے وقت صاف طے کر لیا، تو گنجایش ہے؛ چوں کہ دو مختلف ملکوں کی مختلف کرنسیوں کے ادھار لین دین میں بازاری ریٹ سے کچھ زائد بھی طے کر لیا جائے، تو اس میں گنجایش ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۶ھ الموافق: ۲۵/۱/۲۰۱۷ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۵۴/ھ، ۵۸۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

ائرٹیل منی سے پیسہ ٹرانسفر کرنے کے عوض کمیشن لینے کا حکم

سوال: میرا دوست ائرٹیل منی (airtel money) کے اکاؤنٹ سے لوگوں کا پیسہ اُن کے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرکے ۲/فی صد کمیشن لینا چاہتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

ہمارے شہر میں کافی لوگ ہیں، جو بہار سے آکر؛ میرٹھ میں کام کرتے ہیں، ان کو نقد پیسہ ملتا ہے، یہ پیسہ وہ لوگ گھر بھیجنے کے لیے ائرٹیل منی کا سہارا لینا چاہتے ہیں، اس کے عوض میں وہ لوگ ائرٹیل اکاؤنٹ ہولڈر کو ۲/فی صد کمیشن دینے کے لیے راضی ہیں، کیا یہ پیسہ لینے والے کے لیے جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: مذکورہ عمل پر متعینہ کمیشن لینے کی گنجایش ہے؛ لیکن قانوناً پابندی ہو، تو احتیاط لازم ہے۔ (مستفاد: کتاب النوازل، جلد:۱۲ص:۴۰۹، ۴۱۰) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقارعلی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۴/شعبان/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۰۴۲/م، ۱۰۰۷/م، ۱۴۳۸ھ)

واسطہ در واسطہ ممبر سازی اور اس پر ملنے والی کمیشن کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام کہ زید کسی کمپنی میں ممبر بنا؛ کسی کے واسطے سے، اور پھر سامان خریدتا ہے، تو جس شخص کے واسطے سے زید؛ ممبر کمپنی کا بنا تھا، اس شخص کو پانچ سو روپیہ کمپنی کی طرف سے ملتا ہے، اور کمپنی کا اصول بھی یہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو ممبر بناتا ہے، پھر نیا نیا ممبر بننے والا شخص کمپنی سے سامان خریدتا ہے، تو ممبر بنانے والے شخص کو کمپنی کی طرف سے پانچ سو روپیہ ملے گا، مثلاً: زید نے عمر اور بکر کو کمپنی کا ممبر بنایا، تو زید کو ایک ہزار روپیہ ملے گا، پھر عمر؛ خالد اور حمزہ کو ممبر بناتا ہے، تو عمر کو ایک ہزار روپیہ ملے گا، ساتھ ہی ساتھ زید کو بھی جس نے عمر کو ممبر بنایا ہے، اسی طرح اگر بکر بھی کسی کو ممبر بناتا ہے، تو بکر کو پیسہ ملے گا ہی، ساتھ میں زید کو بھی ملے گا؛ لیکن جب نیا نیا ممبر بننے والا شخص کمپنی کا کوئی سامان خریدتا ہے، تب ممبر بنانے والے کو پیسہ ملتا ہے، صرف ممبر بنانے سے نہیں،

اب جتنے بھی ممبر بڑھتے جائیں گے، تو جو سب سے پہلے ممبر بنانے والا ہوگا، اُس کو بھی پیسہ ملے گا، اور بالکل اخیر میں ممبر بنانے والے کو بھی پیسہ ملے گا۔

نقشہ
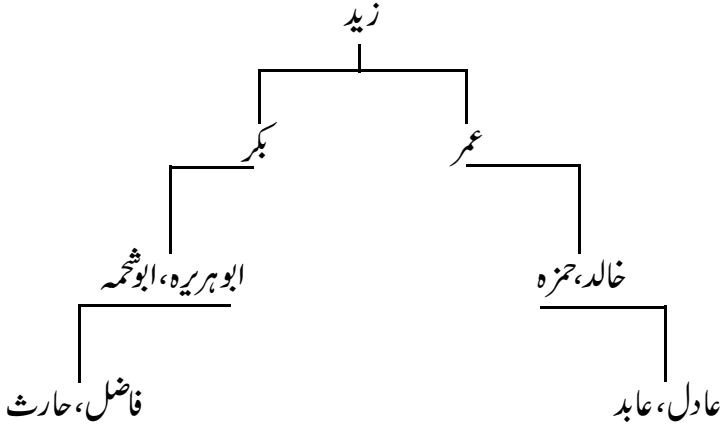
تو مذکورہ صورت کا کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: صورتِ مسئولہ میں اگر زید؛ عمر اور بکر کو کمپنی کا ممبر بناتا ہے، اور اس پر کمپنی زید کو متعینہ کمیشن دیتی ہے، تو اس کی گنجایش ہے، یہ تو اس کی محنت کی اجرت شمار ہوگی؛ لیکن عمر اور بکر اگر کسی کو ممبر بناتے ہیں، تو اس کا کمیشن بھی زید کو ملتا ہے، اسی طرح نیچے تک جتنے ممبر جڑتے جائیں گے، اُن سب کا کمیشن زید کو بھی ملتا ہے، یہ ناجائز ہے؛ کیوں کہ زید نے جس کو ممبر بنایا، اس کے علاوہ میں زید کی محنت وعمل کا کوئی دخل نہیں، تو اس زنجیری سلسلے کے ذریعے روپے کمانا درست نہیں، اس طرح کی کمپنیوں میں اور بھی شرائطِ فاسدہ ہوتی ہیں؛ نیز ضرر، غرر کا اندیشہ رہتا ہے، اور سودی معاملات پر مبنی نظام ہوتا ہے؛ اس لیے مسلمانوں کو اس طرح کی کمپنیوں میں جڑنے اور جوڑنے سے احتراز چاہیے۔

إذا اجتمَع الحلالُ والحرامُ غُلِّب الحرامُ. (الأشباه) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۷؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۶۰۷؍م، ۸۲۰؍م، ۱۴۳۸ھ)

قرض، سود، انشورنس اور رشوت سے متعلق مسائل

زمین کے بدلے قرض لینے کی دوصورتیں اور ان کا حکم

سوال: (۱) زید خالد سے ۲۵۰۰۰/روپے لے رہا ہے، خالد کو اپنی زمین دے رہا ہے، اور خالد سے کہہ رہا ہے کہ جب تک میں پچیس ہزار روپے واپس نہ کردوں، تب تک تم اناج اُگا کر کھاتے رہو، دریافت طلب امر یہ ہے کہ اناج اُگا کر کھانا، جو روپے سے زائد چیز ہے؛ سود میں شامل ہے یا نہیں؟

(۲) زید خالد سے ۲۵۰۰۰/روپے لے رہا ہے، اور خالد کو اپنی زمین دے رہا ہے، اور خالد سے کہہ رہا ہے کہ تم میری زمین سے اناج اُگا کر کھاتے رہو، جب تک میں تمھیں روپے واپس نہ کردوں؛ لیکن ہر سال کے پانچ پانچ سو روپے کم کرکے واپس کروں گا، اسی طرح اگر پچاس سال پورے ہوگئے، تو ایک بھی روپے واپس نہیں کروں گا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید کا اس شرط کے ساتھ روپے لے کر خالد کو زمین دینا، اور خالد کا اُس کو قبول کرنا کیسا ہے؟ آیا یہ سود ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) صورتِ مسئولہ میں خالد کے لیے اس زمین سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے۔

یا تو رہن سے نفع اٹھانا ہوا، جو کہ ناجائز ہے، اور ربا کے حکم میں ہے۔

قال في المنح: وعن عبد اللّٰه بن محمَّد بن أسلم السَّمرقندي وكان من كبار عُلماء سمرقند أنَّه لا يحلُّ له أن ينتفع بشيءٍ منه بوجهٍ من الوجُوه، وإن أذن له الرَّاهن؛ لأنَّه إذنٌ له في الرِّبا؛ لأنَّه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعةُ فضلاً، فيكون رباً .

(الدر مع الرد، كتاب الرهن: ۸۳/۱۰، ط: زكريا، ديوبند)

یا اجارۂ فاسد کے درجے میں ہے، جیسا کہ تاتارخانیہ میں ہے:

قال في التّاتارخانية ما نصُّه: ولو استقرض دراهم، وسلَّم حماره إلى المُقرض يستعمله إلى شَهرين حتّٰى يوفيه دينه، أو دارَه يسكنها فهُو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعليه أجرُ مثله ولا يكون رهناً. (الدر مع الرد، كتاب الرهن: ۱۰/۸۷، ط: زكريا، ديوبند)

(۲) ہر سال جو ۵۰۰/روپے کاٹے گا، وہ گویا زمین سے انتفاع حاصل کرنے کا کرایہ ہوگا، اگر اُس زمین کا متعارف کرایہ بھی ۵۰۰ ہے، تو یہ اجارے کا معاملہ ہوگا؛ لیکن قرض کے معاملے کے ساتھ اس کو مشروط کرنا غلط ہے، اور اگر متعارف کرایے سے ۵۰۰ کی رقم کم ہے، تو قرض سے نفع اٹھانا ہوا، جو کہ ناجائز ہے، اور سود کے حکم میں داخل ہے۔ **كلُّ قرضٍ جرَّ منفعةً فهو ربا.** (مصنف ابن أبي شيبة: ۶/۱۸۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۱۷ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد مصعب عفی عنہ

(۷۷۳/د، ۹۱۰/د، ۱۴۳۸ھ)

حرام مال کمانے والے سے قرض لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

سوال: حرام کمانے والے سے قرض لیا جاسکتا ہے یا کہ نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّما: اگر اُس شخص کا ذریعۂ معاش خالصتاً حرام ہو، یا حرام وحلال مخلوط ہو؛ مگر حرام کا غلبہ ہو، تو اُس شخص سے قرض لینا جائز نہیں۔

المالُ المغصُوبُ وما في حُكمه، مثل ما قبضه الإنسانُ رشوةً أو سرقةً أو بعقدٍ باطلٍ شرعاً لا يحلُّ له الإنتفاعُ به ولا بيعُه وهبتُه، ولا يجُوز لأحدٍ يعلم ذلك أن يأخُذه منه شراءً أو هبةً أو إرثاً إلخ. (فقه البيوع: ۲/۴۲۹) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۱۷ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۶۱/ل، ۳۷۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

تعلیم وغیرہ کے لیے بینک کے غیر سودی قرض کا حکم

سوال: آج کل تعلیم یا کسی اور مقصد کے لیے حکومت بینک سے قرض دلاتی ہے، اور اُس پر جو انٹرسٹ عائد ہوتا ہے، وہ مقروض سے دلوانے کے بجائے حکومت خود ادا کرتی ہے، تو بینک سے ایسا قرض لینا جائز ہے یا نہیں؟ جواب مرحمت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سرکاری بینک؛ حکومت کا ذیلی ادارہ ہوتا ہے؛ اس لیے اگر عصری تعلیم یا کسی کاروبار وغیرہ کے لیے حکومت بینک سے غیر سودی قرض دلاتی ہے، یا سود؛ سرکاری بینک کو خود حکومت ادا کرتی ہے، اور قرض لینے والا صرف اصل رقم جمع کرتا ہے، تو بینک سے ایسا قرض لینا جائز ہے؛ کیوں کہ جب بینک سرکاری ہے، اور سود ادا کرنے والا حکومت کا کوئی ذیلی ادارہ یا شعبہ ہے، تو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک ہی مالک کا مال؛ ایک ادارے سے دوسرے ادارے میں منتقل ہو، اور قرض لینے والے نے جتنا قرض لیا ہے، اس نے صرف اتنا ہی جمع کیا ہے، اس سے زیادہ نہیں؛ اس لیے از روئے شرع یہ سودی قرض کی شکل نہیں ہے۔ (مستفاد: منتخبات نظام الفتاوی: ۱/۲۸۲-۲۸۵، مسائل سود، ص: ۱۹۶، اور محمود الفتاوی: ۲/۴۹۰) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۳/۲۱ھ = ۲۰۱۶/۱۲/۲۱ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۴۴/ن، ۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

نوٹ: جواب میں جو تفصیل لکھی گئی ہے، وہ سوال کے مدنظر ہے، جب کہ تحقیق یہ ہے کہ کوئی بینک؛ تعلیم یا کاروبار وغیرہ کسی بھی ضرورت کے لیے غیر سودی قرض نہیں دیتا؛ بل کہ ہر قرض پر سود کا حساب؛ بینک کا لازمی ضابطہ ہے، نیز گورنمنٹ کا کوئی محکمہ صرف سود وصول کرنے کی بھی ذمے داری نہیں لیتا؛ کیوں کہ معلوم نہیں کہ قرض لینے والا قرضے کی ادائیگی میں کتنی تاخیر کرے گا، اور کس قدر سود چڑھے گا؟ البتہ قرض کی بعض اقسام وہ ہیں، جن سے ملک کا تعلیمی یا معاشی واقتصادی مفاد وابستہ ہوتا ہے، اُن میں گورنمنٹ کا متعلقہ محکمہ؛ سبسڈی دیتا ہے، یعنی: قرض کا کچھ متعینہ فی صد حسبِ شرائط؛ گورنمنٹ کا متعلقہ محکمہ؛ بینک کو ادا کر دیتا ہے، پھر بینک مابقیہ پر حسبِ ضابطہ سود لیتا ہے،

جس میں یہ امکان ہوتا کہ قرض لینے والے کی طرف سے ادا کی جانے والی رقم؛ اصل قرضے سے زیادہ نہ ہونے پائے؛ اس لیے ۲ر شرطوں کے ساتھ سبسڈی والا لون لینے کی گنجایش دی جاتی ہے:

ایک یہ کہ سبسڈی والا لون، کسی سرکاری (مرکزی یا صوبائی) بینک سے لیا جائے، جیسے: ایس بی آئی یا پی این بی، وغیرہ۔ **دوسری** شرط یہ کہ قرض لینے والے کو اپنے حالات اور مالی پوزیشن کے مدنظر یہ یقین یا غالب گمان ہو کہ وہ سارا قرضہ اتنی مدت میں ادا کردے گا کہ قرضے کا سود؛ سبسڈی کی رقم سے آگے نہیں جائے گا؛ بل کہ اُس کے اندر ہی رہے گا۔

(اضافہ از: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۲/۷/۱۴۴۱ھ = ۱۸/۳/۲۰۲۰ء، چہارشنبہ)

سودی قرض لے کر تجارت کرنا اور نفع حاصل کرنا اور ایسے شخص سے میل جول رکھنا کیسا ہے؟

سوال: ۱۹۹۰ء میں میرے سسر نے سود پر ۲۵۰۰۰/روپے قرض لے کر ایک الیکٹریکل دکان کی تھی، اس کے بعد اُنھوں نے کئی مرتبہ سود پر قرض لیا، تو کیا ان کی دکان سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام ہے؟ وہ اپنی دکان میں الیکٹریشن کے طور پر کام کرتے ہیں، ان کا کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے، اس کی وجہ سے ہم میاں بیوی تقریباً دو سال سے اُن کے پاس نہیں کھا رہے ہیں، تو کیا میں غلط راستے پر ہوں؟ کیوں کہ اُنھوں نے میری بیوی کو کہا ہے کہ وہ والدین کو تکلیف دے کر جنت میں نہیں جائے گی، کیا ہم ان کے پاس کھائیں؟ اُن کے لیے توبہ کرنے کی کیا صورت ہے؟ اُنھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اُنھوں نے توبہ کرلی ہے، اب وہ سود پر قرض نہیں لیتے ہیں؛ لیکن ان کے بھائی کو اب بھی کچھ سود ادا کرنا ہے، اس کے بعد وہ بھی توبہ کرلیں گے؛ مگر اُن کی مشترکہ فیملی ہے، اور میرے سسر اپنے بھائی کے ساتھ اب بھی کھاتے ہیں، کیا اُن کی توبہ قابلِ قبول ہے؟ یہ سوچ کر اُنھوں نے بھائی کے ساتھ کھانا کھانا نہیں چھوڑا ہے، بہ ہر حال! مجھے ان پر بھروسا نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ میں کسی بھی صورت میں اُن کے گھر پہ کھانا کھاؤں؛ اس لیے کہ اُن کو احباب کے درمیان اس بات سے شرمندگی ہو رہی ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں سب سے بہتر طریقہ جاننا چاہتا ہوں، میں کوئی رعایت تلاش نہیں کر رہا ہوں، اگر میں اُن کے پاس کھانا نہ کھانے کا سلسلہ جاری رکھوں تو کیا میں گناہ گار ہوں گا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق: **حامدا ومصلیاً ومسلماً:** سودی قرض لینا تو بہ ہر حال معاملۂ حرام ہے، جس سے سچی پکی توبہ اور اصلاح واجب ہے، تاہم جو سودی قرض لیا، اور پھر اس سے کاروبار کیا یا کرتے ہیں، اس سے جو کچھ آمدنی ہو رہی ہے، اس پر حرام ہونے کا حکم نہیں ہے، اس آمدنی میں سے اگر سسر یا ان کے بھائی کے یہاں جا کر آپ کچھ کھا پی لیں، یا آپ کی بیوی بچے کھا پی لیں، تو اس پر حرام کھانے کا حکم لاگو نہیں ہوتا، آپ نے جو کچھ حالات لکھے ہیں ان میں بہتر صورت یہی ہے کہ از راہِ حسنِ اخلاق وحسنِ معاشرہ کبھی کبھار جا کر کھا پی لیا کریں، اور حسنِ انداز کے ساتھ موقع دیکھ کر حکمت وبصیرت کے ساتھ اصلاح کی طرف بھی متوجہ کر دیا کریں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۲۳/۴/۱۴۳۸ھ الموافق: ۲۲/۱/۲۰۱۷ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۶۰/ھ، ۵۷۱/ھ، ۱۴۳۸ھ)

ایک خاص سرکاری اسکیم سے سودی قرض لے کر کاروبار کرنے کا حکم

سوال: گرامی قدر حضرات مفتیانِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

بعدہ عرض یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی کاروبار کرنا چاہے، اور اس کے پاس کاروبار کرنے کے لیے پیسہ نہ ہو، تو ایسے آدمی کے لیے حکومت کی جانب سے ہمارے گوا میں یا شاید پورے ہندوستان میں ایک سہولتی اسکیم ہے کہ کام کی سطح کے اعتبار سے؛ مثلاً: دس لاکھ روپے درکار ہیں، تو حکومت ساڑھے تین لاکھ روپے اپنی طرف سے دے گی، باقی ساڑھے چھ لاکھ روپے کسی بینک سے قرض دلائے گی، پھر حکومت نے جو پیسہ دیا ہے، حکومت اس کو واپس نہیں لیتی؛ البتہ بینک سے جو قرض لیا گیا، جتنی میعاد تک کا فارم بھرا گیا، اتنی میعاد تک ماہانہ قسطوں کی شکل میں دس فی صد سود کے ساتھ جمع کرنا ہوگا، مکمل جمع ہونے کے بعد واپس کی گئی رقم دس لاکھ سے نیچے نیچے ہی رہتی ہے، بعد میں حکومت کے کارندے باضابطہ جانچ کرتے ہیں کہ جس کام کے لیے پیسہ لیا گیا تھا، اُس کام میں لگایا گیا یا نہیں۔

دریافت طلب یہ ہے کہ اس اسکیم میں حصہ لینا، اور جس کام کے لیے پیسہ لیا گیا ہے، اسی کام میں لگائے، تو جائز ہے یا نہیں؟

نیز اگر اس اسکیم کے تحت پیسہ لینا جائز ہے، تو جس کام کے لیے پیسہ لیا گیا ہے، اُس کام کے علاوہ کسی اور کام میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اس قسم کے پلان سے حکومت کا مقصد؛ سودخوری نہیں ہے؛ بل کہ روزگار اور غریب رعایا کو روزگار مہیا کرنا، اور فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کرنا ہے؛ اس لیے اگر کوئی شخص سرکاری بینک سے اس قسم کی اسکیم کے تحت قرض لے، اور حکومت کی طرف سے ملی ہوئی امدادی رقم سے سود ادا ہو جاتا ہو، اپنی طرف سے زائد رقم نہ دینا پڑے، تو اس تاویل سے کہ حکومت نے بہ طور تعاون جو رقم دی تھی، اس نے وہ تعاون والی رقم واپس کردی؛ مذکورہ اسکیم سے استفادہ کرنے کی گنجایش ہے؛ بہ شرطے کہ وقت کے اندر قرض ادا کر دے؛ تاکہ تاخیر کرنے کی وجہ سے اپنے پاس سے سود نہ دینا پڑے، اور حکومت سے جس کام کے نام پر قرض حاصل کیا، اسی کام میں خرچ کرنا چاہیے، دوسرے کام میں وہ رقم لگانا قانوناً جرم ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۴۹۰/د، ۶۰۳/د، ۱۴۳۸ھ)

کیا دو الگ الگ ملکوں کی کرنسیوں کا کمی زیادتی کے ساتھ تبادلہ کیا جاسکتا ہے؟

سوال: ہمارے پاس ریال ہو، اور انڈیا میں اس کو روپے میں لینا چاہیں، تو اس کا تبادلہ؛ ایکسچینج ریٹ سے زیادہ دے کر لے سکتے ہیں کیا؟ مثلاً: سعودی عرب میں ۲۵۰۰/ ریال دیں گے، تو انڈیا میں اس کی وَیلو ایک لاکھ روپے ملیں گے، کیا یہ جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: دو ملکوں کی کرنسی آپس میں مختلف الجنس ہیں، اُن کا تبادلہ کمی زیادتی کے ساتھ جائز ہے، صورتِ مسئولہ میں سعودیہ کرنسی ۲۵۰۰/ ریال دے کر انڈیا میں اس کی ویلو ایک لاکھ روپے لینا جائز ہے۔

وإذا عدِم الوصفان والمعنى المضمُوم إليه حلّ التّفاضُل والنَّساء؛ لعدم العلّة المُحرّمة. (هداية: ۳/ ۷۹) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　　۸/ ربیع الاول/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۳۱۵/ م، ۳۳۴/ م، ۱۴۳۸ھ)

دو مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا تفاوت کے ساتھ تبادلہ کرنا سود نہیں

سوال: پرانے نوٹ بند ہوگئے ہیں، ہم تو سعودی عرب میں ہیں، یہاں پہلے تقریباً ۶۵۰۰/ ریال کے انڈیا میں ایک لاکھ ملتے تھے؛ لیکن اب ۳۵۰۰/ ریال میں ایک لاکھ دے رہے ہیں؛ لیکن پرانے نوٹ، تو کیا یہ سود ہے یا حلال ہے؟ برائے مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں راہ نمائی فرمائیں۔ کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: دو ملکوں کی کرنسی کا آپس میں تبادلہ کمی زیادتی کے ساتھ جائز ہے، اور حلال ہے، یہ سود نہیں ہے؛ البتہ ایک ملک کی کرنسی کو تبادلہ کرنے میں برابری کا ہونا ضروری ہے، اس میں کمی زیادتی ہوگی، تو یہ سود ہو جائے گا۔

الرِّبا محرَّمٌ في كلّ مكيل أو موزُون إذا بيع بجنسه مُتفاضلاً، فالعلّة عندنا الكيلُ مع الجنس أو الوزنُ مع الجنس. (الهداية، كتاب البيوع، باب الربا: ۳/ ۶۱، ط: اتحاد، ديوبند)

وعلَّته أي: علَّةُ تحريم الزِّيادة القدرُ المعهُود بكيلٍ أو وزن مع الجنس، فإن وجدا حرم الفضلُ والنَّساء، وإن عدما حلاَّ، وإن وجد أحدُهما حلَّ الفضلُ وحرم النَّساءُ. (الدرالمختار، كتاب البيوع، باب الربا: ۷/ ۴۰۳-۴۰۴، ط: زكريا، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند　　۸/ ربیع الاول/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۷۳/ ب، ۳۱۰/ ب، ۱۴۳۸ھ)

گلٹ کے سکوں کو نوٹ یا سامان کے بدلے کمی بیشی کے ساتھ تبدیل کرنے کا حکم

سوال: ہمارے یہاں دس روپے کے گلٹ کے سکے بہت بڑی تعداد میں چل رہے ہیں، بڑے دکان دار؛ لینے سے انکار کرتے ہیں، تو پولس آجاتی ہے کہ تم گورنمنٹ کے سکے کی توہین کررہے ہو، مجبوراً دکان داروں نے یہ کام شروع کردیا کہ گلٹ کے ۱۰۰؍ روپے لیتے ہیں، اور ۹۵؍روپے، یا ۹۵؍روپے کا سامان دیتے ہیں، کہیں پانچ پرسنٹ کہیں سات پرسنٹ کمی کے ساتھ لے رہے ہیں، کیا شرعاً یہ درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: گلٹ والے سکوں کے سو روپے کے بدلے؛ کاغذی پچانوے روپیوں کا لین دین جائز نہیں؛ البتہ پچانوے روپے کا سامان؛ آپسی رضامندی سے لین دین کرلیں، اس کی گنجایش ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۳؍۶؍۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۳؍۳؍۲۰۱۷ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخرالاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۸۱؍ھ،۲/۱۷۲؍ھ، ۱۴۳۸ھ)

پٹرول ادھار بیچنے کی صورت میں کچھ فی صد زائد کٹوتی کرنا یا سروس چارج کے نام سے زائد رقم لینا سود ہے

سوال: محترم! سوال یہ ہے کہ میں ایک پٹرول پمپ پر عرصۂ دراز سے ملازم ہوں، اور الحمد للہ ناپ تول اور کوالیٹی کا معیار بالکل درست ہے، ہمارا مال جہاں نقد فروخت ہوتا ہے، وہیں دو مختلف صورتوں میں ادھار بھی فروخت ہوتا ہے:

(۱) کریڈٹ کارڈ کے ذریعے؛ جس میں سودی استعمال کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں، اور سود سے بچ بچا کر استعمال کرنے والے لوگ بھی، ہمیں اس ادھار کی ادائیگی بینک کی طرف سے کی جاتی ہے؛ ۰۰۵۔۰؍ فی صد کٹوتی کے بعد، یہ جو کٹوتی بینک کرتا ہے، سود ہے یا نہیں؟

(۲) دوسری طرح کا ادھار ہم اپنے پٹرول پمپ کے ذاتی کھاتے سے دیتے ہیں، یعنی: مخصوص رقم کا ڈپازٹ رکھ کر کھاتے دار کو پٹرول لینے کے لیے کتاب دے دیتے ہیں، جس میں وہ چیک بُک کی طرح اندراجات کرکے ہمیں دیتا ہے، جس کے مطابق ہم اسے پٹرول وغیرہ ایک مہینے کے ادھار پر فراہم کردیتے ہیں، مہینہ گذرنے کے بعد گذشتہ ماہ کا مکمل حساب بل کی صورت میں پارٹی کو دیتے ہیں، جس کی وہ چند دن میں یا بعض اوقات کئی کئی دن بعد ادائیگی کرتا ہے، جس پر ہم کوئی بھی لیٹ فیس نہیں لیتے، ہاں کھاتا کھولتے وقت ادھار کی شرائط میں ایک تو مخصوص رقم ڈپازٹ کی صورت میں رکھتے ہیں، اور ٹوٹل بل کی رقم پر؛ جیسے: ۱۰۰۰۰/روپے کے بل پر ۲/فی صد؛ یعنی: ۲۰۰/روپے، یا ۱/فی صد؛ یعنی: ۱۰۰/روپے چارج کرتے ہیں، یہ جو ہم ایک یا دو فی صد سروس چارج کی مد میں وصول کرتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) جی ہاں! بینک؛ کارڈ ہولڈر کی طرف سے وکالتاً نقد ادائیگی میں آپ سے مکمل بل میں جو ۰٫۰۰۵/فی صد کی کٹوتی کرتا ہے؛ جب کہ وہ کارڈ ہولڈر سے کسی کٹوتی کے بغیر مکمل رقم وصول کرتا ہے، وہ شرعاً سود ہے۔

(۲) ایک ماہ یا کم وبیش مدت کے بعد ٹوٹل بل پر سروس چارج کے نام سے جو ایک فی صد یا دو فی صد مزید رقم وصول کی جاتی ہے، یہ شرعاً سود ہے، جائز نہیں؛ البتہ اگر آپ ادھار کی وجہ سے پٹرول کا ریٹ کچھ بڑھا دیں، مثلاً: ادھار کی صورت میں پٹرول ۷۵/روپے فی لیٹر کے بجائے ۷۹/روپے فی لیٹر ہوگا، اور اسی حساب سے بل بنا کر ایک ماہ یا کم وبیش متعینہ مدت میں رقم وصول کی جائے، تو اس میں شرعاً کچھ حرج نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۱۲/۹ھ = ۲۰۱۷/۹/۱ء، جمعہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۳۶۴/ن، ۱۲۲۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

بینک کی سودی رقم کے مصارف کیا کیا ہیں؟

سوال: کیا بینک میں رکھی رقم؛ حسبِ ذیل میں خرچ کی جاسکتی ہے:

(۱) کورٹ کے ناجائز مقدمات (کیس) میں، کورٹ کی فیس، وکلاء کی فیس، اور ناجائز اخراجات؛ جیسا کہ پولیس پر، خالی کرنے کے سلسلے میں اُن افراد پر جو اثر اور طاقت رکھتے ہیں، اور وکلاء پر؛ جو کہ لاکھوں روپے ہوتے ہیں؛ دی جاسکتی ہے؟

(۲) کھاتے پیتے خوش حال گھرانے کے کم عمر بچے، جب اسکول میں داخلہ کراتے وقت؛ اسکول کی بلڈنگ، تعمیری فنڈ پر مطالبہ کیا جاتا ہے، جو رقم تقریباً ایک لاکھ روپے ہے؛ دی جاسکتی ہے؟

(۳) کیا مسلمان طالب علم کے لیے ڈاکٹری تعلیم، یا دوسرے علم کی فیس میں کچھ رقم دی جاسکتی ہے؟

(۴) کیا کوئی مسلمان جو مجبور ہے، سائل ہے، مدد کے لیے سوال کرتا ہے، کیا یہ رقم دی جاسکتی ہے؟

(۵) کیا انکم ٹیکس یا بلدی ٹیکس؛ اس سود کی رقم سے دی جاسکتی ہے؟

(۶) آج کے مہنگے دور میں غریب کے گھر کی تعمیر، یا غریب کے قرض کی ادائیگی پر یہ رقم دی جاسکتی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱،۲)** بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم؛ کورٹ کی فیس، وکیل کی فیس میں، یا پولیس کو دینا جائز نہیں، اسکولی تعمیر میں لگانا بھی جائز نہیں۔

(۳) ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے والے مال دار طالبِ علم کی فیس میں دینا جائز نہیں۔

(۴) جی ہاں! اُس کو یہ رقم دے سکتے ہیں۔

(۵) جی نہیں! بلدی ٹیکس میں دینا جائز نہیں، انکم ٹیکس میں دے سکتے ہیں۔

(۶) جی ہاں! اُسے دے سکتے ہیں، اس طرح پر کہ اس کے ہاتھ میں اُسے مالک ومختار بنا دیں، اینٹ، بجری، سیمنٹ، لوہا، سریا اُسے خرید کر دینا بھی جائز ہے۔

و یردُّونها على أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبيل الكسب الخبيث التصدُّق إذا تعذَّر الرَّد على صاحبه. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره: ۵۵۳/۹، ط: زكريا، ديوبند)

و يُشترطُ أن يكون الصَّرفُ تمليكاً لا إباحةً كما مرَّ، لا يُصرفُ إلى بناءِ

نحو مسجدٍ. (الدر المختار، کتاب الزکاۃ، باب الصرف: ۳/ ۲۹۱، ط: زکریا، دیوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۷۸/ب،۱۹۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

بینک میں سیونگ اکاؤنٹ کھلوانا اور اس میں ملنے والے سود کا مصرف

سوال: میں میانمار (برما) کا رہنے والا ہوں، میانمار میں کوئی اسلامی بینک نہیں ہے، اگر ہم بینک میں پیسے جمع کرنا چاہیں، تو ہمارے لیے دو آپشن ہیں: سیونگ اکاؤنٹ؛ جس میں انٹرسٹ ملتا ہے، اور کرنٹ اکاؤنٹ؛ جس میں کوئی انٹرسٹ نہیں ملتا ہے؛ اس لیے اگر ہم انٹرسٹ سے بچنا چاہیں، تو ہم کرنٹ اکاؤنٹ میں اپنے پیسے جمع کرسکتے ہیں؛ مگر کچھ مسلمان سیونگ اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرتے ہیں؛ انٹرسٹ لینے کے ارادے سے؛ تاکہ اس کا استعمال بیت الخلاء بنانے، اور رشوت دینے وغیرہ میں کیا جاسکے، تو کیا اس طرح کے کاموں کے لیے انٹرسٹ لینا حلال ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: کرنٹ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں صرف یہ فرق نہیں ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں انٹرسٹ نہیں ملتا، اور سیونگ میں کچھ فی صد انٹرسٹ ملتا ہے؛ بل کہ دونوں اکاؤنٹس میں مختلف وجوہ سے فرق ہے (جس کی تفصیل واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں) اور لوگوں کی ضروریات کے اعتبار سے بھی دونوں اکاؤنٹ یک ساں نہیں ہیں، بعضوں کی ضروریات؛ صرف سیونگ اکاؤنٹ سے پوری ہوتی ہے، اور بعضوں کی کرنٹ اکاؤنٹ سے؛ اس لیے آدمی اپنے حالات وضروریات ومسائل کے مدِنظر دونوں میں سے کوئی بھی اکاؤنٹ کھلواسکتا ہے۔ (مستفاد: منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۱۶۲، مطبوعہ: ایفا پبلی کیشنز، دہلی) البتہ اگر کسی نے سیونگ کھلوایا، تو اس میں انٹرسٹ کے نام سے جو رقم ملے، وہ ذاتی استعمال میں نہ لائی جائے؛ بل کہ بلا نیتِ ثواب غرباء ومساکین کو دے دے، اور اگر انٹرسٹ سرکاری بینک کا ہو تو سرکار کے غیر شرعی ٹیکس میں بھرا جاسکتا ہے، جیسے: انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس وغیرہ، ان کے علاوہ کسی اور مصرف؛ جیسے: رشوت وغیرہ میں انٹرسٹ کی رقم لگانا جائز نہیں، اور اکابر علمائے دیوبند کے فتوے کے مطابق بیت الخلاء اور غسل خانے وغیرہ کی تعمیر میں بھی یہ رقم نہیں لگائی جاسکتی۔

و یردُّونها علی أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلَّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبیل الکسب الخبیث التصدُّق إذا تعذَّر الرَّد علی صاحبه. (رد المحتار، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره: ۹/۵۵۳، ط: زکریا، دیوبند)

قال شیخُنا: ویُستفادُ من کتب فُقهائنا کالهدایة وغیرها: أنّ من ملَكَ بملكٍ خبیثٍ، ولم یُمکنه الرَّد إلی المَالك، فسبیلُه التَّصدُّقُ علی الفقراء، قال: والظَّاهرُ أن المُتصدّق بمثله ینبغِي أن ینويَ به فراغ ذمَّته، ولا یرجُو به المثُوبة. (معارف السنن، أبواب الطهارة، باب ما جاء: لا تقبل صلاة بغیر طهور: ۱/۳٤، ط: المکتبة الأشرفیة، دیوبند)

أفتٰی بعضُ أکابرنا أنّ للمُسلم أن یاخُذ الرِّبا من أصحاب البنك أهل الحرب في دارهم، ثُمَّ یتصدَّق به علی الفُقراء، ولا یصرفه إلی حوائج نفسه. (إعلاء السنن: ۱٤/۳۷۲، ط: إدارة القرآن والعلوم الاسلامیة، کراتشي) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۱۸ھ = ۲۰۱۷/۲/۱۶ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۳۵/ن، ۴۶۴/ن، ۱۴۳۸ھ)

سودی رقم غریب رشتے داروں یا ان کے بچوں کی شادی وغیرہ میں دینا کیسا ہے؟

سوال: میں سودی رقم کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں:

(۱) کیا ہم بینک کی سودی رقم کو اپنے غریب رشتے داروں کو دے سکتے ہیں؟

(۲) یا کیا ہم اُن کے بچوں کی شادی کے لیے یہ رقم؛ سونے کی شکل میں دے سکتے ہیں؟

(۳) یا کیا ہم کسی بھی غریب کی شادی میں یہ پیسہ دے سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جی ہاں! آپ سود کی رقم اپنے غریب رشتے داروں کو دے سکتے ہیں؛ البتہ سود کی رقم کسی غریب کو دیتے وقت ثواب کی نیت نہ کی جائے، صرف حرام مال کے وبال سے بچنے کی نیت کی جائے۔

و یردُّونها على أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلَّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبيل الكسب الخبيث التصدُّق إذا تعذَّر الرَّد على صاحبه. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع: ۵۵۳/۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

قال شيخُنا: ويُستفادُ من كتب فُقهائنا كالهداية وغيرها: أنّ من ملَكَ بملكٍ خبيثٍ، ولم يُمكنه الرَّد إلى المَالك، فسبيلُه التَّصدُّقُ على الفقراء.... قال: والظَّاهرُ أن المُتصدّق بمثله ينبغِي أن ينويَ به فراغ ذمَّته، ولا يرجُو به المثُوبة. (معارف السنن، أبواب الطهارة، باب ما جاء: لا تقبل صلاة بغير طهور: ۳۴/۱، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

(۲) جی ہاں! آپ غریب رشتے داروں کو اُن کے بچوں کی شادی کے لیے سود کی رقم؛ سونے کی شکل میں دے سکتے ہیں؛ البتہ دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

ایک یہ کہ رشتے داروں میں جس کو سود کی رقم کا مالک بنایا جائے، وہ اس وقت غریب ہو، مال دار نہ ہو؛ ورنہ اُسے سود یا زکاۃ کی رقم دینا درست نہ ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بہ یک مشت سونے یا چاندی کی صرف اتنی مقدار دی جائے، جس سے وہ صاحبِ نصاب نہ بنے؛ ورنہ ادائیگی تو درست ہوجائے گی؛ البتہ بہ یک مشت اتنی مقدار دینا مکروہ ہوگا۔

قال محمَّد في الأصل: إذا أعطى من زكاته مأتي درهم أو ألف درهم إلى فقيرٍ واحدٍ، فإن كان عليه دينٌ مقدار ما دفع إليه، وفي الخانية: أو يبقى دون المأتين، م: أو كان صاحب عيالٍ يحتاجُ إلى الإنفاق عليهم؛ فإنَّه يجُوز ولايُكره، وإن لم يكن عليه دينٌ ولاصاحب عيالٍ، فإنَّه يجُوز عند أصحابنا الثَّلاثة و يُكره إلخ. (الفتاوى التاتارخانية، كتاب الزكاة، الفصل الثامن: ۳/ ۲۲۱-۲۲۲، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

(وكُره إعطاءُ فقيرٍ نصابًا) أو أكثر (إلا إذا كان) المدفُوع إليه (مديُوناً،أو) كان (صاحب عيالٍ) بحيثُ (لوفرَّقه عليهم لايخصُّ كلًّا) أو لايفضل بعد دينه (نصابٌ) فلايُكره. فتح. (الدرالمختار مع ردالمحتار، كتاب الزكاة، باب المصرف: ۳۰۳/۳ - ۳۰۴، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) قولُه: (وكُره إعطاءُ فقيرٍ نصاباً أو أكثر:).... دفعُ مايكمل النِّصاب كدفع النِّصاب، قال في النَّهر: والظَّاهرُ أنَّه لافرق بين كون النِّصاب نامياً أو لا، حتّٰى لوأعطاهُ

عروضاً تبلغُ نصاباً فكذلك، و لابين كونه من النقُود أو من الحيوانات إلخ. (ردالمحتار)

وانظُر مراقي الفلاح وحاشيته للطحطاوي (ص: ۷۲۱ - ۷۲۲، ط: دارالكتب العلمية، بيروت) **أيضًا.**

(۳) جی ہاں! آپ سود کی رقم کسی غریب کو؛ اس کی یا اس کے کسی بچے کی شادی کے لیے دے سکتے ہیں؛ البتہ غریب یا اُس کی اولاد کو جب سود کی رقم دی جائے، تو اس وقت اس کا غریب ومستحق ہونا ضروری ہے (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) اگر سود کی رقم دیتے وقت؛ وہ غریب نہ ہوا، یا کچھ رقم دینے کے بعد وہ غریب نہیں رہا، تو اسے سود کی رقم دینا جائز نہ ہوگا، اور آج کل شادی کے لیے عام طور پر لوگ ہزاروں؛ بل کہ لاکھوں کا خرچا کرتے ہیں؛ لہٰذا غریب لوگوں کی شادی کے لیے سود یا زکاۃ کی رقم دیتے وقت؛ غربت کی شرط کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۹ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۷ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۹۰/تتمہ/ن، ۵۲۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

کیا اکاؤنٹ میں آنے والی سودی رقم اور گری پڑی چیز کو غریب استعمال کرسکتا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

(۱) ایک شخص غیر صاحبِ نصاب ہے، اس کے سیونگ اکاؤنٹ میں دو تین ہزار روپے رہتے ہیں، اور جو تنخواہ ملتی ہے، وہ ہر مہینے ہاتھ کے ہاتھ خرچ ہوجاتی ہے، تو اس کے اکاؤنٹ میں جو سود کا پیسہ آتا ہے، اُس کو کسی دوسرے غریب کو دے، یا خود اپنے کام میں؛ بچوں کی فیس وغیرہ میں خرچ کرسکتا ہے؟

(۲) اسی طرح کسی کو کوئی گری پڑی چیز ملی، اور اس کے مالک کا پتا نہیں چل پایا، جس کو ملی ہے، وہ صاحبِ نصاب ہے، اُس نے اِس غریب کو دے دی، تو یہ کسی اور مستحق کو دے، یا خود اپنے کام میں؛ بچوں کی فیس وغیرہ میں خرچ کرلے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۲) اگر کسی غریب (غیر صاحبِ نصاب) نے کسی ضرورت کے تحت سیونگ اکاؤنٹ کھلوایا ہوا ہے، سود لینے کے مقصد سے نہیں، تو اس کے اکاؤنٹ میں موجود؛ دو، تین ہزار کی رقم ماہانہ یا سالانہ جو انٹرسٹ آتا ہے، وہ یہ شخص بہ حیثیت غریب اپنی ضروریات، جیسے: کھانے، پینے کی اشیاء، گھریلو ضروریات اور بچوں کے اخراجات وغیرہ میں استعمال کرسکتا ہے، کسی دوسرے غریب کو دینا ضروری نہیں۔

اسی طرح اگر کسی غریب (غیر صاحبِ نصاب) کو کسی شخص نے راستے وغیرہ میں کوئی گری ہوئی چیز دی، جب کہ اس نے مالک کا پتا لگانے کی کوشش کی؛ لیکن اس کا کوئی پتا نہیں لگا، اور اتنی مدت گذر گئی کہ اٹھانے والے کو یقین ہوگیا کہ اب مالک اُسے تلاش نہیں کررہا ہوگا، یا مزید انتظار کرنے میں اُس چیز کے خراب ہوکر ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، تو یہ غریب شخص وہ سامان اپنی جس ضرورت میں چاہے استعمال کرسکتا ہے، کسی دوسرے غریب کو دینا ضروری نہیں ہے۔

وعرف .... إلی أن علم أنّ صاحبها لایطلبُها أو أنّها تفسُد إن بقیت، کالأطعمة والثّمار کانت أمانةً لم تضمن بلا تعدٍّ .... فینتفع الرّافعُ بها لو فقیراً؛ وإلا تصدَّق بها علی فقیرٍ إلخ. (الدرالمختار مع رد المحتار، کتاب اللقطة: ۶/۴۳۵ - ۴۳۸، ط: مکتبة زکریا، دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۰ھ = ۲۰۱۷/۲/۱۸ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۴۵/ن، ۴۷۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

غریب قیدی کی رہائی اور وکیل وغیرہ کے لیے سود کا پیسہ لگانے کا حکم

سوال: البر فاؤنڈیشن ممبئی؛ ایک سوشل ورفاہی ادارہ ہے، جو پچھلے کئی سالوں سے ممبئی اور اس کے اطراف کے کئی جیلوں میں؛ مسلم اور غیر مسلم قیدیوں کی رہائی کا کام کرتا ہے، الحمدللہ مذکورہ فاؤنڈیشن کی طرف سے اب تک ۱۲۰ سے زائد قیدیوں کی رہائی کروائی جا چکی ہے، اُن میں ایسے مسلم و غیر مسلم قیدی شامل ہیں، جو مجرمانہ ریکارڈ نہیں رکھتے، یا جرم کے عادی نہیں ہیں؛ مگر کسی

چھوٹے موٹے کیس میں پھنس جاتے ہیں، مجبوری اور غربت کے سبب بیل کا پیسہ جمع نہیں کروا سکتے، یا وکیل کی فیس جمع کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، جس کے سبب: کافی دنوں تک جیل میں پھنسے رہ جاتے ہیں، اُن کے پیچھے غریب اہل وعیال کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ادارہ ابھی تک ایسے غیر مسلم قیدیوں کو سود وانٹرسٹ کی رقم سے رہائی کرواتا رہا ہے، سوال یہ ہے کہ:

(۱) بہت سارے مسلمان جو اصلاً جرم کے عادی نہیں ہوتے ہیں؛ مگر کسی وجہ سے پھنس جاتے یا پھنسا دیے جاتے ہیں، غربت و مجبوری کی وجہ سے جیل میں پھنسے ہوتے ہیں، جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا، کیا اُن کی رہائی کے لیے سود اور انٹرسٹ کا پیسہ استعمال کیا جاسکتا ہے؟

(۲) کسی بھی قیدی کی رہائی کروانے کا ایک مکمل پروسیزر ہوتا ہے، جس میں مسلم و غیر مسلم وکلاء وعملاء کام کرتے ہیں، آفس کا خرچ، اُن کی فیس، تنخواہیں اور دیگر اخراجات کو سود کی رقم سے ادا کیا جاسکتا ہے؟

بہ راہِ کرم ان سوالات کا؛ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں؛ تاکہ بہتر طریقے سے وسیع پیمانے پر یہ کام کیا جا سکے، اللہ ہم سب کی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱-۲)** سود کی رقم جو بینک سے ملتی ہے، اُس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اسے بلا نیتِ ثواب؛ غرباء و مساکین پر صدقہ کر دیا جائے؛ یعنی: اُنھیں مالک بنا کر دے دیا جائے، بینک سے ملنے والا سود بہ راہِ راست قیدیوں کو چھڑانے، وکیلوں کی فیس، کاغذات کی تیاری وغیرہ میں استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، قیدی؛ خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہاں یہ کرسکتے ہیں کہ آپ کی کمیٹی جس قیدی کے مقدمے کی پیروی کرنا چاہ رہی ہے، وہ قیدی کسی کو وکیل؛ یعنی: نمایندہ بنا دے کہ یہ کمیٹی سے میرے لیے رقم لے کر میرے مقدمے میں خرچ کریں، پھر یہ وکیل؛ یعنی: نمایندہ؛ کمیٹی سے مذکورہ قیدی کے نام پر سود کی رقم لے کر مقدمے میں حسبِ ضرورت؛ خرچ کرتا رہے، حاصل یہ ہے کہ کمیٹی کا بہ راہِ راست سود کی رقم؛ مقدمات کی پیروی میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، جس قیدی کے مقدمے کی پیروی کرنی ہے، وہ قیدی کسی کو نمایندہ بنا دے، تو نمایندہ سود کی رقم سے وکیل کی فیس وکاغذات کی تیاری، ضمانت کی رقم وغیرہ ادا کرسکتا ہے۔

قال في الدّر: ويردُّونها على أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلَّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبيل الكسب الخبيث التصدُّق إذا تعذَّر الرَّد على صاحبه. (الدر مع الرد: ۵۵۳/۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۲۶ھ

الجواب صحیح: محمد مصعب عفی عنہ

جواب درست ہے؛ البتہ قیدی کی طرف سے رقم وصول کرنا اُس وقت درست ہوگا، جب کہ قیدی؛ غریب مستحقِ زکاۃ ہو۔

فخر الاسلام عفی عنہ

(۶۷۶/د، ۱۰۱۷/د، ۱۴۳۸ھ)

غیر مسلموں کی زور زبردستی کی وجہ سے سودی رقم مندر میں دینے کا حکم

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ کیا سود کا پیسہ کسی ایسے مندر کے خرچ میں دینا جائز ہے، جس کا ٹرسٹ مسلمانوں کی دکانوں میں پیسہ مانگنے کے لیے آتا ہے، اور نہ دینے کی صورت میں زبردستی کرتے ہیں، اور کوئی چیز اٹھا کر چلے جاتے ہیں، اور پولیس بھی اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی، اور نہ دینے کی صورت میں کاروبار کے لیے وہ ہمیشہ دردِسر بن جاتے ہیں، بہ راہِ کرم جلد از جلد جواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: سود کا پیسہ مالِ خبیث اور حرام ہے، بلا نیتِ ثواب؛ اُس کو لٹے پٹے خستہ حال اور پریشان حال لوگوں کو دے دیں، مندر کو دینا جائز نہیں، مندر کے لیے مانگنے والے اگر زبردستی کریں، اور نہ دینے پر کوئی قیمتی سامان لے کر جبراً چلے جاتے ہیں، تو آپ اپنی جیب سے اُن لوگوں کو اس نیت سے دے دیجیے کہ اُن کو ہبہ کرکے اُنھیں مالک بنا دیجیے، پھر وہ مالک ہونے کے بعد جس کام میں چاہیں لگائیں، مندر کی نیت سے نہ دیں، اس طرح آپ مندر کی اعانت سے بچ جائیں گے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۲۵/ب، ۲۴۳/ب، ۱۴۳۸ھ)

بینک سے ملنے والی سودی رقم کو بینک کے سروس چارج میں دینا درست نہیں

سوال: آج کل ہر بینک میں نیٹ بینکنگ، موبائل بینکنگ، کریڈٹ اور ڈیبٹ کارڈ وغیرہ کی سہولیات ہیں، اور بینک والے اکاؤنٹ سے سروس چارج کے نام پر پیسے کاٹ لیتے ہیں، نیز بینک کے اکاؤنٹ میں سودی رقم بھی دیتے ہیں، میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس سودی رقم کو سروس چارج میں استعمال کر سکتے ہیں؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: سودی رقم کو سروس چارج میں دینا درست نہیں۔

فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلۂ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۲/رجب/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلۂ بلند شہری

(۱۰۴۱/م، ۱۰۰۶/م، ۱۴۳۸ھ)

سرکاری اقلیتی لون لینے کا حکم

سوال: سرکاری اقلیتی لون لینا حلال ہے یا حرام؟ جیسے: حکومت دو لاکھ کا لون دیتی ہے، یہ مجموعی رقم بینک سے لینا پڑتا ہے، تو اس میں ایک لاکھ معافی ہے، اور باقی ایک لاکھ کا بینک میں انٹرسٹ (سود) ادا کرنا پڑ رہا ہے، یہاں پر مسئلہ یہ ہے کہ حکومت تو انٹرسٹ نہیں لے رہی ہے؛ لیکن بینک میں انٹرسٹ ادا کرنا پڑ رہا ہے، تو کیا اس کا لینا جائز ہوگا یا نہیں؟ بہ راہِ کرم اس کا حل بتائیں۔ جزاک اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر یہ صحیح ہے کہ حکومت دو لاکھ کا لون دے کر؛ ایک لاکھ معاف کر دیتی ہے، اور بقیہ ایک لاکھ کی ادائیگی انٹرسٹ (سود) کے ساتھ کرنی پڑتی ہے، تو مذکورہ اقلیتی لون لینے کی اس شرط کے ساتھ گنجایش ہوگی کہ انٹرسٹ (سود) کی ادائیگی ایک لاکھ سے

زائد نہ ہو؛ ورنہ سود ادا کرنے کا گناہ ہوگا، اور معاملہ ناجائز ہوگا۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۴؍جمادی الاولیٰ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۶۳۵؍م، ۶۶۵؍م، ۱۴۳۸ھ)

ایل آئی سی پالیسی اور بینک سے ہوم لون لینا کیسا ہے؟

سوال: میں ایک فری لانسر (آزاد پیشہ ور) ہوں، اور دہلی میں ایک کرایے کے مکان میں رہتا ہوں، میری سالانہ آمدنی آٹھ دس لاکھ روپے ہیں، میرا سوال یہ ہے کہ:

(۱) میری ایک ایل آئی سی پالیسی ہے، جس میں ۲۴۰۰۰؍روپے ہر سال ادا کرتا ہوں، اس میں مرنے کا انشورنس بھی شامل ہے، کیا اس کی اجازت ہے؟

(۲) کیا میں بینک سے سود پر ہوم لون لے سکتا ہوں؟ میرا کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے، جب کہ میرے کچھ کاشت کے کھیت ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: **(۱)** ایل آئی سی کا کاروبار سود اور قمار (جوے) پر مشتمل ہے؛ لہٰذا اس قسم کی پالیسی میں مسلمان کو حصہ لینا جائز نہیں۔

قال اللّٰه تعالیٰ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الخَمرُ وَالمَيسِرُ وَالأَنصَابُ وَ الأَزلَامُ رِجسٌ مِّن عَمَلِ الشَّيطَانِ فَاجتَنِبُوهُ لَعَلَّكُم تُفلِحُونَ﴾ (المائدة: ۹۰)

عن عبد اللّٰه بن عمرو أن نبيَّ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم نهى عن الخمر والمَيسر والكُوبة والغُبيراء، و قال: كلُّ مُسكرٍ حرامٌ. (أبوداؤد، باب النهي عن المسكر: ۳۲۷/۲، رقم الحديث: ۳۶۸۵)

وحرم لو شُرِط فيها من الجَانبين؛ لأنَّه يصيرُ قِماراً. (الدرالمختار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره: ۵۷۷/۹، ط: زكريا، ديوبند)

(۲) عام حالات میں؛ بینک سے لون لینا مسلمان کے لیے جائز نہیں، اس سے آدمی آزمایش میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے گھر میں، کاروبار میں نحوست اور بے برکتی آتی ہے۔

قال اللّٰه تعاليٰ: ﴿أَحَلَّ اللّٰهُ البَيعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (البقرة: ٢٧٥)

عن جابر رضي اللّٰه عنه قال: لعَن رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم آكل الرِّبا ومُوكلِه وكاتبه وشاهديه، وقال: هُم سواءٌ. (صحيح مسلم، كتاب الربا: ٢/ ٢٧، ط: اتحاد، ديوبند)

كلُّ قرضٍ شُرِط فيه الزِّيادةُ فهُو حرامٌ بلا خلافٍ، قال ابنُ المُنذر: أجمعُوا على أن السَّلف إذا شرط على المستسلف زيادة أو هديَّة فأسلف على ذلك، إن أخذ الزِّيادة على ذلك رباً. (إعلاء السنن، كتاب الحوالة، باب كل قرض جرّ منفعة فهو ربا: ١٤/ ٥١٣، ط: إدارة القرآن والعلوم الإسلامية، كراتشي) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۶۷/ب، ۲۹۱/ب، ۱۴۳۸ھ)

کرایے کے گھر کے ڈپازٹ کے لیے لون لینا کیسا ہے؟

سوال: کرایے کے گھر کا ڈپازٹ (جمع کرنا) دینے کے لیے لون لینا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّيا ومسلّما: اس مقصد کے لیے سودی قرض لینا جائز نہیں، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۱۵ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۵۶/تتمہ/ل، ۶۵۸/ل، ۱۴۳۸ھ)

بینک سے لون پر کار لینے کی جائز صورت

سوال: ہم اگر کار نقد پورا پیسہ دے کر لیں، تو انکم ٹیکس کے جھمیلے کا ڈر ہے، اور وہی اُسے بینک سے لون پر لیں، تو اس مصیبت سے بچ جائیں گے، اور یہ کار مجھے (uber,ola) میں تجارت کے حساب سے لینی ہیں، تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: بینک سے لون لے کر کار خریدنے کی صورت میں انکم ٹیکس کی مصیبت سے تو بچ جائیں گے؛ لیکن سود دینے کی خرابی سے نہیں بچ پائیں گے، جب کہ سود سے بچنا بھی اہم ہے؛ اس لیے لون لینے کے بجائے اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ بینک والا کمپنی سے کار پہلے خود خرید لے، اور اس پر جس قدر وہ منافع لینا چاہے، اُس کو کار کی قیمت میں شامل کر لے: چاہے وہ اُسے سود کا نام دے؛ لیکن آپ اُسے کار کی قیمت سمجھ کر قسطوں پر خرید لیں، اور ادائیگی کی قسطیں متعین کر لیں، آپ بینک والے کو خریدنے کا وکیل نہ بنائیں؛ بل کہ وہ خود اصیل کی حیثیت سے خرید کر اُس پر نفع شامل کر کے آپ کے ہاتھ؛ قسطوں پر بیچ دے، اس طریقے پر معاملہ کرنے سے سود سے بچ جائیں گے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۷؍ربیع الاول؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۳۴۵؍م، ۳۳۰؍م، ۱۴۳۸ھ)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے پی ئی ایف میں پیسہ جمع کرانے کا حکم

سوال: میں ایک تنخواہ یافتہ ملازم ہوں، اور ایک سرکاری کمپنی میں کام کر رہا ہوں، سرکاری اصول وضابطے کے مطابق مجھ پر انکم ٹیکس لاگو ہوتا ہے، اور کمپنی کے مالی محکمے سے میرا ٹیکس وضع ہو جاتا ہے، میں ہر مہینے /2500 روپے انکم ٹیکس ادا کرتا ہوں، سال کے باقی مہینے: فروری اور مارچ میں: میں علی الترتیب/ 7500،9000 ٹیکس ادا کرتا ہوں، تنخواہ میں اضافے کے ساتھ ساتھ ٹیکس بھی بڑھ جاتا ہے، ٹیکس کی کچھ رقم بچانے کے لیے ایک طریقہ پی ئی ایف میں انویسٹ کرنا ہے، اور یہ پی ئی ایف سودی نظام والا ہے، اس کے علاوہ ہندوستان میں ٹیکس بچانے کے لیے کوئی غیر سودی نظام؛ موجود نہیں ہے، تو کیا میں پی ئی ایف میں پیسے لگاؤں؛ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے، اور مستقبل میں بچت کی نیت سے؟ جب کہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے؛ لیکن ہم مستقبل کی خوش حالی کی امید پر جیتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملھم الصواب: انکم ٹیکس سے بچنے کا اگر صرف یہی راستہ ہو کہ پی ئی ایف میں روپیہ انویسٹ کیا جائے، تو بہ درجۂ مجبوری اس کی گنجایش ہے؛ لیکن پی ئی ایف میں جتنی رقم اپنے اختیار سے کٹوائیں گے، اُس پر جس قدر اضافہ کمپنی کی جانب سے ملے گا، وہ اضافہ اپنے استعمال میں نہ لائیں، اُسے فقراء پر صدقہ کردیں، اور جو جبری طور پر ادارے کی طرف سے کاٹ لیا جائے، تو اس پر ملنے والا اضافہ استعمال میں لا سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۷/ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۶۴۲/ م، ۶۵۷/ م، ۱۴۳۸ھ)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے تجارتی لون لینا اور فائنانس پر گاڑی لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

(۱) زید ایک ہندوستانی تاجر ہے، اپنے کاروبار کو مزید فروغ دینے کے لیے بینک سے کچھ رقم لون لینا چاہتا ہے، مثلاً: بیس لاکھ روپے اس کے پاس ہیں، اور مزید بیس لاکھ روپے بینک سے لے کر ایک نئے کاروبار کا آغاز کرنا چاہتا ہے، اور دوسرے لون لینا اس لیے بھی مجبوری ہے کہ یک مشت اگر کاروبار میں اتنی بڑی رقم لگائی جائے، تو اِنکم ٹیکس کی ریڈ کا خطرہ ہے، اور تیسری بات یہ کہ ہندوستان کے بینکوں میں جو پیسہ جمع ہے، وہ ہندو مسلمان سب لوگوں کا ہے، اس سے دوسری قومیں فائدہ اٹھائیں، اور مسلمان یک سر محروم رہیں، یا سرکار کی تمام تجارتی اور کاروباری اسکیموں سے جو بینک کے تحت ہی عمل میں آتی ہیں؛ مسلمان یک سر محروم رہیں، جو اقتصادی طور پر پہلے ہی خستہ حالی کا شکار ہیں، اور مزید خستہ تر ہونے کی کگار پر ہیں۔

(۲) جس طرح ہندوستانی پسِ منظر میں علمائے کرام نے گاڑی کو فائنانس کرانے کی اجازت دی ہے، کیا ایسی کوئی شکل کاروباری لون کی نہیں ہوسکتی؟ اور اگر ہوسکتی ہے، تو اس کی کیا صورتِ حال رہے گی؟ بہ راہِ کرم جواب سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱) اسلام میں جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے، احادیث میں سود لینے والے اور سود دینے والے دونوں پر لعنت آئی ہے؛ اس لیے کاروبار کی ترقی، یا کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کے لیے بینک سے سودی قرض لینا ہرگز جائز نہیں، سخت حرام ہے؛ البتہ اگر کسی شخص کے پاس کاروبار کی ترقی، یا کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کے لیے دیگر اخراجات سے خالی؛ مطلوبہ رقم موجود ہے؛ لیکن وہ انکم ٹیکس ادا کردہ نہیں ہے، یعنی: حکومت کی نظر میں غیر قانونی ہے، جس کی بنا پر کاروبار کی ترقی، یا کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کے لیے اگر بینک سے لون نہ لیا جائے، تو انکم ٹیکس کے حوالے سے مختلف پریشانیوں کا خطرہ ہے، تو ایسی صورت میں محض انکم ٹیکس کے مسائل سے بچنے کے لیے؛ ظاہری طور پر بینک سے لون لینے کی گنجایش ہوگی؛ کیوں کہ یہاں بینک سے سودی قرض؛ کسی فائدے کی غرض سے نہیں لیا جارہا ہے؛ بل کہ صرف انکم ٹیکس کے مسائل سے بچنے کے لیے؛ یعنی: دفعِ ظلم کے لیے؛ اس لیے اس صورت میں ان شاء اللہ گناہ نہ ہوگا۔

(دیکھیے: فتاوی نظامیہ اوندرویہ: ۱/۲۳۳-۲۳۴، مطبوعہ: تھانوی آفسیٹ پرنٹرس، دیوبند، مسائلِ سود، مرتبہ: حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم العالیہ، ص: ۲۴۴-۲۴۵، مطبوعہ: حراء بک ڈپو، دیوبند)

لیکن اس صورت میں بھی بہتر یہ ہے کہ لون کی رقم؛ کہیں اٹھا کر رکھ دی جائے، کاروبار میں استعمال نہ کی جائے، اور پہلے سے موجود اپنی حلال رقم ہی کاروبار میں لگائی جائے۔

عن جابر بن عبد اللّٰہ رضي اللّٰہ عنہما قال: لَعَن رسُول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم آکل الرِّبوا ومُوکلہ وکاتبہ وشاھدیہ، و قال: ھُم سواءٌ. (الصحیح لمسلم: ۲/۷۲، ط: المکتبۃ الأشرفیۃ، دیوبند)

واضح رہے کہ مسلمانوں کی دینی ودنیوی ہرطرح کی ترقی صرف دین وشریعت پر عمل کرنے سے ہوسکتی ہے، دین وشریعت کو نظر انداز کرکے، اور سودی لین دین اور معاملات میں پڑکر ہرگز نہیں ہوسکتی؛ جب کہ غیر مسلموں کے لیے یہ کچھ شرط نہیں؛ کیوں کہ وہ فروعات کے مکلّف ہی نہیں ہیں؛ اس لیے مسلمانوں کو غیروں کی دیکھا دیکھی، اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، اُنھیں اپنے تمام کام شریعت کے مطابق ہی کرنے چاہییں، اسی سے اُن کی ہرطرح کی ترقی ہوگی، بینک کی سودی اسکیموں، یا ناجائز وحرام لین دین اور کاروبار سے مسلمانوں کی کچھ ترقی نہیں ہوسکتی، یہ محض ہماری خام خیالی ہے۔

قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَ لَو أَنَّهُم آمَنُوا وَاتَّقَوا لَفَتَحنَا عَلَيهِم بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرضِ. الآية﴾ (سورة الأعراف، رقم الآية: ٩٦)

(۲) فائنانس پر گاڑی لینے کا حکم وہی ہے، جو اوپر کاروبار کی ترقی، یا کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کے لیے بینک سے سودی قرض لینے کا ذکر کیا گیا، یعنی: اگر کسی کے پاس گاڑی خریدنے کے بہ قدر پیسہ ہے؛ لیکن انکم ٹیکس کے مسائل کی وجہ سے، وہ اپنے پاس موجود؛ ذاتی وحلال رقم سے نہیں خرید سکتا، تو اس صورت میں گاڑی فائنانس پر لینا جائز ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں سودی قرض کا مقصد؛ کوئی فائدہ حاصل کرنا نہیں ہے؛ بل کہ انکم ٹیکس کے مسائل سے بچنا ہے، جو دفعِ ظلم کی شکل ہے، اور اس صورت میں گاڑی خریدنے والے کو چاہیے کہ اگر قسطوں کے انتظار کے بغیر؛ جلد از جلد بینک کا لون ادا کیا جاسکتا ہو، تو ادا کردے، اس میں تاخیر نہ کرے۔

اور اگر کسی کے پاس گاڑی خریدنے کے بہ قدر پیسہ نہیں ہے، تو فائنانس پر گاڑی خریدنا جائز نہیں؛ کیوں کہ اس میں بینک سے سودی قرض کا معاملہ پایا جاتا ہے، جو اسلام میں سخت حرام ہے، ایسا شخص اپنی ضروریات؛ کرایے کی گاڑیوں سے پوری کرے، اُس کے لیے فائنانس پر گاڑی لینے کی اجازت نہیں ہے، اور آپ نے مطلق جواز کا جو مسئلہ سنا، وہ صحیح نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲۷ھ = ۲۰۱۷/۳/۲۷ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۸۱۷/تتمہ/ن، ۶۸۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

ٹیکس سے بچنے کے لیے سودی رقم یا سرکاری پالیسی لینا کیسا ہے؟

سوال: (۱) میں نے ۲۰۱۵ء میں پوسٹ آفس میں ۵۰/ہزار روپے انویسٹ کیے ہیں، جو ۲۰۲۰ء میں ۷۵/ہزار روپے ہو جائیں گے، اور میں نے سال ۲۰۱۶ء اور ۲۰۱۷ء کے لیے ۲۵/ہزار، ۸۷۰/روپے ٹیکس ادا کر دیے ہیں، میرا ارادہ اس آمدنی سے حکومت کو ٹیکس ادا کرنا ہے، میرا سوال یہ ہے کہ کیا میں ۲۰۲۰ء میں اس اضافی رقم کو لے سکتا ہوں؟ چوں کہ ٹیکس سے بچنے کے لیے میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

(۲) کیا میں مستقبل میں بھی پوسٹ آفس سیونگ بونڈ میں پیسے لگا سکتا ہوں؟ اور اس سے ٹیکس ادا کرسکتا ہوں؟

(۳) اگر میرے پاس ٹیکس سے بچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، تو میں کیا پی پی ایف اور سکنیا اکاؤنٹ (sukanya account) میں پیسے لگا سکتا ہوں؟ ٹیکس سے بچنے کے لیے، اور مدت پوری ہونے پر سود لینے کے لیے، مدت ۱۵/سال کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: **حامداً ومصلّیاً ومسلّماً:** **(۱-۳)** اگر آپ ٹیکس میں ۲۵/ہزار روپے دے چکے ہیں، تو ۲۰۲۰ء میں ملنے والی ۲۵/ہزار سودی رقم کو سابقہ ٹیکس کے عوض میں اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، محض ٹیکس سے بچنے کی نیت سے کسی سرکاری پالیسی کو لینے کی گنجایش ہے؛ تاہم اگر آپ ٹیکس ادا کر کے رقم کو کسی تجارت وغیرہ میں لگا کر نفع کمائیں: یہ بہتر ہے، اور اس میں حرام امور کے ارتکاب سے بھی نجات ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۴۰۳/ل، ۱۳۷۲/ل، ۱۴۳۸ھ)

انکم ٹیکس میں دی ہوئی رقم کو سودی رقم سے وصول کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

مکتبہ دارالعلوم دیوبند سے طباعت شدہ کتاب: ''چند اہم عصری مسائل'' (ص: ۳۳۱) پر: امداد المفتیین (۲/۸۵۱، کتاب الربا والقمار) کے حوالے سے؛ یہ لکھا ہے کہ اگر غیر شرعی ٹیکس حکومت کو ادا کر چکا ہے، تو سرکاری بینک، یا دوسرے سرکاری محکمات سے ملنے والی سود کی رقم میں سے؛ ٹیکس میں ادا کردہ رقم کے بہ قدر لے سکتے ہیں، لینے والے کے حق میں سود نہ ہوگا، مذکورہ عبارت کی صورت: یہ بنتی ہے کہ مثلاً: زید ایک سرکاری ملازم ہے، جس کی سالانہ آمدنی تقریبا چار لاکھ ہے، اس نے آئینِ ہند کے مطابق دس ہزار روپے ٹیکس ادا کر دیا، اُس کے بعد زید کے کھاتے میں تین ہزار روپے سود کے نام پر آئے، دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا زید اس رقم کو اپنے ضروریات میں استعمال کرسکتا ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: صورتِ مسئولہ میں اگر وہ بینک جس میں زید کا کھاتا ہے، سرکاری ہے، تو زید کے لیے؛ سود کے نام پر آئے تین ہزار روپے کو اپنی ضروریات میں استعمال کرنے کی گنجایش ہوگی۔

قال في الوهبانيَّة: ومن بيتِ مال المُسلمين ديانة ۞ لذي الحظّ جَاز الأخذُ إن هُو يظفر، ومثلُه في: (احسن الفتاوی: ۲۱/۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۷/۴/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۱۰/ل، ۵۹۱/ل، ۱۴۳۸ھ)

نیشنل اور غیر نیشنل بینک میں انکم ٹیکس سودی رقم سے ادا کرنے کا حکم

سوال: (۱) ابھی حال ہی میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ سود سے انکم ٹیکس ادا کیا جا سکتا ہے، میں تقریباً ایک لاکھ روپے ٹیکس ادا کرتا ہوں، جو میری تنخواہ سے وضع ہوجاتے ہیں، نیشنل بینک میں میری نوکری کے دس سال کا سود جمع ہے، تو جیسا کہ ٹیکس پہلے ہی وضع ہوجاتا ہے، تو کیا میں ٹیکس اور سود کا حساب کرکے؛ آج کی تاریخ تک جتنے پیسے ٹیکس میں وضع ہوئے ہیں، اُتنے ہی پیسے سود میں سے اپنے ذاتی استعمال میں خرچ کرسکتا ہوں؟

(۲) اور کیا یہ حکم غیر نیشنل بینک پر لاگو ہوگا؟ بہ راہِ کرم جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) جی ہاں! آپ انکم ٹیکس کے بہ قدر سرکاری بینک کا سود؛ ذاتی استعمال میں لا سکتے ہیں، گنجایش ہے۔ (امداد المفتین، ص: ۷۰۶، سوال: ۷۴۳، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

مُستفاد: فإذا ظفر بمَال مديُونه له الأخذُ ديانةً؛ بل له الأخذُ من خِلاف الجِنس. (رد المحتار، كتاب السرقة، مطلب في أخذ الدائن من مال مديونه من خلاف جنسه: ۱۵۷/۶، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

اور اگر آپ دس سال کا سارا سود؛ بلا نیتِ ثواب غرباء ومساکین کو دے دیں، تو یہ زیادہ اچھا ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ اس میں غریبوں کا فائدہ ہوگا، دوسرے یہ کہ انکم ٹیکس میں سود کی رقم بھرنے کا مسئلہ؛ اکابر کے درمیان مختلف فیہ ہے؛ اگرچہ راجح گنجایش کا قول ہے۔

(۲) جی نہیں! صرف سرکاری بینک کا سود انکم ٹیکس میں بھرا جاسکتا ہے، یا وضع شدہ انکم ٹیکس کے بہ قدر ذاتی استعمال میں لایا جاسکتا ہے، پرائیویٹ (غیر نیشنل) بینک کا سود انکم ٹیکس میں بھرنا، یا وضع شدہ انکم ٹیکس کے بہ قدر ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں؛ کیوں کہ سرکاری بینک کا سود ذاتی استعمال میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے انکم ٹیکس کے نام سے ناجائز طور پر آپ کی جو حلال رقم لی، آپ نے دوسرے راستے سے وہ رقم حکومت سے وصول کرلی، اور پرائیویٹ بینک میں یہ واپس لینے کا مفہوم نہیں پایا جاتا؛ کیوں کہ انکم ٹیکس حکومت لیتی ہے، انکم ٹیکس کسی پرائیویٹ بینک یا پرائیویٹ ادارے کو نہیں جاتا۔

و یردُّونَها علی أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلاّ تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبیل الکسب الخَبیث التَّصدُّق إذا تعذَّر الرَّد علی صاحبِه. (رد المحتار، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، فصل في البیع: ۵۵۳/۹، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

و یبرأ ولو بغیر علم المَالك، في البزَّازیة: غصب درَاهم إنسان من کیسه، ثُمَّ ردَّها فیه بلا علمه برئ، وکذا لو سلَّمه إلیه بجهةٍ أخریٰ، کهبةٍ وإیداع وشِراءٍ، وکذا لو أطعَمَه فأکلَه .... زیلعي. (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الغصب: ۲۶۶/۹-۲۶۷)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۳/۵/۱۴۳۸ھ = ۲۱/۲/۲۰۱۷ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۶۲/ن، ۴۹۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے لون لینا اور اس پر ملنے والے سود کو اسی بینک کی سودی رقم سے ادا کرنا کیسا ہے؟

سوال: محترم حضرات مفتیانِ کرام، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، دامت برکاتہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! درج ذیل دو مسئلوں سے متعلق حکم شرعی بتلا کر ممنون ومشکور فرمائیں:

(۱) زید ایک بڑا تاجر ہے، اللہ تعالیٰ نے اُسے بہت نوازا ہے، اس وقت وہ ایک نیا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے؛ لیکن اسے خوف ہے کہ اگر وہ اپنے کیش پیسے سے کاروبار شروع کرے گا، تو وہ حکومت کی نظر میں آجائے گا، اور رانکم ٹیکس والے اُس کے پیچھے پڑجائیں گے، اب اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ کیا زید حکومت کی نظر سے بچنے کے لیے ایک بڑی رقم ''لون'' لے کر؛ اپنا نیا کاروبار شروع کرسکتا ہے؟ شرعاً اُس کے لیے اس کی گنجایش ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب تحریر کریں۔

(۲) زید کی ایک بڑی رقم بینک میں جمع ہے، جس پر اُسے کافی مقدار میں سود ملتا ہے، کیا زید اس سود کی رقم کو اُس سود میں ادا کرسکتا ہے، جو اُسے ''لون'' لینے کی وجہ سے بینک کو ہر سال ادا کرنا پڑے گا؟ اُس کی شکل یہ ہوگی کہ زید کے؛ مثلاً: آئی سی آئی سی آئی (ICICI) بینک میں بڑی مقدار میں پیسے جمع ہیں، جس پر اُسے ہر سال کافی رقم بہ طور سود ملتی ہے، اور زید نے اسی بینک سے ''لون'' بھی لیا ہوا ہے، جس پر اُسے سالانہ ایک موٹی رقم بہ طور سود ادا کرنی پڑتی ہے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا زید اپنی جمع شدہ رقم پر ملنے والے سود کو اُس سود میں بھر سکتا ہے، جو اُسے ''لون'' لینے کی وجہ سے ادا کرنا پڑتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: (۱) جس طرح سود لینا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح سود ادا کرنا بھی ناجائز اور حرام ہے؛ اس لیے ایک مسلمان کے لیے بلاضرورتِ شدیدہ سود پر قرض (لون) لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

﴿أَحَلَّ اللّٰهُ البَيعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ (سورة البقرة: ۲۷۵)

و في الأشباه: ماحرم أخذُه حرم إعطاؤه، كالرِّبا و مهر البغي و حُلوان الكاهن إلخ. (الأشباه لابن نجيم: ۱/۱۳۲، ط: بيروت)

البتہ اگر کسی کے پاس کاروبار وغیرہ کے لیے کافی پیسہ موجود ہے؛ لیکن اگر وہ اپنا پیسہ ظاہر کرے گا، تو یہ اندیشہ ہے کہ حکومت کی طرف سے اُس پر ٹیکس اور جرمانہ وغیرہ لگ جائے گا، تو ایسی صورت میں اپنی گاڑھی کمائی کو بچانے کے مقصد سے ''لون'' لینے کی علماء نے گنجایش دی ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر واقعۃً زید کے پاس ذاتی اتنا سرمایہ ہے، جس سے وہ نیا کاروبار شروع کرسکتا ہے؛ لیکن اُسے یہ خطرہ ہے کہ اپنا پیسہ ظاہر کرنے کی صورت میں وہ حکومت کی نگاہ میں آجائے گا، اور ٹیکس

وغیرہ کے محکمے؛ اُس کے پیچھے پڑ جائیں گے، تو صورتِ مسئولہ میں اس کے لیے بینک سے ''لون'' لے کر نیا کاروبار شروع کرنے کی گنجایش ہے۔ (فتاوی نظامیہ اندورویہ: ۱/۲۳۳-۲۳۴، وغیرہ)

(۲) صورتِ مسئولہ میں زید کے لیے بینک کی طرف سے ملنے والے سود کو اُس سود میں بھرنے کی گنجایش ہے، جو ''لون'' لینے کی وجہ سے اُس پر واجب الاداء ہوگا؛ کیوں کہ دونوں بینک؛ (یعنی: جس سے سود ملا ہے، اور جس کے سود میں اُسے بھرنا ہے) اگر ایک ہی کمپنی کے ہیں، جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں ہے، تو یہ رد الی المالک کی شکل ہے، اور سود کی رقم میں یہی بات اصولاً مطلوب ہے۔

(منتخبات نظام الفتاوی: ۳/۱۰۵-۱۰۶، ط: ایفاء پبلی کیشنز)

اور رد المحتار میں ہے:

لأنّ سبيل الكسب الخَبيث التَّصدُّق إذا تعذّر الرَّد على صاحبه. (رد المحتار: ۵۵۳/۹، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع، ط: زكريا) **كما يستفَادُ من النَّصّ الفقهي التَّالي: غصَب دراهم إنسانٍ من كيسه ثُمَّ ردَّها فيه بلا علمه برئ، وكذا لو سلَّمه إليه بجهةٍ أخرى كهبةٍ أو إيداع أو شراءٍ، وكذا لو أطعَمه فأكلَه.** (الدر مع الرد: ۲٦٧/٩، كتاب الغصب، مطلب في ردّ المغصوب إلخ، ط: زكريا) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۶/۱۱/۱۴۳۸ھ، شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۳۵/تتمہ/س، ۱۳۳۰/س، ۱۴۳۸ھ)

سرکاری بینک کا سود انکم ٹیکس میں ادا کرنا یا انکم ٹیکس کے بہ قدر سود ذاتی استعمال میں لانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ سرکاری بینک میں جمع شدہ رقم ڈپازٹ (deposit) پر جو سود (interest) حاصل ہوتا ہے، کیا اُس سے انکم ٹیکس (income tax) ادا کر سکتے ہیں؟

برائے مہربانی شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: انکم ٹیکس؛ اصولِ شرع کی روشنی میں ایک ناروا اور ظالمانہ ٹیکس ہے، اکثر اکابر علماء ومفتیانِ کرام کی تحقیق یہی ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے؛ اس لیے اگر کسی مسلمان کے پاس سرکاری بینک کا سود ہو، تو وہ انکم ٹیکس میں بھر سکتا ہے، اور اگر کسی کے اکاؤنٹ سے انکم ٹیکس؛ من جانب حکومت وضع کرلیا گیا ہو، تو وہ وضع شدہ انکم ٹیکس کے بہ قدر سرکاری بینک کا سود؛ اپنی ضروریات میں استعمال کرسکتا ہے؛ کیوں کہ یہ درحقیقت ایسا ہی ہے، جیسے کسی کا حلال و جائز مال؛ غلط طریقے پر لے لیا جائے، اور وہ اُسے دوسرے راستے سے وصول کرلے، یا کوئی کسی کا جائز مال؛ غلط طریقے پر لینا چاہتا ہو، تو وہ اُسی کا مال اس مد میں دے دے، اور شریعت نے اس طرح اپنا جائز مال بچانے، اور اگر ناحق لے لیا گیا ہو، تو واپس لینے کی اجازت دی ہے؛ اس لیے انکم ٹیکس میں سرکاری بینک کا سود بھرنے، یا انکم ٹیکس کے بہ قدر سرکاری بینک کا سود ذاتی استعمال میں لانے کی گنجایش ہے۔ (امداد المفتین، ص: ۷۰۶، سوال: ۷۴۳، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

اور اگر کوئی شخص پرائیویٹ بینک کی طرح سرکاری بینک کا سود بھی بلانیتِ ثواب؛ غرباء ومساکین ہی کو دے دیا کرے، انکم ٹیکس یا کسی اور ناروا ٹیکس (جیسے: سیل ٹیکس، اور ویٹ ٹیکس) میں نہ بھرا کرے، اور نہ ہی اُس کے بہ قدر سود ذاتی استعمال میں لائے، تو یہ بہت بہتر اور اعلیٰ درجے کی بات ہے؛ کیوں کہ سرکاری بینک کے سود کا یہ متفق علیہ مصرف ہے، نیز اس میں غریبوں کا فائدہ ہے۔

و يردُّونَها على أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلَّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبيل الكسب الخَبيث التَّصدُّق إذا تعذَّر الرَّد على صاحبِه. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع: ۵۵۳/۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

قال شيخُنا: ويُستفادُ من كتب فُقهائنا كالهداية وغيرها: أنّ من ملَكَ بملكٍ خبيثٍ، ولم يُمكنه الرَّد إلى المَالك، فسبيلُه التَّصدُّقُ على الفقراء.... قال: والظَّاهرُ أن المُتصدّق بمثله ينبغِي أن ينويَ به فراغ ذمَّته، ولا يرجُو به المثُوبة. (معارف السنن، أبواب الطهارة، باب ما جاء: لا تقبل صلاة بغير طهور: ۳٤/۱، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

(ويبرأ ولو بغير علم المَالك) في البزَّازية: غصب درَاهم إنسان من كيسه، ثُمَّ ردَّها فيه بلا علمه برئ، وكذا لو سلَّمه إليه بجهةٍ أخرىٰ، كهبةٍ وإيداع وشِراءٍ،

وكذا لو أطعمه فأكله خلافاً للشافعي. زيلعي. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الغصب: ۹/۲۶۶-۲۶۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

مُستفاد: فإذا ظفر بمَال مديُونه، له الأخذُ ديانةً؛ بل له الأخذُ من خِلاف الجِنس. (ردالمحتار، كتاب السرقة: ۶/۱۵۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۱۲/۳۳۸، ت: الفرفور، ط: دمشق) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۰/۶/۱۴۳۸ھ = ۱۰/۳/۲۰۱۷ء، جمعہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۶۲/ن، ۵۸۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

ہیرے جواہرات کے کاروبار میں انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے بینک سے تجارتی لون لینے کا حکم

سوال: عالی مقام واجب الاحترام حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند! راقم اپنے کاروبار میں درپیش مسائل میں دینی راہ نمائی کے لیے وقتاً فوقتاً استفتاء ارسال کرتا رہتا ہے، اور موصولہ فتاوی کی روشنی میں اپنے کاروبار کو اسلامی اور حلال بنیادوں پر کھڑے کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے، جو آپ حضرات کی خالصۃً لوجہ اللہ راہ نمائی اور بے لوث جذبۂ خدمتِ دین و مسلمین کے بغیر ممکن نہیں، اللہ رب العزت آپ حضرات کو آپ کی مساعیِ جمیلہ کے عوض دنیا وآخرت میں اپنے شایانِ شان بدلا نصیب فرمائے۔

راقم سونے، چاندی اور جواہرات سے بننے والے زیورات اور گہنوں کا کاروبار کرنے جا رہا ہے، اور اس سلسلے کی تمام تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی ہیں، فی الوقت یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہمارے شوروم میں رکھے جانے والے زیورات، جواہرات اور خام سونا چاندی کی مالیت؛ ان شاء اللہ دس کروڑ روپے سے متجاوز ہوگی، اور یہ رقم کل کی کل ہماری اپنی ہوگی، یعنی: مقروضہ نہیں ہوگی، دوسری طرف اس قدر مالیت کو محکمۂ انکم ٹیکس میں جمع کیے جانے والے کاغذات پر ظاہر کر دینے سے؛ غیر معمولی ٹیکس ادا کرنا ہوگا، اور اس طرح کاروباری نقطۂ نظر سے اس کام کو نفع بخش کاروبار کے طور پر چلا پانا انتہائی مشکل ہو جائے گا، اس صورت میں ٹیکس بچت کے واقف کار یہ مشورہ دیتے ہیں کہ عام طور پر کاروباری لاگت کی مد میں بینک سے حاصل شدہ قرض دکھا دیا جاتا ہے، جس سے انکم ٹیکس کی شرح میں خاطر خواہ کمی ہو جاتی ہے،

اور کاروبار نفع بخش طور پر چلایا جاسکتا ہے، یوں تو بفضل اللہ راقم کو بینک یا کسی اور سے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن مذکورہ بالا وجہ سے مجبوری ہورہی ہے، ٹیکس بچت واقف کار کے مشورے کی رو سے اگر بینک سے قرض لے لیا جائے، اور اپنے اکاؤنٹ میں ہی پڑا رہنے دیا جائے، اور انکم ٹیکس فائل کرنے کے موقع سے یا اس سے قبل حیلۃً ایک معمولی رقم (جس پر کسی قدر سود ادا کرنا ہوگا) استعمال میں لے لی جائے، تو کیا بہ درجۂ مجبوری شرعی طور پر ایسا کرنا جائز ہوگا؟ اگر نہیں، تو پھر آں جناب کے علم میں اس پیچیدہ صورتِ حال سے نکلنے کا کوئی متبادل راستہ موجود ہو، تو اس سے بھی آگاہ فرمائیں، اور عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں۔ بینوا وتوجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: صورتِ مسئولہ میں جب آپ کے پاس کاروبار کے لیے بہ قدرِ ضرورت مکمل رقم موجود ہے، جس کی بنا پر آپ کو کاروبار کے لیے بینک سے لون لینے کی بالکل ضرورت نہیں ہے؛ لیکن اپنی رقم سے سارا کاروبار کرنے، اور کاروبار کے لیے بینک سے لون نہ لینے کی صورت میں محکمۂ انکم ٹیکس کی طرف سے آپ کو مختلف پریشانیوں کا اندیشہ ہے، جس کی بنا پر کاروباری نقطۂ نظر سے آپ کے لیے کم از کم دکھاوے کی خاطر؛ بینک سے لون لینا ضروری ہے، اور انکم ٹیکس شریعت کی نظر میں غلط وناجائز اور ظالمانہ ٹیکس ہے، تو چوں کہ اس صورت میں لون لینے کا مقصد؛ محض دفعِ ظلم ہے، لون کے ذریعے کاروبار کرنا، یا کاروبار کو ترقی دینا مقصود نہیں ہے؛ اس لیے صورتِ مسئولہ میں آپ؛ محض دکھاوے کے لیے، یا انکم ٹیکس کی شرح کم کرانے کے لیے بینک سے لون لے سکتے ہیں، شرعاً اس کی اجازت ہے۔ (دیکھیے: فتاوی نظامیہ اوندرویہ: ۲۳۳/۱-۲۳۴، مطبوعہ: تھانوی آفسیٹ پرنٹرس، دیوبند، مسائل سود، مرتبہ: حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی دامت برکاتہم العالیہ، ص: ۲۴۴-۲۴۵، مطبوعہ: حراء بک ڈپو، دیوبند)؛ البتہ کاروبار آپ اپنی ذاتی رقم ہی سے کریں، لون کی رقم کاروبار میں نہ لگائیں، مناسب یہی ہے؛ تاکہ آپ کا کاروبار؛ سودی قرض کی نحوست سے مکمل طور پر محفوظ رہے، اور اس کی برکت متاثر نہ ہو۔

مستفاد: الرِّشوةُ ما يُعطى لإبطال حقّ أو لإحقاق باطلٍ، أمَّا إذا أعطي؛ ليتوصَّل به إلى حقّ أو ليدفع به عن نفسه ظُلماً فلا بأس به، قال التُّوربشتي: ورُوي أن ابن مسعُودٍ رضي اللّٰه عنه أخذ في شيءٍ بأرض الحَبشة، فأعطى دينارين فخلّٰى سبيلَه.

(مرقاة المفاتيح: ۲۹۵/۷، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

و فیـه – في المُجتبیٰ – أیضاً: دفعُ المال للسُّلطان الجائر لدفع الظُّلم عن نفسه و مـالـه و لاستخراج حقّ له لیس برشوةٍ، یعني: في حقّ الدَّافع اهـ. (رد المحتار، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، فصل في البیع وغیره: ۶۰۷/۹، ط: مکتبة زکریا، دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　۱۵/۹/۱۴۳۸ھ = ۱۱/۶/۲۰۱۷ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – وقار علی غفرلہٗ

(۱۰۵۱/تتمہ/ن، ۱۰۶۰/ن، ۱۴۳۸ھ)

بزنس کے لیے لون لینا جب کہ حکومت اس پر سبسڈی دیتی ہو یا سود کی شرح بہت کم ہو کیسا ہے؟

سوال: (۱) ہمارے صوبے میں حکومت؛ بینک کی مداخلت کے بغیر ہمیں لون دیتی ہے، یہ لون نیا بزنس شروع کرنے کے لیے دیا جاتا ہے،اس کے علاوہ حکومت اس لون پر ۳۵/فی صد سبسڈی دیتی ہے، گویا کہ یہ سود فری لون ہوتا ہے۔

(۲) اور دوسری اسکیم ہے، جس میں شرح سود چار فی صد ہوتی ہے، میں ایک نیا بزنس شروع کرنا چاہتا ہوں، تو کیا میں اس طرح کی اسکیم لوں؟ جزاک اللہ

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ۳۵/فی صد سبسڈی والا لون آپ اس شرط کے ساتھ لے سکتے ہیں کہ اس لون میں متعینہ شرح سود کے پیشِ نظر آپ مکمل لون کی ادائیگی تک؛ انٹرسٹ کے نام سے حکومت کو جو مزید پیسے ادا کریں گے، اُن کی مقدار ۳۵/فی صد سبسڈی سے آگے نہ بڑھے؛ بل کہ اُس سے کم رہے، یا اس کے برابر، اور اگر ایسا نہ ہو سکے، تو آپ ۳۵/فی صد سبسڈی والا لون بھی نہیں لے سکتے: کیوں کہ پہلی صورت میں یہ تاویل ممکن ہے کہ آپ نے انٹرسٹ میں جو کچھ دیا، وہ گویا سبسڈی والی معاف کردہ رقم حکومت کو واپس کردی، حکومت کی معافی قبول نہیں کی؛ جب کہ دوسری صورت میں از روئے شرع؛ یقینی طور پر سود کی حقیقت پائی جاتی ہے، اس میں کوئی تاویل ممکن نہیں۔

(۲) سود کی شرح کم ہو یا زیادہ؛ سود بہ ہر حال سود ہے، اس سے بچنا لازم وضروری ہے۔

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۴۹۱/۱۴، سوال: ۶۱، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم دیوبند)

اس لیے چار فی صد شرح سود والا لون بھی لینا جائز نہ ہوگا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے کی طرح؛ سود دینے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ (مسلم شریف: ۲/۲۷، مطبوعہ: مکتبہ اشرفیہ، دیوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۱/۲۹ھ = ۲۰۱۶/۱۰/۳۱ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۷۶/ن، ۹۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

سم کارڈ میں ٹاک ٹائم کے لیے بیلنس لون پر لینا درست ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عظام؛ مندرجۂ ذیل صورتِ مسئلہ کے بارے میں کہ سِم (sim) آفس سے وقتی طور پر لون (loan) لینا جائز ہے یا نہیں؟

تفصیل یہ ہے کہ آج کل اگر سِم کے اندر پیسے (balance) نہ ہو، تو سِم آفس میں کال کرنے سے؛ آفس والے دس (۱۰) روپے لون (loan) کے طور پر دیتے ہیں، پھر ۲۴/ گھنٹے کے بعد بارہ (۱۲) روپے؛ یعنی: دو (۲) روپے سود کے ساتھ واپس لیتے ہیں (اگر سِم کے اندر رقم نہ ہو) اس لیے اکثر لوگ اس سِم کو استعمال کے بعد پھینک دیتے ہیں (تاکہ نہ رہے بانس؛ نہ بجے بانسری)

اولاً: مجبوری کی صورت میں اس طرح معاملہ کرنا کیا درست ہے؟

ثانیاً: بارہ (۱۲) روپے واپس نہ کرنے کی صورت میں کیا وہ شخص قیامت کے دن حقوق العباد کے گناہ میں عنداللہ مجرم ہوگا؟ بینوا وتوجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: یہ معاملہ سود کے دائرے میں نہیں آتا، آپ سِم آفس سے دس روپے کا بیلنس حاصل کر سکتے ہیں، اور اس پر ضابطے میں آپ کو ۱۲/ روپے کی ادائیگی لازم ہوگی، بیلنس استعمال کر کے سِم پھینک دینا، اور پیسے ادا نہ کرنا ناجائز اور قابلِ مواخذہ عمل ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　　۲۰/ ربیع الثانی/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۵۳۱/م، ۵۸۲/م، ۱۴۳۸ھ)

سودی رقم سے روڈ ٹیکس ادا کرنے کا حکم

سوال: کیا ہم اپنی نئی کار کے لیے روڈ ٹیکس (roadtax) سود کے پیسے سے ادا کر سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: روڈ ٹیکس؛ روڈ استعمال کرنے کا عوض ہوتا ہے؛ اس لیے یہ واجبی ٹیکس ہے، ناروا اور ظالمانہ نہیں ہے؛ پس آپ سرکاری بینک کا سود یا کوئی بھی سود، روڈ ٹیکس میں نہیں ادا کر سکتے، خواہ آپ کی کار نئی ہو یا پرانی؛ کیوں کہ اس میں بلاعوض ردّ إلی ربِّ المال کی صورت نہیں پائی جاتی، اور یہ سودی رقم ذاتی استعمال میں لانے کی شکل ہے؛ جو جائز نہیں۔

و یردُّونَها علی أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلَّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبیل الکسب الخَبیث التَّصدُّق إذا تعذَّر الرَّد علی صاحبِه. (رد المحتار، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره، فصل في البیع: ۵۵۳/۹، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

قال شیخُنا: ویُستفادُ من کتب فُقهائنا کالهدایة وغیرها: أنّ من ملَكَ بملكٍ خبیثٍ، ولم یُمکنه الرَّد إلی المَالك، فسبیلُه التَّصدُّقُ علی الفقراء.... قال: والظَّاهرُ أن المُتصدّق بمثله ینبغِي أن ینويَ به فراغ ذمَّته، ولا یرجُو به المثُوبة. (معارف السنن، أبواب الطهارة، باب ما جاء: لا تقبل صلاة بغیر طهور: ۳۴/۱، ط: المکتبة الأشرفیة، دیوبند)

أفتیٰ بعضُ أکابرنا أنّ للمُسلم أن یاخُذ الرِّبا من أصحاب البنك أهل الحرب في دارهم، ثُمَّ یتصدَّق به علی الفُقراء، ولا یصرفه إلی حوائج نفسه. (إعلاء السنن، أبواب بیوع الربا، باب الربا في دار الحرب بین المسلم والحربي: ۳۷۲/۱۴، ط: إدارة القرآن والعلوم الاسلامیة، کراتشي)

(ویبرأ بردِّها ولو بغیر علم المَالك) في البزَّازیة: غصب درَاهم إنسان من کیسه، ثُمَّ ردَّها فیه بلا علمه برئ، وکذا لو سلَّمه إلیه بجهةٍ أخریٰ، کهبةٍ وإیداع و شِراءٍ، وکذا لو أطعَمَه فأکلَه خلافاً للشَّافعي. زیلعي. (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الغصب: ۲۶۶/۹-۲۶۷، ط: مکتبة زکریا، دیوبند)

مستفاد: و في حدِّ الزَّکاة: مع قطع المَنفعَة عن المُملك من کلِّ وجهٍ، کذا في عامَّة کُتب الفقه والفتاوی، مثل التَّنویر (مع الدر المختار ورد المحتار، أول کتاب الزکاة: ۱۷۳/۳، ط: مکتبة زکریا، دیوبند، ۴۱۹/۵، ت: الفرفور، ط: دمشق)

ولو دفعَها المُعلِّم لخليفته إن كان بحيثُ يعمَلُ له لو لم يُعطه صحَّ؛ وإلَّا لا. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الزكاة، آخر باب المصرف: ۳۰۸/۳، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۱۲۹/۶، ت: الفرفور، ط: دمشق) قولُه: إلَّا لا: أي: لأنّ المدفُوع يكون بمنزلة العوض. ط. (رد المحتار) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۱۲/۲۶ھ = ۲۰۱۷/۹/۱۸ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۴۱۸/ن، ۱۴۴۴/ن، ۱۴۳۸ھ)

گاڑی کے انشورنس میں بینک کی سودی رقم بھرنے کا حکم

سوال: حضرت مفتی صاحب! کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ مثلاً: انڈیا میں بائیک انشورنس لازمی ہے، تو کیا میں اپنی بائیک کی انشورنس کی ادائیگی؛ بینک سے حاصل شدہ سودی رقم سے کرسکتا ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اگر انشورنس کمپنی سرکاری ہو، تو آپ سرکاری بینک کا سود؛ گاڑی کے انشورنس کی قسطوں میں بھر سکتے ہیں، گنجائش ہے؛ البتہ اس صورت میں اگر گاڑی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے، تو آپ جمع کی ہوئی رقم کے بہ قدر بھی کوئی معاوضہ نہیں لے سکتے۔

اسی طرح اگر دونوں (انشورنس کمپنی اور بینک) پرائیویٹ ہوں؛ لیکن دونوں کا مرکزی ادارہ ایک ہو، تب بھی اس ادارے کے بینک کا سود؛ اُسی ادارے کی انشورنش کمپنی میں گاڑی کے انشورنس کی قسطوں میں بھر سکتے ہیں۔

اور اگر ایک پرائیویٹ اور دوسرا سرکاری ہو، یا دونوں پرائیویٹ ہوں؛ لیکن دونوں کا مرکزی ادارہ الگ الگ ہو، تو کسی بھی بینک کا سود؛ گاڑی کے انشورنس کی قسطوں میں بھرنا جائز نہ ہوگا۔

و يردُّونَها على أربابِها إن عرفُوهم؛ وإلَّا تصدَّقُوا بها؛ لأنّ سبيل الكسب الخَبيث التَّصدُّق إذا تعذَّر الرَّد على صاحبِه. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع: ۵۵۳/۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

(ويبرأ بردِّها ولو بغير علم المَالك) في البزَّازية: غصب درَاهم إنسان من كيسه، ثُمَّ ردَّها فيه بلا علمه برئ، وكذا لو سلَّمه إليه بجهةٍ أخرىٰ، كهبةٍ وإيداع و شِراءٍ،

و کذا لو أطعمه فأكله خلافاً للشافعي. زيلعي. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الغصب: ۹/۲۶۶-۲۶۷، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۴/۷/۱۴۳۸ھ = ۲۲/۴/۲۰۱۷ء، شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۸۴۷/ن، ۸۴۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

گاڑی کا فل انشورنس یا تھرڈ پارٹی انشورنس کرانا کیسا ہے؟

سوال: بہ راہِ کرم کار انشورنس پر روشنی ڈالیں، جیسے کہ آج سڑک پر گاڑی چلانے کے لیے کار کا انشورنس ہونا ضروری ہے، تو علمائے کرام؛ کار انشورنس کے بارے میں کیا مشورہ دیتے ہیں؟ کیا فل انشورنس یا تیسری پارٹی انشورنس کرنا جائز ہے؟ میں نے ایک مولانا سے سنا ہے کہ اگر انشورنس کرانا ضروری ہے، تو تیسری پارٹی انشورنس کرنا جائز ہے؛ ورنہ نہیں، مجھے اپنی کار کا انشورنس کرانا ضروری ہے؛ مگر میں شرعی حکم کے خلاف نہیں جانا چاہتا ہوں۔ جزاک اللہ خیرا۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: فل انشورنس اور تیسری پارٹی انشورنس؛ شریعت میں دونوں قسم کے انشورنس بنیادی طور پر ناجائز ہیں؛ کیوں کہ فل انشورنس میں واضح طور پر سود اور جوے کا معاملہ ہوتا ہے، اور سود اور جوا دونوں اسلام میں قطعی طور پر حرام و ناجائز ہیں، اور تیسری پارٹی انشورنس میں اگر سود اور جوے کی نفی کی جائے، تو اس میں ایک طرح رشوت کی حقیقت پائی جاتی ہے، اور شریعت میں جس طرح رشوت لینا ناجائز ہے، اسی طرح عام حالات میں؛ رشوت دینا بھی ناجائز ہے، اور اس صورت میں اصل رقم کی واپسی یا وصول یابی ممکن نہیں؛ جب کہ فل انشورنس میں بعض صورتوں میں اصل رقم حاصل کی جاسکتی ہے، یعنی: اگر گاڑی کسی حادثے کا شکار ہو جائے، تو اصل رقم کے بہ قدر معاوضہ جائز ہوتا ہے، اور باقی رقم بلا نیتِ ثواب غرباء و مساکین کو دینا ہوتا ہے؛ اس لیے از روئے شرع بہ وجہ مجبوری؛ گاڑیوں کا فل انشورنس اور تھرڈ پارٹی انشورنس دونوں کی گنجایش ہے؛ البتہ تھرڈ پارٹی انشورنس کرانا بہتر ہے؛ کیوں کہ اس میں صرف رشوت دینے کا پہلو ہے، اور مجبوری میں رشوت دینے کی

گنجایش بھی ہوتی ہے؛ اگر چہ اس صورت میں اصل رقم کی واپسی بالکل نہیں ہوسکتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۹/۹ھ = ۲۰۱۷/۶/۵ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۰۲۵/ن، ۹۵۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

بیمہ شدہ گاڑی میں نقصان کی وجہ سے ملنے والی انشورنس رقم کا حکم

سوال: انگلینڈ میں رہتے ہوئے میری اُس گاڑی کو نقصان ہوا، جو بیمے پر تھی، شکایت کرنے پر مجھے دو ہزار پاؤنڈ ملے، جو میں نے اس نیت سے لیے کہ میں اُس کو ثواب کی نیت کے بغیر پاکستان میں غرباء میں تقسیم کردوں گا، اب وہ رقم پاکستان بھی پہنچ گئی، کیا میرا یہ عمل درست ہے؟ اگر نہیں تو راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جس قدر آپ کی گاڑی کو نقصان ہوا ہے، اگر آپ کو تاوان میں جمع کردہ رقم یا اُس سے کم رقم ملی ہے، تو آپ کے لیے لینا درست ہے، اور اُسے ضروریات میں خرچ کرنا درست ہے، اور اگر آپ کو جمع کردہ رقم سے زیادہ پیسے ملے ہیں، تو زائد رقم کو غریبوں اور مسکینوں پر صدقہ کرنا ضروری ہے، آپ نے یہ کل رقم غربائے پاکستان کے لیے بھیج دی؛ یہ عمل آپ کا درست رہا۔

لأنّ سبیل الکسب الخبیث التصدُّق إذا تعذَّر الرَّد علی صاحبه. (شامي، کتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغیره: ۹/۵۵۳، ط: زکریا، دیوبند) **قال شیخُنا: ویُستفادُ من کتب فُقهائنا کالهدایة وغیرها؛ أنّ من ملَكَ بملكٍ خبیثٍ، ولم یُمکنه الرَّد إلی المَالك، فسبیلُه التَّصدُّقُ علی الفقراء، قال: إنّ المُتصدّق بمثله ینبغِي أن ینويَ به فراغ ذمَّته، ولا یرجُو به المثُوبة.** (معارف السنن، أبواب الطهارة، باب: لا تقبل صلاة بغیر طهور: ۱/۳٤، ط: مکتبة سعید) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند　　۶/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۹۹/ب، ۳۰۰/ب، ۱۴۳۸ھ)

ملازمت کے حصول کے لیے رشوت دینے کا حکم

سوال: اگر کوئی عام آدمی کسی مدرسے یا اسکول میں تقرری کا متمنی ہو، اور اس کے سامنے

یہ شرط رکھی جائے کہ اگر آپ اتنی رقم ادا کریں گے، تو مقبول ہیں؛ ورنہ دوسرے امیدوار کو جگہ دی جائے گی، اور اس مدفوعہ رقم کو رشوت یا کوئی اور نام دیا جائے گا مزید، ایسا کرنا حلال ہے یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کوئی شخص کسی مدرسے یا اسکول میں مطلوبہ اہلیت وشرائط کی تکمیل کی بنا پر بہ جا طور سے تقرری کا استحقاق رکھتا ہے، اور اگر تقرری کے لیے امتحان لیا گیا ہے، تو اس میں اس نے تمام امیدواروں میں اول نمبر سے کام یابی بھی حاصل کی ہے؛ لیکن رشوت نہ دینے کی صورت میں استحقاق سوخت ہوجانے کا اندیشہ ہے، تو ایسی مجبوری میں حق کی وصول یابی اور دفعِ ظلم کے لیے رشوت دینے کی گنجایش ہوگی؛ البتہ لینے والے کے لیے رشوت لینا اس صورت میں بھی حرام ہی ہوگا، اور اگر کوئی شخص مطلوبہ اہلیت اور شرائط کی عدمِ تکمیل کی بنا پر؛ تقرری کا استحقاق ہی نہیں رکھتا؛ بل کہ استحقاق دوسروں کا ہے، تو رشوت دے کر استحقاق حاصل کرنا، اور اصل مستحق کی حق تلفی کرنا ہرگز جائز نہیں؛ بل کہ سخت حرام وناجائز ہے۔

عن عبد اللّٰه بن عمرو رضي اللّٰه عنه قال: لعَن رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم الرَّاشي والمُرتشي، رواه أبوداؤد وابن ماجه، ورواه التِّرمذي عنه وعن أبي هُريرة رضي اللّٰه عنه. (مشكاة شريف، ص: ۳۲٦، مطبوعة: مكتبة اشرفية، ديوبند) **الرِّشوةُ ما يُعطیٰ لإبطال حقّ أو لإحقاق باطلٍ، أمَّا إذا أعطي؛ ليتوصَّل به إلى حقّ أو ليدفع به عن نفسِه ظلماً فلا بأس به، قال التُّوربشتي: و روي أنّ ابن مسعُود رضي اللّٰه عنه أخذ في شيءٍ بأرض الحبشة، فأعطى دينارين فخلّي سبيله.** (مرقاة المفاتيح: ۲۹۵/۷، مطبوعة: دار الكتب العلمية، بيروت)

وفيه – في المُجتبى – أيضاً: دفعُ المَال للسُّلطان الجائر؛ لدفع الظّلم عن نفسِه وماله؛ ولاستخراج حقّ له ليس برشوةٍ، يعني: في حقّ الدَّافع. اهـ. (شامي: ٦۰۷/۹، مطبوعة: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۲/۱۱ھ = ۲۰۱٦/۱۱/۱۲ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۰/ن، ۱۲۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

اوقاف، مساجد و مدارس اور قربانی سے متعلق مسائل

بہ وجہ مجبوری موقوفہ مکان کو فروخت کر کے دوسرا متبادل خرید نے کی گنجایش ہے

سوال: بعد سلام مسنون ایں کہ بندۂ ناچیز کو ایک مسئلہ درپیش ہے، صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کا ایک مکان ہے، جو کسی نے مسجد کو وقف کیا تھا، اس مکان میں ایک بوڑھی امّا کرایے پر رہا کرتی تھی، اور ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، ایک صاحب جو وہیں قریب میں رہتے تھے، امّا کی دیکھ بھال خدمت کرتے تھے، اور وہ صاحب امّا کے انتقال ہوتے ہی مسجد کے مکان پر قابض ہو گئے، کرایہ نہیں دیا، بہ ہر حال! لوگوں کے کہنے سننے سے کرایہ دینا شروع کر دیا، اور کچھ عرصے تک کرایہ دیا، پھر کرایہ نہیں دیا، اور اب کرایہ دیے ہوئے کئی سال ہو گئے، اور اس شخص نے بلا اجازت مسجد کے مکان میں تصرف کرتے ہوئے کچے کو پکا بنا دیا، اور ایک منزل سے دو منزل بنا دی، اب اس وقت حالات یہ ہیں کہ یہ شخص نہ مکان خالی کرتا ہے، اور نہ کرایہ دیتا ہے؛ مگر ہماری ایک مشکل یہ ہے کہ اگر ہم یہ مکان؛ پاور دار آدمی کو بیچ دیں، تو وہ مکان خود خالی کرا لے گا، اور ہم اس رقم سے کوئی مکان خرید لیں گے، اور وہ مسجد کی آمدنی کا ذریعہ بھی ہو جائے گا، اور واقف کا مقصد بھی فوت نہ ہوگا، آپ ذمے دارانِ دارالافتاء سے مودبانہ التماس ہے کہ اس مسئلے کا صحیح جواب تحریر فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اصل حکم یہ ہے کہ موقوفہ مکان یا زمین کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے؛ لیکن اگر مسجد کے لیے موقوفہ مکان سے انتفاع نہیں ہو رہا ہے،

اور آیندہ بھی انتفاع کی امید نہیں ہے، تو اس کو فروخت کر کے حاصل شدہ رقم سے مسجد کی آمدنی کے لیے دوسرا مناسب مکان خریدنے کی گنجایش ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکور شخص: نہ مسجد کے لیے موقوفہ مکان کو خالی کر رہا ہے، اور نہ ہی اُس کا کرایہ دے رہا ہے، اور مسجد کی انتظامیہ کے لیے اُس سے مکان خالی کرانا بہ ظاہر مشکل نظر آ رہا ہے، تو مسجد کے متولی یا انتظامیہ کمیٹی یا اہل محلّہ کے مشورے سے اس موقوفہ مکان کو فروخت کر کے؛ دوسری جگہ کوئی مناسب مکان خریدنے کی گنجایش ہے۔

وشُرِط في البحر خُروجُه عن الانتفاع بالكلِّية، وكونُ البدل عقاراً والمستبدل قاضي الجنَّة المفسَّر بذي العلم والعمل. (الدر المختار، كتاب الوقف، مطلب في اشتراط الإدخال والإخراج: ٣٨٦/٤، دارالفكر، بيروت، كذا في البحر الرائق، كتاب الوقف: ٥٨٦/٦ ـ ٥٨٧، زكريا)

والـمُعتمـدُ أنَّه يجُوز للقَاضي بشرط أن يخرج عن الانتفاع بالكلِّية، وأن لايكون هُناك ربحٌ للوقف يعمر به. (الفتاوى الهندية، الباب الرابع من كتاب الوقف: ٤٠١/٢، زكريا، كذا في النهر الفائق، كتاب الوقف: ٣٢٠/٣، زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۲/۱۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - وقار علی غفرلہٗ

(۱۲۳/ص، ۱۱۱/ص، ۱۴۳۸ھ)

مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور قبرستان میں سے کسی کی رقم دوسرے میں لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

سوال: (۱) مسجد کی رقم مدرسے میں، یا مدرسے کی رقم مسجد میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) نیز مدرسے اور مسجد کی رقم کو عیدگاہ میں یا قبرستان میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) اسی طرح عیدگاہ اور قبرستان کی رقم کو مدرسے اور مسجد میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۴) نیز قبرستان کی رقم عیدگاہ میں، یا عیدگاہ کی رقم قبرستان میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۴) شریعت میں مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور قبرستان وغیرہ؛ یہ سب الگ الگ وقف ہیں، اور اوقاف کے سلسلے میں شرعی ضابطہ یہ ہے کہ ہر وقف کی آمدنی اسی وقف

میں لگ سکتی ہے، کسی دوسرے وقف میں نہیں لگ سکتی؛ اس لیے سوال میں مذکور؛ اوقاف میں سے کسی وقف کی آمدنی دوسرے وقف میں لگانا (عام حالات میں) جائز نہیں؛ بل کہ ہر وقف کی آمدنی اُسی وقف کی مصالح اور ضروریات میں لگانا ضروری ہے۔

(و إن اختلف أحدُهما) بأن بنى رجُلان مسجدين أو رجلٌ مسجداً ومدرسةً، ووقف عليهما أوقافاً (لا) يجُوز له ذلك. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الوقف: ٦/ ٥٥١، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ١٣/ ٤٤١–٤٤٢، ت: الفرفور، ط: دمشق)

قال الخير الرَّملي: أقُول: ومن اختلاف الجهة ما إذا كان الوقفُ منزلين: أحدهما للسُّكنى والآخر للاستغلال، فلا يصرفُ أحدُهما إلى الآخر، وهي واقعةُ الفتوىٰ اهـ. (رد المحتار: ٦/ ٥٥١، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ١٣/ ٤٤٢، ت: الفرفور، ط: دمشق)

وقد تقرَّر عند الفُقهاء أنّ نصَّ الواقف كنصِّ الشَّارع، وأنّ مُراعاة غرض الواقفين واجبةٌ، كما في ردّ المُحتار وغيره من كتب الفقه والفتاوى الأخرى.

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری – محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

کیا مسجدوں میں رکھے ہوئے زائد قرآن مدارس میں دے سکتے ہیں؟

سوال: دیکھا جاتا ہے کہ بہت سارے لوگ؛ قرآن مجید مسجدوں میں دیتے ہیں، ایصالِ ثواب کے لیے؛ لیکن یہ رکھے رہتے ہیں، اور بہت دنوں تک کوئی نہیں پڑھتا ہے، تو کیا اُن کو مدارس میں دیا جاسکتا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: جی ہاں! ایسے فاضل اور ضرورت سے زائد؛ قرآن کے نسخوں کو اپنے یہاں کے بڑے لوگوں سے مشورے کے بعد اُنھیں مدرسے میں دے سکتے ہیں؛ تاکہ اُنھیں پڑھا جائے، اور دینے والوں کو ثواب بھی ملتا رہے۔

وإن وقف على المَسجد جاز، ويقرأ فيه ولا يكون محصُوراً على هذا المَسجد، وبه عُرف حكمُ نقلِ كُتب الأوقاف من مَحالها؛ للإنتفاع بِها. (الدرالمختار، كتاب الوقف: ٥٥٨/٦، ط: زكريا، ديوبند)

فإن استغنى عنه هذا المسجدُ يحوَّل إلى مسجدٍ آخر. (هندية، كتاب الوقف، الباب الحادي عشر: ٢/ ٤١٠، ط:اتحاد، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۸/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۸۴/ب، ۳۱۵/ب، ۱۴۳۸ھ)

مسجد کی دیوار پر پوسٹر لگانا کیسا ہے؟

سوال: کیا ہم مسجد کی سامنے کی دیوار پر پوسٹر چسپاں کر سکتے ہیں؟ جس میں اسلامی باتیں ہوں؛ لیکن ساتھ ساتھ اشتہار بھی ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: اس قسم کے پوسٹروں کو مسجد میں چسپاں کرنا کراہت سے خالی نہیں؛ البتہ مسجد سے باہر مناسب جگہ میں لگا دیں کہ گرکر نالی میں جانے کا اندیشہ نہ ہو، تو گنجایش ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۸ھ الموافق: ۲۰۱۷/۸/۱ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۱۹۴/ھ، ۱۲۸۵/ھ، ۱۴۳۸ھ)

قبرستان کے لیے وقف شدہ رقم سے مکتب کے لیے جگہ خریدنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام وعلمائے عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

ایک قبرستان؛ جس کی چہار دیواری مضبوط شکل میں ہو چکی ہے، اور فی الحال قبرستان میں کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے، جس کے لیے پیسے خرچ کرنے کی ضرورت ہو، جب کہ مذکورہ قبرستان کے پاس

سات لاکھ روپے موجود ہیں، اور گاؤں والے متفقہ طور پر چاہتے ہیں کہ اس پیسے سے مکتب کے لیے زمین خرید لی جائے؛ کیوں کہ گاؤں میں جو مکتب ہے، وہ دوسرے آدمی کے مکان پر چل رہا ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا گاؤں والوں کے لیے اس پیسے (قبرستان کے پیسے) سے مکتب کے لیے جگہ خریدنی جائز ہے یا نہیں؟ آپ حضورِ والا سے درخواست ہے کہ تشفی بخش جواب دے کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: یوں تو ایک وقف کی آمدنی دوسرے وقف میں لگانا جائز نہیں؛ لیکن اگر اتنی زیادہ رقم ہوگئی ہے کہ مستقبل قریب میں اس قبرستان، یا کسی اور قبرستان کو کوئی ضرورت نہ ہوگی، اور ضیاع کا اندیشہ ہے، تو ایسی صورت میں بستی والوں کے بڑے لوگوں سے مشورے اور اُن کی اجازت کے بعد مکتب کے لیے زمین؛ قبرستان کے پیسوں سے خرید سکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۱/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۳۱۳/ب، ۳۲۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

مدرسے کے مفاد میں مدرسے کی گاڑی کو اپنا پٹرول ڈلوا کر استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں کہ زید ایک مدرسے کا ناظم ہے، مدرسہ ہٰذا میں تعلیمی معیار: پرائمری، درجہ پنجم اور شعبۂ حفظ، نیز ابتدائی عربی، فارسی، جس میں بیش تر طلبہ بیرونی ہیں، زید کا تعلق مدرسے کے ناظم ہونے کی وجہ سے علاقے میں دور دراز تک ہے، زید کا یہ تعلق اگر مدرسے سے نسبت نہ جڑی ہوتی، تو شاید نہ ہوتا، ایسی صورت حال کی بنا پر متعلقین؛ شادی بیاہ کے موقع پر، نیز مدرسے والے جلسے جلوس و دیگر غمی وخوشی کے مواقع پر اکثر و بیش تر مدعو کرتے رہتے ہیں، زید متعلقین کی شادی بیاہ، جلسے جلوس، غمی وخوشی کے مواقع پر مدرسے کی بائیک میں اپنے ذاتی پیسے سے تیل ڈلا کر؛ اُن مواقع پر سفر کر لیتا ہے، جس سے متعلقین کی حوصلہ افزائی ہوجاتی ہے، اور ذمے دار ہونے کی حیثیت سے مدرسے کے تعارف میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، اور اگر

شرکت نہ کی جائے، تو لوگوں کو شکایت ہوجاتی ہے، یہ شکایت گھریلو زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، مدرسے کی طرف منسوب ہوتی ہے، ایسی صورت حال کی بنا پر زید مدرسے کی بائیک میں اپنا ذاتی تیل ڈال کر سفر کرلیتا ہے، مسئلے کی رو سے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

نوٹ: زید کی معاشی پوزیشن بھی ایسی نہیں ہے کہ اپنی ذاتی بائیک خرید کر سفر کرلے، روڈ پر چلنے والی گاڑیوں سے اگر سفر کیا جائے، تو وقت بہت برباد ہوتا ہے، جس سے تعلیمی نقصان بھی ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: مدرسے کے مفاد میں مدرسے کی گاڑی؛ اپنا پٹرول ڈال کر استعمال کرنا، علاقے میں لوگوں کے یہاں خوشی وغمی میں شرکت کرنا: تاکہ لوگ مدرسے سے متعارف ہوں، اور اس سے تعاون حاصل ہو، اور ان کاموں میں مدرسے کے اوقات بھی صرف کرنا؛ یہ سب ایسی باتیں ہیں، جن کا فیصلہ زید (مہتمم) کو خود نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ مدرسے کے مال، اسباب، اور مدرسے کے اوقات کے سلسلے میں وہ امین ہے، اور امانت میں خیانت سنگین جرم ہے؛ اس لیے کمیٹی؛ جس میں ذی فہم اور ذی علم افراد ہوں، تشکیل دینا چاہیے، پھر وہ لوگ جن باتوں کو مدرسے کے مفاد میں کرنے کی اجازت دیں، اُسے کرنا چاہیے، اور جسے مدرسے کے مفاد میں نہ سمجھیں، اس سے رکنا چاہیے، یا پھر ذاتی طور پر اپنے خرچ سے اور اپنے وقت میں کرنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۷/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۹۹/د، ۶۳۱/د، ۱۴۳۸ھ)

مسجد کی زمین پر ٹاور وغیرہ لگوانا کیسا ہے؟

سوال: مسجد کی ممٹی (یعنی: مسجد کی سیڑھیوں کی چھت) جو کہ مسجد کے خارجی حصے میں واقع ہے، اُس پر موبائل کا ٹاور لگوانا؛ کیوں کہ جو بھی کمپنی اپنا ٹاور کسی چھت پر لگاتی ہے، تو ایک اچھی خاصی رقم: ماہانہ کرایے کے طور پر دیتی ہے، اور اُس سے جو ماہانہ کرایہ اُس کے عوض حاصل ہو، اُس سے مسجد کے اخراج؛ یعنی: بجلی کا بل، امام اور موذن کی تنخواہ وغیرہ کی ادائیگی کی جائے، تو کیا اس ممٹی پر ٹاور لگوانا، جو کہ خارج مسجد ہے، اور اُس سے حاصل شدہ کرایے کو مذکورہ شکل میں خرچ کرنا درست ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللّٰہ التوفیق: مسجد کی سیڑھیوں کی چھت پر موبائل ٹاور لگوانا جائز نہیں ہے، خواہ سیڑھی کی چھت خارجی حصّے میں کیوں نہ ہو، اس میں مسجد کی چھت کو ایک لمبی مدت تک اس طرح محبوس رکھتا ہے، جس کو ضرورت کے وقت ہٹایا نہ جا سکے، نیز موبائل ٹاور سے انٹرنیٹ، ٹی وی وغیرہ مختلف چیزوں کا بھی تعلق ہوتا ہے، جس کی وجہ سے یہ ٹاور؛ مسجد کے تقدس کے بھی منافی ہے، نیز یہ ٹاور مصلیوں کے لیے نقصان دہ بھی ہے، بہ ہر حال! مسجد کے خارجی حصّے پر کرایے کے لیے موبائل ٹاور لگانے کی گنجایش معلوم نہیں ہوتی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۴۸۵/ص، ۵۴۲/ص، ۱۴۳۸ھ)

مسجد کے مائک پر اجتماعی حمد وثنا پڑھنا، چندہ جمع کرنا یا چندے کے لیے گھر گھر طلبہ کو بھیجنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام وعلمائے عظام مندرجۂ ذیل مسائل کے بارے میں:

(۱) مدرسے کے اندر تقریباً ۴۰/سال سے یہ معمول چلا آ رہا ہے کہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد جب سورج کی شعاعیں خوب پھیل جاتی ہیں، مائک پر کچھ بچے اور طلبہ مل کر ''حمد وثنا ہو تیری کون ومکان والے'' یہ حمد پڑھتے ہیں، جیسا کہ دیگر مدارس میں بھی یہ معمول دیکھنے میں آتا ہے، اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ محلّے کے بچوں کو اطلاع ہو جائے کہ اب مدرسے کا وقت شروع ہو چکا ہے، سب بچے وقت پر حاضر ہو جائیں؛ اسی لیے سب بچے دعا کی آواز سنتے ہی فوراً مدرسے میں حاضر ہو جاتے ہیں، اب محلّے کے ایک صاحبِ ایمان شخص کا کہنا یہ ہے کہ یہ سلسلہ بند کرو، پہلے تو اُس نے کہا کہ مائک اونچا کرو، اونچا کر دیا گیا، پھر کہا: آواز ہلکی کرو، آواز ہلکی کر دی گئی، پھر کہتا ہے کہ مائک ہی ہٹاؤ، دعا کوئی ضروری نہیں ہے، وہ یہ کہتا ہے: مجھے موبائل فون پر بات کرنے میں پریشانی ہوتی ہے، جب کہ مندر میں برابر مائک چلتا رہتا ہے، کوئی پریشانی نہیں ہوتی، شادی بیاہ کے موقع پر ڈھول، باجے پوری پوری رات اور

پورے دن بجتے ہیں، کوئی پریشانی نہیں ہوتی، اگر پریشانی ہو رہی ہے، تو بچوں کی حمد اور دعا سے ہو رہی ہے، جب کہ روزانہ اس میں مشکل سے ۵/ ۱۰ر منٹ لگتی ہیں، اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محلّے کے بچے وقت پر حاضر ہو جاتے ہیں؛ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے مسلمان ہیں، صاحبِ ایمان ہیں، تو اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس معترض کے کہنے کی وجہ سے یہ معمول بند کر دیا جائے، یا طلبہ کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے؛ اس معمول کو جاری رکھا جائے؟ جو بھی صورت ہو برائے کرم باوضاحت جواب تحریر فرمائیں۔

(۲) نیز اسی صاحبِ ایمان شخص کا یہ بھی کہنا ہے کہ جمعرات کے دن؛ مائک پر جو چندہ ہوتا ہے، اور پیسے بولے جاتے ہیں، یہ بھی بند کرو، حالاں کہ اس سے مدرسے کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے؛ لیکن دوسروں کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب بھی ہوتی ہے، اور جو تعاون کرتے ہیں، اُن کے حق میں صرف مائک پر چند دعائیہ کلمات کہہ دیے جاتے ہیں، جب کہ مدرسے کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے، اور نہ ہی مدرسے کے لیے مستقل کوئی سفیر ہے، بس صرف توکل علی اللہ، اور کچھ گاؤں کے مخلصین حضرات کے تعاون پر ہی کام چل رہا ہے، تو کیا یہ جمعرات کے دن بعد نمازِ عصر اور نمازِ مغرب؛ مائک پر پیسے بولنا، اور کچھ معاونین کے حق میں دعائیہ کلمات کہہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جو بھی صورت ہو؛ برائے مہربانی تحریر فرمائیں۔

(۳) جمعے کے دن جمعے کی نماز کے بعد مدرسے کے چھوٹے چھوٹے بچے، جو نابالغ ہوتے ہیں، مدرسے کے ۱۰، ۲۰ر والے ٹوکن لے کر؛ بستی کے گھروں میں گھوم جاتے ہیں، ہماری مائیں بہنیں شوق سے تعاون کرتی ہیں، اور دکان دار حضرات بھی ماشاء اللہ تعاون کرتے ہیں، تو معلوم یہ کرنا ہے کہ بچوں کا گھر گھر جا کر چندہ وصول کرنا شرعی اعتبار سے کیا حکم رکھتا ہے؟ جب کہ وہ بچے نابالغ ہوتے ہیں، اور چھٹی کا دن ہوتا ہے، اُس میں اُن کی تعلیم اور پڑھائی کا بھی کوئی حرج اور نقصان نہیں ہوتا ہے، جواب تحریر فرمائیں، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: (۱) حمد وثنا اور دعائیہ کلمات کا مائک پر؛ اجتماعی طور پر اس لیے پڑھوانا کہ بچے اُن کلمات کو سن کر آجائیں، یہ خود کلماتِ طیبات کا بے محل استعمال ہے؛ اس لیے بھی لائق ترک ہے، نیز اس کی وجہ سے اگر کسی کو اذیت

و پریشانی ہوتی ہے، تو یہ دوسری وجہ ہے اس کے جائز نہ ہونے کی؛ لہٰذا اس حمد وثنا میں مائک کا استعمال نہ کرنا چاہیے۔

و في حاشية الحموي عن الإمام الشَّعراني: أجمَع العُلماءُ سلفاً وخلفاً على استحباب ذكر الجَماعةِ في المَساجد وغيرها؛ إلا أن يُشوش جهرهم على نائمٍ أو مُصلٍّ أو قارئ إلخ. (الفتاوی رد المحتار: ۱/ ٤٤٤، قبیل باب الوتر والنوافل، ط: نعمانیة)

اور مندر میں مائک، اور شادی بیاہ میں ڈھول باجوں پر قیاس کرنا درست نہیں، پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ اُن کی وجہ سے پریشانی نہیں ہوتی؟ ممکن ہے کہ پریشانی تو ہوتی ہو؛ مگر اُن کو بند کرنے میں کسی فتنے اور شر کا اندیشہ درپیش ہو۔

(۲) کچھ عرصے سے مائک پر جگہ جگہ چندہ کرنے کی جو رسم رائج ہوئی ہے، اس میں مفاسد وخرابیاں بہت ہیں؛ اس لیے یہ واجب الترک ہے، آپ کے یہاں ممکن ہے پیسوں کی مقدار کو بتلا کر دعائیہ کلمات کہنے پر اکتفا کرلیا جاتا ہو؛ اگرچہ یہ بھی اچھا طریقہ نہیں، تاہم بہت سی جگہوں پر تو بچوں سے قراءت، نعت پڑھواتے رہتے ہیں، اور بعض جگہوں پر کیسٹیں چلا دیتے ہیں، اور درمیان درمیان میں آنے والے چندہ دینے والوں کے ناموں کا اعلان ہوتا رہتا ہے، بعض جگہ مستورات کے ناموں کے ساتھ اعلان ہوتا ہے، یہ سب امور؛ شرعاً مکروہ وقبیح ہیں۔

(۳) اگرچہ بچے نابالغ ہیں، اور اُن کی تعلیم کا نقصان نہ ہوتا ہو؛ مگر اس طرح طلبہ کو گھروں میں اور دکانوں پر بھیجنا؛ طلبۂ علوم دینیہ کی ایک درجے میں ذلت ہے، اور طلبہ کی ذلت؛ بعض مرتبہ دین کی حقارت لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے کا موجب بن جاتی ہے؛ اس لیے اس سے احتراز چاہیے، چندہ کرنے کرانے کا نظام حدودِ شرعیہ میں رکھنا چاہیے، احسن الفتاویٰ جلد اول میں مستقلاً ایک رسالہ ہے: "**صيانة العُلماء عن الذُّل عند الأغنياء**" (ص: ۴۳۵ تا ۴۵۰) اس میں چندہ کرنے کے حدود؛ تفصیل سے مدلل بیان کیے گئے ہیں، ان کو بہ غور ملاحظہ کرکے چندے کا نظام اپنائیں۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۷ھ الموافق: ۲۰۱۷/۵/۴ء، یوم الخمیس

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۷۳/ھ، ۹۶۱/ھ، ۱۴۳۸ھ)

مساجد میں چندہ کرنا یا بھیک مانگنا کیسا ہے؟

سوال: استفتاء بہ خدمت مفتیانِ کرام دارالعلوم دیوبند دامت برکاتہم!

(۱) زمانۂ حال میں مساجد میں فرض نمازوں کے بعد دعا سے قبل؛ سوال کرنے و مانگنے کا رواج بہت زیادہ ہوگیا ہے، زیادہ تر تو اپنی ذات کے لیے مانگنے والے ہوتے ہیں، دوسرے نمبر پر مدرسے کے لیے، تیسرے نمبر پر مساجد کے لیے، درمختار میں مسجد میں سوال کرنے کو مطلقاً حرام لکھا ہے، مسجد وغیرہ کا کوئی استثناء بھی نہیں کیا ہے۔

ویحرم فیه السُّوال ویُکره الإعطاءُ مطلقاً، وقیل: إن تخطی. (تحت فروع في مکروهات الصلاة)

موجودہ وقت میں کافی تعداد میں لوگوں کی رکعات چھوٹ جاتی ہیں، وہ اُن رکعات کو ادا کرتے ہوئے ہوتے ہیں، اُن کی نمازوں میں خلل واقع ہوتا ہے، نیز سوالی بیان کرتے ہوئے مسبوقین کی طرف کو اُن کا منہ ہوتا ہے، اس نوعیت کے ہوتے ہوئے مسجد میں سوال کرنا جائز ہے یانہیں؟ نیز اگر خلل فی الصلاۃ کا مفسدہ نہ ہو، اس طور پر کہ نماز سے سب فارغ ہوگئے، تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟ اور اپنی ذات و مدرسے وغیرہ کے لیے سوال کا ایک ہی حکم ہے، یا کچھ فرق ہے؟

(۲) مسجد کے اندر؛ مسجد کے لیے نمازِ جمعہ سے قبل دو آدمیوں کا کپڑا پکڑ کے صفوں کے بیچ گھوم کر چندہ کرنا کیسا ہے؟ جب کہ کچھ لوگ سنتیں پڑھتے ہوئے ہوتے ہیں، اور بعض مرتبہ خطبہ بھی شروع ہوجاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفیق: **(۱)** مسجد دراصل نماز کے لیے ہے؛ اس لیے مسجد میں کوئی بھی ایسا کام جائز نہیں، جس سے کسی نمازی کی نماز میں خلل واقع ہو، اور اگر نمازیوں کا خیال رکھتے ہوئے، اور آدابِ مسجد کی پاس داری کے ساتھ کوئی دینی یا جائز کام مسجد میں کیا جائے، تو شرعاً اس کی اجازت ہے، مسجد یا مدرسے کے لیے، یا کسی قابلِ اعتماد تنظیم یا ادارے کے تحت غریب و محتاج اور تنگ دست لوگوں کے لیے چندہ کرنا؛ ایک دینی امر ہے، اور یہ شرعاً بہ حکمِ سوال نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر صحابۂ کرام کو عمومی طور پر چندے کی ترغیب فرمائی تھی؛ اس لیے اہل مدارس یا

مساجد وغیرہ کا؛ مسجد میں نمازیوں کی رعایت کے ساتھ مختصر اعلان کرکے چندہ کرنا جائز ہے، اس میں شرعاً کچھ حرج نہیں، اور کسی ضرورت منداور محتاج شخص کا اپنی ذات کے لیے سوال کرنا شرعاً جائز ہے؛ بہ شرطے کہ سوال کرنے والا کمانے سے عاجز ہو، یا سخت تنگی وغربت کا شکار ہو، یا کسی بڑی بیماری میں علاج کے لیے خطیر رقم کی ضرورت ہو؛ پس ایسا شخص اگر نمازیوں کا خیال رکھتے ہوئے؛ اپنی ذات کے لیے مختصر اعلان کرکے چندہ کرے، تو شرعاً یہ بھی درست ہے؛ البتہ اگر اعلان کرنے والے؛ نمازیوں کا خیال نہ رکھیں، مثلاً: نماز کے بعد کھڑے ہوکر پوری داستان سنا کر لمبا اعلان کریں، اور نمازیوں کے سامنے سے گذریں، تو ذمے دارانِ مسجد مناسب انداز میں سمجھادیں، حنفیہ کا مختار قول یہی ہے، اور درِمختار کی روایت اپنے اطلاق پر محمول نہیں ہے۔

قولُه: (لقُرآن أو تعليم)؛ لأنّ المسجد بُني للصَّلاة، وغيرُها تبعٌ لها؛ بدليل أنَّه إذا ضَاق فلِلمُصلِّي إزعاجُ القاعد للذِّكر أو القراءة أو التَّدريس؛ ليُصلِّي موضعه دُون العَكس. (ردالمحتار، كتاب الديات، باب مايحدثه الرجل في الطريق وغيره: ۱۰/۲۶۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

وفي كتاب الكسب لمُحمَّد بن الحَسن صاحبِ أبي حنيفةَ: قال أبُو مُطيع البَلخي: لايحِلُّ للرَّجُل أن يُعطيَ سُؤال المَسجد؛ لما رُوي في الآثار: يُنادي يومَ القيامة مُنادٍ: ليقُم بفيض اللّٰه فيقُوم سؤال المسجد، قال: والمُختار أنَّه إن كان السَّائلُ لايتخطّٰى رِقاب النَّاس ولايمُرُّ بين يدي المُصلِّي، ولا يسألُ النَّاس إلحافاً فلا بأس بالسُّؤال والإعطاءِ؛ لأنّ السُّؤال كانُوا يسألُون على عهد رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم في المسجد، حتى يروى أنّ عليًّا تصدَّق بخاتَمه وهُو في الرُّكوع، فمَدحه اللّٰهُ بقولِه: ﴿يُؤتُونَ الزَّكوةَ وَهُم رَاكِعُونَ﴾ وإن كان يتخطّٰى رِقاب النَّاس ويمُرُّ بين يدي المُصلِّي فيُكره إعطاؤه؛ لأنَّه إعانةٌ له على أذى النَّاس، حتّٰى قيل: هذا فلسٌ واحدٌ يحتاجُ إلى سبعين فلساً لكفَّارته. (إعلام المساجد بأحكام المساجد للزركشي، الباب الرابع فيما يتعلق بسائر المساجد، الأمر الحادي والخمسون، ص: ۳۵۳ – ۳۵٤)

قولُه: (ويُكره التَّخطّي للسُّؤال إلخ:) قال في النَّهر: والمُختارُ أنّ السَّائل إن كان لايمُرُّ بين يدي المُصلِّي ولايتخطّٰى رِقاب النَّاس ولايسألُ إلحافًا؛ بل لأمر لابُدَّ منه، فلا بأس بالسُّؤال والإعطاءِ اهـ. ومثلُه في البزَّازية، فيها: لا يجُوز الإعطاءُ إذا لم يكونُوا

علی تلك الصِّفة المذكُورة. (ردالمحتار، کتاب الصلاة، باب الجمعة، مطلب في الصدقة علی سؤال المسجد: ۴۲/۳، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

و نقَله في الهِنديَّة (كتاب الصلاة، الباب السادس عشر في صلاة الجمعة: ۱۴۸/۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **عن البزازية.**

(۲) اگر یہ لوگ کسی نمازی کے سامنے نہ گذریں، لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگیں، اور خطبہ شروع ہونے سے پہلے چندے سے فارغ ہوجائیں، تو اس طرح مسجد کی ضروریات کے لیے چندہ کرنا درست ہے، اور اگر خطبے کے دوران چندہ کرتے ہیں، یا سنتیں پڑھنے والوں کے سامنے سے گذرتے ہیں، یا لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہیں، تو یہ امور قابلِ اصلاح ہیں، چندے کے دوران ان سے بچنا ضروری ہے، اور اگر بچنا مشکل و دشوار ہو یا ناممکن ہو، تو چندے کا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں، مثلاً: نماز کے بعد مسجد کے دروازے پر دو چار نوجوان کوئی بڑا رومال لے کر کھڑے ہوجائیں، اور چندہ دینے والے حضرات چندہ دیتے ہوئے مسجد سے نکلتے رہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۶/۱۵ھ = ۲۰۱۷/۳/۱۵ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۱۲/تتمہ/ن، ۶۱۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

دورِ حاضر میں مدارس کے خراب نظام اور چندے وغیرہ میں بے راہ روی کی اصلاح کیسے ہو؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائلِ ذیل کے متعلق:

(۱) آج کل مدارس بہت قائم کیے جارہے ہیں، اور یہ کہا جارہا ہے کہ ہر گھر اور گلی میں مدرسہ ہونا چاہیے، اور حالت یہ ہے کہ اگر مدرسے میں اختلاف ہوگیا، یا کسی سے کچھ کاروبار نہیں ہورہا ہے، تو فوراً دوسرا مدرسہ قائم کیا جاتا ہے، ہمارے سامنے بے شمار حضرات ایسے ہیں کہ جن سے دنیاوی کاروبار نہیں چلا، نہ حافظ، نہ عالم؛ لیکن مدرسہ قائم کرلیا، جس کا غلط اثر قدیم مدارس اور علمائے حق پر پڑتا ہے، حتیٰ کہ قوم مسلم؛ صحیح مدارس وعلماء کو بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی ہے، اور ایسے الفاظ استعمال کررہی ہے،

جن کا زبان سے اظہار نہیں کیا جا سکتا ہے، گویا کہ حقیقتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی شکل میں خواہشِ نفسانی کی تکمیل کی جا رہی ہے۔

ہمارے قصبے سیانہ میں پرانے مدرسے خالی ہیں؛ لیکن جدید مدرسوں کی بنیاد رکھی جا رہی ہے، تو سوال یہ ہے کہ قصبے یا دیہات میں جدید مدرسہ کب قائم کیا جائے؟ اور ذمے دار کیسا شخص ہونا چاہیے؟ اور زکاۃ کی وصول یابی کیسے طلبہ اور کتنے طلبہ پر ہونی چاہیے؟

(۲) قصبہ: ''سیانہ''، ضلع: ''بلند شہر'' کے بعض مدرسوں کا حال یہ ہے کہ بیس، تیس باہر کے طلبہ رکھ لیے، اور زکاۃ، فطرہ اور صدقہ لینا شروع کر دیا، ایک عالم صاحب نے ''منظمۃ الدعوۃ الاسلامیہ، قصبہ: دیوبند'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کر لی، اور رہتے ''سیانہ'' میں ہیں، اور زکاۃ، فطرہ، صدقہ؛ ہندوستان کے مختلف مقامات پر وصول کرتے ہیں۔

نیز ''سیانہ'' میں ہی ایک قاری صاحب ہیں، جن کو پہلے ۹۴/سال پرانے مدرسے سے ہٹایا گیا، اُس کے بعد ''سیانہ'' ہی کے دوسرے مدرسے میں تقرر ہو گیا، کچھ عرصے کے بعد اخلاق واعمال کو دیکھ کر اُس مدرسے کی کمیٹی نے بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ نکال دیا، اور اب قاری صاحب کی موجودہ حالت یہ ہے کہ اُنھوں نے ''مدرسہ اسلامیہ عربیہ نور العلوم، قصبہ: سیانہ'' کے نام سے رسیدات چھپوالیں، اور علی الاعلان؛ زکاۃ، فطرہ اور صدقہ وصول کر رہے ہیں، حالاں کہ عالمِ دنیا میں؛ خصوصاً قصبہ سیانہ کی سرزمین پر مدرسے کا وجود بھی نہیں ہے۔

قصبہ سیانہ میں ایک اور عالم صاحب ہیں، جو تقریباً ڈیڑھ سال سے زکاۃ، فطرہ، صدقہ وصول کر رہے ہیں، حالاں کہ مدرسے کی صرف ۲۰۰ یا ۳۰۰/گز زمین ہے، جس میں تعمیر نہیں ہوئی ہے، مدرسے کی زمین کے متصل ہی ایک صاحب نے مسجد کے نام زمین عطیہ کر دی ہے، جس میں دو منزلہ عمارت ہے، حالاں کہ ابھی تک مسجد اور مدرسے کی زمین پر تعلیم کا نام ونشان نہیں ہے، اور چندے کا حال یہ ہے کہ زکاۃ، فطرہ اور صدقہ علی الاعلان لیا جا رہا ہے، محترم ومکرم عالم صاحب سے کہا گیا کہ آپ کے یہاں تو نہ تعلیم ہے، نہ مقامی وبیرونی طلبہ ہیں، تو زکاۃ کیوں لے رہے ہیں؟ تو موصوف نے جواب دیا کہ عید الفطر کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا، اور رہا زکاۃ کی وصول یابی کا معاملہ، تو مسائل ہم بھی جانتے ہیں، سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے موصوف نے کہا کہ زکاۃ کی رقم؛ اگر غریب، مقروض آدمی، یا دوسرے مدرسے کے غریب، نادار طلبہ سے تملیک کرالی جائے، تو زکاۃ کی رقم امداد کی

ہو جاتی ہے، اور پھر اُس رقم کا تنخواہ اور تعمیر میں استعمال کرنا جائز ہے، اور ہم اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں، تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ قصبہ سیانہ میں کافی مدرسوں کے باوجود؛ تعمیر، تعلیم اور طلبہ کے وجود سے پہلے زکاۃ، فطرہ اور صدقے کی رقم تملیک کرا کر تعمیر، تنخواہ وغیرہ میں لگانا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) مولانا محمد شاہد قاسمی (ذمے دار مدرسہ اسلامیہ عربیہ تجوید القرآن، وامام جامع مسجد وعیدگاہ، قصبہ سیانہ) نے عید الفطر کے روز؛ عیدگاہ میں عوام کے سامنے قصبے کے مدارس کی حقیقت ظاہر کر دی، اور خصوصاً عالم صاحب کے مدرسے کی حقیقت ظاہر کر دی (کیوں کہ عالم کا اثر عوام وخواص سبھی پر پڑتا ہے)

اب کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ عیدگاہ پر نہیں کہنا چاہیے تھا؛ بل کہ بعد میں مولانا کو بلا کر نصیحت کر دیتے، اور جب مولانا صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ نے عیدگاہ پر کیوں کہا؟ تو اُنھوں نے جواب دیا کہ میں نے عید الفطر سے کئی روز پہلے مولانا کو بلایا، سمجھایا؛ لیکن جب مولانا اپنی بات پر بہ ضد رہے، تو میں نے صرف اور صرف زکاۃ اور مصرفِ زکاۃ کو عیدگاہ میں بیان کیا، اُن کی ذاتی حالت بیان نہیں کی، نہ اُن پر تہمت لگائی؛ بل کہ موصوف کے مدرسے کی زمین کی حقیقت؛ عوام کے سامنے ظاہر کی؛ تاکہ عوام کی زکاۃ کی رقم کا غلط استعمال نہ کیا جائے، علمائے حق بدنام نہ ہوں، مدارسِ حقہ کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھا جائے، اور زکاۃ کی وصول یابی؛ غیر مشروع طریقے پر نہ کی جائے، تو سوال یہ ہے کہ شاہی امام کا عید الفطر کے روز؛ حق اور ناحق مصرفِ زکاۃ، مدارس کی حالت، خصوصاً مولانا موصوف کے مدرسے کی حالت، اور زکاۃ کی وصول یابی کا طریقہ؛ عیدگاہ میں بیان کرنا جائز تھا یا نہیں؟ یا عوام الناس اور اہل مدارس کو اُن کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے تھا؟ شریعت اس کے متعلق کیا کہتی ہے؟ برائے مہربانی آگاہ کر دیں؛ تاکہ آیندہ عمل ہو سکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: (۱) آج کل دینی امور؛ بالخصوص مدارس ومکاتب میں، اور اُن میں بھی خاص طور پر؛ چندہ کرنے کرانے میں بے راہ روی واغراض پرستی کا جس قدر عمل دخل ہو گیا ہے، وہ بالکل ظاہر وعیاں ہے، جدید وقدیم مدارس ومکاتب کے نظام میں مفاسد وخرابیوں کا سیلاب جو کچھ آیا ہوا ہے، وہ سب کے سامنے ہے، جہاں دیگر اسباب ہیں، وہیں ان مفاسد وخرابیوں کے پیدا ہونے کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ مدرسے کو بجائے دین کے؛ مقصود کا درجہ دے دیا گیا ہے، یعنی: دین رہے یا جائے یا دین میں نقصان آئے، کچھ پرواہ نہیں؛ مگر مدرسے اور

مکتب اور ان کے نظام چندہ پر آنچ نہ آجائے، اسی کے اثرات ونتائج وہ ہیں کہ جو آپ کے قصبہ سیانہ؛ بل کہ اور بھی دیگر شہروں وعلاقوں میں بہ کثرت رونما ہیں،قوم مسلم جو کچھ شکوک وشبہات ظاہر کررہی ہے، یا جو کچھ عام مسلمانوں کی زبانوں پر آرہا ہے، اس سب کی اصلاح بھی ضروری ہے؛ مگر اُس سے زیادہ اہم: ذمے دارانِ مدارس ومکاتب، علماء وغیر علماء سب کو مدارس ومکاتب کے معاملات سے متعلق اپنے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر؛ اپنی اپنی اصلاح کی فکر بھی واجب واہم ہے، ہمارے قریبی حضراتِ اکابرِ دیوبند علمائے عظام نور اللہ مراقدہم نے جس تقوے اور پرہیزگاری سے نظام چلایا تھا، اسی ڈگر پر واپس لوٹنے میں ہماری صلاح وفلاح ہے، اُسی ڈگر اور راستے کو قدیم وجدید مدرسوں ومکتبوں کے چلانے اور قائم کرنے میں معیار بنانا چاہیے، حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب (الف) امداد الفتاویٰ، اور (ب) مفاسدِ چندہ، (ج) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب ''آپ بیتی'' میں جو کچھ مدارس کے قائم کرنے اور چلانے میں تفصیلات ہیں، اُن کا بہ غور مطالعہ، اور بار بار اُن کو پڑھنے کی ضرورت ہے، ذمے دارانِ مدارس کو چاہیے کہ اُن میں روشن ہدایات کو حرزِ جان بنا کر نظام مدارس کو چلائیں۔

(۲) مقامی علمائے کرام اور ہم دردانِ قوم وملت، سنجیدہ وبا اثر حضرات؛ نمبر:۱ میں تحریر کردہ کتابوں کا مطالعہ کریں، اور نظامِ مدارس میں عمدگی لانے میں جد وجہد کرتے رہیں، عیدگاہ وغیرہ جیسے عمومی میدانوں میں ان جیسے امور کو بیان کرنے سے فائدے کی توقع کم، اور مضرت وفتنے کے پھیل جانے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے، جو صورت تملیک کی لکھی ہے، وہ بلاشبہ غلط ہے، اور اس سے تملیکِ شرعی کا تحقق نہیں ہوتا، اور مسلمانوں کی زکاۃ کے ضیاع کا بھی اس میں اندیشہ ہے، چندہ کرنے نیز اُس کو صرف کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، معطیین؛ یعنی: چندہ دینے والوں کے منشا کو ملحوظ رکھنا بھی واجب ہے، اور اس کے علاوہ شریعتِ مطہرہ کے جو اصول وضوابط ہیں، اُن کا بھی لحاظ لازم ہے، ذمے دارانِ مدارس کو ہرگز یہ اختیار وآزادی نہیں کہ جس طرح چاہیں چندہ کرلیں، اور جس طرح چاہیں خرچ کرلیں، زکاۃ ودیگر صدقاتِ واجبہ کو اگر تعمیر یا تنخواہ وغیرہ جیسے امور میں لگا دیا، تو زکاۃ ہی ادا نہ ہوگی، چندہ دہندگان نے جس مدرسے کے طلبۂ مستحقین کے لیے رقوم دی ہوں، اُس مدرسے کے علاوہ دیگر مدارس کے مصارفِ زکاۃ؛ طلبہ پر خرچ کر دینا، یا ان کو تھما دینا ہرگز جائز نہیں، مدرسہ قائم کرنا، چلانا؛ خالص دینی کام ہے، جس قدر اخلاص کے ساتھ، اصول کے مطابق ہوگا، تو اس سے فائدہ ہوگا، اور جتنا اس سے

منحرف ہوگا، دنیا وآخرت کے فتنوں اور پریشانیوں میں ابتلاء کا خطرہ اور اندیشہ بڑھتا رہے گا۔
﴿وَاللّٰهُ يَهدِي مَن يَّشَاءُ إِلىٰ صِرَاطٍ مُّستَقِيم﴾

(۳) نمبر: ۱ و نمبر: ۲ کے تحت ذکر کردہ تفصیل سے؛ اس نمبر کا جواب بھی ہوگیا۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۲/۱۱/۱۴۳۸ھ الموافق: ۲۶/۷/۲۰۱۷ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۱۱۴/تتمہ/ھ، ۱۲۴۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

مدارس اسلامیہ کے لیے چندے کا ثبوت کہاں سے ہے؟

سوال: مدارس اسلامیہ کے لیے جو چندہ مانگا جاتا ہے، اُس کا ثبوت کہا سے ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: جب مدارس اسلامیہ دین کی حفاظت کا سبب ہیں، اور ملتِ اسلامیہ کی مشترکہ اجتماعی ضرورت ہیں، تو ظاہر ہے کہ ان مدارس کے اخراجات کی ذمے داری قوم اور ملت ہی پر ہوگی؛ لہٰذا مدارس کے لیے چندہ مانگنا؛ گویا مسلمانوں کی مشترکہ دینی ضروریات کے لیے چندہ مانگنا ہے، اور دورِ نبوی سے مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت کے لیے چندہ کرنا ثابت ہے۔

يُستفَاد: عن أبي بُردة بن أبي موسى عن أبيه رضي اللّٰه عنه قال: كان رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم إذا جاءه السَّائلُ أو طُلبت إليه حاجةٌ، قال: اشفعُوا توجرُوا، و يقضِي اللّٰهُ على لسَان نبيِّه صلّى اللّٰه عليه وسلّم ما شاء. (صحيح البخاري، كتاب الزكاة، باب التحريض على الصدقة والشفاعة فيها، ص: ۳٤۱۱، رقم: ۱٤۳۲، دار الفكر، بيروت)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۹/۱۰/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی

(۹۵۸/ص، ۱۰۰۹/ص، ۱۴۳۸ھ)

جانور ذبح کرنے کے چند طریقوں کا شرعی حکم

سوال: (۱) جانور کو ذبح کرتے وقت اُس کے گلے کی کتنی رگیں کاٹنا ضروری ہیں؟

(۲) نیز جانور کو ذبح کرتے وقت جب اس کی روح ابھی باقی ہو، اُس وقت اُس کی گردن کو مروڑ کر کسی اور طریقے سے توڑنا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) نیز اس بات کی بھی وضاحت کی جائے کہ جانور کے گلے کی مین ہڈی میں جو رگ ہوتی ہے، اُس کو چھری کی چونچ سے کاٹنا؛ جب کہ جانور کے اندر ابھی روح باقی ہو، جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ اُس رگ کو کاٹنے سے جانور کو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ وہ تڑپ جاتا ہے، برائے کرم باحوالہ جواب عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱) ذبحِ شرعی میں جانور کی چار رگوں: حلقوم (سانس کی نلی، جس کو نرخرہ کہتے ہیں) مری (نرخرے سے معدے تک کھانے پینے کی نلی) اور ودجان (خون کی دو نلی، جو نرخرے کے دائیں بائیں ہوتی ہیں، جس کو شہ رگ کہتے ہیں) میں سے کم از کم تین رگوں کا کٹنا ضروری ہے، تین رگوں سے کم کٹنے کی صورت میں ذبح کیا ہوا جانور حلال نہیں ہوگا۔

(۲) مکمل روح نکلنے کے بعد جب جانور ٹھنڈا ہو جائے، اُس وقت اُس کی گردن الگ کرنی چاہیے، ٹھنڈا ہونے سے پہلے گردن کو الگ کرنا؛ جس سے جانور کو تکلیف پہنچے مکروہ ہے۔

(۳) ذبح کرنے کے بعد جانور ٹھنڈا ہونے سے پہلے؛ گلے کی ہڈی کی رگ کو چھری کی نوک سے کاٹنا؛ جس سے جانور کو تکلیف پہنچے مکروہ ہے۔

عن عُمر أنَّه نهى عن الفَرس في الذَّبيحةِ ثُمَّ حكى عن أبي عبيدة أنّ الفرس هو النَّخع، يُقال: فرستُ الشَّاة ونخعتُها وذلك أن ينتهي بالذَّبح إلى النّخاع، و هو عظمٌ في الرَّقبة. (إعلاء السنن: ۱۴۵/۱۷، دار الكتب العلمية، بيروت)

ويُكره أن يضجعها ثم يحدُّ الشَّفرة وأن يبلُغ بالسِّكين النّخع وهو عرقٌ أبيضُ في عظم الرَّقبة، أمَّا الكراهيةُ؛ فلماروي عن النَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم نهى أن ينخع

الشّاة إذا ذبحت. (الفتاوى التاتارخانية: ۳۹۶/۱۷، رقم: ۲۷۶۲۰، زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۷ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۱۲۹/ص، ۱۱۸۹/ص، ۱۴۳۸ھ)

مشینی ذبیحے کا حکم

سوال: محترم المقام قابلِ صد احترام جناب مفتیانِ کرام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ!

بعد سلام مسنون! کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ شرع متین مشینی ذبیحے کے بارے میں:

جس کی صورت یہ ہے کہ تین چار سو مرغیاں ایک ساتھ لائن پر لٹکا کر لگا دی جاتی ہیں، اور ایک چھرا لگا ہوا ہوتا ہے، جو اپنی ہی جگہ سے حرکت کرتا ہے، آگے نہیں بڑھتا، مشین چلانے والا شخص؛ بسم اللہ پڑھ کر بٹن دبا دیتا ہے، جس کی وجہ سے مشین چالو ہو جاتی ہے، اور چھرا حرکت کرنے لگتا ہے، اور مرغیاں اُس کی زد میں آتی ہیں، اور ذبح ہوتی چلی جاتی ہیں، اور یہ واضح رہے کہ مرغیاں؛ یکے بعد دیگرے چھرے کے زد میں آتی ہیں، تو کیا ایسا ذبیحہ حلال ہے؟ جب کہ ایک مفتی صاحب اس طرح مشینی ذبیحے کے جواز کے قائل ہیں، میں اُنھی کی عبارت نقل کر رہا ہوں، وہ حضرت مفتی صاحب ''حلال وحرام'' نامی کتاب (ص:۱۴۲) پر لکھتے ہیں:

''اس کے برخلاف؛ ذبحِ اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق فعلِ ذبح سے ہے، مشہور فقیہ ابن نجیم کہتے ہیں:

لأنّ التّسمية في الذّكاة الاختياريّة مشروعةٌ على الذّبح لا على آلتِه، وفي الذّكاة الاضطراريّة التّسمية على الآلَة لا على الذّبيحة. (البحر الرائق: ۱۶۸/۸)

دوسرے یہ کہ چوں کہ ذبحِ اختیاری میں بسم اللہ کا تعلق؛ فعلِ ذبح سے ہوتا ہے؛ اس لیے اگر بالتعاقب فعلِ ذبح پایا جائے، یعنی: ایک جانور کو لٹایا، اُس کو ذبح کیا، پھر دوسرے جانور کو لٹایا، اور اُس کو ذبح کیا، تو اب ایک ہی بسم اللہ اُس دوسرے جانور کے حلال ہونے کے لیے کافی نہ ہوگا؛ بل کہ دوبارہ بسم اللہ کہنا ضروری ہوگا، اور اگر ایک ساتھ چند بکریوں کو ایک دوسرے پر لٹا دیا، اور ایک ہی بسم اللہ

سے ذبح کرتے چلے گئے، تو وہ سب حلال ہو جائیں گے، گویا فعلِ ذبح میں تکرار ہو، تو بسم اللہ میں بھی تکرار ضروری ہوگا، اور فعلِ ذبح ایک ہی ہو، تو گو ذبیحے متعدد ہوں؛ ایک ہی تسمیہ سب کے لیے کافی ہوگا، صاحبِ درمختار نے اس نکتے کو واضح کیا ہے:

لو أضجع شاتين إحداهما فوق الأخرىٰ فذَبَحهُما ذبحةً واحدةً بتسميةٍ واحدةٍ حلاًّ، بخلاف ما لو ذبحهُما على التَّعاقُب؛ لأنّ الفعل يتعدَّد بتعدُّد التَّسمية .

(الدر المختار: ۱۹۲/۵)

تیسرے اس بات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ ذبح کا وہ مسلسل عمل؛ جس میں بلا انقطاع؛ چھرا حرکت کرتا رہتا ہے، اور مرغیاں اُس کی زد میں آئیں، اور ذبح ہوتی چلی جائیں؛ ایک ہی فعلِ ذبح ہے، اس کا اندازہ درِمختار کی مذکورہ بالا عبارت؛ جس میں ایک سے زیادہ جانوروں کے ذبح کو ایک ساتھ حلال قرار دیا گیا ہے، اس کے علاوہ عالمگیری کی اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امرار اور چھرے کی مرورِ حرکت کی کیفیت کو فعلِ ذبح قرار دیا گیا ہے، اور جب تک امرار کی اس کیفیت میں انقطاع نہ پیدا ہوا ہو، اُس کو ذبحِ واحد کے حکم میں ہی رکھا گیا ہے؛ چناں چہ کہا گیا:

لو اضجع إحدى الشَّاتَين على الأخرى تكفي تسميةٌ واحدةٌ إذا ذبحهُما بإمرارٍ واحدٍ، ولو جمع العصافير في يده فذَبح وسمّٰى وذبح على أثرٍ و لم يُسمِّ لم يحلّ الثَّاني، ولو أمَرَّ السِّكينَ على الكلِّ جَاز بتسميةٍ واحدةٍ. (الفتاوى الهندية: ۲۸۹/۵)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے، تو مشینی ذبیحے کا حکم اس طرح نکلتا ہے کہ ”بسم اللہ کہہ کر بٹن دبانے والے شخص نے کسی خاص مرغی پر تسمیہ نہیں کہا؛ بل کہ مشین کے ذریعے صادر ہونے والے؛ مسلسل فعلِ ذبح پر تسمیہ کہا، اور ذبحِ اختیاری میں تسمیہ کا تعلق؛ فعلِ ذبح ہی سے ہوتا ہے“۔

لیکن جس عبارت سے مرغیوں کے مشینی ذبیحے کا مسئلہ ثابت کیا جا رہا ہے، اس میں یہ ہے کہ بکری کے اوپر بکری ہو، اور اس کو بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا جائے، یہاں پر تو فعلِ ذبح کے ایک ہونے میں کوئی اشکال نہیں؛ لیکن مرغیوں کا مسئلہ اس کے برعکس ہے کہ اس میں مرغیاں یکے بعد دیگرے؛ چھرے کی زد میں آتی ہیں، اور ذبح ہوتی چلی جاتی ہیں، درِمختار اور عالمگیری کی مذکورہ عبارت سے مرغیوں کے مشینی ذبیحے پر استدلال کرنا صحیح ہے؟ مسئلے کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔ بینوا توجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: اگر کوئی مسلمان بسم اللہ پڑھ کر مشینی چھری کا بٹن دبا دے، تو اولِ وہلہ میں جتنی مرغیوں کے گلے پر وہ چھری چلے گی، صرف وہی مرغیاں مذبوحہ اور حلال شمار ہوں گی، اس کے بعد بہ تدریج جو مرغیاں چھری کے تحت آتی جائیں گی، وہ مذبوحہ نہ ہوں گی، اور نہ ان کا گوشت کھانا حلال ہوگا؛ کیوں کہ نصوصِ فقہیہ سے اس بات کی گنجایش تو نکلتی ہے کہ مشینی چھری کے بٹن دبانے کو ہاتھ سے چھری چلانے پر قیاس کیا جائے۔ (دیکھیں: احسن الفتاوی: ۱۰۹/۷)

لیکن چوں کہ فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کے نتیجے میں؛ جانور اُس وقت حلال ہوں گے، جب بسم اللہ پڑھنا، اور ذبح کرنا دونوں متصل واقع ہوں، معمولی ایک آدھ منٹ کی تقدیم کا تو کوئی اعتبار نہ ہوگا؛ کیوں کہ اتنا فرق تو عادتاً ناگزیر ہے؛ مگر اس سے زیادہ تقدیم ہوئی، تو یہ تسمیہ متصل نہ ہونے کی وجہ سے کالعدم ہوجائے گا، اور جانور حلال نہ ہوگا؛ اس لیے پہلے وہلے کے بعد بہ تدریج ونوبۃً بعدنوبۃ جو چھری سے ذبح ہوں گی؛ حلال نہ ہوں گی، ذبح اور تسمیہ کے درمیان فصل واقع ہوجانے کی وجہ سے، بدائع الصنائع میں ہے:

أمَّا وقتُ التَّسمية: فوقتُها في الذَّكاة الاختياريَّة وقتُ الذَّبح، لا يجُوز تقديمُها عليه؛ إلَّا بزمان قليلٍ لا يُمكنُ التَّحرُّز عنه؛ لقوله تبارك وتعالىٰ: ﴿وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَم يُذكَرِ اسمُ اللّٰهِ عَلَيهِ﴾ والذَّبحُ مُضمرٌ فيه، معناه: ولا تأكلُوا ما لم يذكر اسم اللّٰه عليه من الذّبائح، ولا يتحقَّقُ ذكرُ اسم اللّٰه تعالىٰ على الذَّبح؛ إلَّا وقت الذّبح إلخ .

(بدائع الصنائع: ۱۷۱/٤، ط: مكتبة زكريا)

نیز بدائع ہی میں ایک دوسری جگہ بہ حوالہ مبسوط للامام محمدؒ یہ عبارت بھی ہے:

أ رأيتَ الذّابح يذبح الشَّاتين والثَّلاثة فيُسمِّي على الأوَّل ويدع التَّسمية على غير ذلك عمدًا، قال: يأكل الشَّاة التي سُمِّي عليها ولا يأكلُ ما سوىٰ ذلك. (بدائع الصنائع: ۱۷۱/٤، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

درِمختار کی جو عبارت: یعنی: "**ولو أضجع شاتَين إلخ**" سوال میں "حلال وحرام" نامی کتاب سے نقل کی گئی، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایک سے زائد جانوروں کو ایک ساتھ لٹا کر؛ بسم اللہ پڑھ کر بہ یک وقت سب کے گلے پر چھری پھیر دی جائے، تو ذبح شدہ تمام جانور حلال ہوں گے، اس عبارت

کا یہ مطلب نہیں کہ بسم اللہ پڑھ کر چھری کو جو حرکت دی گئی تھی، جب تک اس میں انقطاع نہ ہو، اس سے ذبح ہونے والے تمام جانور حلال ہوں گے۔

یہ مطلب صاحبِ درمختار کی عبارت: ''فذبحهُما ذبحةً''، اسی طرح اس مسئلے میں بدائع الصنائع کی عبارت: ''وأمرَّ السِّكين عليهما معاً'' کے قطعاً خلاف ہے، بدائع کی پوری عبارت یہ ہے: **لو أضجع شاتين وأمرَّ السِّكين عليهما معاً أنَّه تجزي في ذلك تسميةٌ واحدةٌ.**

(بدائع الصنائع: ٤/١٧٣، ط: مكتبة زكريا)

نیز فقہاء نے یہ مسئلہ جہاں کہیں بھی ذکر کیا؛ اسی طرح کی عبارت استعمال فرمائی ہے۔

(دیکھیں: محیط برہانی: ٦/٦٦، تبیین الحقائق: ٦/٥٥، وغیرہ)

حاصل یہ ہے کہ مشینی ذبیحے کے حوالے سے سوال میں جس استدلال کا ذکر کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بسم اللہ پڑھ کر بٹن دبا دیا جائے، اور چھری حرکت کرنے لگے، تو جب تک اس حرکت میں انقطاع نہ آئے گا، اس چھری سے ذبح ہونے والی تمام مرغیاں؛ حلال اور مذبوحہ قرار پائیں گی، ہمارے نزدیک استدلال صحیح نہیں ہے، جس کی وجہ مختصراً اوپر ذکر کر دی گئی ہے، نیز مسئلے کا اصل حکم بھی اوپر لکھ دیا گیا ہے، اور اس مسئلے سے متعلق مزید تفصیلات اور دلائل کے لیے ''احسن الفتاوی'' (۷/۴۵۹) میں شامل؛ رسالہ ''احسن القضاء فی الذبح باعانۃ الکہرباء''، نیز فتاوی بینات، بہ عنوان: ''ذبح کا مسنون طریقہ اور مشینی ذبح سے متعلق شرعی مسائل'' (فتاوی بینات: ۴/۴۹۱-۵۰۹، ط: کراچی) ملاحظہ فرمائیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۱۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۳۷/تتمہ/د، ۵۸۵/د، ۱۴۳۸ھ)

ذبیحہ کمپنی سے متعلق ذبح شرعی کے چند مسائل

سوال: محترم المقام قابلِ صد احترام جناب مفتیانِ کرام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! بعد سلام مسنون! عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ شرع متین؛ مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

(۱) جانور کو ذبح کرنے میں جن چیزوں کی رعایت کرنا ضروری ہے، اُن میں سے کچھ ایسی ہیں، جن پر عمل کرنا ہماری فیکٹری میں مشکل ہے، مثلاً: جانور کو چارا کھلا کر ذبح کرنا کہ بغیر کھلائے ذبح کرنا مکروہ ہے، اسی طرح جانور کے سامنے چھری تیز کرنا مکروہ ہے، اس سے بچنا بھی مشکل ہے، اسی طرح ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا، اس سے بچنا بھی مشکل ہے، ان تمام چیزوں کو (فتاوی رحیمیہ: ۱۰/۶۸-۶۹) پر مکروہ لکھا ہے۔

اب معلوم یہ کرنا ہے کہ ان تمام چیزوں کی رعایت کریں، تو اتنی مقدار میں جانور ذبح نہیں ہو سکتے کہ جس سے فیکٹری کے ملازمین کا خرچ نکل سکے، اور مالک کو نفع بھی ہو سکے؛ لہٰذا یہ جو کراہت ہے، یہ کس درجے کی ہے، تنزیہی یا تحریمی؟

(۲) اور اس کی بھی وضاحت فرمائیں کہ جانور کو سرد ہونے سے پہلے (جانور ابھی حرکت کر رہا ہے) اُس کا چمڑا نکالنا مکروہ ہے؛ تنزیہی یا تحریمی؟

(۳) جانور کے ذبح ہونے کے بعد کوڑی کرتے ہیں، اُس کی صورت یہ ہے کہ چاقو کا نوک حرام مغز پر رکھ کر حرکت دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں حرام مغز کا تعلق دماغ سے منقطع ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے جانور جلدی سرد پڑ جاتا ہے، اور خون جتنی مقدار میں نکلنا چاہیے اتنی مقدار میں نہیں نکلتا ہے۔

(۴) جانور کو لٹا کر ذبح کرنا سنت ہے، اگر کوئی شخص لٹائے بغیر کھڑے یا بیٹھے ہونے کی حالت میں ذبح کر دے، تو یہ عمل مکروہِ تحریمی ہے یا تنزیہی؟

(۵) اسی طرح حاملہ جانوروں کو ذبح کرنا کیسا ہے؟ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدھا بچہ اندر اور آدھا باہر ہوتا ہے، اور یہ عمل بیوپاریوں کے دھوکا دینے سے ہوتا ہے۔

(۶) اسی طرح ایسا جانور ذبح کرنا، جس کا بچہ بالکل چھوٹا ہو، مثلاً: دو چار ہی دن کا ہو، اور اسی طرح بچوں کے ذبح کرنے کی کیا عمر ہے؟ آیا کوئی خاص عمر ہے، یا کسی بھی عمر کے بچّے کو ذبح کر کے اُس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے؟

(۷) اور یہ بھی واضح فرمائیں کہ ذبح میں جن چار رگوں کا کٹنا ضروری ہے، اُن میں سے اگر سب نہ کٹ سکیں، تو کن ائمہ کے نزدیک کتنی رگیں کٹ جائیں، تو جانور حلال ہو جائے گا؟

(۸) نیز اسی طرح جانور کو حلقوم سے ذبح کرنا ضروری ہے، یا حلقوم کے اوپر سے، یا حلقوم کے زیادہ نیچے سے ذبح کر دیں، تو کوئی حرج تو نہیں ہے، جب کہ مطلوبہ رگیں کٹ جاتی ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۲،۱) ذبح سے پہلے چارا کھلانا، ایک جانور کے سامنے دوسرا جانور ذبح نہ کرنا، اور ذبح کے بعد سرد ہونے سے پہلے چمڑا نہ اتارنا، یہ امور: مستحبات و آدابِ ذبح میں سے ہیں، اگر کسی وجہ سے ان کی خلاف ورزی ہو جائے، تو یہ مکروہِ تنزیہی ہوگا، نہ کہ تحریمی۔

و ندب إحدادُ الشَّفرة قبل الإضجاع و كُره بعده، و كذا جرُّها برجلها إلى المذبح ...... والسّلخُ قبل أن تبرد إلخ. (ملتقى الأبحر: ۱۵۹/۱، كتاب الذبائح، ط: بيروت)

اور ہدایہ میں ہے: **ويُكره أن يجُرَّ ما يُريدُ ذبحَه برِجله إلى المَذبح وأن تنخع الشَّاة قبل أن تبرد .... إلا أنّ الكراهة لمعنى زائدٍ، وهو زيادةُ الألم قبل الذّبح أو بعده فلا يوجب التَّحريم إلخ.** (هدايه: ۴۳۹/۴، ط: مكتبة أشرفية، ديوبند)

(۳) کوڑی کرنا بھی مکروہ ہے؛ کیوں کہ اس کی وجہ سے بھی جانور کو معہود سے زیادہ تکلیف پہنچتی ہے، اگر اس کی وجہ سے دم مسفوح کا خروج کم ہو جائے، تو کراہت میں شدت آئے گی؛ ورنہ فی نفسہ یہ عمل مکروہِ تنزیہی ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

وكره النَّخعُ وهو أن يبلغ بالسِّكين النّخاع وتُؤكل الذّبيحة، والنّخاعُ عرقٌ أبيض في عظم الرَّقبة، وقيل أن يمدَّ رأسه حتى يظهر مذبحه، وقيل أن يكسر عنقه قبل أن يسكن من الإضطراب، وكلُّ ذلك مكروهٌ؛لأنَّه تعذيبُ الحيوان بلا ضرورةٍ، والحاصلُ أنّ كلّ ما فيه زيادةُ ألمٍ لا يحتاجُ إليه في الذّكاة مكروهٌ، كذا في الكافي. (۲۸۸/۵، ط: مكتبة زكريا)

(۴) گائے، بیل، بھینس وغیرہ؛ یعنی: اونٹ کے علاوہ دیگر جانوروں کو بٹھا کر یا کھڑا کر کے ذبح کرنا؛ خلافِ سنت اور مکروہِ تنزیہی ہے۔

وحُبَّ –بالحاء– نحرُ الإبل في سفل العُنق، وكره ذبحُها، والحُكم في غنم وبقَرٍ عكسُه، فندب ذبحُها وكره نحرُها؛ لترك السُّنة. (در مختار) **وقال الشَّامي: وفي المُضمَرات: السُّنة أن ينحر البعيرُ قائماً و تذبح الشّاة أو البقرة مضجعةً. قهستاني، قولُه: وكره إلخ.... ينبغي أن تكون كراهة تنزيهٍ.** (درمختار مع الشامي: ۴۳۹/۹، ط: مكتبة زكريا)

(۵) قریب الولادۃ حاملہ جانور کو ذبح کرنا مکروہ اور خلافِ اولیٰ ہے۔

في الكفاية: إن تقَاربت الولادةُ يُكره ذبحُها. (درمختار مع الشامي: ٩/٤٤١، ط: مكتبة زكريا)

(٦) اس سلسلے میں شرعاً کوئی عمر متعین نہیں، کسی بھی عمر کے بچے کو ذبح کر کے اُس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔

(۷) ذبح میں حلقوم؛ یعنی: نرخرہ، مری (وہ رگ جس سے دانہ پانی جاتا ہے) اور ودجین (دو شہ رگیں) ان چار رگوں میں سے کم از کم تین کا کٹنا ضروری ہے، اگر تین رگیں کٹ جائیں، تو عندالاحناف جانور کا گوشت حلال ہے، ان سے کم کٹنے کی صورت میں حلال نہیں ہے۔

والعُروق التي تقطع في الذّكاة أربعةٌ: الحُلقُوم، والمري والودجان ...... وعندنا: إن قطعَها حلَّ الأكلُ وإن قطَع أكثرها فكذالك. (هداية: ٤/٤٣٧، ط: أشرفية)

(۸) حلق اور لبہ کے درمیان ذبح کرنا مسنون ہے، باقی اگر اتفاقاً حلق سے کچھ اوپر یا کچھ نیچے ذبح ہوجائے، تب بھی جانور حلال رہے گا؛ بہ شرطے کہ کم از کم تین رگیں کٹ جائیں۔

وذكاةُ الاختيار ذبحٌ بين الحلق واللّبة إلى آخرما في ردّ المحتار: (٩/٤٢٤، ط: مكتبة زكريا)

نوٹ: کراہت؛ خواہ تحریمی ہو یا تنزیہی، ایک مسلمان کو چاہیے کہ ہر ایک سے بچے، محض مالی منفعت کے پیشِ نظر مکروہاتِ تنزیہیہ کا ارتکاب کر ڈالنا؛ بل کہ مسلسل کرتے رہنا ایک مسلمان کی شان نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۴ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۸/تتمہ/د، ۵۸۶/د، ۱۴۳۸ھ)

جانور پر تسمیہ بھول جائے یا دھار دار آلے پر ’’بسم اللہ، اللہ اکبر‘‘ لکھوا کر ذابح صرف بٹن دبائے تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے متعلق؛ بہ حقِ شریعتِ صواب کے مطلع کیا جائے:

(۱) جانور کے گلے پر اگر بسم اللہ پڑھنا بھول جائے، اور جانور ذبح ہوگیا، آیا وہ جانور از روئے شرع مذبوحہ مانا جائے یا نہیں؟

(۲) نیز آلۂ دھار دار پر ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' لکھ دیا گیا، اور پھر بٹن کے ذریعے اس کو متحرک کر دیا گیا، جانور سلسلہ وار آتے گئے، اور ذبح ہوتے گئے، یہ شکل جواز کی ہے یا عدم جواز کی؟ برائے کرم مدلل مذکورہ بالا صورت حال سے آگاہی دی جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: (۱) اگر ''بسم اللہ، اللہ اکبر'' پڑھنا بھول گیا، تو ذبیحہ حلال ہے۔

(۲) دھار دار آلے پر تسمیہ کا لکھ دینا کافی نہیں؛ بل کہ ذابح کا بہ وقتِ ذبح زبان سے تسمیہ پڑھنا واجب ہے، دھار دار آلے پر تسمیہ لکھ دیا، اور بٹن دبا کر اس کو متحرک کر دیا، اور سلسلہ وار جانور اُس کے نیچے آکر ذبح ہوتے رہے، تو یہ شکل جواز کی نہیں؛ بل کہ عمداً تسمیہ کے چھوڑ دینے کی ہے؛ لہٰذا جتنے جانور؛ سلسلہ وار اس دھار دار آلے کے نیچے آکر ذبح ہوئے، سب کے سب مردار اور حرام ہوگئے۔

وتارك تسميةٍ عمداً خلافاً للشّافعي، فإن تركها ناسيًا حلَّ اهـ. (در مختار) **وفي شرحه الفتاویٰ ردّ المُحتار: (قولُه: و تارك تسميةٍ عمداً) بالجرّ عطفاً على وثني أي: ولاتحلُّ ذبيحةُ من تعمَّد تركَ التَّسميةِ مُسلماً أو كتابياً؛ لنصِّ القُرآن، و لانعقاد الإجماع ممَّن قبل الشَّافعي على ذلك اهـ.** (۵/۱۹۰، كتاب الذبائح، مطبوعة: نعمانية، ديوبند)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۱۹ھ الموافق: ۲۰۱۷/۵/۱۶ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۹۶۵/ھ،۱۰۵۴/ھ، ۱۴۳۸ھ)
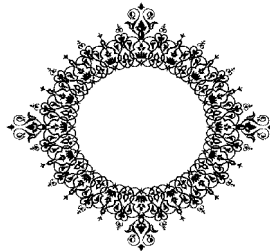
طب، میڈیکل سائنس اور مختلف دواؤں سے متعلق مسائل

کیا مریض کو خون دینا یا مجبوری میں خون خریدنا اور خون دینے والے کا اس پر اجرت لینا جائز ہے؟

سوال: **(۱)** کیا آدمی اپنا خون دوسروں کو دے سکتا ہے، اُس کی جان بچانے کے لیے؟ اسی طرح اپنے جسم میں دوسرے کا خون چڑھا سکتا ہے؟

(۲) اگر کوئی اپنا خون مانگنے پر مجبور کرے، تو کیا اپنے خون کو قیمتاً دے سکتے ہیں کہ میں اپنا خون دیتا ہوں، مجھے اتنے ہزار یا لاکھ روپے دو گے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: (۱-۲) مجبوری میں خون لینے دینے اور جان بچانے کی خاطر؛ بہ قدرِ ضرورت چڑھوالینے میں گنجایش ہے، اگر بغیر پیسے لیے دیے حاصل ہونے کی کوئی صورت نہ ہو، اور وقتی طور پر پیسے دے کر مجبوری میں لے لیں، تو اس کی بھی گنجایش ہے؛ مگر پیسوں کا لینا جائز نہیں؛ کیوں کہ خون کی خرید وفروخت اصالۃً باطل اور حرام ہے، اور پیسے لینے میں کوئی مجبوری اور اضطرار کا نہ ہونا ظاہر ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۵/۱۰ھ الموافق: ۲۰۱۷/۲/۸ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۶۲/ھ، ۶۳۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

فوری ضرورت کی بنا پر خون عطیہ کرنے اور پیشگی طور پر بلڈ بینک میں خون جمع کرانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے علمائے کرام ومفتیانِ شرع عظام مسئلہ ذیل میں:

اس وقت ہسپتالوں میں مریضوں کو خون کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، حادثات کے اندر شدید زخمی ہونے والے حضرات، اور دورانِ ولادت خواتین کے لیے یہ ضرورت عام ہوچکی ہے، ہمارے یہاں متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ مریض کو فوری طور پر خون نہ ملنے کی وجہ سے اُس کی جان چلی گئی؛ کیوں کہ خون کا انتظام کرنے کے لیے بہت ساری کارروائیاں کرنی پڑتی ہیں، جس میں بسااوقات کافی تاخیر بھی ہوجاتی ہے، اس مسئلے کے حل کے لیے ہم نے بلڈ بینک انتظامیہ سے رابطہ کیا، تو اُنھوں نے ہمیں یہ ترکیب بتلائی کہ آپ حضرات: خون جمع کرنے کے لیے ایک کیمپ لگائیں، اور جب کافی مقدار میں خون جمع ہوجائے، تو وہ بلڈ بینک میں جمع کردیں؛ چوں کہ پیشگی طور پر آپ کا خون؛ بلڈ بینک میں جمع رہے گا؛ اس لیے آپ کے مریض کو خون کی ضرورت کے وقت؛ فوری طور پر بلاکسی تاخیر کے خون مہیا کرادیا جائے گا، اور دیگر کارروائیوں کی بھی ضرورت نہیں رہے گی؛ اسی لیے ہماری کمیٹی نے خون کے عطیے کے لیے ایک کیمپ لگانے کا پروگرام بنایا ہے، جس میں تمام نوجوان اجتماعی طور پر خون کا عطیہ کریں گے؛ تاکہ ہنگامی صورتِ حال میں ہمارے مریضوں کو فوری خون مہیا ہوسکے، اور اُن کے لواحقین مجبوری کے حالات میں لاکھوں روپے خرچ کرنے سے بچ جائیں۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ہمارا یہ فعل جائز وثواب ہے، یا ناجائز وحرام؟ اگر جائز ہے، تو فبہا؛ وگرنہ تو ایسے ہنگامی حالات میں ہمارے پاس کون سا راستہ باقی رہتا ہے؟ مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں، اللہ آپ کو بہترین صلہ عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: انسان کا خون جب بدن سے نکال لیا جائے، تو وہ نجس ہوتا ہے، اور ساتھ ساتھ یہ انسان کا جزو بھی ہے؛ اس لیے واجب التّکریم بھی ہے؛ لہٰذا اس کا استعمال عام حالات میں جائز نہیں ہے؛ البتہ جب کسی مریض کی ہلاکت کا اندیشہ ہو، اور اس کی جان خطرے میں ہو، اور خون دینے سے جان بچ جانے کی توقع ہو،

یا تجربے کار ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیے بغیر صحت کا امکان نہ ہو، تو ان حالات میں خون دینا جائز ہے، اور جب ضرورت نہ ہو، تو چوں کہ انسان اپنے بدن یا کسی عضو کا مالک نہیں ہے؛ اس لیے اس کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ امکانی ضرورتوں کے لیے اپنا خون نکلوا کر بلڈ بینک میں جمع کرادے؛ لہٰذا اس کی اجازت نہیں ہے؛ البتہ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جو نوجوان اپنا خون دینا چاہتے ہیں، ان کا نام اور کس گروپ کا خون ہے؛ لکھ دیا جائے، اور آیندہ جب کسی مریض کو خون کی ضرورت ہو، تو اُس نوجوان سے لے لیا جائے، جس کا خون مریض کے گروپ کے مطابق ہو۔ (مستفاد: فتاوی رحیمیہ: ۱۷۲/۱) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۱ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۰۶۷/تتمہ/ل، ۸۵۵/ل، ۱۴۳۸ھ)

مسلم کا غیر مسلم کو خون دینے اور بلڈ کیمپ میں خون عطیہ کرنے کا حکم

سوال: **(۱)** کیا میں بلڈ کیمپ میں بلڈ (خون) دان کرسکتا ہوں؟

(۲) اور کیا میں کسی غیر مسلم کو اپنا بلڈ دے سکتا ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: **(۱-۲)** شدید مجبوری اور ضرورت کے وقت؛ اپنا خون کسی شخص کو؛ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم؛ از راہِ ہم دردی دے سکتے ہیں، شرعاً اس کی اجازت ہے۔

يجُوز للعَليل شُربُ الدَّم والبَول وأكلُ الميتة؛ للتَّداوي، إذا أخبَره طبيبٌ مسلمٌ أنّ شِـفَاءه فيه، ولم يجِد من المُباح ما يقُوم مقامه. (هندية، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر في التداوي: ۵/ ۴۱۰، ط: اتحاد، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ

الجواب صحیح، اور بلڈ کیمپ میں خون دینے کی اجازت نہیں ہے؛ کیوں کہ ضرورت موہوم ہوتی ہے، اور عام طور پر اس طرح جمع شدہ خون فروخت کیا جاتا ہے۔ محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۳۰۳/ب، ۳۵۷/ب، ۱۴۳۸ھ)

بہ طور علاجِ رحم پلیسنٹا ایکسٹریکٹ انجکشن لگوانا کیسا ہے؟

سوال: ڈاکٹر نے میری بیوی کے رحم کی بیماری کے علاج کے لیے پلیسنٹا ایکسٹریکٹ انجکشن (placenta extract injection) کا مشورہ دیا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اس کا استعمال کرنا حلال ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: ضرورت پر فقہائے کرام نے منعِ حمل کی عارضی تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی ہے، جیسے: عزل، کنڈوم کا استعمال، کاپرٹی لگوانا، ملٹی لوڈ کروانا، دوا کھانا اور انجکشن کا استعمال وغیرہ؛ اس لیے بچّے دانی کی کسی بیماری کے علاج کے لیے؛ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق؛ پلیسنٹا ایکسٹریکٹ انجکشن (placenta extract injection) لگوایا جاسکتا ہے؛ علاج کے طور پر، شرعاً اس کی اجازت ہے۔

مستفاد: أفَاد وضع المَسألة أنّ العزل جائزٌ بالإذن، وهذا هُو الصَّحيحُ عند عامَّة العُلمَاء؛ لما في البُخاري عن جابر رضي الله عنه: كنَّا نعزِل و القُرآنُ ينزِل إلخ.

(البحر الرائق: ۳۴۸/۳، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

فإذًا فلا كراهةَ في العَزل عند عامَّة العُلماء وهُو الصَّحيحُ، وبذٰلك تظافرت الأخبار، وفي الفتح: وفي بعض أجوبة المَشايخ: الكراهة، وفي بعض: عدمها، نهر إلخ.

(رد المحتار، كتاب النكاح، باب نكاح الرقيق: ۳۳۵/۴، ط: مكتبة زكريا، ديوبند)

وقال رسُول الله صلّى الله عليه وسلّم: تزوَّجُوا الودُود الولُود؛ فإنِّي مُكاثرٌ بكم الأمم يوم القِيامة. (مشكاة المصابيح، ص: ۲۶۷، نقلاً عن السنن لأبي داؤد والسنن للنسائي)

وقال رسُول الله صلّى الله عليه وسلّم: ذلك – العزل – الوأدُ الخفيُّ، وهي: و إذا المَوءُ ودةُ سُئِلَت. (المصدر السابق، ص: ۲۷۶، نقلاً عن الصحيح لمسلم) **فالحديثُ لا يدلُّ على حُرمتِه، غايتُه الكراهةُ.** (هامش المشكاة، ص: ۲۷۶، نقلاً عن اللمعات) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۳/۵ھ = ۲۰۱۶/۱۲/۵ء، دوشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۱۹۶/ن، ۲۲۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

شدید مجبوری کی صورت میں بچّے دانی بند کروانے کا حکم

سوال: اگر زوجہ کے تین آپریشن ولادت کے لیے ہو چکے ہوں، اور چوتھے آپریشن میں ڈاکٹر بچہ دانی بند کروانے کا مشورہ دے کہ مزید زچگی زوجہ کے لیے مناسب نہیں ہے، تو کیا یہ جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: صورتِ مذکورہ میں اگر چوتھے آپریشن میں عورت کی جان کا خطرہ ہے، یا دائمی مریض اور انتہائی کمزور ہو جانے کا غالب گمان ہے، تو ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کے بجائے مانعِ حمل تدبیر؛ ۳-۴ ؍سال تک اختیار کریں، بچّے دانی بند نہ کرائیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۸؍صفر؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۳۱۴؍ب، ۱۹۳؍ب، ۱۴۳۸ھ)

کسی عضو کے خراب ہو جانے پر اسے تبدیل کروانے کا حکم

سوال: کسی آدمی کے جسم کے اندر یا باہر کا کوئی حصہ بے کار ہو جائے، اور ڈاکٹر مشورہ دے کہ اس کو بدل کر دوسرا لگانا پڑے گا، اس سلسلے میں سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں:

(۱) کسی زندہ قریبی رشتے دار یا دوست سے تبرعاً، یا کسی غیر سے قیمتاً لے کر لگا سکتے ہیں؟

(۲) کسی انسان کی طبعی موت کے بعد اُس کا وہ مطلوبہ حصہ لگا سکتے ہیں یا نہیں؟

(۳) کسی رشتے دار یا کسی بھی انسان کا؛ کسی حادثے میں انتقال ہو جائے، تو اس کا وہ مطلوبہ حصہ نکال کر لگایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جب کہ اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا، تو اُس کے اندر کے اہم اجزاء: دل، گردہ وغیرہ نکال لیا جائے گا۔

(۴) بڑے ہسپتالوں میں جسم کے اہم اعضاء: دل، گردہ، پھیپھڑا وغیرہ فروخت ہوتے ہیں، وہاں سے خرید کر لگانا شرعاً کیسا ہے؟

نوٹ: میں ایک عالم ہوں، اور میڈیکل کا طالب علم ہوں؛ اس لیے آں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم سے درخواست ہے کہ جوابات کے ساتھ مختصراً ہی سہی؛ دلیل تحریر فرما دیں، تو بڑی مہربانی ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۴) انسان اپنے جسم کے تمام اعضاء کے ساتھ قابلِ احترام ہے، انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنا کوئی جسم کا حصہ؛ کسی کے ہاتھ فروخت کرے، یا ہدیہ دے؛ کیوں کہ انسان کے جان و مال کو اللہ نے جنت کے عوض میں خرید لیا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشتَرَى مِنَ المُؤمِنِينَ أَنفُسَهُم وَأَموَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ﴾ (توبة: ١١١)

جب یہ جان ہماری نہ رہی، تو ہمیں اُس کے بیچنے اور ہبہ یا دان کرنے کا بھی حق حاصل نہ رہا، صرف انسان کے خون کو دودھ کے اوپر قیاس کرکے؛ انتفاع کی ضرورۃً اجازت دی ہے، اور کسی عضو کی پیوندکاری کو ناجائز بتایا گیا ہے۔

و الآدميُّ مُحترمٌ بعد مَوته؛ علی ما كان عليه في حياته، فكما يحرُم التَّداوي بشيءٍ من الآدميِّ الحيِّ؛ إكراماً له، فكذٰلك لا يجُوزُ التَّداوي بعظم الميِّت، قال – صلّى اللّٰه عليه وسلّم –: كسرُ عظم الميِّت ككسر عظم الحَيِّ. (شرح السّير الكبير: ٨٩/١)

الانتفَاعُ بأجزاءِ الآدميِّ لم يجُز، قيل: للنَّجاسةِ، وقيل: للكرَامةِ، هُو الصَّحيحُ، كذا في جَواهر الأخلاطِي. (الهندية: ٣٥٤/٥، كتاب الكراهية، الباب الثامن عشر في التداوي)

فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۸۷/ب، ۹۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

حجامہ لگوانے کی مسنون تاریخ کیا ہے؟

سوال: (۱) کیا حجامہ قمری مہینے کی ۱۷، ۱۹، اور ۲۱ تاریخوں میں کروانا؛ صحیح احادیث سے ثابت ہے؟ حدیث کا حوالہ مع اردو ترجمہ کے ضرور دیں، نیز ضرورت کے تحت کیا کسی بھی تاریخ کو کروایا جاسکتا ہے؟

(۲) کیا کسی بھی دن کروایا جاسکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول؛ کن دنوں میں کروانے کا تھا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: (۱-۲) جی ہاں! قمری مہینے کی ۱۷، ۱۹/ اور ۲۱/ تاریخ میں حجامہ کرانا؛ صحیح حدیث سے ثابت ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تاریخوں میں حجامہ کرانے کو پسند فرماتے تھے، بہ ضرورت کسی بھی تاریخ میں حجامے کا عمل کرایا جاسکتا ہے؛ لیکن مذکورہ تاریخوں میں افضل ہے۔

البتہ بعض مرسل روایتوں میں یہ آیا ہے کہ اگر کسی نے بدھ یا سنیچر کے دن حجامہ کرایا، اور پھر اُس کو سفید داغ کا مرض ہوگیا، تو وہ خود کو ملامت کرے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ اور سنیچر کو حجامہ نہ کرانا بہتر ہے۔

و عن ابن عبَّاس – رضي اللّٰه عنهُما – أنّ النَّبي – صلّى اللّٰه عليه وسلّم– كان يستحبُّ الحِجامة لسبع عشرة، وتسع عشرة وإحدى وعشرين. رواه في شرح السُّنة.

و عن أبي هُريرة – رضي اللّٰه عنه– عن رسول اللّٰه – صلّى اللّٰه عليه وسلّم – قال: ”من احتجم لسبع عشرة وتسع عشرة وإحدى وعشرين كان شفاءً له من كلِّ داءٍ“ رواه أبُو داود.

و عن الزُّهري مُرسلاً، عن النَّبي – صلّى اللّٰه عليه وسلّم –: من احتجم يوم الأربعاء، أو يوم السَّبت فأصَابه وضحٌ فلا يلُومنَّ إلا نفسَه، رواه أحمد، و أبُو داود، وقال: وقد أسند ولا يصحّ. (مشكاة شريف: ص: ۳۸۹، كتاب الطب والرقى) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۶/ شعبان/ ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۰۵۸/م، ۹۷۷/م، ۱۴۳۸ھ)

پوسٹ مارٹم کروانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوجائے، اور تمام عزیز واقرباء؛ میت کا پوسٹ مارٹم کرانا چاہتے ہوں، تو پوسٹ مارٹم کرانا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: **حامداً ومصلّیا ومسلّما**: مسلمان میت کی نعش کا احترام؛ مثل زندہ کے احترام کے؛ بل کہ بعض صورتوں میں زیادہ لازم ہے، میت کے جسم کو چیرنا، پھاڑنا اُس کے احترام کے منافی ہے؛ اس لیے شدید مجبوری کے بغیر پوسٹ مارٹم کی اجازت نہیں ہے۔

قال تعالیٰ: ﴿وَلَقَد كَرَّمنَا بَنِي آدَمَ. الآية﴾ وقال عليه السَّلام: كسرُ عظم الميِّت ككسرِه حيًّا. فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱/۱۱ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۷ر ل، ۳۷ر ل، ۱۴۳۸ھ)

اسقاطِ حمل کب جائز ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل میں:

گائنیک ڈاکٹرس (ماہرِ امراضِ نسواں) جو اسقاط (abortion) کرتے ہیں، وہ کتنا جائز ہے؟ کس اعتبار سے اسقاط (abortion) جائز ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حمل پر چار مہینے گذرنے سے پہلے پہلے؛ بعض مجبوریوں کی صورت میں اسقاطِ حمل کی شرعاً گنجایش ہے؛ لہٰذا اگر کوئی خاتون آئے، اور وہ اسقاطِ حمل کے لیے کہے، تو اگر اُس کے حمل پر چار مہینے سے زیادہ نہیں گذرے، تو ڈاکٹر کے لیے اسقاط کی گنجایش ہے؛ بہ شرطے کہ ڈاکٹر کی نظر میں بھی اُس کا اسقاط ناگزیر ہو، اس سے زیادہ مدت والے حمل کا اسقاط جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۷/۲۸ھ، چہارشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸ر تتمہ ر س، ۹۲۷ر س، ۱۴۳۸ھ)

ڈاکٹر کے مشورے سے حاملہ کا الٹراساؤنڈ کرایا جاسکتا ہے؟

سوال: کیا ڈاکٹر کے کہنے پر حاملہ عورت کا بروقت الٹراساؤنڈ کرنا درست ہے؟ بہ راہِ کرم جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر حمل کی کیفیت وحالت کو سمجھنے اور علاج کی ضرورت کے لیے الٹراساؤنڈ ناگزیر ہو، تو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق؛ عورت کا الٹراساؤنڈ کرایا جاسکتا ہے، اور کوشش کی جائے کہ یہ کام لیڈیز ڈاکٹر کے ذریعے انجام پائے، اگر یہ ممکن نہ ہو، تو بہ درجۂ مجبوری؛ مرد ڈاکٹر سے کرانے کی گنجایش ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۳؍شوال ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۲۱۴؍م، ۱۲۳۸؍م، ۱۴۳۸ھ)

الٹراساؤنڈ اور ولادت کے وقت پردے کا حکم

سوال: میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عورت کے لیے پردہ فرض ہے، اور ہم پردہ کرواتے بھی ہیں؛ مگر جب وہ حمل سے ہوتی ہے، تو کبھی الٹراساونڈ مرد کرتے ہیں، اور ولادت کے وقت بھی مرد آجاتے ہیں، تو اس میں شریعت کیا کہتی ہے؟ پیسوں کی وجہ سے ہمیں سرکاری ہاسپٹل میں علاج کرانا پڑتا ہے، برائے کرم راہ نمائی کریں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: جی ہاں! پردہ عورت کے لیے فرض ہے، یعنی: اس کے جسم کے کسی حصّے پر کسی اجنبی مرد کی نگاہ نہ پڑے، بعض اہم ضرورت کے مواقع مستثنیٰ ہیں، بہ قدرِ ضرورت نگاہ ڈالنے کی گنجایش ہے، الٹراساؤنڈ کے لیے کوشش کی جائے کہ لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے یہ کام ہو، عموماً بڑے شہروں میں ایسی لیڈی ڈاکٹر پائی جاتی ہیں، کوشش کے باوجود؛ اگر لیڈی ڈاکٹر سے کرانا ممکن نہ ہو، تو مجبوری ہے، پھر مسلمان دین دار ڈاکٹر سے کرائے؛ تاکہ وہ بہ قدرِ ضرورت حصّے

سے ہی کپڑا ہٹائے، ولادت کے سلسلے میں کوشش اسی بات کی ہونی چاہیے؛ بل کہ پہلے سے فکر کی جائے، اور معلومات حاصل کی جائے؛ تاکہ کسی خاتون کے ذریعے ڈیلیوری ہو سکے، خواہ قدیم طرز پر خاتون گھر پر آجائے (لیکن شہروں میں یہ طریقہ تقریباً مفقود ہے) یا جدید طرز پر ہسپتال میں لیڈی ڈاکٹر کے ذریعے، اس سلسلے میں ڈاکٹروں کی طرف سے غلط راہ نمائیاں بھی کی جاتی ہیں، اُسے بھی سمجھنا چاہیے، اور پہلے سے معلوم کرلیا جائے کہ ڈیلیوری صرف خاتون ڈاکٹر ہی کرائے گی؛ مرد تو نہیں آئیں گے؟ ان احتیاطی امور کا لحاظ کرنا، اور اس کے مطابق جگہ کا انتخاب کرنا آدمی کی خود اپنی ذمے داری ہے، سرکاری ہسپتال میں بھی لیڈی ڈاکٹر ہوتی ہے، آپ اُن سے رابطہ کریں، اپنی احتیاط کا اظہار کر دیں، نیز پرائیویٹ جگہیں بھی بعض ایسی ہوتی ہیں، جہاں کم خرچ میں کام چل جاتا ہے، بہ ہرحال! اپنی حد تک؛ یعنی: موجودہ ماحول سے نظر بلند کر کے کوشش کی جائے، اللہ تعالیٰ راستہ پیدا کریں گے، مجبوری پیش آجائے، تو دوسری بات ہے۔

ومُداواتُها ينظر الطَّبيبُ إلى موضع مرضِها بقَدر الضَّرُورة؛ إذ الضَّرورات تتقدَّر بقدرها، وكذا نظرُ قابلةٍ وختَّان، وينبغي أن يعلم امرأة تداويها؛ لأنّ نظر الجنسِ إلى الجنسِ أخفُّ. (الدر المختار، كتاب الحظر والإباحة: ۵۳۲/۹-۵۳۳، ط: زكريا، ديوبند) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۷/۲۱ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۵۴۵/د، ۴۷۷/د، ۱۴۳۸ھ)

میڈی کلیم پالیسی (mediclaim policy) لینے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسائلِ ذیل میں:

(۱) میڈی کلیم لے سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) پیشنٹ؛ میڈی کلیم کے پیسے دے، تو کیا علاج کر سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰه التوفيق والعصمة: **(۱)** صرف اس قدر رقم لینے کی گنجایش ہے، جتنی پالیسی ہولڈر نے جمع کی ہے، مابقیہ واجب التصدق ہے۔

(۲) کرا سکتے ہیں؛ گنجایش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

غیر سند یافتہ ڈاکٹر کا پیشنٹ دیکھنا اور ڈاکٹر کا اپنی جگہ کسی کمپاؤنڈر کو چھوڑ کر جانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسائلِ ذیل میں:

(۱) بغیر ڈگری کے میڈیکل پریکٹس کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے؟ بہت سی بار پیشنٹ؛ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے؛ لیکن ڈاکٹر بغیر ڈگری کے ہوتے ہیں، اور پیشنٹ کو اس کے بارے میں نہیں کہا جاتا، شریعت کے اعتبار سے یہ ایک دھوکا ہوگا یا نہیں؟

(۲) ڈاکٹر کے باہر جانے پر (چاہے دنیوی کام ہو، یا دینی کام ہو) اپنی جگہ کیسے ڈاکٹر کو تبدیل کرنا چاہیے؟ کیا کمپاؤنڈر سے کام چل سکتا ہے؟ اس وقت پیشنٹ کو تبدیل کیے ہوئے ڈاکٹر کے بارے میں پوری معلومات دینا ضروری ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: **(۱)** اگر کوئی شخص باضابطہ سند یافتہ ڈاکٹر تو نہیں ہے؛ البتہ اُسے میڈیکل سائنس سے متعلق معلومات ہے، نیز کسی ماہرِ فن اور تجربے کار ڈاکٹر کے پاس رہ کر مریض دیکھنے اور دوائیں تجویز کرنے کی عملی تربیت بھی حاصل کی ہے، تو اُس کے لیے اپنی معلومات اور تجربے کی حد تک پریکٹس کرنے کی فی نفسہ گنجایش ہے؛ لیکن احتیاط بہتر ہے؛ کیوں کہ قانون کی زد میں آنے کا خطرہ ہے، نیز اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے آپ کو سند یافتہ ڈاکٹر باور کرائے۔

(۲) اگر کمپاؤنڈر فنی معلومات اور تجربہ رکھتا ہے، تو ڈاکٹر اُسے بھی اپنی جگہ رکھ کر جا سکتا ہے؛ لیکن کمپاؤنڈر کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنی تشخیص وتجویز کو ڈاکٹر کی طرف منسوب کرے، اور نہ ڈاکٹر

کے لیے یہ جائز ہے کہ کمپاؤنڈر کو ایسی ہدایت دے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

جس چیز کی ڈگری نہ ہو اس کی پریکٹس کرنا اور دوائی لکھنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل میں:

ڈاکٹر الگ الگ ڈگری والے ہوتے ہیں، جیسے کہ آیورویدک، ہومیو پیتھک، ایلو پیتھک، کیا ڈاکٹر کو جس میں ڈگری ملی ہو، اُس کے علاوہ کی پریکٹس کرنا جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: اصل ہے فنی معلومات اور تجربہ؛ نیز مریض کا ضرر سے بچنا، اگر کسی ڈاکٹر کو اپنی پیتھی کے علاوہ دوسری پیتھی کے بارے میں بھی معلومات اور تجربہ ہو، اور اُس کے حوالے سے یہ خطرہ نہ ہو کہ اُس کی دوا اور تشخیص سے مریض کو فائدے کے بجائے نقصان لاحق ہو، تو اُس کے لیے دوسری پیتھی کے مطابق بھی علاج کرنے کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر ایسا کرنا ملکی قانون کے خلاف ہو، تو احتیاط کرنا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

جس چیز میں مہارت اور تجربہ نہ ہو ڈاکٹر کا اس میں کام کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلۂ ذیل میں:

ڈاکٹر کی اسپیشلٹی (مہارت) کے علاوہ کام کرنا؛ جیسے: کہ ڈاکٹر کا فارمیسی (دوائی کی دکان) کا اسٹور ہونا، یا لیبارٹری یا سونوگرافی یا ایکسرے کی سہولیات کا ہونا؟ ان سہولیات کے غلط استعمال ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: اگر ان چیزوں کے بارے میں معلومات اور تجربہ نہیں ہے، تو ان غیر متعلق کاموں میں لگنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ ایسی صورت میں مریض کو ضرر پہنچے گا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س،۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

ڈاکٹر دوا دیتے وقت یا بوتل وغیرہ چڑھاتے وقت کس بات کا مکلّف ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسائل ذیل میں:

(۱) کتنے ڈاکٹر اپنے پاس سے مریض کو دوا دیتے ہیں، جس کی کوالیٹی بازار میں سے ملنے والی دوا سے کم درجے کی ہوتی ہے، ڈاکٹر کو؛ اپنی پریکٹس صحیح کرنے کے لیے اپنے پاس سے جو دوائی دے رہے ہیں، اُس کی کوالیٹی کے بارے میں کیا خیال رکھنا چاہیے؟

(۲) کتنے ڈاکٹر پیشنٹ (مریض) کو بلاضرورت بوتل، انجکشن دے دیتے ہیں، حالاں کہ پیشنٹ صرف دوائی لینے سے ٹھیک ہو جاتا ہے، تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: **(۱)** ڈاکٹر کو چاہیے کہ مریض کو ایسی دوائیں دے، جن سے جلد از جلد مریض کے شفایاب ہونے کی امید ہو، اور اُس کا سائڈ ایفکٹ (ضمنی اثر) نہ ہو، یا کم از کم ہو، نیز دوائیں دینے میں مریض کی مالی حالت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ **(۲)** ڈاکٹر کے لیے ایسا کرنا قطعاً جائز نہیں ہے، یہ مریض کے ساتھ دھوکا دہی اور خیانت ہے، جس کا ناجائز اور گناہ ہونا قرآن وحدیث میں مصرح ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س،۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

بلاضرورت مریض کو ایڈمٹ کرنا یا نچلے درجے کے بجائے اوپری وارڈ میں داخل کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں:
پیشنٹ کو ضرورت کے بغیر داخل کرنا کیسا رہے گا؟ اور اگر داخل کرنا ہے، تو ایک درجے کے علاوہ دوسرے درجے میں داخل کرنا کیسا رہے گا؟ جیسا کہ جنرل وارڈ کی جگہ آئی سی یو (ICU) میں داخل کرنا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: پیشنٹ کو بغیر ضرورت ایڈمٹ کرنا، یا نچلا درجہ کافی ہونے کے باوجود مریض کی طرف سے مطالبے کے بغیر اوپر کے درجے میں داخل کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، یہ بھی دھوکا اور خیانت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ
الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ
(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲/۷/س، ۱۴۳۸ھ)

فیس دینے کے بعد مریض نہ آئے تو پیسے لوٹانے اور کنسلٹنگ (مشورہ) فیس کا اعلان لگانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسائلِ ذیل میں:
(۱) ڈپازٹ؛ آپریشن سے پہلے لیتے ہیں، اگر پیشنٹ نہ آئے، تو کیا واپس کرنی پڑے گی؟
(۲) کنسلٹنگ فیس (consulting fees) کا بورڈ؛ باہر ویٹنگ روم میں لگانا ضروری ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: (۱) جی ہاں! واپس کرنی پڑے گی۔

(۲) شہرت کی وجہ سے اگر لوگوں کو واقعی فیس کے بارے میں معلوم ہے، تو ضروری نہیں؛ ورنہ لگا دینا چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

مریض کے بچے ہوئے انجکشن وغیرہ کو ہسپتال والوں کا بلا اجازت استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل میں:

آپریشن کے وقت یا ہسپتال میں پیشنٹ کے پاس جو دوائی، انجکشن، سولوشن (solution) منگواتے ہیں، وہ پورے استعمال نہیں ہوتے، وہ دوسرے پیشنٹ میں پہلے پیشنٹ کی اجازت کے بغیر استعمال ہوتے ہیں، یا پھر ہسپتال میں رکھ لیتے ہیں، تو یہ کیسا ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: ان دواؤں اور سولوشن کے مالک مریض ہیں؛ اگر مریض نے اپنے پیسے سے خرید کر ڈاکٹر کو دیا ہو؛ لہٰذا ایسی صورت میں اُن کی طرف سے اجازت یا اُنھیں اُن چیزوں کا معاوضہ ادا کیے بغیر؛ دوسرے مریضوں کے لیے اُن کا استعمال کرنا، یا ہسپتال میں رکھ لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲۷/س، ۱۴۳۸ھ)

فیزیشن سیمپل کی دوائی مریض کو فروخت کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل میں:

فیزیشن سیمپل (physician sample) کی دوائی پیشنٹ کو دینے پر کیا پیسے لے سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: جی ہاں! لے سکتے ہیں؛ کیوں کہ یہ دوائیں ڈاکٹر کو تملیکاً دی جاتی ہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی

نوٹ: البتہ مریض کو بتا دے، یا کسی طرح اس کے علم میں لا کر سیمپل کی دوا دے۔ محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۹۲/س، ۱۴۳۸ھ)

میڈیکل کمپنی کی طرف سے ملنے والے گفٹ اور اسپونسر شپ و دیگر منافع کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسائلِ ذیل میں:

(۱) میڈیکل کمپنی سے گفٹ لینا کیسا ہے؟

(۲) میڈیکل کمپنی کانفرنس کے لیے ڈاکٹر کو اسپونسر شپ کرتی ہے (اس میں ہوٹل میں رہنا، کھانا، کانفرنس کے لیے آنا جانا شامل ہے) کس اعتبار سے اس کا لینا جائز ہے؟

(۳) کئی میڈیکل کمپنیاں ڈاکٹر کو اپنے منافع میں سے کچھ حصہ دیتی ہیں، کیا اس طرح کا حصہ لینا جائز ہے؟ اس میں ضروری نہیں کہ ڈاکٹر صرف اُسی کمپنی کی دوائی لکھے؛ بل کہ جو دوائی لکھے (اُس کمپنی کی) اُس میں سے منافع دیتے ہیں۔

(۴) دوائی کی دکان والے؛ ڈاکٹر کو اپنے منافع میں سے کچھ حصہ دیتے ہیں، اُس کا لینا کیسا ہے؟

(۵) بہت سی جگہ دیکھا گیا ہے کہ دوا کی دکان والے؛ ڈاکٹر کو ہاسپٹل بنا دیتے ہیں، یا پھر اُس ہاسپٹل کا خرچ دیتے ہیں، اس بارے میں کیا رائے ہوگی؟

(۶) کٹ پریکٹس (cut practice) یہ اس کو کہتے ہیں کہ اگر کوئی ڈاکٹر کسی اسپیشلسٹ (ماہر) کے پاس بھیجے، یا کوئی ڈاکٹر کسی جانچ کے لیے لیبارٹری، ریڈیولوجسٹ کے پاس بھیجے، تو بھیجنے والے ڈاکٹر کو کچھ حصہ؛ اسپیشلسٹ ڈاکٹر یا لیبارٹری یا ریڈیولوجسٹ دیتے ہیں، اس طرح کا لینا جائز ہوگا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: (۱-۵) ڈاکٹر؛ مریض سے فیس لے کر مرض کی تشخیص کرتا ہے، اور اُس کے لیے دوائیں لکھتا ہے، نیز اُس کا فرض ہے کہ وہ مریض کی حالت کے پیشِ نظر مریض کے لیے ایسی دوا لکھے، جو اُس کے مناسبِ حال ہو، الغرض ڈاکٹر کی طرف سے جو کچھ محنت ہوتی ہے، وہ مریض کے حق میں ہے، اور فیس لینے کی بنا پر یہ ڈاکٹر کا فرض ہے، دوا ساز کمپنی یا میڈیکل اسٹور کے لیے ڈاکٹر کی طرف سے کوئی قابلِ ذکر محنت نہیں پائی گئی، جس پر ڈاکٹر کو معاوضہ لینا جائز ہو؛ اس لیے ڈاکٹر کے لیے دوا ساز کمپنی یا میڈیکل اسٹور کی طرف سے قولی یا عملی معاہدے کے تحت کوئی گفٹ لینا، خواہ سامان کی شکل میں ہو، یا کانفرنسوں میں اسپانسر شپ کی شکل میں ہو، یا نفع کے کچھ پرسنٹ کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں ہو؛ شرعاً جائز نہیں ہے، مزید اگر ڈاکٹر اس طرح کے گفٹ کے لالچ میں غیر ضروری یا غیر معیاری دوائیں لکھے، تب تو یہ خیانت ہونے کی وجہ سے اور بھی برا ہے۔

(٦) اس کا حکم بھی شروع میں ذکر کردہ پانچ سوالات کے جوابات کی طرح ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ، چہار شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۲۹۸/تتمہ/س، ۷۹۲/س، ۱۴۳۸ھ)

کیا مریض کو نقصان پہنچنے کی وجہ سے ڈاکٹر ضامن ہوگا؟ نیز عورتوں کا؛ مرد ڈاکٹروں سے علاج کروانا کیسا ہے؟

سوال: محترم مفتی صاحب! میں پیشے سے ڈاکٹر ہوں، مجھے برائے مہربانی نیچے لکھے ہوئے مسائل میں فتویٰ دے کر ممنون فرمائیں:

(۱) ایلوپیتھی طریقۂ علاج میں کسی بھی دوائی کے ری ایکشن آنے کی وجہ سے مریض کو نقصان پہنچ سکتا ہے، یا مریض کی جان بھی جاسکتی ہے، ایسی صورت میں کیا ڈاکٹر گناہ گار ہوگا، جب کہ دوائی بیماری کے علاج کے لیے دی گئی تھی۔

(۲) اسی طرح آپریشن کرنے کے درمیان یا بعد میں؛ جب کہ مریض کی اصل بیماری یا خراب عضو کو نکال دیا گیا ہو؛ مگر آپریشن کی وجہ سے دوسری تکلیف شروع ہوئی، یا مریض کی جان نکل گئی، تو کیا ڈاکٹر گناہ گار ہوگا؟

(۳) مرد ڈاکٹروں کے ذریعے سے خواتین مریضوں کے بدن کے سبھی حصوں کو؛ جس میں شرم گاہ بھی داخل ہے؛ کھول کر اور ہاتھ لگا کر چیک اپ کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں کیا فتویٰ ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱،۲)** اگر ڈاکٹر کے اندر اہلیت ہو، اور اس نے مریض کی خیر خواہی اور علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کی ہو، مذکورہ دوائی یا آپریشن کو مریض کے لیے مفید سمجھا ہو؛ نہ کہ محض پیسہ کمانے کے لیے، نیز آپریشن کی صورت میں مریض یا اُس کے اولیاء سے اجازت لی ہو، تو پھر مریض کی جان تلف ہونے یا مریض کو نقصان پہنچنے سے؛ ڈاکٹر ضامن و گناہ گار نہیں ہوگا۔

قال عليه السَّلام: من تطبَّب ولم يُعلم منه قبل ذلك طِبٌّ فهُو ضامنٌ.

(سنن أبي داؤد: ٢/ ٦٣٠)

وأمَّا الطَّبيبُ وما أشبهه إذا أخطأ في فعله إن لم يكن من أهل المَعرفة فعليه الضَّربُ والسِّجنُ والدِّيةُ. (بداية المجتهد: ٤/ ١٨، ط: دار الحديث، قاهرة)

وكَذا الخِتانُ وقلعُ الضّرس والطّب فلا ضمان؛ إلَّا بالتَّفريط. (الشرح الصغير: ٤/ ٤٧، ط: دار المعارف)

طبيبٌ حاذقٌ أعطى الصَّنعة حقّها ولم تجن يده فتولَّد من فعله المأذُون فيه من جهة الشَّارع ومن جهة من يطبه تلف العُضو أو النَّفس أو ذهاب صفةٍ فهذا لا ضمان عليه بالاتِّفاق. (زاد المعاد: ٤/ ١٢٨، فصل: أقسام الأطباء من جهة إتلاف الأعضاء، ط: الرسالة)

(۳) خاتون مریضہ کو خاتون ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے؛ لیکن اگر خاتون ڈاکٹر موجود نہ ہو، یا موجود ہو؛ مگر مریضہ کو لاحق ہونے والے مرض کا علاج نہیں کرسکتی، جب کہ علاج کے بغیر جان چلی جانے یا شدید ضرر لاحق ہونے کا قوی اندیشہ ہو، تو مرد ڈاکٹر کے پاس جائے، مرد ڈاکٹر کے لیے مریضہ کے بدن کا اتنا حصہ دیکھنا اور چھونا جائز ہے، جتنے سے ضرورت پوری ہو جائے، ضرورت سے زائد حصوں کو

دیکھنا یا ہاتھ لگانا ناجائز وحرام ہے، اور اگر مرض عورت کی شرم گاہ سے متعلق ہے، تو دور ونزدیک کی خاتون ڈاکٹرنی سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں، اور اگر رابطہ نہ ہوسکے، جب کہ علاج کرنا ناگزیر ہے، تو مریضہ کے جسم کے تمام حصّے کو پردے میں رکھا جائے، صرف بیماری کی جگہ کا علاج کرے، اور ڈاکٹر اپنی نظر جہاں تک ہوسکے نیچی رکھنے کی کوشش کرے۔

قال في الجَوهرة: إذا كان المَرضُ في سائر بدَنها غير الفرج يجُوز النَّظرُ إليه عند الدَّواء؛ لأنَّه موضِعُ الضَّرُورة، وإن كان في موضِع الفَرج فينبغي أن يعلّم امرأة تداويها، فإن لم تُوجد وخافُوا عليها أن تهلك أو يُصيبها وجعٌ لا تحتمله يستُروا منها كلّ شيءٍ؛ إلّا موضع العِلّة، ثُمَّ يُداويها الرَّجُل ويغُضُّ بصرَه ما استطاع؛ إلّا عن موضع الفرج.

(رد المحتار: ۵۳۳/۹، ط: مكتبة زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۱/۱۷ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۸/تتمہ/د، ۸۱/د، ۱۴۳۸ھ)

انجکشن سے پہلے لگائی جانے والی اسپرٹ پاک ہے یا ناپاک؟

سوال: (۱) انجکشن دینے سے پہلے اسپرٹ (spirit) سے جسم کا حصہ صاف کیا جاتا ہے، تو کیا یہ پاک ہے یا ناپاک؟

(۲) اور اگر یہ ہمارے کپڑے کو لگ جائے، تو کیا اس سے کپڑا ناپاک ہوجائے گا؟

(۳) اس کپڑے کو پہن کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۳) انجکشن سے پہلے؛ انجکشن لگنے کی جگہ صاف کرنے کے لیے جو اسپرٹ استعمال کیا جاتا ہے، تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اُس میں کھجور یا انگور سے تیار شدہ الکحل نہیں ہوتا؛ اس میں شامل کیا جانے والا الکحل؛ گنے کا رس، مختلف دانوں، سبزیات اور کوئلے وغیرہ سے تیار شدہ ہوتا ہے، اور اس طرح کا الکحل حضراتِ شیخین: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے مسلک کے مطابق حرام وناپاک نہیں، **كذا في عامّة كتب الفقه والفتاوى.**

اور دورِ حاضر میں علاج ومعالجے کی ضرورت اور عموم بلوی کی وجہ سے محققین علمائے کرام نے اس مسئلے میں اصل اصول کے مطابق شیخینؒ کے قول کو راجح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ جس علت کی بنا پر ماضی میں علمائے کرام نے امام محمدؒ کے قول کو راجح قرار دیا تھا، وہ دورِ حاضر میں کھجور اور انگور کے علاوہ دیگر چیزوں سے تیار شدہ الکحل میں نہیں پائی جاتی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: تکملۃ فتح الملہم: ۵۰۶/۱-۵۰۷، ۵۱۵-۵۱۶، مطبوعہ: دار احیاء التراث العربی، بیروت، احسن الفتاوی: ۹۵/۲، مطبوعہ: ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، اختری بہشتی زیور مدلل: ۱۰۲/۹، مطبوعہ: کتب خانہ اختری، متصل مظاہر علوم، سہارن پور اور فتاوی نظامیہ: ۴۳۸/۱ وغیرہ)؛ اس لیے انجکشن کے موقع پر جو اسپرٹ استعمال کیا جاتا ہے، وہ ناپاک نہیں ہے، وہ اگر کپڑے میں لگ جائے، یا جسم کے جس حصّے میں لگے گا، وہ ناپاک نہ ہوگا، اس کپڑے کو پہن کر، اور جسم کے اس حصّے کو دھوئے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں، نماز ہوجائے گی، اور اگر کوئی شخص دھولے تو اچھی بات ہے، لازم وضروری نہیں ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۹/۶/۱۴۳۸ھ = ۱۹/۳/۲۰۱۷ء، یک شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۶۰۲/ن، ۶۲۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

نشہ کرنے والی دوائی بیچنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام درج ذیل مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے یہاں بعض دوا ایسی ملتی ہیں، جن کے ذریعے لوگ نشہ کرتے ہیں، اور یہ دوا نشہ کرنے کے لیے ہی استعمال ہوتی ہے، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح کی دوا بیچنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اس سے حاصل شدہ رقم کا شرعاً کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر بیچنے والے کو یقین سے معلوم ہو کہ فلاں دوا نشے کے لیے ہی استعمال ہوتی ہے، اور لوگ اسی مقصد کے لیے خریدتے ہیں، تو ایسی دوا کا بیچنا؛ کراہت سے خالی نہیں، اور اس سے حاصل شدہ رقم پاکیزہ نہیں۔

وجَاز بیعُ عصیر عنب ممَّن یُعلم أنَّه یتَّخذُہ خمراً ؛ لأن المَعصیة لاتکونُ بعینه؛

بل بعد تغيُّره، وقيل: يُكره؛ لإعانته على المَعصية، و نقَل المُصنِّفُ عن السِّراج والمُشكِلات أنّ قوله: ممَّن أي من كافرٍ، أمَّا بيعُه من المُسلم فيُكره و مثلُه في الجَوهرة والباقاني وغيرهما، زاد القُهستاني معزيّاً للخانية أنَّه يُكره بالاتِّفاق. (الدر المختار مع الشامي، ۹/ ۴۷۷، ط: أشرفي، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　　۱۱/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۸۹/م، ۲۳۲/م، ۱۴۳۸ھ)

حمل ساقط کرنے والی دوائی بیچنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام حسب ذیل مسئلے کے متعلق:

سائل کا میڈیکل اسٹور؛ دوا کی دکان ہے، سائل کے پاس بہت سے مریض آتے ہیں، سائل یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ حمل گرانے والی، حمل کو ختم کرنے والی دوائیاں بیچنا جائز ہے، یا ناجائز ہے؟

حمل گرانے والی دوائیاں اور بہت سی بیماریوں میں ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں، یہ دوائیاں ''ہارمون'' (harmon) ہوتی ہیں، جو عورتوں کے ''ہارمون'' سے متعلق کام کرتی ہیں، سب سے زیادہ استعمال؛ حمل گرانے میں ہوتا ہے، کن کن صورتوں میں یہ دوا بیچنا جائز اور حلال ہے؟ اور کن صورتوں میں ناجائز؟

بہت سی مریضہ کو ڈاکٹر کی طرف سے یہ ہدایت ہوتی ہے کہ تم اور بچہ پیدا نہیں کرسکتیں، تمھاری جان کو خطرہ ہے، بہت سے مریض سائل کو بتاتے ہیں کہ ہم اور بچہ نہیں چاہتے، یا ہمارا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے، مجبوری ہے یا بیماری، ہماری بیوی کا ابھی ایک سال پہلے بڑا آپریشن ہوا ہے؛ اس لیے ہمیں ڈر ہے کہ پھر دوبارہ کوئی پریشانی نہ ہوجائے، ایسی صورتوں میں اس دوا کا بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

اگر کوئی آدمی خالی دوا کا پیکٹ؛ پتّا لایا ہے، اور ہم نے دے دیا، پتا نہیں کہ وہ کیسے اور کس بیماری میں استعمال کرے گا، یہ تو وہی جانتا ہے، ہم دے سکتے ہیں یا نہیں؟ بہت سے مریض دوا کا پرچہ لکھا ہوا لاتے ہیں، اُنھیں دوا دینا جائز ہے یا نہیں؟ مذکورہ دوا کے متعلق تفصیلی جواب (کن کن صورتوں میں بیچنا جائز ہے، اور کن صورتوں میں ناجائز؟) دے کر ممنون ومشکور ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملہم الصواب: حمل ساقط کرانا عام حالات میں ناجائز ہے، اور بعض ناگزیر صورتِ حال میں گنجایش ہے، ناجائز صورت یہ ہے کہ اگر حمل میں جان پڑ جائے؛ یعنی: حمل پر چار ماہ کی مدت گذر جائے، تو اب اُسے گرانا کسی حال میں جائز نہیں، اور چار ماہ سے پہلے شرعی عذر کے بغیر گرانا بھی درست نہیں، ہاں اگر شرعی عذر ہو، مثلاً: عورت کی صحت نہایت کمزور ہو، اور بچہ پیدا ہونے کی صورت میں عورت یا بچّے کی جان کی ہلاکت کا خطرہ ہو، تو ایسی مجبوری میں چار ماہ سے پہلے اسقاط کی گنجایش ہے، اگر یقین سے معلوم ہو کہ حمل روکنے اور گرانے والی دوائیوں کا اکثر استعمال ناجائز طور پر ہوتا ہے، یا حرام کاری کو فروغ دینے کے مقصد سے وہ دوائیاں تیار کی گئی ہیں، یا اُن دوائیوں کی اکثر خریدار؛ بدکار، زناکار عورتیں ہوتی ہیں، تو ایسی صورتوں میں اُن دواؤں کا بیچنا گناہ اور ناجائز ہوگا، اسی طرح اگر کسی گاہک اور خریدار کے متعلق؛ قرائن وشواہد کے ذریعے پتا چل جائے کہ یہ ناجائز طریقے پر استعمال کرے گا، تو اس کے ہاتھ فروخت کرنا تعاون علی الاثم کی بنا پر مکروہ ہوگا، اگر خریدار ایسا ہو جس پر اطمینان ویقین ہو کہ ناجائز استعمال نہیں کرے گا، تو اُس کے ہاتھ فروخت کرنے میں مضائقہ نہیں، اُس کو پرچی دیکھ کر دوا دی جاسکتی ہے، اس کے باوجود اگر وہ غلط استعمال کرتا ہے، تو اُس کا گناہ استعمال کرنے والے کو ہوگا، اور جہاں خریدار کے بارے میں ناجائز استعمال کا شبہ ہو، وہاں بیچنے سے احتیاط کی جائے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۶؍ جمادی الاولیٰ؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۶۵۱؍م، ۶۸۰؍م، ۱۴۳۸ھ)

حیض روکنے کے لیے دوا کا استعمال کیسا ہے؟

سوال: میرا نام مہوش فاطمہ ہے، کراچی سے تعلق رکھتی ہوں، میرے حیض کے ایام؛ اس رمضان کے ۲۵؍ روزے سے شروع ہوں گے، جس کی وجہ سے آخری عشرے کی طاق راتوں کو عبادت کا اہتمام نہیں کرسکوں گی، کیا آخری عشرے کے روزے اور عبادات کو پورا کرنے کے لیے ٹیبلیٹ اور دوا سے حیض کی وقتی روک جائز ہے؟ بہ راہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: حیض؛ خواتین کے لیے قدرت کے مقرر کردہ نظام کا حصہ ہے، اور فطری چیز ہے، ہر تندرست عورت کو آنا چاہیے، دواؤں کے ذریعے اس کی روک تھام طبی اعتبار سے نقصان دہ ہے؛ اس لیے روزہ، نماز اور دیگر عبادات کے جذبے میں اس قدرتی نظام سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ہی دواؤں کے ذریعے اس کی روک تھام کی کوشش کرنی چاہیے؛ لہٰذا ماہِ رمضان کے اخیر عشرے میں جب تک آپ کو حیض نہ آئے؛ آپ نماز، روزہ وغیرہ کریں، اور جب حیض آجائے، تو آپ اپنی خواہش کے برعکس؛ خدائی فیصلے پر راضی رہیں، اور دن اور رات میں حسبِ ہمت وتوفیق؛ نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن پاک کے علاوہ دیگر ذکر واذکار: تسبیحات، استغفار، درود شریف اور دعاؤں کا خوب اہتمام کریں، ان شاء اللہ اس صورت میں بھی آپ کو اخیر عشرے کی برکات وفضیلت حاصل ہو جائے گی۔

و في حديث عائشَة رضي اللّٰه عنها عند البُخاري: فلمَّا كُنَّا بسرف حضتُ، فدَخَل عليَّ رسُولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم وأنا أبكِي، فقَال: أ نفستِ؟ قُلتُ: نعم، قال: إنّ هذا أمرٌ كَتبَه اللّٰهُ على بَناتِ آدم، فاقضِي ما يقضِي الحاجُّ غيرَ أن لا تطُوفي بالبيت. الحديث. (الجامع الصحيح للإمام البخاري، كتاب الحيض، باب كيف كان بدء الحيض: ۱/ ۴۳، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۹/۱۷ھ = ۲۰۱۷/۶/۱۳ء، سہ شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – وقار علی غفرلہٗ

(۹۹۶/ن، ۱۰۷۲/ن، ۱۴۳۸ھ)

کتوں کو مارنے کے لیے زہریلی دوا کا استعمال کیسا ہے؟

سوال: کتوں کو مارنے کے لیے زہریلی دوا کا استعمال کرنا کیسا ہے؟ جب کہ ان کتوں کے علاوہ؛ دوسرے کتوں کے اس دوا کے کھانے کا احتمال ہے۔ بینوا توجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر کتوں سے نقصان پہنچنے کا

اندیشہ ہو، تو زہریلی دوا کے ذریعے مارنے کی گنجائش ہے، خواہ دوسرے کتے کے بھی دوا کھانے کا احتمال ہو۔

قريةٌ فيها كلابٌ كثيرةٌ، ولأهل القَرية منها ضررٌ يُؤمرُ أربابُ الكِلاب بأن يقتُلوا كِلابهُم؛ لأنّ دفع الضَّرر واجبٌ، وإن أبوا ألزمَهُم القَاضي. (تكملة البحر الرائق: ٨/ ٢٠٤)

و جَاز قتلُ ما يضرُّ منها ككلبٍ عقُورٍ وهِرَّةٍ تضرُّ، و يذبحها: أي الهرة ذبحًا، ولا يضر بُها؛ لأنَّه لا يُفِيدُ، و لا يحرقُها (الدر المختار) **و قال الشَّامي تحت قوله: (وهرَّة تضرُّ) كما إذا كانت تأكُل الحمام والدَّجاج.** (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الخنثىٰ، مسائل شتى: ٦/ ٧٥٢)

وقال الحصكفي رحمه اللّٰه تعالى: لا يحلُّ قتلُ ما لا يُؤذي، ولذا قالُوا: لم يحلَّ قتلُ الكَلب الأهلي إذا لم يُؤذ، والأمرُ بقتل الكِلاب منسُوخٌ، كما في الفتح: أي إذ لم تضر (الدر المختار) **وقال العلَّامة الشَّامي رحمه اللّٰه تعالىٰ: قولُه: (أي إذا لم تضر) تقييدٌ للنَّسخ، ذكره في النَّهر أخذًا ممَّا في المُلتقط: إذا كثُرت الكِلابُ في قريةٍ وأضرَّت بأهلها، أمر أربابُها بقتلها، فإن أبوا رُفِع الأمرُ إلى القَاضي حتّى يأمُر بذلك.** (الدر المختار مع الشامي، كتاب الحج، باب الجنايات: ٣/ ٦٠٨، ط: دار الكتب العلمية، بيروت، الفتاوىٰ الهندية، الباب الحادي والعشرون فيما يسع من جراحات بني آدم: ٥/ ٣٦٠، ط: زكريا، الفتاوىٰ البزازية على هامش الهندية، كتاب الكراهية، الثامن في القتل: ٦/ ٣٧٠، ط: زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱۱/۲۱ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۱۲۰۴/تتمہ/ص، ۱۲۷۸/ص، ۱۴۳۸ھ)
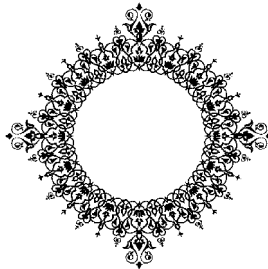
لباس، زیب وزینت اور فیشن سے متعلق مسائل

کالے کپڑے پہننے کا شرعی حکم

سوال: کیا اسلام میں مرد یا عورت کے لیے کالے کپڑے پہننا؛ جائز ہے یا نہیں؟ صرف شرٹ (کرتا) یا پینٹ (پاجاما) دونوں میں سے کوئی ایک کالا پہن سکتے ہیں یا نہیں؟ یا دونوں ہی کالے کپڑے نہیں پہننا؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلام میں مرد اور عورت دونوں کے لیے کالے کپڑے پہننا جائز ہے، چاہے دونوں کپڑے کالے ہوں یا ایک، مثلاً: قمیص شلوار یا کرتا پاجاما؛ البتہ محرم کے مہینے میں یا جہاں شیعہ بہ طور اظہار غم کے پہنتے ہیں، وہاں نہ پہننا بہتر ہے۔

عن عائشة رضي اللّٰه عنها قالت: صبغتُ للنَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم بُردةً سَوداء فلبِسها. (سنن أبي داؤد: ۲/ ۵۶۳)

ويُستحبُّ الأبيضُ والأسودُ؛لأنَّه شِعَارُ بني العبَّاس، ودخَل رسُولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلَّم مكة وعلى رأسِه عمامةٌ سوداءُ. (رد المحتار: ۹/ ۵۰۵، ط: مكتبة زكريا)

وقَال في الشَّامي أيضاً: وندُب لُبسُ السَّوادِ؛لأنّ مُحمَّدًا ذَكرَ في السِّيَر الكَبير في باب الغَنائم حديثاً يدُلُّ على أنّ لُبسَ السَّوادِ مُستحبٌّ. (رد المحتار: ۱۰/ ۴۸۶، ط: مكتبة زكريا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۱۴ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۲۳۹/د، ۲۹۸/د، ۱۴۳۸ھ)

عورتوں کے لیے بیلٹ والی شلوار پہننے کا حکم

سوال: عورتیں اپنی شلوار؛ پینٹ کے مشابہ سلواتی ہیں، ہوتی تو یہ شلوار ہی ہے؛ مگر نیفے کے پاس ایسا رومال لگاتی ہیں، جس سے وہ شلوار کچھ حد تک پینٹ کے مشابہ ہوجاتی ہے، کیا اس طرح کی شلوار زیب تن کرنا درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اس طرح کی شلوار؛ عرف میں بیلٹ والی شلوار کہلاتی ہے، اور نیچے سے وہ مکمل طور پر عام شلوار ہی کی طرح ہوتی ہے، اور بیلٹ دار شلوار؛ پہننے میں آرام دہ ہوتی ہے، اور کمر کے پاس زیادہ مقدار میں کپڑا جمع نہیں ہوتا، اور یہ مردوں کی پینٹ کی طرح بالکل نہیں ہوتی؛ اس لیے آرام وسہولت کے لیے اس طرح کی شلوار سلوانا اور پہننا جائز ہے، شرعاً اس میں کچھ حرج نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۲/۶/۱۴۳۸ھ = ۲/۳/۲۰۱۷ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

عورت کا گھر میں جوان بیٹے کے سامنے بے پردہ لباس یا پینٹ شرٹ پہننا کیسا ہے؟

سوال: (۱) کیا عورت کو گھر میں اپنے جوان بیٹے کے سامنے؛ پردہ بازو اور ٹانگوں کا کرنا چاہیے؟ (۲) عورت کا گھر میں اپنے جوان بیٹے کے سامنے پینٹ شرٹ پہننا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: (۱) جوان بیٹے کے سامنے اگر بازو کھل جائے، تو گنجایش ہے؛ لیکن ٹانگوں (گھٹنوں سے اوپر رانوں) کا پردہ؛ جوان بیٹے سے بھی واجب ہے۔

(۲) پینٹ شرٹ بہ ذاتِ خود بھی مکروہ لباس ہے، مسلمان عورت کو اس کا پہننا جائز نہیں، اور عامۃً یہ لباس اتنا چست اور ٹائٹ ہوتا ہے کہ جس میں بدن کی ساخت وضخامت صاف ظاہر ہوتی ہے، نیز ویسے بھی یہ لباس فساق فجار عورتوں کا لباس ہے، نیک متقی مسلمان بہن بیٹیاں اس لباس کو نہیں پہنتیں؛ اس لیے جوان بیٹے اور دیگر محارم کے گھر میں موجود رہتے ہوئے بھی اس کا پہننا جائز نہیں، دین دار شریف گھرانوں میں آج بھی اس جیسے لباس کا مستورات کو پہننا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۱۳ھ الموافق: ۲۰۱۷/۵/۱۰ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۰۷/ھ، ۱۰۰۰/ھ، ۱۴۳۸ھ)

کانوں میں بالی، ہاتھوں میں کالا دھاگا، گلے میں نرسنگھا اور بالوں میں ربڑ وغیرہ پہننے، نیز ہاتھوں کو گدوانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین حسبِ ذیل مسئلے کے بارے میں:

(۱) ایک شخص کانوں میں بالی پہنتا ہے۔ **(۲)** ہاتھوں میں کالا دھاگا، جیسا کہ اہل ہنود باندھتے ہیں۔ **(۳)** گلے میں نرسنگھا کی مالا، جو اہل ہنود کی مخصوص مالا ہوتی ہے؛ پہنتا ہے۔ **(۴)** ہاتھوں میں لکھوا بھی رکھا ہے، جیسا کہ اہل ہنود نام وغیرہ لکھوا لیتے ہیں، نیز یہ بھی کہتا ہے کہ کون سی حدیث میں ان چیزوں کا پہننا ناجائز ہے؟ اور اس بات کا بھی معترف ہے کہ میرا دل سیاہ ہو گیا۔ **(۵)** بالوں میں ربڑ بھی ڈالتا ہے، جیسا کہ عورتیں چوٹی میں ربڑ ڈالتی ہیں، ایسے شخص کا ایمان ونکاح باقی رہا یا نہیں؟ اور اس کو یہ کہنا کہ ہندو بنا پھرتا ہے، یا ہندو ہو گیا ہے کہنا جائز ہے یا نہیں؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: (۱،۴،۵) کانوں میں بالی پہننا، یا بالوں میں ربڑ ڈالنا؛ عورتوں سے مشابہت کی وجہ سے ناجائز ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مردوں پر لعنت فرمائی ہے، جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔

وعنه قال النبيُّ صلّى الله عليه وسلّم: لعَن الله المُتشبّهين من الرِّجال بالنِّساءِ والمُتشبِّهات من النِّساءِ بالرِّجال. (مشكاة، ص: ۳۸۰)

اسی طرح ہاتھوں میں گوندنا، گندوانا بھی ناجائز ہے، اور موجبِ لعنت ہے۔

(۳،۲) ہاتھوں میں اہل ہنود کی طرح کالا دھاگا باندھنا، یا گلے میں نرسنگھا کی مالا ڈالنا، جو اہلِ ہنود کی مخصوص مالا ہوتی ہے؛ سخت حرام ہے؛ بل کہ حسبِ تشریحِ فقہاء؛ ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، اُس شخص کو چاہیے کہ صدق دل سے توبہ واستغفار کرے، اور تجدید ایمان کرے، اور اگر شادی شدہ ہو، تو تجدید نکاح بھی کرے۔

قال في الهندية: يُكفَّر بوضع قلنسُوةِ المجُوس على رأسِه على الصَّحيح؛ إلا لدَفع ضرُورةِ الحرِّ والبَردِ وشدِّ الزنار في وسطِه؛ إلا إذا فعَل ذلك خديعةً في الحرب وطليعةً للمُسلِمين. (الهندية: ۲/۲۷٦)

لوگوں کو چاہیے کہ ایسے شخص کو سمجھا بجھا کر دوبارہ راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۴/۲۴ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۳۷/ل، ۱۷۵/ل، ۱۴۳۸ھ)

عورت کس کس طرح کے زیورات پہن سکتی ہے؟

سوال: عورت بناؤ سنگار کے لیے کن زیوروں کا استعمال کرسکتی ہے؟ جیسے کہ پیر کی انگلیوں میں جو چھلیاں پہنتی ہے اور گلے میں ہار، ماتھے پر ٹیکا سونے کا یا چاندی کا یا کسی اور دھات کا پہن سکتی ہے یا نہیں؟ اور چوڑی پہننا کیا ضروری ہے؟ نہ پہنے تو گناہ تو نہیں ہے؟ اور پیروں میں پازیب پہننا کیسا ہے؟ مدلل اور مفصل جواب عنایت فرمائیں، نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰه التوفيق: عورت کے لیے فی نفسہ ہرطرح کے زیورات؛ اعضائے زینت میں پہننا جائز ہے؛ البتہ گھنگرو والا زیور پہننا درست نہیں ہے،

اور جو زیور کسی غیر قوم کا شعار ہو، اُس سے بھی بچنا چاہیے، جیسے: بعض علاقوں میں پاؤں کی انگلیوں میں چھلے پہننا؛ غیر مسلم عورتوں کی خاص علامت سمجھا جاتا ہے، ایسے علاقوں کی مسلمان عورتوں کو اُن کی مشابہت سے بچنا چاہیے، اسی طرح انگوٹھی یا تو صرف سونے چاندی کی ہونی چاہیے، یا ایسی دھات کی ہونی چاہیے، جس پر سونے چاندی کا پانی چڑھا ہوا ہو، اس کے علاوہ کی انگوٹھی پہننا مکروہ ہے۔

یجُوزُ للنِّساءِ لُبس أنواع الحُلي کلِّها. (إعلاء السنن: ۲۹۳/۱۷) **عن عليّ بن سهل بن الزُّبیر أخبره أنّ مولاةً لهُم ذهبت بابنةِ الزُّبیر إلی عُمَر بن الخَطّاب رضي اللّٰه عنه، وفي رِجلِها أجراسٌ، فقَطعَها عُمر، ثُمَّ قال: سمعتُ رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه و سلَّم یقُول: مع کل جرسٍ شیطاناً.** (سنن أبي داؤد، باب ماجاء في الجلاجل: ۵۸۱/۲) **عن ابن عُمر رضي اللّٰه عنهُما قال: قَال رسُولُ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: من تشبَّه بقومٍ فهُو منهُم .**

(سنن أبي داؤد، کتاب اللباس، باب في لبس الشهرة: ۵۵۹/۲، رقم: ۴۰۳۱، دارالفکر، بیروت، مشکاة المفاتیح، کتاب اللباس، الفصل الثاني: ۳۷۵/۲) **وفي المُغني لابن قُدامة: یُباحُ للنِّساءِ من حُليّ الذَّهبِ والفِضَّةِ والجَواهِر کلّ ماجَرَت عادتُهنَّ یلبسه، کالسّوار والخلخال والقرط والخاتم، ومایلبسه علی وجُوههنَّ، وفي أعناقهنَّ وأیدیهنَّ وأرجُلِهنَّ وأذانهنَّ وغیره.** (إعلاء السنن: ۲۹۴/۱۷) **والتَّختُّم بالحَدیدِ والصّفر والنُّحاس والرَّصاص مکرُوهٌ للرِّجال والنِّساءِ جمِیعاً، و لابَأس بأن یتخذ خاتم حَدید قدلوي علیه فِضَّةٌ أو ألبس بفضَّةٍ حتّی لایری.**

(الفتاوی الهندیة، کتاب الکراهیة، الباب العاشر في استعمال الذهب والفضة: ۳۳۵/۵، شامي، کتاب الحظر والإباحة، فصل في اللبس: ۵۱۸/۹، زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۲۵ھ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی

(۳۰/تتمہ/ص، ۶۳/ص، ۱۴۳۸ھ)

کیا بال کٹوانا یا آئی برو بنوانا اور میک اپ کرنا لڑکیوں کے لیے جائز ہے؟

سوال: لڑکی کا اپنے بالوں کو ہلکا سا کٹوانا، یا آئی برو (پلکیں) بنوانا، یا میک اَپ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: بالوں کی جڑیں کٹوانا؛ تاکہ بالوں کی رکی ہوئی بڑھوتری شروع ہوجائے؛ جائز ہے، اور فیشن کے طور پر بال کٹوانا یا آئی برو بنوانا درست نہیں؛ البتہ غیر محرم مردوں سے مکمل پردہ کرنے کی شرط کے ساتھ؛ بہ قدرِ ضرورت زینت کے لیے میک اپ کرنے کی اجازت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہار شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۵/تتمہ/ن، ۴۰۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

جسم کے اضافی بالوں کو ختم کرانے کے لیے ویکس کرانا کیسا ہے؟

سوال: کیا ہمیں جسم کے مختلف حصوں سے اضافی بالوں کو ختم کرنے کے لیے ویکس (موم) کا استعمال کرنا جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق: **حامداً ومصلیاً ومسلماً**: اضافی بالوں کو ختم کرنے کی شرعاً اجازت ہے، اُن کو ویکس (موم) کے ذریعے بھی زائل کر لینے کی گنجایش ہے؛ بہ شرطے کہ ویکس میں کسی ناپاک چیز کی آمیزش نہ ہو۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۶ھ الموافق: ۲۰۱۷/۱۱/۷ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: محمد اسد اللہ غفرلہٗ

نوٹ: داڑھی کے علاوہ جسم کے مختلف حصوں سے اضافی بالوں کو ختم کرنے کی گنجایش ہے۔ فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۴۰/ھ، ۱۷۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

لپ اسٹک لگانے کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا عورت لپ اسٹک ہونٹوں پر لگا سکتی ہے؟ مشہور یہ ہے کہ عورت لپ اسٹک بالکل نہیں لگا سکتی ہے، نہ تقریب میں، نہ عید میں، نہ مرد؛ یعنی: شوہر کے لیے، کیا درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کا ہونٹوں پر سرخی؛ یعنی: لپ اسٹک لگانا جائز اور درست ہے (بہ شرطے کہ کوئی نجس چیز اس میں شامل نہ ہو۔ زین الاسلام) البتہ اگر لپ اسٹک تہ دار ہے، اور ہونٹوں تک پانی پہنچنے سے مانع ہے، تو اس کو صاف کیے بغیر وضو اور غسل درست نہیں۔

ولایمنعُ الطَّهارة ونيمٌ، وحناءٌ، ودرنٌ، ووسخٌ، وتُرابٌ في ظفر مُطلقاً، ولايمنع ما على ظفر صباغ، وقيل: إن صلبا منع، وهو الأصحُّ. (الدر المختار مع الشامي: ۲۸۸/۱، زکریا)

يُستحبُّ لكُلٍّ من الزَّوجين أن يتزيَّن للآخَر. وقال ابنُ عبَّاسٍ رضي اللّٰه عنهُما: إنِّي لأحبُّ أن أتزيَّن للمَرأةِ كمَا أحبُّ أن تتزيَّن لي. فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱/۲۵ھ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی

(۳۰ رتتمہ رص، ۶۳ رص، ۱۴۳۸ھ)

عورتوں کا پیروں میں مہندی لگانا اور ناخن پالش کرنا کیسا ہے؟

سوال: عورتوں کے لیے پیروں میں مہندی لگانا بلا کراہت جائز ہے؟ کوئی عورت پھول بھی بناتی ہے، کوئی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی داڑھی مبارک میں مہندی لگائی تھی؛ اس لیے پیروں میں لگانا گناہ ہے، اس کا کیا جواب ہے؟

نیز التا (ناخن پالش) لگاسکتی ہے کہ نہیں، جو ہندو عورتیں پیروں میں لگاتی ہیں؟ بینوا توجروا فقط والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورتوں کے لیے پیروں میں مہندی لگانا بلاکراہت جائز ہے، اور پھول پتی بنانے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس سے مقصود؛ زینت ہے، اور عورت پردے میں رہتے ہوئے جائز حد تک زینت اختیار کرسکتی ہے، اور یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی داڑھی میں مہندی لگائی تھی؛ اس لیے پیروں پر لگانا گناہ ہے؛ درست نہیں ہے۔

نیز التا (یعنی: ناخن پالش) اگر تہ دار ہے، جو کہ پانی کے؛ ناخنوں تک پہنچنے سے مانع ہے، تو اُس کا لگانا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے لگے رہنے کی حالت میں وضو اور غسل درست نہ ہوگا، جس سے نماز بھی صحیح نہ ہوگی، اور اگر تہ دار نہیں ہے، تب بھی غیر مسلم عورتوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

ولا ينبَغي أن يخضب يدي الصَّبي الذّكر ورجلَه؛ إلا ساعةَ الحاجة، ويجُوز ذلك للنِّساءِ. (هندية: ٥/٤١٥)

قال في الدُّر: يُستحبُّ للرَّجُل خِضابُ شعره ولِحيته، و في الشَّامي: لا يدَيه ورِجليه؛ فإنَّه مكرُوهٌ؛ للتَّشبُّه بالنِّساءِ. (الدر مع رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء: ٩/٦٠٤، ط: زكريا، ديوبند)

وإن ممضُوغاً مضغاً متأكّداً بحيثُ تداخلَت أجزاءُه وصار لُزوجةً وعلاكةً كالعَجين؛ لامتناع نفُوذِ المَاءِ مع عدم الضَّرُورةِ والحَرج. (رد المحتار، كتاب الطهارة: ١/٢٨٩) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵/۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۲۰۴/د، ۲۴۶/د، ۱۴۳۸ھ)

عورت کس کس عضو پر مہندی لگا سکتی ہے اور کیا مخصوص ایام میں مہندی لگانا ممنوع ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسائلِ ذیل کے بارے میں:

عورت مہندی کس کس اعضاء پر لگا سکتی ہے؟ کیا کلائیوں پر کہنیوں تک، یا اور اوپر تک لگا سکتی ہے، اور پیروں پر پنڈلیوں تک، یا اور اوپر تک لگا سکتی ہے؟ مہندی لگانے کی کوئی حد ہے، یا کوئی وقت ہے؟ جیسے کہ ناپاکی کی حالت میں؛ یعنی: حیض ونفاس میں نہ لگائے، اس کا پورا خلاصۂ جواب مرحمت فرمائیں، مشہور یہ ہے کہ ناپاکی کی حالت میں مہندی نہ لگائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لیے ہاتھ اور پیروں میں مہندی لگانا پسندیدہ ہے، باقی آج کل پیٹ، پیٹھ اور دیگر اعضائے مستورہ پر پھول بوٹے والی مہندی محض دکھاوے کے لیے لگائی جاتی ہے، اگر دکھاوا مقصود نہ ہو، تو ان جگہوں پر مہندی لگانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں؛ کیوں کہ باحیا عورتیں ان اعضاء کو ہمیشہ کپڑوں میں چھپا کر رکھتی ہیں؛ لہٰذا دکھاوے کے لیے ان اعضائے مستورہ پر مہندی لگانا ممنوع ہے، ہاں شوہر کے لیے لگانے میں مضائقہ نہیں، اور حیض ونفاس کی حالت میں مہندی لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

أَمَّا خضبُ اليدَين والرِّجلين فيُستحبُّ في حقِّ النِّساءِ. (مرقاة المفاتيح: ۳۰٤/۸، تحت رقم: ٤٤٥٢) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۲۵ھ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی

(۳۰/تتمہ/ص، ۶۳/ص، ۱۴۳۸ھ)

بالوں میں خضاب لگانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

آج کل جیسا فیشن کا دور ہے، کچھ لوگ بالوں کو کالا رکھنے کے لیے مہندی یا کسی اور چیز کا استعمال کرتے ہیں، وہ ناجائز ہے، یا مکروہ ہے؟ یا اُس سے کیا خرابی ہے؟ دوسرے کچھ لوگ کالی مہندی کی جگہ لال رنگ والی استعمال کرتے ہیں، جس سے بال لال نظر آتے ہیں، اور اس کے اندر چائے کی پتی پکا کر یا کتّھا پکا کر استعمال کرتے ہیں، جس سے بال بہ مائلِ سیاہ نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ بازار میں بکنے والی مہندی جو سرخ ہوتی ہے، بالآخر کس طرح کی مہندی کے استعمال کی اجازت ہے؟ جس سے وضو، غسل، نماز کے اندر کسی قسم کی کراہت نہ آئے۔ تفصیل سے آگاہ فرمائیں، کرم ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: بالوں میں سیاہ خضاب لگانے پر احادیث میں سخت وعید آئی ہے:

عـن ابـن عبَّاس قَال: قَال رسُول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم: یکونُ قومٌ یخضِبُون في آخر الزَّمان بالسَّوادِ کحَواصِل الحمام لا یریحُون رائحةَ الجنَّة. (أبو داؤد، باب ما جاء في خضاب السّواد: ۵۷۸/۲، ط: اتحاد، دیوبند)

اسی لیے کالا خضاب لگانا، خواہ سیاہ مہندی کا ہو، یا اور کوئی کیمیکل ملا کر کے اُسے کالا بنایا گیا ہے، اُس کا لگانا جائز نہیں، صرف مہندی کا وہ خضاب جس سے بال سرخ اور لال نظر آئیں؛ اُس کے لگانے کی اجازت ہے، اگر اُس مہندی میں بالوں کو کالا بنانے کی کوئی چیز ڈالی گئی ہو، تو اس مہندی کا خضاب بھی لگانا جائز نہیں ہے، یہ مکروہِ تحریمی ہے، اس سے نماز بھی مکروہ ہوتی ہے۔

(و یُکرهُ بالسَّوادِ) أي: لغیر الحرب، قال في الذَّخیرة: أمَّا الخضابُ بالسَّواد للغَزوِ؛ لیکون أهیب في عین العدُوِّ فهو محمُودٌ بالاتِّفاق، وإن لیُزیِّن نفسَه للنِّساء فمکرُوهٌ، وعلیه عامَّةُ المَشایخ. (الدر مع الرد: ۶۰۵/۹، ط: زکریا، دیوبند)

و من فعَل ذلك لیُزیِّن نفسَه للنِّساءِ ولیحبِّب نفسَه إلیهنَّ فذلك مکرُوهٌ، وعلیه عامَّةُ المَشایخ. (هندیة، الباب العشرون، کتاب الکراهیة: ۴۱۴/۵، ط: اتحاد، دیوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۹۶/ب، ۱۴۸/ب، ۱۴۳۸ھ)

داڑھی اور اس کی مقدار کا شرعی حکم

سوال: مفتی صاحب! میرا آپ سے ایک سوال تھا:

(۱) کیا ایک مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا ضروری ہے؟ اسلام کے مطابق داڑھی کتنی ہونی چاہیے؟

(۲) کیا چھوٹی داڑھی رکھنے سے سنت پوری ہو جائے گی؟

(۳) کیا داڑھی نہ رکھنے کا کوئی گناہ ہے؟ اگر داڑھی والے آدمی سے گناہ ہو جائے، تو کیا بغیر داڑھی والے سے زیادہ گناہ ہوگا؟ مفتی صاحب قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری اصلاح کیجیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: **(۱)** داڑھی رکھنا واجب ہے، اس کی کم سے کم

مقدار؛ ایک مشت ہے، یعنی: ایک مشت ہونے سے پہلے کاٹنا گناہِ کبیرہ ہے، ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ حکم متفق علیہ ہے، بے شمار احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا قومی شعار ہے، تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پابندی کے ساتھ داڑھی رکھی، پورے ذخیرۂ احادیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی صحابی نے داڑھی کاٹی ہو۔

(۲) داڑھی کا ایک مشت ہونا بھی ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ مسئلہ ہے؛ البتہ جب ایک مشت سے زائد ہوجائے، تو مشت سے زائد بالوں کو کٹوا دینا جائز؛ بل کہ افضل ہے، اور ایک مشت سے پہلے داڑھی کٹوانا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں، علامہ ابن الہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

ویحرُم علی الرَّجُل قطعُ لحیته، وأمَّا الأخذُ منها ما دُون القبضَة کما یفعلُه بعضُ المُغَاربة فلم یُبحهُ أحدٌ. (فتح القدیر: ۳۴۸/۲)

لہٰذا چھوٹی داڑھی رکھنے سے سنت پوری نہیں ہوگی؛ بل کہ داڑھی کاٹنے کا گناہ ہوگا۔

(۳) جی ہاں! داڑھی نہ رکھنا گناہِ کبیرہ ہے، اس سے آدمی فاسق ہوجاتا ہے، گناہ؛ اختیاری چیز ہے، جس کا ارتکاب آدمی اپنے اختیار سے کرتا ہے؛ لہٰذا گناہ جس طرح بغیر داڑھی والا شخص کرتا ہے، اسی طرح داڑھی والا شخص بھی اس کا مرتکب ہوسکتا ہے؛ لیکن ایک نیکی دوسری نیکی پر آمادہ کرتی ہے، اور برائی سے بچانے والی ہوتی ہے، اس اعتبار سے داڑھی والا شخص؛ بے داڑھی والے شخص کے مقابلے میں دوسرے نیک کاموں کی طرف زیادہ راغب، اور برے کاموں سے زیادہ بچنے والا ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ داڑھی کی وجہ سے بہت سے برے کاموں سے بچنے کا داعیہ اُس کے اندر پیدا ہوگا، اور اچھے کاموں کی طرف رغبت اور میلان پیدا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ دین کی صحیح فہم عطا فرماوے؛ تاکہ عظمت اور قدر کے ساتھ تینوں باتوں پر عمل کی توفیق نصیب ہو؛ لہٰذا آپ فہم اور توفیق کی دعا کرتے ہوئے اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیں، جو بات معلوم کرنی ہو، یہاں سوال بھیج کر معلوم کرلیا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۲/۳/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۹۰/د، ۳۳۹/د، ۱۴۳۸ھ)

داڑھی کو خوب صورت کرنے کی خاطر منڈوانا جائز نہیں

سوال: میری داڑھی الحمد للہ شرع کے مطابق قبضہ کے برابر ہے؛ لیکن بے ڈھب سی ہے، کوئی بال کس طرف، کوئی کس طرف ہیں، جن کو دیکھ کے میری طبیعت بے چین سی رہتی ہے، تو کیا داڑھی کو خوب صورت بنانے کی غرض ونیت سے صرف ایک بار اس کو شیو کرسکتا ہوں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللّٰہ التوفیق: ایک مشت سے پہلے داڑھی کو کاٹنا ہرگز جائز نہیں ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں داڑھی کو خوب صورت بنانے کے لیے ایک بار بھی شیو کرانے کی شرعاً گنجایش نہیں ہے، یہ آپ کا اپنا غلط خیال ہے کہ شیو کرانے سے داڑھی خوب صورت بن جائے گی، انسان کے چہرے کی اصل خوب صورتی اور رونق اس کے فطری رہنے میں ہے، اللہ کے حکم کو توڑنے اور گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی وجہ سے چہرے کی فطری رونق ختم ہوجاتی ہے، اور چہرہ مرجھا جاتا ہے۔

عن ابن عُمر رضي اللّٰه عنه عن النَّبي صلّى الله عليه وسلّم قال: احفُوا الشَّوارب واعفُوا اللُّحىٰ. (سنن النسائي، الطهارة، باب إحفاء الشوارب وإعفاء اللحىٰ، رقم: ١٥)

ويحرُم على الرَّجُل قطعُ لحيتِه. (درمختار مع الشامي: ٤٠٧/٦، كراچی) **و أمَّا الآخذُ منها و هي دُون ذلك دُون القبضةِ كما يفعلُه بعضُ المُغاربة ومخنثةُ الرِّجال فلم يُبحه أحدٌ.**

(شامي، الصوم، مطلب في الأخذ من اللحية: ٢١٨/٢، كراچی، شامي: ٣٩٨/٣، زكريا، فتح القدير، الصوم، مايوجب القضاء والكفارة: ٤١٨/٢، دار الفكر، بيروت) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۵/۱۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - زین الاسلام قاسمی

(۴۲۳/ص، ۴۹۹/ص، ۱۴۳۸ھ)

تصویر سازی، ویڈیو گرافی اور پردے سے متعلق مسائل

تصویر کشی کی مختلف صورتوں کا حکم

سوال: احادیثِ مبارکہ میں؛ تصویر کے متعلق سخت وعید آئی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے: **کلُّ مُصوِّرٍ في النَّار**، معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ حدیث میں "مُصوِّر" سے مراد: فوٹو گرافر نہیں؛ بل کہ پینٹر ہے، جو کہ ہاتھ سے ڈیزائن بنائے۔

اور ساتھ میں یہ کہنا کہ اگر تصویر کشی اتنا سخت گناہ ہوتا، تو بڑے بڑے علماء کی تصویریں نہیں ہوتیں، وہ ہم سے زیادہ حدیث کو جانتے ہیں۔

برائے مہربانی تشفی بخش جواب دیجیے کہ آخر تصویر کے متعلق شریعت کیا کہتی ہے؟ اور علمائے کرام کی تصویریں کیوں ہیں؟ حتی کہ بعض علمائے کرام کے بیانات بھی تصویر کے ساتھ ہوتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: جو مٹی، پتھر کی دھات کا مجسمہ بنایا جائے؛ اصل تصویر وہی ہے، اور پینٹ کے ذریعے یا کیمرے کے ذریعے جو تصویر کھینچی جاتی ہے جان دار کی، وہ اسی کے حکم میں ہے، اور سب حرام ہے، اور دونوں طرح کی تصویریں بنانے والے **أشدّ النَّاس عذاباً یوم القِیامة المُصوِّرون** کے مصداق ہوں گے، اگر کوئی فوٹو گرافر، یا میڈیا والے، یا کیمرہ والا کسی عالم کا فوٹو لے لے، جب کہ وہ عالم اُسے ناپسند کرتا ہو، تو جب بھی فوٹو لینے والے گناہ گار ہوں گے، وہ علماء گناہ گار نہ ہوں گے، پاسپورٹ کے لیے، بیرون ملک کا سفر کرنے کے لیے، اور دیگر سرکاری کاموں کے لیے؛ جہاں جہاں

فوٹو دینا ضروری ہے، تو یہ صورتیں اس سے مستثنیٰ ہوں گی۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۷/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۲۰/ب، ۲۵۳/ب، ۱۴۳۸ھ)

واٹس ایپ میں دوسرے کی ڈسپلے پکچر دکھائی دے تو کیا حکم ہے؟

سوال: واٹس ایپ پر ڈسپلے پکچر بند کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؛ لہٰذا چھوٹی سی تصویر ہر نمبر کے ساتھ نظر آتی ہے، جن میں اکثر جان دار کی تصاویر ہوتی ہیں، اور جب واٹس ایپ پر کال آتی ہے، تو پوری اسکرین پر بڑی تصویر نظر آتی ہے، کیا ایسی صورت میں واٹس ایپ کا استعمال جائز ہے؟ جب کہ ہم اس سے دینی کام لیتے ہیں، یعنی: بیانات وغیرہ سننے سنانے کا کام لیتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: بہ وقتِ ضرورت جائز کام کے لیے واٹس ایپ کے استعمال کی گنجایش ہے، اگر واٹس ایپ چلانے والا اپنے واٹس ایپ پر جان دار کی تصویر لگاتا ہے، تو اس کا گناہ اُسی کو ہوگا، دوسرے کے واٹس ایپ پر اگر وہ تصویر آتی ہے، تو وہ گنہ گار نہ ہوگا۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۱/۵/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۵۲۷/ل، ۱۷۷/ل، ۱۴۳۸ھ)

فیس بک پر آئی ڈی بنا کر فوٹو یا تصویری اشتہار پوسٹ کرنا کیسا ہے؟

سوال: موجودہ فیس بک پر آئی ڈی بنا کر فوٹو پوسٹ کرنا (بھیجنا) اور غیر محرم عورتوں کو دوست بنانا؛ کیا یہ اسلامی عمل ہے؟ فیس بک پر آئی ڈی بنانا، اور اس پر اپنا فوٹو پوسٹ کرنا، اور غیر محرم مستورات کو اپنا دوست بنانا، اپنے بزنس کی تشہیر کے لیے اپنا فوٹو لگانا، فیس بک پر ڈالنا؛ کیا اسلام میں جائز ہے، یا یہ اسلامی عمل ہے؟

یہاں ایک بات اور بھی بتانا ضروری ہے کہ جس کو ہم فیس بک پر ایڈ (add) کرلیں گے (یعنی: دوست بنالیں گے)، تو وہ جتنی بار بھی؛ فوٹو یا ویڈیو فیس بک پر پوسٹ (بھیجنا) کریں گے، وہ بھی ہمارے فیس بک آئی ڈی پر دکھائی دے گا، قرآن وحدیث کی روشنی میں شرعی حکم بتلا کر ہماری راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: فیس بک پر آئی ڈی بنا کر اپنا فوٹو پوسٹ کرنا، غیر محرم مستورات کو دوست بنانا، اور بزنس کی تشہیر کے لیے اپنا فوٹو فیس بک پر ڈالنا، یہ ناجائز اور گناہ ہے، حدیث میں ہے: إنّ أشدَّ النَّاس عذاباً عند الله المُصوِّرُون. (البخاري) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۲۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۵۸۴؍م، ۶۱۲؍م، ۱۴۳۸ھ)

ویڈیو کالنگ کے ذریعے فحاشی اور عریانیت کرنا ناجائز ہے

سوال: اگر کوئی شخص ویڈیو کے ذریعے ہونے والی بات چیت میں فحاشی (اپنا جسم دکھانا، اور حرکتیں کرنا) میں ملوث ہو، تو یہ زنا کے کس درجے میں آئے گا؟ شریعت میں اس کے لیے کیا سزا ہے؟ اگر وہ شادی شدہ ہے، تو کیا اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا؟ کیا سزا ہے؟ بہ راہِ کرم توبہ کرنے اور معافی مانگنے کا کوئی بہتر طریقہ بتائیں، نیز نفس کی برائیوں پر کنٹرول پانے کے لیے کوئی عمل بتائیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: ویڈیو کالنگ کرتے ہوئے فحاشی کرنا؛ یعنی: غیر کو اپنے جسم کے مستور حصّے کو دکھانا، ناچنا اور گندی حرکتیں کرنا؛ شرعاً ناجائز وحرام ہیں، اگر یہ بری حرکت شادی شدہ شخص کرتا ہے، تو محض اس کی وجہ سے اس کا نکاح تو نہیں ٹوٹے گا؛ کیوں کہ نکاح؛ طلاق یا خلع، یا شرعی فسخ وتفریق کے ذریعے ٹوٹتا ہے؛ لیکن شادی شدہ کے لیے ایسا کرنا مزید قبیح ہے، شریعت میں اس ناجائز وفحش فعل پر اگرچہ کوئی مخصوص سزا وارد نہیں؛ لیکن یہ کام بہ ہرحال گناہ اور معصیت والا ہے، جس سے احتراز لازم ہے، توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ گناہ پر دل سے ندامت ہو، اور آیندہ اس گناہ کو

نہ کرنے کا عزمِ مصمم ہو، دو رکعت صلاۃ التوبۃ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے، آیندہ ویڈیو کالنگ کرنے سے بچے، تنہائی اور خلوت میں گناہ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے؛ لہٰذا خلوت سے اجتناب کرے، اور جب بھی برائی کا خیال دل میں آئے، تو مضبوطی سے اُسے دبائے، اور اس کے تقاضے پر عمل نہ کرے، کسی شیخ صاحبِ نسبت بزرگ سے اصلاحی تعلق قائم کر کے اُن کی تجویز کردہ ہدایات پر عمل کرے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۹؍محرم؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۸۳؍تتمہ؍م، ۱۱۴؍م، ۱۴۳۸ھ)

کیا بیانات وغیرہ کے ویڈیو بنانا اور تصاویر کھینچنا جائز ہے؟

سوال: (۱) کیا ویڈیو بیانات بنانا اور دیکھنا جائز ہے؟ بہت سارے علماء؛ جیسے: مولانا الیاس گھمن، مفتی عدنان پاکستان اس کی اجازت دیتے ہیں۔

(۲) آج کل موبائل سے اپنے فوٹو لینے کا رواج عام ہو رہا ہے، اس کے بارے میں بھی راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: **حامداً ومصلّیا ومسلّما**: **(۱-۲)** ویڈیو بیانات بنانا ناجائز ہے، یہی حکم موبائل سے اپنے فوٹو لینے کا بھی ہے، اور اس طرح کے ویڈیوز یا فوٹو کا دیکھنا کراہت سے خالی نہیں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۵؍۴؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۷۰؍ل، ۶۶۰؍ل، ۱۴۳۸ھ)

یوٹیوب پر اپلوڈ کرنے کے لیے مسجد میں ویڈیو بنانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں کہ مسجد میں دینی پروگرام کی ویڈیو ریکارڈنگ کر کے یوٹیوب پر ڈالنا؛ شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: ویڈیو ریکارڈنگ میں چوں کہ تصویر کشی ہوتی ہے، اور اُس کا حرام ہونا ظاہر ہے، مسجد میں قباحت مزید ہو جاتی ہے، پھر اُس کو یوٹیوب پر ڈال کر منتقل کرنا بھی گناہ ہے، مسجد کو ان جیسے قبیح امور سے پاک صاف رکھنا واجب ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۰/۲۷ھ الموافق: ۲۰۱۷/۷/۲۲ء، یوم السبت

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۱۲۳/ھ، ۱۲۲۸/ھ، ۱۴۳۸ھ)

کیا چہرہ بھی پردے میں داخل ہے؟

سوال: عورت کے ستر میں چہرہ شامل ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے چہرے کا بھی پردہ ہے، خاص طور پر آج کل جو فتنے کا دور ہے، اس میں چہرے کا چھپانا اور بھی واجب وضروری ہے۔

وفي المُنتقیٰ: تمنعُ الشَّابةُ عن کشف وجهها؛ لئلاَّ یؤدِّي إلی الفتنة، وفي زماننا واجبٌ؛ بل فرضٌ؛ لغلبة الفساد، و عن عائشة رضي اللّٰه عنها: جمیعُ بدن الحُرَّةِ عورةٌ؛ إلاَّ عینیها؛ لاندفاع الضَّرُورة. (مجمع الأنھر: ۱/۱۲۲، ط: فقیه الأمت، دیوبند) **فقط واللہ اعلم**

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۵/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۶۱/ب، ۲۷۵/ب، ۱۴۳۸ھ)

مردے کو قبر میں رکھ کر چہرہ دیکھنے اور اجنبی مرد کا عورت کو اور عورت کا اجنبی مرد کو دیکھنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسئلوں کے بارے میں:

(۱) کیا مردے کو قبر میں رکھنے کے بعد چہرہ کھول کر دکھا سکتے ہیں؟

(۲) کیا غیر محرم عورت؛ غیر محرم مردے کے چہرے کو دیکھ سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح غیر محرم مرد؛ غیر محرم مری ہوئی عورت کے چہرے کو دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: (۱-۳) میت کو قبر میں رکھنے کے بعد چہرے سے کفن ہٹا کر چہرہ دکھانے کی مروجہ رسم ثابت نہیں؛ بل کہ بے اصل و بے بنیاد ہے، نیز کفن کا بند لگا دینے کے بعد چہرہ کھولنا مناسب بھی نہیں؛ کیوں کہ بسا اوقات کفن کا بند لگانے کے بعد ہی آثارِ برزخ شروع ہو جاتے ہیں، اور شریعت میں اُن کا اخفا مقصود و مطلوب ہے۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۳۹۸/۵، جواب سوال: ۳۰۵۰، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم دیوبند، فتاوی محمودیہ: ۷۹/۹-۸۰، جواب سوال: ۴۲۰۶، مطبوعہ: ادارۂ صدیق، ڈابھیل) اور ایک حدیث سے بھی بہ طور اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ کفن کا بند لگا دینے کے بعد میت کا چہرہ نہیں کھولنا چاہیے، اور وہ حدیث یہ ہے:

عن أنس بن مالك رضي اللّٰه عنه قال: قُبِض إبراهيمُ بنُ النَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم، قال لهم النَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم: لاتدرجُوه في أكفانه حتى أنظر إليه، فأتاه فانكب عليه وبكى. (سنن ابن ماجه، أبواب الجنائز، باب ماجاء في النظر إلى الميت إذا أدرج في أكفانه، ص: ۱۰۶، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

البتہ اگر کوئی خاص قریبی عزیز، جیسے: بیٹا یا باپ وغیرہ؛ دفن ہی کے وقت پہنچا، اور میت قبر میں رکھی جا چکی ہے، اور وہ ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے، تو اسے دِکھا سکتے ہیں، گنجایش ہے۔ (باقیات فتاوی رشیدیہ، ص: ۱۹۳-۱۹۴، مطبوعہ: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ، اور کفایت المفتی جدید: ۵۶/۴، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی)

البتہ اجنبی مرد کا عورت کو اور عورت کا اجنبی مرد کو دیکھنا درست نہیں، اس میں لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں؛ لہٰذا خیال رکھا جائے۔ (مستفاد: اصلاح انقلاب امت: ۲۳/۱) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

عورتوں کے لیے باپردہ گاڑی چلانا کیسا ہے؟

سوال: مسئلہ کچھ اس طرح ہے کہ کیا عورت شرعی لباس میں رہ کر گاڑی چلاسکتی ہے؛ دو پہیا یا چار پہیا گاڑی؟ اگر جواب ہاں ہے، تو کس اصل سے متعلق سمجھا جائے گا؟ برائے مہربانی تفصیلی جواب ارسال فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں، کتابت میں خطا ہوئی ہو، تو بندہ معافی کا طلب گار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: عورت یا لڑکی کا دو پہیا یا چار پہیا؛ کوئی گاڑی چلانا مردوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے منع ہے۔ (دینی مسائل اور ان کا حل، ص: ۳۴۳-۳۴۴)؛ کیوں کہ گاڑی چلانا اصل وضع میں مردوں کا کام ہے، عورتوں کا کام نہیں ہے، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (مشکاۃ المصابیح، ص: ۳۸۰، بہ حوالہ: بخاری شریف)

اور اِسکوٹی اگر چہ عورتوں کے لیے بنائی گئی گاڑی ہے؛ لیکن گاڑی چلانا دراصل عورتوں کا کام ہے ہی نہیں، طبرانی کی روایت میں ہے: ایک عورت کمان لٹکائے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب سے گذری، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی لعنت ہو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر، اور عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر۔

شامی (۶۰۶/۹، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند) میں حدیث: **لعَن اللّٰه الفُروج على السُّرج** کی تشریح میں ہے:

لكن نقَل المَدني عن أبي الطَّيب أنَّه لا أصل له. اهـ. يعني: بهذا اللّفظ؛ و إلا فمَعناهُ ثابتٌ، ففي البُخاري وغيره: لعَن رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم المُتشبِّهين من الرِّجال بالنِّساء، والمُتشبِّهات من النِّساء بالرِّجال، وللطّبراني: أنّ امرأةً مرَّت على رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم مُتقلّدةً قوساً، فقال: لعَن اللّٰه المُتشبِّهات من النِّساء بالرِّجال والمُتشبِّهين من الرِّجال بالنِّساء. اهـ.

اور عورتوں یا لڑکیوں کے گاڑی چلانے میں مردوں کی مشابہت کے علاوہ؛ عام طور پر بے پردگی وغیرہ کے جو مفاسد پائے جاتے ہیں، وہ الگ ہیں۔ (جن کی کچھ تفصیل؛ بعض عرب علماء کے فتاوی میں آئی ہے۔ (دیکھیے: فتویٰ ابن بازؒ، اور فتویٰ صالح بن عثیمینؒ در فقہ النوازل للجیزانی: ۳۶۳/۳-۳۶۹)؛ اس لیے

عورتوں یا لڑکیوں کو گاڑی نہیں چلانی چاہیے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۱۸ھ = ۲۰۱۷/۲/۱۶ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۱۳/ن، ۴۲۹/ن، ۱۴۳۸ھ)

عورتوں کا باپردہ باغ یا کھیت پر کام کے لیے جانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ مسئولہ کے بارے میں:

کیا عورتیں حجاب وغیرہ لگا کر کھیت و باغ میں کام کر سکتی ہیں؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کے لیے گھریلو کام بہتر ہے، اُسے باہر نکلنے سے احتیاط کرنا چاہیے، تاہم اگر کسی قسم کے شر اور فتنے کا اندیشہ نہ ہو، تو سخت ضرورت کے موقع پر پردے کے ساتھ محرم کی موجودگی میں باغ یا کھیت میں کام کرنے کی گنجایش ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۱۶/د، ۱۱۳/د، ۱۴۳۸ھ)

جلسہ وغیرہ بہ راہِ راست نشر کرکے عورتوں کو دکھانا کیسا ہے؟

سوال: جلسہ، بیانات وغیرہ بہ راہِ راست نشر کرکے عورتوں کو دکھانا، جب کہ عورتوں کو مردوں سے الگ جگہ میں بٹھایا جائے؛ اس طرح جائز ہے یا ناجائز؟ اس میں اگر علماء کا اختلاف ہو، تو قولِ راجح اور دارالعلوم کا موقف مدلل واضح فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: جو ویڈیو پروگرام بہ راہِ راست نشر ہوتے ہیں، اُن میں بھی کیمرے کے ذریعے تصویرسازی کا عمل پایا جاتا ہے، کیمرہ پہلے تصاویر لیتا ہے، اُس کے بعد وہ تصاویر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ برقی ذرات میں تبدیل ہوکر دوسری طرف ٹرانسفر ہوتی ہیں، اور چوں کہ

یہ عمل نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ہوتا ہے؛ اس لیے یہ بات ممکن ہے کہ عام لوگوں کے حق میں تصویر کا کیمرے میں اتارا جانا محسوس نہ کیا جائے، تفصیل کے لیے دیکھیں حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کی کتاب: (ٹیلی ویژن اسلامی نقطۂ نظر سے، ص: ۵۹-۶۶) پس جب اس میں کیمرے کے ذریعے تصویر کشی وتصویر سازی کا عمل پایا جاتا ہے، اور احادیث میں تصویر کشی اور تصویر سازی پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، دیکھیے: (مشکوۃ شریف، باب التصاویر، ص: ۳۸۵-۳۸۷، مطبوعہ: مکتبہ اشرفیہ، دیوبند) تو بہ راہِ راست نشر ہونے والے ویڈیو پروگرام بھی شرعاً درست نہ ہوں گے، اور عورتوں کو ویڈیو کے ذریعے مردوں کا پروگرام دکھانے میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ عورتیں مردوں کو دیکھیں گی، اور بالقصد وارادہ عورتوں کا مردوں کو دیکھنا منع ہے، حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ نے تانک جھانک کرکے عورتوں کے لیے مردوں کے دیکھنے کو نادرست قرار دیا ہے۔ (بہشتی زیور مکمل مدلل مع عربی حاشیہ: ۶۵/۳، مسئلہ: ۱۵، مطبوعہ: کتب خانہ اختری، متصل مظاہر علوم، سہارن پور، احسن الفتاوی: ۶۱/۸، مطبوعہ: ایچ، ایم سعید، کراچی) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۱/۲/۱۴۳۸ھ = ۱۲/۱۱/۲۰۱۶ء، شنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۶۰/ن، ۱۳۰/ن، ۱۴۳۸ھ)

بھائی بنا کر کسی اجنبی سے لڑکی کا بات کرنا کیسا ہے؟

سوال: حضرت میں نکہت پروین آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ ایک لڑکا عبدالرحمٰن؛ جو میرے بھائی کا دوست ہے، وہ مجھے اپنی بہن سمجھتا ہے، اور ہم اس کو بھائی، ہم دونوں واٹس ایپ پر بات کرتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ آپ قرآن اور حدیث کی روشنی میں مشورہ فرمادیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: صورتِ مسئولہ میں عبدالرحمٰن آپ کے لیے غیر محرم ہیں، بلاضرورتِ شدیدہ بات چیت کرنا جائز نہیں؛ اس لیے آپ کا واٹس ایپ پر عبدالرحمٰن سے بات کرنا اور اُس سے تعلق رکھنا دونوں ناجائز ہیں، ان دونوں کو فوراً ترک کریں۔

ولا يُكلِّمُ الأجنبيَّة ...... ويُكلِّمُها بما ...... يحتاجُ إليه. (الدر المختار مع الرد: ۵۳/۹)

فإذا نُجيزُ الكلام مع النِّساء للأجانب ومُحاورتهنَّ عند الحَاجة إلى ذلك،

ولا نُجِيزُ لهُنَّ رفع أصواتهنَّ ولا تَمطِيطها ولا تَليينَها وتقطِيعها؛ لما في ذلك من استمالَة الرِّجال إليهنَّ وتحريك الشَّهوات منهُم. (شامي، كتاب الصلاة، باب شروط الصلاة: ۲/۷۹، ط: زكريا، ديوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۴/محرم/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۸۰/ب، ۲۶/ب، ۱۴۳۸ھ)

عورت کی آواز میں درس سننے کا حکم

سوال: کیا عورت کی آواز میں درسِ حدیث یا درس قرآن سننا جائز ہے؟ برائے مہربانی مفصل جواب عنایت فرمائیں۔ جزاک اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: عورت کی آواز بھی ستر ہے؛ لہٰذا وہ اگر عورتوں کو درسِ حدیث یا درسِ قرآن دیں، تو پست آواز میں دیں؛ تاکہ مردوں تک آواز نہ پہنچے، اور مردوں کے مجمع کے لیے عورتوں کے درسِ حدیث یا درسِ قرآن دینے کی ضرورت نہیں ہے، اور ٹیپ وغیرہ سے عورت کی آواز میں نعت، تلاوت، درس وغیرہ سننا کراہت سے خالی نہیں ہے، اور اگر استلذاذ ہو، تو احتراز واجب ہے؛ اسی لیے عورتوں کو اذان دینے کی اور زور سے تلبیہ پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

نغمةُ المرأةِ عورةٌ، وتعلُّمها القُرآن من المَرأة أحبُّ، قَال عليه الصَّلاة والسَّلام: التَّسبيحُ للرِّجال والتَّصفيقُ للنِّساء، فلا يحسن أن يسمعها الرَّجُل. و في الكافي: ولا تلبِّي جهراً؛ لأن صوتها عورةٌ. (رد المحتار: ۲/۷۸)

ولا نُجِيزُ لهُنَّ رفع أصواتهنَّ ولا تَمطِيطها ولا تَليينَها وتقطِيعها؛ لما في ذلك من استمالَة الرِّجال إليهنَّ وتحريك الشَّهوة منهُم. (رد المحتار: ۲/۷۹) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴/۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۱۳۸/د، ۲۰۸/د، ۱۴۳۸ھ)

اکل وشرب اور دعوت وضیافت سے متعلق مسائل

کیا کھانے سے پہلے نمک چکھنا سنت ہے؟

سوال: کیا کھانے سے پہلے نمک چکھنا سنت ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق: حامدا ومصلياً ومسلماً: اگرچہ فقہی کتابوں میں نمک سے کھانے کی ابتداء واختتام کو سنت کہا گیا ہے؛ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ کھانے سے پہلے نمک کے سلسلے میں سبھی روایات ساقط الاعتبار ہیں؛ اس لیے اس بارے میں کسی ایک پہلو کو سنت اور دوسرے کو خلافِ سنت کہنا مشکل ہے؛ لہٰذا جب جیسا موقع ہو، نمکین وغیرہ کھالیں، اس بارے میں شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے۔

ومن السُّنَّة البداءةُ بالمِلح والختمُ به. (شامي: ۹/ ۴۹۱، كتاب الحظر والإباحة، ط: زكريا، ديوبند، الفتاوى الهندية: ۵/ ۳۹۱، الباب الحادي عشر في كراهية الأكل، ط: زكريا) **ومن السُّنَّة البداءةُ بالمِلح والختمُ به لكن لم يصحَّ عن النَّبي صلّى اللّٰه عليه وسلّم شيءٌ من هذا؛ بل ذكره ابن الجوزي أنَّه حديثٌ موضُوعٌ.** (الفقه الحنفي في ثوبه الجديد: ۵/ ۳۱۷، ط: دار الايمان، سهارن فور) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۳۰ھ الموافق: ۲۰۱۷/۸/۲۳ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - وقار علی غفرلہٗ

(۱۳۰۸/ھ، ۲۸۲/ھ، ۱۴۳۸ھ)

کیا کھانے کے بعد میٹھا کھانا مسنون ہے؟

سوال: کھانا کھانے کے بعد میٹھا کھانا سنت ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: عوام میں جو مشہور ہے کہ کھانے کے بعد میٹھا کھانا سنت ہے، اس کی کہیں مجھے صراحت نہیں ملی؛ البتہ دورِ نبوی میں آج کل کی طرح فراوانی نہیں تھی، عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا یہی تھا کہ کھجور کھالی، اور پانی پی لیا، گھر میں مہینوں چولھا نہیں جلتا تھا، اگر کبھی گوشت کا نظم ہوگیا، تو چولھا جل گیا؛ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو میٹھا پسند تھا؛ اس لیے ہم لوگ جو دسترخوان پر قسم قسم کے مختلف کھانے کھاتے ہیں، اور کھانے کے بعد میٹھے کی فکر کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں اس طرح کھانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ (فتاوی محمودیہ: ۱۸/۷۴-۷۵، سوال: ۸۶۲۲، مطبوعہ: ادارۂ صدیق، ڈابھیل) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۶/۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

کھانے سے فراغت کے بعد انگلیاں کس طرح چاٹی جائیں؟

سوال: کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کو چاٹنا سنت بتاتے ہیں، بہ راہِ کرم وضاحت کرکے بتائیں کہ پہلے کون سی انگلی چاٹی جائے، اور پھر کون سی؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: کھانا کھانے کے بعد انگلیاں چاٹنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے بیچ والی انگلی چاٹی جائے، اس کے بعد شہادت والی، اور آخر میں انگوٹھا۔

اور اگر کھانے میں پانچوں انگلیاں استعمال ہوئی ہوں، تو انگلیاں چاٹنے میں ترتیب کیا ہوگی؟ اس کی صراحت نہیں ملی؛ البتہ تین کی صورت میں اوپر جو ترتیب ذکر کی گئی ہے، اس کا بہ ظاہر مقتضا یہ ہے کہ سب سے پہلے چھنگلی چاٹی جائے، پھر اُس سے متصل والی انگلی، پھر بیچ والی، پھر شہادت کی انگلی کے بعد آخر میں انگوٹھا چاٹا جائے۔

قولُه: (يلعقُ أصابعه الثَّلاث:) وأخرج الطَّبراني عن كعب بن عُجرة قال: رأيت رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم يأكُل بأصابعه الثَّلاث: بالإبهام والّتي تلِيها والوُسطىٰ،

ثُمَّ رأيتُه يلعقُ أصابعه الثَّلاث قبل أن يمسحَها: الوُسطىٰ ثُمَّ الّتي تلِيها ثُمَّ الإبهام ، ذكره الهيثمي في مجمع الزَّوائد (٣/ ٢٨ [مجمع الزوائد، كتاب الأطعمة، باب لعق الصحفة والأصابع: ٥/ ٢٩، ط: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت١٢ . محمد نعمان]) وقال: وفيه الحُسين بن إبراهيم الأذني ومُحمَّد بن كعب بن عُجرة، و لم أعرفهُما و بقيَّةُ رجاله ثِقاتٌ، و أخرجه أيضاً ابنُ سعد في الطَّبقات (١/ ٣٨١) من طريق مُحمَّد بن مُقاتل، أخبرنا عبدُ الله بن المُبارك قال: قراء ة على ابن جُريج ، قال: أخبرنا هِشامُ بن عُروة أنّ ابن كعب بن عُجرة أخبره عن كعب بن عُجرة، ورجالُه كُلُّهم رجالُ الصَّحيح؛ إلا ابن كعب بن عُجرة. و دلَّ هذا الحديثُ على استحباب الأكل بالأصابع الثَّلاث وتعيينها والتَّرتيب بينها في اللَّعق، قال الحافظ في الفتح: ويُؤخذ من حديث كعب بن مالك أن السُّنَّة الأكلُ بثلاث أصابع وإن كان الأكلُ بأكثر منها جائزاً ...... فإن اضطرَّ إلى ذلك؛ لخِفَّة الطَّعام وعدم تلفيفه بالثَّلاث فيدعمه بالرَّابعة والخامسة، وقد أخرج سعيدُ بن منصُور من مُرسل ابن شهاب: أنّ النَّبي صلّى الله عليه وسلّم كان إذا أكل أكل بخمسٍ، فيجمعُ بينه وبين حديث كعب باختلاف الحال. (تكملة فتح الملهم، كتاب الأطعمة: ٤/ ٢٣، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

ويُمكنُ الجمعُ بينهما باختلاف أنواع الطَّعام، وكان جُلُّ أكله صلّى الله عليه وسلّم التّمرَ ونحو ذلك ممَّا يُمكنُ أكلُه بسهُولةٍ بثلاث أصابع فقط. فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۶/۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

سیپی (گھونگا) کھانا کیسا ہے؟

سوال: سیپیوں (Oysters) کا کھانا حرام ہے یا حلال؟ ائمۂ اربعہ کے نزدیک اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: سیپی (Oyster) جس کو ہندی میں گھونگا کہتے ہیں،

اُس کا کھانا حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے، دیگر ائمہ کا مسلک جاننے کے لیے اُن کے ادارے یا اُن کے علمائے کرام سے رجوع کریں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند　۳/جمادی الثانیہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۵۶۷/م، ۷۸۷/م، ۱۴۳۸ھ)

بام مچھلی کا کیا حکم ہے؟

سوال: میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ایل (بام مچھلی) ہندوستانی مڈایل (indian mudeel) کھانا حرام ہے یا حلال؟ اگر یہ حرام ہے، تو کیوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: بام مچھلی حلال ہے؛ چوں کہ یہ مچھلی ہی ہوتی ہے؛ البتہ سانپ کی شکل پر ہوتی ہے، اور اُس کی پیٹھ پر کانٹے ہوتے ہیں، اس (بام مچھلی) کو انگریزی میں ہندوستانی مڈایل کہتے ہیں، اس کی تحقیق انگریزی لغات سے ہو نہ سکی۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم (ملحوظ رہے کہ بام مچھلی indian mudeel کے نام سے ویکیپیڈیا پر موجود ہے۔ حبان)

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱۲/۱۱ھ الموافق: ۲۰۱۷/۹/۳ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۳۹۵/ھ، ۳۸۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

مرغیوں کی افزائش کے لیے شراب پلانا اور ان کے گوشت کا حکم

سوال: مفتیانِ کرام سے ایک مسئلہ؛ تحقیق طلب ہے، امید ہے کہ مدلل جواب عنایت فرمائیں گے:

سوال یہ ہے کہ مرغیوں کے پولٹری میں مرغیوں کی افزائش کے لیے؛ مرغیوں کو شراب پلائی جاتی ہے، مقدار کیا ہے؟ اس کا علم نہیں ہے؛ مگر شراب پلانے سے مرغی کی افزائش جلدی ہوتی ہے، اگر صرف پانی پلایا جائے، تو تاخیر سے اُس کی افزائش ہوتی ہے، اور یہ سارے پولٹری فارم والے

کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کاروبار کی ترقی کے لیے از روئے شرع؛ ایک مسلم کے لیے ایسا کرنا کیسا ہے؟ ایک صاحب جن کا تعلق میسور سے ہے، وہ اپنا پولٹری فارم شروع کرنا چاہتے ہیں، اور اُن کے سامنے یہ مشکلات ہیں۔

دوسرا مسئلہ ایسی مرغیوں کے گوشت کے حلت وحرمت کا ہے کہ جس کی افزائش شراب پلا پلا کر ہوئی ہے؛ آیا اُس کا کھانا حرام ہے، یا مکروہ یا حلال؟ جب کہ یہ عمل تمام پولٹری فارم والوں کے پاس عام ہے۔ امید ہے مدلل ومفصل جواب عنایت فرمائیں گے۔ شکریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: شراب خریدنا، اور اُسے جلد افزائش کی غرض سے مرغیوں کو پلانا ناجائز وحرام ہے؛ لہٰذا پولٹری فارم والوں کا یہ عمل کرنا جائز نہیں ہے، اور سخت گناہ ہے؛ البتہ اگر مرغی نے شراب پی لی ہے، تو اس کی وجہ سے اُس کا گوشت حرام نہ ہوگا، جب تک کہ اس میں بدبو پیدا نہ ہوجائے، تاہم شراب کی معنوی خرابی اس میں برقرار رہے گی؛ اس لیے جو پولٹری فارم والے شراب پلاتے ہیں، وہاں سے گوشت لینے سے احتیاط کرنا بہتر ہے، اور اگر مرغ کے اندر بدبو پیدا ہوجائے، تو اُس کا کھانا مکروہ ہے، ایسے مرغ کو کچھ دن تک حلال غذا کھلائی جائے، پھر جب گوشت سے بدبو ختم ہوجائے، تب ذبح کرے۔

قال في الدُّر مع الرَّد: و تُحبسُ الجلاَّلةُ حتی یذهب نتنُ لحمِها، وقُدِّرَ بثلاثة أیّامٍ لدجاجةٍ، و لو أکلت النَّجاسة وغیرها بحیث لم ینتن لحمُها حلَّت. (۴۹۱/۹، ط: مکتبة زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۱۶ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۴۶۹/د، ۵۷۵/د، ۱۴۳۸ھ)

حلال جانور کی آنکھ کھانے کا حکم، نیز جانور میں ممنوع اجزاء کیا کیا ہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں:

(۱) ماکول اللحم جانور (خواہ بحری ہوں یا بری) کی آنکھ کے کھانے کے بارے میں، اس کو کھانا کیسا ہے؟ (حرام، جائز، مکروہ) خصوصاً مچھلی کی آنکھ کا کیا حکم ہے؟

(۲) نیز جانوروں کی کن کن چیزوں کو کھانا حرام ہے؟

ان تمام مسائل کے مدلل جوابات دے کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: (۱-۲) جن خشکی یا سمندری جانوروں کا گوشت حلال ہے، اُن کے سات اجزاء کا کھانا ناجائز ہے، باقی اُن کی کھائی جاسکنے والی تمام چیزیں حلال و جائز ہیں، ناجائز سات اجزاء یہ ہیں: خون، عضو تناسل، کپورے، مادہ کی اگلی شرم گاہ، غدود، مثانہ، اور پِتّا؛ پس کسی بھی حلال جانور کی آنکھ کھانے میں کچھ حرج نہیں، خواہ وہ مچھلی ہو، یا بکرا وغیرہ۔

قال في ردّالمحتار: (كتاب الذبائح: ۹/ ۴۵۱، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **ما يحرُم من أجزاءِ الحيوان المأكُول سبعةٌ: الدَّمُ المسفُوح والذَّكرُ والأنثيان والقُبل و الغُدَّةُ و المَثانةُ والمرارةُ. بدائع اهـ. وانظر الدُّر والرَّد** (كتاب الخنثى، مسائل شتى: ۱۰/ ۴۷۷ -۴۷۸) **والفتاوى الهندية** (كتاب الذبائح، الباب الثالث في المتفرقات: ۵/ ۲۹۰، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **والكنز مع التبيين** (كتاب الخنثىٰ، مسائل شتى: ۶/ ۲۲۶، ط: المكتبة الإمدادية، ملتان) **أيضًا.**

نیز **فتاوی رشیدیہ** (ص: ۵۵۲، مطبوعہ: گلستان کتاب گھر، دیوبند) **تذکرۃ الرشید** (۱/ ۲۵۱، مطبوعہ: دارالکتاب، دیوبند) **امداد الفتاوی** (۴/ ۱۱۸، سوال: ۱۰۹، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند) **فتاوی دارالعلوم دیوبند** (۱۵/ ۴۶۶، سوال: ۱۶۷، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم دیوبند) **فتاوی محمودیہ جدید** (۱۷/ ۲۹۸ - ۳۰۱، سوال: ۸۳۷۰-۸۳۷۳، مطبوعہ: ادارۂ صدیق، ڈابھیل، گجرات) **فتاوی رحیمیہ جدید** (۱۰/ ۷۵، ۷۹، ۸۰، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی) **احسن الفتاوی** (۷/ ۴۰۶، مطبوعہ: دارالاشاعت، کراچی) **امداد الاحکام** (۴/ ۳۱۳، مطبوعہ: مکتبہ دارالعلوم، کراچی) **فتاوی حقانیہ** (۱/ ۴۵۳) **آپ کے مسائل اور اُن کا حل جدید، تخریج شدہ** (۵/ ۵۱۰-۵۱۲، مطبوعہ: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند) دیکھیں۔ **فقط واللہ تعالی اعلم**

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۷/ ۱/ ۱۴۳۸ھ = ۱۹/ ۱۰/ ۲۰۱۶ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۰/ ن، ۶۸/ ن، ۱۴۳۸ھ)

حلال گوشت کو رکھنے سے جو خون رِستا ہے اس کا کیا حکم ہے؟

سوال: میں ایک ریسٹورینٹ (ہوٹل) کا نگراں ہوں، مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ رکھے ہوئے گوشت یا قیمے سے جو پتلا خون بہتا ہے، اُسے کھانے میں ملانا کیسا ہے؟ ہمارے یہاں کے اکثر ہوٹلوں میں گوشت کو دھویا نہیں جاتا، جسے دیکھ کر کراہیت آتی ہے؛ لیکن لوگ بحث کرتے ہیں کہ یہ مکروہ نہیں ہے، بہ راہِ کرم راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: ذبح شرعی کے بعد جب دمِ مسفوح نکل گیا، تو گوشت یا قیمے کو پکانے سے پہلے اُسے دھونا ضروری نہیں؛ وہ گوشت پاک ہے؛ پس آپ کے یہاں کے ہوٹلوں میں جو گوشت کو بغیر دھوئے پکانے کا رواج ہے، وہ ناجائز نہیں، ہاں اگر گوشت رکھنے کے بعد اُسے مستقل جداگانہ خون لگ گیا، تو اُسے دھوکر پاک کرنا لازم ہے۔ (محمودیہ: ۴۰/۲۷)

المسفُوحُ ولو على اللَّحم فهو نجسٌ لا الباقي في اللَّحم؛ لأنَّه ليس بمسفُوح ولمشقَّة الاحترازِ عنه. (طحطاوي على مراقي الفلاح) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند　　۲۹/رجب/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۰۴۷/م، ۱۰۰۹/م، ۱۴۳۸ھ)

مونچھ کے بال پانی میں ڈوب جائیں تو پانی کا کیا حکم ہے؟

سوال: اگر مونچھ کے بال اتنے بڑھ جائیں کہ پانی میں ڈوب جائیں، تو کیا پانی حرام ہوجاتا ہے؟ اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ آیا یہ مکروہ ہے، یا حرام؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: اگر مونچھ کے بال اتنے بڑھ جائیں کہ پانی پیتے وقت پانی میں ڈوبنے لگیں، تو پانی حرام نہیں ہوتا؛ البتہ مونچھ کاٹنے میں چالیس دن سے زیادہ تاخیر ناجائز وگناہ ہے۔

قولُه: (وكُره تركُه:) أي: تحريماً؛ لقول المُجتبى: ولا عُذر فيما وراء الأربعين، ويستحقُّ الوعيد. اهـ، وفي أبي السّعود عن شرح المشارق لابن ملك: روى مُسلمٌ عن أنس بن مالك رضي الله عنه: وقّت لنا في تقليم الأظفار وقصِّ الشَّارب ونتفِ الإبطِ أن لا نَترُك أكثر من أربعين ليلة، وهو من المُقدَّرات التي ليس للرَّأي فيها مدخلٌ، فيكُون كالمرفُوع. اهـ. (رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء وغيره، فصل في البيع وغيره: ۵۸۳/۹، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۵/۲۴ھ = ۲۰۱۷/۲/۲۲ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری-محمد مصعب عفی عنہ

(۵۰۵/تتمہ/ن، ۴۰۶/ن، ۱۴۳۸ھ)

پتن جلی کی مصنوعات کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا ہم پتن جلی کی مصنوعات (patanjali products) کا استعمال کر سکتے ہیں، یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: اگر مشاہدے اور یقین کے ساتھ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی مصنوعات میں ناجائز وناپاک چیز ملائی جاتی ہے، تو اس کا استعمال کرنا ہم مسلمانوں کے لیے حرام ہے، اور اگر ہمیں مشاہدے اور پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ اس کی مصنوعات ہر قسم کی حرام اور ناپاک چیزوں سے پاک وصاف ہیں، تو اُنھیں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ اجازت ہے، اور اگر شک ہے، تو اُس سے بچنا بہتر ہے۔

دع ما يُريبُك إلى ما لا يُريبُك. (جامع الترمذي، أبواب صفة القيامة: ۷۸/۲، ط: اتحاد، ديوبند)

قال رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: الحلالُ بيِّنٌ والحَرامُ بيِّنٌ و بينهُما مشتبهاتٌ لا يعلمُها كثيرٌ من النَّاس، فمن اتَّقى المُشتبهات استبرأ لدينه و عِرضه، ومن وقَع في الشُّبهاتِ كراعٍ يرعى حول الحمى يُوشِكُ أن يُواقعه. (صحيح البخاري،

کتاب الإیمان: ۱/ ۱۳، رقم الحدیث: ۵۲، ط: اتحاد، دیوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۵۶/ب،۲۳۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

گائے کا پیشاب ملا ہوا تیل استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال: ایک ڈابر کا آیورویدک کھجلی میں لگانے کا تیل ہے، اُس میں پانچ ایم ایل گائے کے پیشاب سے بنا ہے، اُس میں اور بھی کچھ ڈالا گیا ہے، اور میں معذور ہوں، میں روز نہیں نہا سکتا، اور میں نماز بھی پڑھتا ہوں، کیا یہ تیل میں لگا سکتا ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ نے نجس چیز میں میری امت کے لیے شفا نہیں رکھی ہے۔

وقَال ابن مسعُودٍ في السّكر: إنّ اللّٰه لم يجعل شِفاء كم فيماحرَّم عليكم.

(صحیح البخاري، کتاب الأشربة، باب شراب الحلواء والعسل، ط: اتحاد، دیوبند)

ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ نجس چیز کے کھانے سے، پینے سے، جسم پر ملنے سے بچیں، کھجلی کے لیے یونانی دواؤں میں ایک سے ایک اعلیٰ دوا اس کا متبادل موجود ہے؛ اس لیے جس دوا میں گائے کا پیشاب ملا ہوا ہو، اُس کا استعمال مسلمان کے لیے جائز نہیں۔

قَال الشَّامي: ولا يخفى أن التَّداوي بالمُحرَّم لا يجُوز في ظاهر المذهب، أصلُه: بولُ ما يُؤكل لحمُه؛ فإنَّه لا يُشرب أصلاً. (شامي، کتاب النکاح، باب الرضاع: ۴/ ۳۹۸، ط: زکریا، دیوبند) فقط واللہ اعلم

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۹/صفر/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ- محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۱۹۸/ب،۲۰۲/ب، ۱۴۳۸ھ)

غیر مسلم کی دعوت یا اس کے ہاتھ کا بنا ہوا سامان کھانا جائز ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ کرام مندرجۂ ذیل مسئلے میں:

(۱) غیر مسلم کے گھر کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) اور غیر مسلم دکان وغیرہ پر جو سامان بناتے ہیں؛ مثلاً: سموسے اور جلیبی وغیرہ، ان کو خرید کر کھانا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) غیر مسلم شادی وغیرہ کی جو دعوت دیتے ہیں، اُس دعوت کے کھانے کا کیا حکم ہے؟ مذکورہ مسئلوں میں جو بھی تحریر فرمائیں؛ مدلل تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمة والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: (۱) عادت نہ بنائے، کسی مجبوری میں تعلقات وغیرہ کی وجہ سے کبھی کھالے، تو گنجایش ہے، جب کہ کھانے کے حلال وپاک ہونے پر بھی پورا اطمینان ہو۔

(۲) گنجایش ہے؛ بہ شرطے کہ حلت وپاکی کا اہتمام کرتا ہو۔

(۳) کھانے کا حکم تو وہی ہے کہ جو نمبر:۱ ونمبر:۲ کے تحت لکھا گیا؛ مگر شادیاں؛ بالخصوص غیر مسلموں کی؛ ہندوانہ رسوم اور ناجائز وحرام امور پر مشتمل ہوتی ہیں؛ اس لیے ان میں شرکت سے حتی المقدرت اجتناب کرے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۲/۲۲ھ الموافق: ۲۰۱۷/۹/۱۴ء، یوم الخمیس

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہ

(۱۴۶۳/ھ، ۱۴۹۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)

غیر مسلم کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھانا کیسا ہے؟

سوال: کیا ہوٹل یا کسی پارٹی میں غیر مسلم کے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا کھانا حرام ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: غیر مسلم کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا اگر حرام ونجس چیز ہے،

تو اُس کا کھانا جائز نہیں، اگر حلال جانور کا گوشت ہے، تو بھی اس کے کھانے سے احتراز لازم ہے، اگر سبزی، دال، چاول وغیرہ ہے، اور اُس میں کسی حرام وناپاک چیز کی ملاوٹ کا اندیشہ نہیں، تو اُسے کھاسکتے ہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۶/شعبان/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۱۱۱۴/م، ۱۱۲۴/م، ۱۴۳۸ھ)

قادیانی ریسٹورینٹ میں کھانا پینا اور اُن سے لین دین کا حکم

سوال: کیا قادیانی ریسٹورینٹ میں کھانا پینا، یا اُن سے خرید وفروخت جائز ہے؟ برائے مہربانی راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: قادیانی لوگ بہ اجماعِ امت؛ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اُن کا ذبیحہ حرام ہے، اسلامی حمیت وغیرت کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کے یہاں سے کھانے، پینے، میل جول رکھنے اور اُن سے کسی قسم کا لین دین کرنے سے احتراز کیا جائے، حضرت مولانا رشید احمد لدھیانویؒ لکھتے ہیں:

”شیعہ کی جملہ اقسام: قادیانی، ذکری، منکرینِ حدیث اور انجمنِ دین داران؛ سب زندیق ہیں، جن کے احکام دوسرے کفار؛ بل کہ مرتدین سے بھی زیادہ سخت ہیں، اُن کے ساتھ خرید وفروخت وغیرہ ہر قسم کا لین دین ناجائز ہے، اور اُن سے دوستانہ تعلق رکھنا، اور محبت سے پیش آنا؛ غیرتِ ایمانیہ کے خلاف ہے، حتی الامکان اُن کے ساتھ ہر قسم کے معاملات سے بچنا فرض ہے“۔ (احسن الفتاوی: ۸/۲۵۰) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۱/جمادی الاولیٰ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ-محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری

(۶۷۸/م، ۷۱۷/م، ۱۴۳۸ھ)

الیکشن کے موقع پر امیدواروں کی طرف سے جو دعوت یا مٹھائی وغیرہ کھلائی جاتی ہے اُس کا حکم

سـوال: الیکشن کے موقع پر دیہات، گاؤں وغیرہ میں گھر گھر مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے، اب اگر مٹھائی ایک انسان کی کھالی؛ لیکن ووٹ دوسرے انسان کو دیا، یا دونوں کی مٹھائی کھائی اور ووٹ کسی اور کو دیا، تو یہ درست ہے یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق: الیکشن کے موقع پر امیدوار؛ عام لوگوں کو جو مٹھائی کھلاتے ہیں، اُن کی دعوت کرتے ہیں، یا انھیں کچھ دیتے ویتے ہیں، اس میں اُن کا مقصد بہ ظاہر ووٹ کے لیے راہ ہموار کرنا ہوتا ہے کہ لوگ اُنھیں ووٹ دیں؛ اگرچہ وہ زبان سے اپنے لیے ووٹ نہ مانگیں، یا یہ کہہ دیں کہ ووٹ جس کو چاہو دو، اور ووٹ شریعت کی نظر میں بعض پہلوؤں سے شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور شہادت پر کسی قسم کا کوئی معاوضہ لینا جائز نہیں۔ (جواہر الفقہ جدید: ۵/۵۳۵-۵۳۶، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند)

اس لیے الیکشن کے موقع پر کسی امیدوار کی کوئی مٹھائی وغیرہ نہیں کھانی چاہیے، یہ صریح رشوت نہ ہو، تو کم ازکم اس میں رشوت کا شائبہ ضرور ہے، اور اگر کبھی مجبوراً اس طرح کی مٹھائی گھر آ جائے، یا قبول کرنی پڑ جائے، تو کسی غریب کو دے دے، خود نہ کھائے، اور نہ بیوی بچوں کو کھلائے، اور اگر کسی نے لاعلمی میں کسی امیدوار کی مٹھائی کھالی، تو اس نے غلط کیا؛ لیکن مٹھائی کھانے کی وجہ سے اُسی امیدوار کو ووٹ دینا لازم نہ ہوگا؛ بل کہ مجموعی طور پر جو امیدوار؛ ملک اور باشندگانِ ملک کے لیے سب سے بہتر ہو، اور مسلمانوں کے حق میں بھی بہتر ہو، یا کم ازکم غیر مضر ہو، اُسے ووٹ دینا چاہیے۔

لا للشَّاهد [أي: لا يجُوز أخذُ الأجرة للشَّاهد]. (الدر المختار مع رد المحتار، كتاب الشهادات: ۸/۱۷۵، ط: مكتبة زكريا، ديوبند، ۱۷/۶۷، ت: الفرفور، ط: دمشق)

قال اللّٰه تعالىٰ: ﴿وَأَكلِهِم أَموالَ النَّاس بِالْبَاطِلِ﴾ بالرِّشوةِ و سائر الوجُوه المُحرَّمة. (مدارك التنزيل وحقائق التأويل: ۱/۲۰۲، سورة النساء، الآية: ۱۶۱)

وقال تعالى أيضاً في مقامٍ آخر: ﴿ سَمّٰعُونَ لِلكَذِبِ اَكّٰلُونَ لِلسُّحتِ ﴾ (سورة المائدة: ۴۲)

اتّفق جميعُ المُتأوِّلين لهٰذه الآية على أنّ قبُول الرّشا محرَّمٌ، و اتَّفقُوا على أنَّه من السُّحت الذي حرَّمه اللّٰه تعالى. (أحكام القرآن الكريم للجصاص، سورة المائدة، باب الرشوة: ٤/ ٨٥، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت)

من أَخَذ مال غيره لا على وجهِ إذن الشَّرع، فقد أكلَه بالبَاطل. (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي: ٢/ ٣٢٣، ط: دار إحياء التراث العربي، بيروت) فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ　　۱۴۳۸/۶/۲ھ = ۲۰۱۷/۳/۲ء، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۵۲۴/تتمہ/ن، ۴۵۸/ن، ۱۴۳۸ھ)

سودی کاروبار کرنے والے کے گھر دعوت کھانا کیسا ہے؟

سوال: اگر کوئی غیر مسلم یا مسلم کا کاروبار ہی سود کا ہے، تو اس کے گھر کھانے کا کیا حکم ہے؟ اور اگر ہم کھانے سے باز رہیں، تو اُسے تکلیف ہوتی ہے، تو ہم اُس کے گھر پر کھائیں یا نہ کھائیں؟ یا اُس کے پیسے جو کھانے میں ہم لوگوں کے استعمال کرتے ہیں، اُس کا کیا حکم ہے؟ صحیح جواب مرحمت فرمائیں۔ فقط والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰه التوفيق: اگر اکثر آمدنی سود کی ہے، جس سے مجموعی رقم کی اکثر مقدار حرام ہوگئی، تو ایسے شخص کی دعوت قبول کرنا یا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے، معذرت کردے، اور اگر اکثر رقم حلال کی ہے، یا جو رقم ہدیے میں دے رہا ہے، یا کھانا بنوانے میں صرف کر رہا ہے؛ خاص طور پر وہ حلال ہے، تو ایسے شخص کا ہدیہ قبول کرنا اور دعوت کھانا جائز ہے۔

أهدىٰ إلى رجُلٍ شيئاً أو أضَافه إن كان غالبُ مالِه من الحَلال فلا بأس؛ إلا أن يعلم بأنَّه حرامٌ، فإن كان الغَالبُ هو الحرامُ ينبغي أن لا يقبل الهديَّة، ولا يأكل الطَّعام؛ إلا أن يخبره بأنَّه حَلالٌ. (الهندية، كتاب الكراهية، الباب الثاني عشر في الهدايا والضيافات: ٥/ ٣٩٦، ط: اتحاد، ديوبند)

اور اگر کل رقم؛ حلال وحرام سے مساوی درجے میں مخلوط ہے، تو پھر احتیاط کرنا بہتر ہے۔

البتہ غیر مسلم کی دعوت اور ہدیہ قبول کرنا بغیر کسی تفصیل کے جائز ہے۔ (بہ شرطے کہ اس سے

دین کی بے توقیری یا کوئی اور ملی وشرعی خرابی لازم نہ آتی ہو۔ حبان) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم**

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۵ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ-محمد مصعب عفی عنہ

(۴۳۸/د، ۵۴۲/د، ۱۴۳۸ھ)

سودی کاروبار کرنے والے کی دعوت کھانے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرعِ متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

جو بیاج کا کاروبار کرتا ہے، اُس کے کچھ کاروبار حلال بھی ہیں، جیسے: مکان کا کرایہ وغیرہ، تو اُس کے یہاں دعوت کھا سکتے ہیں یا نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: اگر اُس شخص کی غالب آمدنی حلال ہے، اور کم آمدنی حرام ہے، اور دونوں رقمیں مخلوط ہیں، تو اس کے یہاں دعوت کھا سکتے ہیں؛ البتہ اگر غالب آمدنی حرام ذریعے سے حاصل ہے، تو اُس کے یہاں دعوت کھانا یا اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، اور مقتدیٰ حضرات کے لیے بہ ہرصورت ایسے شخص کے یہاں کھانے سے احتراز کرنا چاہیے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۳/ل، ۲۹/ل، ۱۴۳۸ھ)
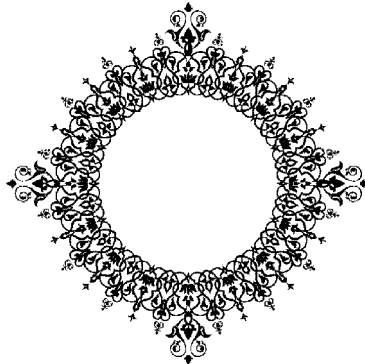
حظر واباحت اور متفرق مسائل

حرام اور ناجائز میں کیا فرق ہے

سوال: بہت سارے مسئلے پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ حرام ہے، یہ ناجائز ہے، تو یہ بتائیں کہ حرام اور ناجائز میں کیا فرق ہوتا ہے؟ مکمل تفصیلی جواب دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: حرام؛ یہ شریعت کا سخت حکم ہے، اور ناجائز؛ اس کے مقابلے میں کم تر ہے، حرام شے کی حرمت؛ نص قطعی سے ثابت ہوتی ہے، جب کہ ناجائز کا ثبوت؛ دلیلِ ظنی سے بھی ہوجاتا ہے، ہرحرام پر ناجائز کا اطلاق درست ہے؛ لیکن ہرناجائز کو حرام نہیں کہا جاسکتا؛ لیکن کبھی مکروہِ تحریمی اور ناجائز حکم کو بھی حَرُم کے لفظ سے تعبیر کردیا جاتا ہے، اسی طرح کبھی صورتِ حال کے پیشِ نظر سداً للباب ناجائز کو بھی حرام سے تعبیر کردیا جاتا ہے؛ اس لیے کتابوں میں اگر لکھا ہوا ملے، تو اس کے فرق وتعبیر کو اہل حق علماء ومفتیان کرام سے سمجھ لینا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۳؍رمضان؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۱۳۱؍م، ۱۱۴۴؍م، ۱۴۳۸ھ)

تحریر کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا اس کا عدد لکھنا، نیز اللہ اور محمد کے بجائے ان کا عدد لکھنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

(۱) آج کل ۹۰ رفی صد لوگ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی جگہ ۷۸۶ لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ''بسم اللہ'' کی بے حرمتی سے بچنے کا آسان طریقہ ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

(۲) احادیثِ شریفہ میں ''بسم اللہ'' لکھنے کی کیا فضیلت آئی ہے؟ یہ بھی بتلادیں۔

(۳) بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر کام کے شروع میں ''بسم اللہ'' لکھنا لازمی ہے، یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟

(۴) اور اس سلسلے میں کوئی حدیث ہو، تو واضح فرمائیں۔

(۵) اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ۷۸۶؛ یہ عدد اہلِ ہنود کے بھگوان ''ہری کرشنا'' کے حروف کا مجموعہ ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

(۶) بعض لوگ اللہ کے نام کی جگہ ۶۶، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی جگہ ۹۲ لکھتے ہیں، کیا اس طریقے سے لکھنا درست ہے؟

حضرت والا سے درخواست ہے کہ مدلل جواب مرحمت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب و باللہ التوفیق: (۱) بے ادبی کے اندیشے کے موقع پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے عدد کے طور پر ۷۸۶ لکھنا جائز ہے، علماء اور مشائخ سے اس کے لکھنے کا معمول چلا آتا ہے، اور بہ ظاہر اس کے رواج کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ خطوط عام طور پر پھاڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں، اور خطوط کے علاوہ دیگر عام تحریریں جو دوسروں کے ہاتھ میں جاتی ہیں، عام طور پر لوگ اُن کا بھی احترام نہیں کرتے، جس سے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی بے ادبی ہوتی ہے، جب کہ وہ قرآن پاک کی آیت بھی ہے، اس بے ادبی سے بچانے کے لیے غالباً علماء اور بزرگانِ دین نے ''بسم اللہ'' کے اعداد لکھنے شروع کیے؛ البتہ اگر بے ادبی کا اندیشہ نہ ہو، تو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' ہی لکھنا بہتر ہوگا۔ (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۶۱۳/۱۸، سوال: ۹۳۰، مطبوعہ: مکتبہ زکریا، دیوبند، اور آپ کے مسائل اور ان کا حل جدید، تخریج شدہ: ۵۷/۲، مطبوعہ: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)

(۲) تحریر کی ابتدا میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھنا ہی اصل ہے، اگر بے ادبی کا اندیشہ نہ ہو، تو اُسی کا لکھنا اولیٰ و بہتر ہے، حدیث میں ہے: **كلُّ أمرٍ ذي بالٍ لم يبدأ ببسم الله فهُو أقطع.** (احکام وخواص بسم اللہ، مولفہ: حضرت مفتی شفیع صاحبؒ، ص: ۹) یعنی: ہر وہ اہم کام جو ''بسم اللہ'' سے نہ شروع کیا جائے، وہ بے برکت ہوتا ہے۔

(۴،۳) ہر تحریر کے شروع میں ’’ بسم اللہ‘‘ لکھنا لازم وضروری نہیں؛ البتہ افضل و بہتر اور موجبِ خیر وبرکت ہے، حدیث میں ہے: **كُـلُّ أمـرٍ ذي بـالٍ لـم يبدأ ببسم اللّٰه فهُو أقطع .** (احکام وخواص بسم اللہ، مولفہ: حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ص:۹) یعنی: ہر وہ اہم کام جو ’’بسم اللہ‘‘ سے نہ شروع کیا جائے، وہ بے برکت ہوتا ہے؛ لہٰذا ہر مسلمان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے؛ تاکہ خیر وبرکت سے محرومی نہ ہو۔

(۵) ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ کے حروف کا عدد ۷۸۶ ہے۔ (احکام وخواص بسم اللہ، ص:۱۲) اور اگر اتفاقی طور پر ’’ہری کرشنا‘‘ کا عدد بھی ۷۸۶ ہو، تو اس میں کچھ حرج نہیں؛ کیوں کہ مسلمان جب ۷۸۶ کا عدد استعمال کرتے ہیں، تو ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ کے عدد کی حیثیت سے ہی استعمال کرتے ہیں، ’’ہری کرشنا‘‘ کی طرف اُن کا خیال قطعاً نہیں جاتا؛ اس لیے اندیشۂ بے ادبی کے موقع پر ’’بسم اللہ الرحمٰن الرحیم‘‘ کے عدد کے طور پر ۷۸۶ کا استعمال درست ہے۔

(۶) لفظ اللہ کے حروف کا عدد تو ۶۶ ہے؛ لیکن لفظ محمد کے حروف کا عدد ۹۲ نہیں ہے؛ بل کہ ۱۳۲ ہے؛ کیوں کہ حرفِ مشدّد اپنی اصل کے اعتبار سے دو شمار ہوتا ہے، اور کھڑا زبر شمار نہیں ہوتا، اور رہا مسئلہ لفظِ اللہ اور لفظِ محمد کی جگہ اُن کے عدد لکھنے کا، تو اس کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ یہ دونوں عام طور پر عام تحریرات میں نہیں آتے، اور خاص تحریرات میں بے ادبی کا اندیشہ نہیں ہوتا، یا برائے نام ہوتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۷/۱/۱۴۳۸ھ = ۱۹/۱۰/۲۰۱۶ء، چہار شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد مصعب عفی عنہ

(۴۵/ن، ۴۰/ن، ۱۴۳۸ھ)

’’بسم اللہ‘‘ کی جگہ ’’۷۸۶‘‘ کا عدد لکھنے اور اس نمبر کو حد درجہ متبرک سمجھنے کا حکم

سوال: جناب حضرات مفتیانِ کرام صاحبان، دامت فیوضکم العالیۃ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عرض ہے کہ آج کل ’’۷۸۶‘‘ کا جو رواج چلا ہوا ہے، اس کے متعلق دریافت کرنا ہے،

اس نمبر کو لوگ متبرک سمجھتے ہیں، اور ''بسم اللہ'' کی جگہ لکھتے ہیں، گھروں اور مدرسوں کے صدر دروازے پر لکھتے ہیں، اور اس کو ''بسم اللہ'' کے نمبر سمجھتے ہیں، اور تحقیق سے پتا چلا ہے یہ ''بسم اللہ'' کے نمبر ہیں بھی، بعض حضرات کا خیال ہے کہ ''بسم اللہ'' کی بے ادبی نہ ہو؛ اس لیے نمبر لکھا جاتا ہے، حالاں کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے پاس خطوط ''بسم اللہ'' کے ساتھ لکھے ہیں، اور کسریٰ نے آپ کا خط پھاڑ بھی دیا تھا، تو کیا حضور ''بسم اللہ'' کی بے ادبی کا سبب بنے؟ بعض حضرات اس نمبر کو حاصل کرنے کے لیے بہت کوشش کرتے ہیں، گاڑی نمبر، موبائل نمبر، مکان نمبر حاصل کرنے کے لیے رشوت تک دیتے ہیں، کوئی نوٹ اس نمبر کا ہو، تو اس کو تبرک سمجھ کر جلدی سے خرچ نہیں کرتے؛ بل کہ اپنے پاس رکھے رہتے ہیں، کسی کو اگر ٹوکتے ہیں، تو وہ کہتا ہے کہ تو علماء سے بھی زیادہ جان کار ہے، وہ تو اس پر نکیر نہیں کرتے؛ بل کہ اپنی تحریروں میں اور دروازوں پر استعمال کرتے ہیں، اگر غلط ہوتا، تو وہ ایسا نہ کرتے۔

تو کیا لوگوں کا یہ رواج اور خیال درست ہے یا نہیں؟ اور اس پر کچھ نکیر کرنی چاہیے یا نہیں؟ جو یہاں پہلے سے لکھے ہوئے ہیں، ان کو ہٹانا یا ہٹانے کے لیے کہنا درست ہے یا نہیں؟ اور اس نمبر کے استعمال کرنے سے ''بسم اللہ'' کے تارک ہوکر ہم ''بسم اللہ'' کی بے ادبی میں تو داخل نہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے پاس جو خطوط ارسال کیے ہیں، ان میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' مکمل لکھا ہے، صحابۂ کرام کا معمول بھی مکمل ''بسم اللہ'' لکھنے کا تھا، بخاری شریف، سنن ابی داؤد، صحیح ابن حبان، موطا امام مالک، مصنف بن ابی شیبہ وغیرہا کتبِ احادیث میں روایات موجود ہیں؛ اس لیے خط وکتابت میں ''بسم اللہ'' مکمل لکھنا اولیٰ اور افضل ہے، ''۷۸٦'' یہ ''بسم اللہ'' کا عدد ہے، اگر کوئی شخص ''بسم اللہ'' کے بجائے ''۷۸٦'' ایسی جگہ میں لکھتا ہے، جہاں ''بسم اللہ'' کی بے ادبی کا اندیشہ ہو، اور لکھنے والے کی غرض بے ادبی سے حفاظت ہو، تو عدد لکھنے کی بھی گنجایش ہے، تاہم جو ثواب ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھنے کا ہے، وہ عدد لکھنے سے حاصل نہ ہوگا، سوال مذکور میں ''بسم اللہ'' کا نمبر لکھنے کے تعلق سے جو لوگوں کا رواج وخیال تحریر فرمایا گیا ہے، وہ غلو پر مبنی ہے، ''بسم اللہ'' کے نمبر کو اس درجہ متبرک سمجھنا کہ اس نمبر کی گاڑی، موبائل، اور مکان وغیرہ حاصل کرنے کے لیے رشوت تک دینے کی کوشش کرتے ہیں؛ یہ غلط ہے، اور غلط رواج وخیال پر حسبِ موقع ومصلحت؛ مناسب طریقے پر نکیر کی جاسکتی ہے، جو لوگ پہلے سے لکھے ہوئے ہیں، یا لکھتے آئے ہیں، اُن کو صحیح مسئلہ

سمجھانے میں مضائقہ نہیں؛ لیکن عدد کو ہٹانے پر جبریہ طریقہ اختیار کرنا درست نہیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۱؍شعبان؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۰۴۵؍تتمہ؍م، ۱۰۹۷؍م، ۱۴۳۸ھ)

اللہ تعالیٰ کے لیے گوڈ (god) کا لفظ استعمال کرنا اور مسجد کو موسک (mosque) کہنا کیسا ہے؟

سوال: کیا ہم اللہ تعالیٰ کے بجائے گوڈ، اور مسجد کے بجائے موسک کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: لفظِ اللہ؛ اس ذات کے ساتھ خاص ہے، جو کہ واجب الوجود ہے، جب کہ لفظ گوڈ (god) کو ہر مذہب والا اپنے معبود کے لیے استعمال کرتا ہے، خواہ ہندو ہو یا عیسائی وغیرہ، اور جب لفظ گوڈ (god) سے اللہ کے مکمل معنی ادا نہیں کیے جا سکتے، تو اللہ پر گوڈ (god) کا اطلاق کرنا بہتر نہیں ہے، اور مسجد؛ تو وہ مسلمانوں کی اُس عبادت گاہ کے ساتھ خاص ہے، جو بہ طور مسجد ہمیشہ کے لیے وقف ہو، اسی طرح لفظ موسک (mosque) بھی مسلمانوں کی خاص عبادت گاہ کے لیے بولا جاتا ہے؛ لہٰذا لفظِ موسک (mosque) کو مسجد کے لیے بول سکتے ہیں؛ لیکن مسجد کے لیے لفظِ مسجد ہی زیادہ بہتر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۶؍۱۱؍۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔ فخر الاسلام عفی عنہ

(۱۰۰۹؍د، ۱۱۴۱؍د، ۱۴۳۸ھ)

اللہ جل شانہ کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین وشرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

اللہ کو ''آپ'' یا ''تم''؛ جیسے: ''اللہ فرماتے ہیں''، ''اللہ یوں کر دیں گے''، کسی بات پر اللہ کے لیے جمع کا لفظ استعمال کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: بہ طورِ تعظیم؛ اللہ رب العزت کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں، اللہ پاک نے خود اپنی ذاتِ مقدسہ سے متعلق بہت سی آیاتِ مبارکہ میں جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا ہے، قرآن شریف میں ہے: ﴿إِنَّا نَحنُ نَزَّلنَا الذِّكرَ وَإِنّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ اور عرفِ عام میں بھی بڑی شخصیت کے لیے بہ طورِ تعظیم جمع کا صیغہ استعمال کرنا شائع وذائع ہے، آدمی ایک دوسرے کو سلام کرتے وقت ''السلام علیکم'' جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے؛ اگرچہ جس کو سلام کیا جارہا ہو، وہ فردِ واحد ہو۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱/۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۳/ل، ۲۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

اہلِ بیتِ اطہار یا اولیاء کے ساتھ ''رضی اللہ عنہم'' لگانا کیسا ہے؟

سوال: کیا اہلِ بیتِ اطہار کے ساتھ ''دعائیہ کلمہ'' استعمال کرنا جائز ہے؟ جیسے: حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ، اور صحابۂ کبار کے ساتھ، جیسے: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، عشرۂ مبشرہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ۔

کیا ہم اولیاء کے ساتھ، جیسے: حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے ساتھ دعائیہ کلمہ ''رضی اللہ عنہ'' کا استعمال کرسکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: اہل بیتِ اطہار؛ یعنی: ازواجِ مطہرات امہات المومنین رضی اللہ عنہن، نیز حضرات خلفائے راشدین وعشرۂ مبشرہ ودیگر تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اسمائے گرامی کے ساتھ '' رضی اللہ عنہم'' جیسا جملۂ دعائیہ لگانا؛ نہ صرف جائز؛ بل کہ انتہائی مستحسن اور مستحب جملہ ہے، تاہم حضرات اولیائے کرام کے نام نامی کے ساتھ بھی اگرچہ لکھنے اور بولنے کی گنجایش ہے؛ مگر ان حضرات کے لیے ''رحمہ اللہ''، ''رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ''،

’’رحمہم اللّٰہ‘‘ وغیرہ جیسے دعائیہ جملے لکھنا بولنا اچھا ہے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۹ھ الموافق: ۲۰۱۷/۵/۶ء، یوم السبت

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۹۶/ھ، ۹۸۳/ھ، ۱۴۳۸ھ)

تسبیحات شمار کرنے میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں استعمال کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

بعد نمازِ عصر وفجر لوگ عموماً انگلیوں کے پوروں سے تسبیح شمار کرتے ہیں، تو اس کا سنت طریقہ کیا ہے؟ صرف دائیں ہاتھ سے، یا دونوں ہاتھ سے؟

بہ راہِ کرم جواب؛ وضاحت اور حوالے کے ساتھ تحریر فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: انگلیوں پر گنتیاں شمار کرنے کا جو طریقہ عربوں میں رائج ہے، برصغیر میں اُس کا رواج نہیں ہے؛ بل کہ خال خال لوگ ہی جانتے ہیں، برصغیر میں عام طور پر لوگ تسبیحات کا شمار انگلیوں کے پوروں پر کرتے ہیں، اور ایک ہاتھ میں صرف پندرہ پوروے ہوتے ہیں؛ اس لیے اگر پندرہ کے بعد بھی دائیں ہاتھ کے پوروں پر تسبیحات شمار کی جائیں، تو اشتباہ کا اندیشہ رہتا ہے؛ اس لیے پندرہ سے زائد اعداد شماری میں دوسرے ہاتھ کا استعمال؛ ضرورت ومجبوری ہے، جیسے: عربی طریقے میں ۹۹ کے بعد سیکڑوں کے شمار کے لیے دوسرا ہاتھ استعمال ہوتا ہے، اور یہ مجبوری ہے، نیز بہت سے کام ہیں، جن میں دونوں ہاتھ استعمال ہوتے ہیں، جیسے: موزوں اور کانوں کا مسح وغیرہ؛ اس لیے ہمارے ملک کے لوگوں کا نمازوں کے بعد؛ بالخصوص فجر اور عصر کے بعد تسبیحات شمار کرنے میں دائیں کے بعد بایاں ہاتھ استعمال کرنا جائز ودرست ہے، اس میں کسی طرح کا کوئی گناہ نہیں ہے؛ البتہ اگر کوئی شخص عربوں کا طریقہ جانتا ہو، تو اس کے لیے افضل وبہتر یہی ہے کہ اسی طریقہ پر تسبیحات شمار کرے؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (عربوں کے طریقے پر) دائیں ہاتھ سے تسبیحات شمار فرماتے تھے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے؛ لیکن ضروری ایسے شخص کے لیے بھی نہیں ہے کہ خلاف کرنے میں کچھ گناہ ہو۔

عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما قال: رأيتُ النَّبي صلّى الله عليه وسلّم يعقد التَّسبيح بيمينه ،أخرجه أبو داؤد بلفظه: (۸۱/۲) والتِّرمذي: (۵۲۱/۵) وانظر: صحيح الجامع: (۲۸۱/٤، برقم: ٤٨٦٥). (حصن المسلم، ص: ۹۲)

وصحَّ أنَّه صلّى اللّٰه عليه وسلّم كان يعقد التَّسبيح بيمينه، وورد أنَّه قال: واعقدُوه بالأنامل؛ فإنَّهنَّ مسؤولات مُستنطقات، وجاء بسندٍ ضعيفٍ عن عليٍّ مرفوعاً: نعم المذكِّر السّبحة، قال ابنُ حجر: والرِّوايات بالتَّسبيح بالنَّوى والحصا كثيرةٌ عن الصَّحابة وبعض أمَّهات المُؤمنين؛ بل رآها صلّى الله عليه وسلّم وأقرَّها عليه، و عقدُ التَّسبيح بالأنامل أفضلُ من السّبحة، وقيل: إن أمن من الغَلط فهو أولى؛ وإلّا فهي أولى، كذا في شرح المشكاة. (حاشية الطحطاوي على المراقي، فصل في صفة الأذكار الواردة إلخ، ص: ٣١٦، ط: دار الكتب العلمية، بيروت)

وقال أهلُ العلم: ينبغي أن يكون عددُ التَّسبيح باليمين. (شرح ابن علان للأذكار: ۲۵۱/۱، عن ابن الجوزي) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۲۸/۷/۱۴۳۸ھ = ۲۶/۴/۲۰۱۷ء، چہارشنبہ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۸۵۰/ن، ۳-۸۷/ن، ۱۴۳۸ھ)

’’اللہ اکبر‘‘ ’’دارالعلوم زندہ باد‘‘ ’’مولانا ارشد مدنی زندہ باد‘‘ کے نعرے لگانا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دینِ شرع متین مندرجہ ذیل مسئلے کے بارے میں:

آج کل جمعیت علمائے ہند کے اجتماعات اور جلسوں میں تکبیر کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اور اس عمل کو سنت کہہ رہے ہیں، نیز ’’مولانا ارشد مدنی زندہ باد‘‘، ’’دارالعلوم دیوبند زندہ باد‘‘ اس طرح کے نعرے لگاتے ہیں، اسی طرح تکبیر کے نعرے، دیگر نعرے لگانا؛ کب، کہاں، کس وقت، کس حد تک درست ہے؟ نیز آیا سنت ہے یا نہیں؟ جواب مدلل؛ فتاوی عربی کی روشنی میں ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: حسبِ ضرورت؛ تکبیر؛ یعنی: اللہ اکبر کے نعرے لگانا درست ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ میں متعدد مواقع پر تکبیر کے نعرے لگانا ثابت ہے، بخاری شریف کے **باب التّکبیر عند الحرب** میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر **اللّٰہ أکبر! خربت خیبر** کے نعرے لگائے تھے۔

قال ابنُ حجر: وأمّا التّکبیرُ؛ فلأنّہ ذکرٌ مأثُورٌ عند کلِّ أمر مھُول، وعند کُلِّ حادث سُرور شُکراً للّٰہ تعالیٰ وتبریۃً لہ من کُلِّ ما نسب إلیہ أعداء ہ. (فتح الباري: ۴۳۸/۲، ط: دار المعرفۃ، بیروت)

تکبیر کے علاوہ ہر وہ نعرہ؛ جس میں کسی خلاف شرع امر کی تائید نہ ہوتی ہو؛ لگانے کی گنجایش ہوگی؛ البتہ جن نعروں میں خلافِ شرع امور ہوں، یا جو نعرے تعصب وقوم پرستی کی ترغیب دیتے ہوں؛ موجبِ اجتناب ہیں، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے قومی نعرے ''ہندوستان زندہ باد'' اور ''ہندوستان آزاد'' کہنے کو جائز کہا ہے۔ (کفایت المفتی: ۳۶۱/۹)؛ اس لیے بہ وقتِ ضرورت ''دارالعلوم دیوبند زندہ باد'' یا ''مولانا ارشد مدنی زندہ باد'' کے نعرے لگانے کی گنجایش ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۱۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۷۹رتتمہ رل، ۲۹۴رل، ۱۴۳۸ھ)

اصل اتباعِ شریعت ہے، محض کسی پیر یا شیخ سے بیعت ہوجانا کافی نہیں

سوال: آج کل کچھ لوگوں کا نظریہ؛ یہ ہے کہ اگر ہم کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت نہ لیں گے، تو ہم جنت میں نہیں جائیں گے، اسی نیت کے ساتھ کسی پیر یا بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرلیتے ہیں، اور اسی کے دیے ہوئے اعمال پر عمل کرتے ہیں، تو دورِ حاضر میں اس قسم کی نیت کے ساتھ، یا کسی بھی نیت کے ساتھ بیعت لینا کیسا ہے؟ اور پیر یا مرشد ہونے کے لیے کیا کیا شرائط ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اصل چیز جس سے آخرت میں کام یابی

حاصل ہوگی، شریعت کی اتباع اور سنت کی پیروی ہے، خود عمل کرنے میں کوتاہی اور پست ہمتی کا امکان رہتا ہے، نیز شیطان مختلف طریقے پر بہکانے کے درپے بھی رہتا ہے؛ اس لیے کسی ایسے شخص کی راہ بری حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے، جو شریعت و سنت کی اتباع میں کامل ہو، اور کسی شیخ نے اس کے کامل ہونے کی اجازت وخلافت دے کر تصدیق بھی کردی ہو؛ لیکن ایسے راہ بر سے بیعت ہونا زیادہ ضروری نہیں ہے؛ بل کہ اصلاحی تعلق قائم کرنا ضروری ہے؛ تاکہ پست ہمتی اور سستی کے وقت اُس سے مشورہ حاصل کیا جائے، جو وساوس وخطرات آئیں، اُن کا ازالہ کیا جاسکے، اور اُس سے پوچھ پوچھ کر اپنے ظاہر وباطن کا حال درست کرلیا جائے، جس سے گناہ اور امراض دور ہوجائیں، اصلاحی تعلق کو مضبوط کرنے کے لیے بیعت ہوجانا اچھا ہے؛ لیکن صرف پیری مریدی کے نام پر بیعت ہونے کو کافی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے، اور پیر جو کچھ بتائے، وہ سنت وشریعت کے مطابق ہو، تبھی اُس پر عمل کرنا جائز ہے؛ ورنہ پیر کی ہر بات پر عمل کرنا؛ خواہ شریعت کے خلاف ہو جائز نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۹/۵ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۰۷/د، ۸۹۱/د، ۱۴۳۸ھ)

اگر شیخ کی صحبت سے فائدہ نہ ہو تو کیا دوسرے سلسلے کے بزرگ سے بیعت کرسکتا ہے؟

سوال: میں ایک سال سے ایک شیخِ طریقت سے بیعت ہوں؛ لیکن میرے باطنی امراض کی اصلاح نہیں ہورہی، اور اس وقت مجھے سلسلۂ طریقت کا بھی صحیح علم نہیں تھا؛ لیکن ابھی مجھے کچھ معلوم ہوا ہے، تو میرا دل نقشبندیہ سلسلے کی طرف بہت زیادہ مائل ہورہا ہے، اور میں اس سلسلے میں کسی شیخِ طریقت سے بیعت ہونا چاہتا ہوں، برائے مہربانی میری راہ نمائی فرمائیں؛ فیصلہ لینے میں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً: الجواب وباللہ التوفیق: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ معتد بہ مدت تک رہے؛ مگر اُس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے، تو اسے چاہیے کہ دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرلے؛ کیوں کہ مقصود؛ خدا تعالیٰ ہے، نہ کہ شیخ؛ لیکن شیخ اول سے بداعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل و مکمل ہو؛ مگر اُس کا حصہ وہاں نہ تھا، اور بلاضرورت محض ہوس ناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، اور شیخ کا قلب مکدر ہوجاتا ہے، اور نسبت قطع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، اور ہرجائی مشہور ہوجاتا ہے۔ (شریعت وطریقت، ص: ۴۰۹)

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کی اصلاح نہیں ہورہی ہے، تو نقشبندیہ سلسلے کے کسی دوسرے متبعِ سنت (شیخ) سے آپ بیعت ہوسکتے ہیں؛ لیکن پہلے شیخ سے بداعتقاد نہ ہوں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۱۱/۳۰ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ

نوٹ: نئے شیخ سے بیعت ہونے میں جلدی نہ کریں گے؛ بل کہ چند روز یا چند بار اُس کی صحبت میں جاکر رہیں، اور خلوت وجلوت کے معاملات دیکھیں، پھر مناسبت معلوم ہو، تو استخارہ کرکے اپنا مقصد شیخِ ثانی سے ظاہر کردیں۔

زین الاسلام قاسمی

(۱۳۰۴/ص، ۱۱۱۳/ص، ۱۴۳۸ھ)

کیا شیخ کے اہل وعیال کا مرید پر کوئی حق ہے؟

سوال: گزارش یہ ہے کہ شیخ کے اہل وعیال کا مرید پر کیا حق ہوتا ہے؟ اور اگر حق ہے، تو کس درجے کا؟ آیا شیخ کے گھر والے مرید سے تقاضا کرسکتے ہیں؛ کسی استعمال کی چیز یا روپے پیسے کا؟ اور اگر تقاضا آجائے، تو مرید کو کیا اپنے شیخ کو اطلاع کرنی چاہیے؟ وضاحت فرمایئے گا۔ جزاکم اللہ خیرا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: مالی واجب حق؛ جس کا مطالبہ کرنا جائز ہو، نہ مرید پر شیخ کا ہے، نہ شیخ کے اہل وعیال کا، درحقیقت جس شیخ سے انسان؛ باطنی اور روحانی استفادہ کرتا ہے، بہ طور تبرع واحسان اُس کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، یا مالی وجسمانی اس کی خدمت کرنا؛

مستحب و پسندیدہ ہے، پھر اسی جذبے سے کبھی انسان شیخ کے آل وعیال کی خدمت کو بھی شرف وسعادت سمجھ کر انجام دیتا ہے؛ لیکن یہ سب تبرع اور خوش دلی کے ساتھ ہدیے کی شکل ہے، حقِ واجب کی طرح اُس کی ادائیگی مرید پر لازم و واجب نہیں ہے، نہ ہی شیخ یا گھر والوں کے لیے اس کا مطالبہ؛ بہ طور حق کے کرنا جائز ہے کہ یہ سوال کرنے میں داخل ہے؛ جو مذموم ہے، اگر شیخ کی لاعلمی میں اس کے گھر والے مرید سے ایسا کوئی مطالبہ کرتے ہیں جو مرید کے لیے زیر باری کا باعث ہے، تو مرید انکار بھی کرسکتا ہے، یا شیخ کو باخبر کرسکتا ہے، مرید کا انکار کرنا یا شیخ کو مطلع کر دینا دونوں جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۲۹ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۳۱۹/د، ۴۰۰/د، ۱۴۳۸ھ)

والدین کا اپنے بچوں کی کمائی میں کتنا حصہ ہوگا؟

سوال: بیٹے اور بیٹی کی شادی سے پہلے اُس کی نوکری یا بزنس کی کمائی سے والدہ اور والد کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ جب کہ اُس کی پڑھائی کا خرچ اُس کے والد اور اس کے دو بھائیوں نے اپنی مشترکہ کمائی سے کیا ہے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: بیٹے کے بالغ ہونے کے بعد اس کے کھانے، کپڑے میں خرچ کرنا، اور اُس کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنا؛ والد پر واجب نہ تھا، والد نے جو کچھ خرچ کیا ہے، وہ تبرع کے قبیل سے ہے؛ لہٰذا لڑکے کے ملازم ہوجانے کے بعد والد کا اپنے خرچ کیے ہوئے پیسوں کا بدلے کے طور پر مطالبہ کرنا جائز نہیں؛ البتہ ملازم لڑکے کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے کہ کل آمدنی والد کو پیش کرے، یا اپنی آمدنی کا ایک حصہ والد کو مالک بنا کر دے دے اور ضروریات میں اُن کا تعاون کرے، نیز یہی حق والدہ کا بھی ہے؛ بل کہ والد سے کچھ زیادہ ہے کہ لڑکا اُن کی ضروریات میں تعاون کرے، اور اُن کی مالی خدمت کرے، اسی طرح حسنِ سلوک اور مالی خدمت کا معاملہ لڑکے کو کچھ اپنے اُس بھائی کے ساتھ بھی کرنا چاہیے، جس کی کمائی اُس کی تعلیم میں خرچ ہوئی ہے، ﴿هَل جَزَاءُ الإِحسَانِ إِلَّا الإِحسَانُ﴾

البتہ اگر ماں باپ نان ونفقے کے محتاج ہوں، تو لڑکے پر فرض عین ہوجاتا ہے کہ اُن کی ضروریات پوری کرے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۵/۶/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ۔ محمد مصعب عفی عنہ

(۴۶۰/د، ۵۶۵/د، ۱۴۳۸ھ)

عید کے موقع پر بیٹیوں کے گھر عیدی کے نام سے سامان بھیجنے کی رسم لائقِ ترک ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین، علمائے شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں یہ رسم چل پڑی ہے کہ لڑکی کی شادی کے بعد جب رمضان کا مہینہ آتا ہے، تو لڑکی کے سسرال والے افطار کی تمام اشیاء: پھل فروٹ، شربت اور دیگر اشیائے خوردنی، اسی طرح عید سے پہلے چاول، مرغا، بریانی کی تمام چیزیں، مزید برآں دولہا اور دلہن دونوں کے کپڑے دینے کا ایسا رواج ہے کہ اگر لڑکی والے مذکورہ بالا چیزیں نہ دیں، تو لڑکی والے کو بہت طعنے سننے پڑتے ہیں، اور اس کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر والوں کو ان اشیاء کے دینے پر مجبور کرتی ہے، اور لڑکی والے اپنی لڑکی کی خوش حالی کے لیے بہ جبر واکراہ یہ چیزیں دیتے ہیں؛ بل کہ بعض سسرال والے ان اشیاء کا مطالبہ بھی کر ڈالتے ہیں، نیز اڑوس پڑوس کے لوگ بھی نہ دینے پر طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح لڑکی والوں سے زبردستی مذکورہ چیزوں کا لینا درست ہے؟ اور لے کر اُنھیں کھانے کا کیا حکم ہے؟ پڑوسیوں کا نہ دینے پر، اور سسرال والوں کو لڑکی کو پریشان کرنے کا کیا حکم ہے؟ نصوص (قرآن وسنت) کی روشنی میں جلد از جلد ہماری راہ نمائی فرمائیں؛ تاکہ امت کو صحیح راہ سے آگاہ کیا جاسکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: حدیث میں ہے: لا یحلُّ مالُ امرءٍ مُسلم إلَّا

بطیب نفسٍ منہ . (ترجمہ: کسی مسلمان کا مال؛ طیبِ نفس (خوش دلی) کے بغیر حلال نہیں) اس حدیث کی روشنی میں بات واضح ہے کہ آپ کے علاقے میں جو رسم رائج ہے، وہ لائقِ ترک ہے، زبردستی لڑکی والوں سے مذکورہ اشیاء لینا، یا ایسا رواج بنا دینا کہ لڑکی والے دینے پر مجبور ہو جائیں، یہ طریقہ لین دین کا؛ خبث پر مبنی ہے، پاکیزہ اور طیب نہیں، خاص کر رمضان اور عید کے موقع پر لڑکی والوں پر اپنے سسرال والوں کے لیے مذکورہ اشیائے خوردنی وکپڑے وغیرہ بھیجنا نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ سنت، اس کو ضروری سمجھنا، اور نہ بھیجنے پر طعن وتشنیع اور پریشان کرنا نہایت مذموم اور بُرا ہے، جو ہدیے تحائف خوش دلی سے بلا جبر واکراہ دیے جائیں، وہ حلال اور پاکیزہ ہیں، اُن کا لین دین بلا کراہت جائز اور درست ہے۔ اور آپس میں زیادتی محبت کا باعث ہے؛ لیکن مطالبے یا رسم ورواج یا طعن وتشنیع کے دباو میں لینا دینا ہرگز محبت کا ذریعہ نہیں؛ اس لیے غیر شرعی رسم کو ترک کرنا لازم ہے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۱/شعبان/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری - نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۹۹۵/تتمہ/م، ۱۰۵۶/م، ۱۴۳۸ھ)

عورت اور مرد کے درمیان اونچ نیچ یا مساوات کے سلسلے میں اسلامی تعلیم

سوال: ہر عورت کا ہر مرد سے مقام میں ایک درجہ نیچے ہے، یا صرف شادی کے معاملے میں اپنے شوہر سے ایک درجہ نیچے ہے؟ کیوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ جائز ہوتا، تو میں بیویوں سے کہتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے، یہاں پر صرف بیویوں کا ذکر ہے، نہ کہ ساری عورتوں کا، بہ راہِ کرم اس بارے میں تفصیل سے بتائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلما: الجواب وباللہ التوفیق: اسلام میں عورت اور مرد دونوں کی اپنی اپنی جگہ، اور اپنے اپنے موقع پر اہمیت ہے، عورت اور مرد کے درمیان ذات کے اعتبار سے اونچ نیچ کا تصور؛ غیر اسلامی ہے، اسلام نے جیسے ایک مرد کو عزت دی ہے، اور اس کو حقوق عطا کیے ہیں، ایسے ہی عورت کو بھی عزت دی ہے، اور اُس کو حقوق عطا کیے ہیں، ہاں فطری طور پر عورت اور مرد کے درمیان؛

بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کی بنیاد پر بہت سی صفات میں فرق رکھا ہے، اس فطری فرق کی بنیاد پر عورت اور مرد پر الگ الگ خاص احکام اور ذمے داریاں ڈالی گئی ہیں، بالخصوص شادی کے بعد عورت اور مرد پر الگ الگ خاص احکام واجب کیے گئے ہیں، اور مرد کو عورت پر ایک گونہ فوقیت عطا کی گئی ہے، مثلاً: عورت پر زور دیا گیا کہ وہ جائز امور میں اپنے شوہر کی مکمل اطاعت کرے، اور اُس کی پابند بن کر رہے، اور مرد کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ عورت کے حقوق ادا کرے، اور اُس کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاو کرے، وغیرہ وغیرہ، عورت اور مرد کا یہ فطری فرق بجائے خود اسلام کا ایک نمایاں امتیاز ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شادی کے معاملے میں شریعت نے عدل وانصاف کی وجہ سے مرد کو عورت پر ایک گونہ فوقیت اور برتری عطا فرمائی ہے، اس سے مقصد؛ عورت پر ظلم وتشدد اور اس کی ذات کو بے حیثیت بنانا نہیں ہے؛ بل کہ یہ تقسیم فطرت کے عین مطابق ہے، اور کائنات میں عدل وانصاف وامن وامان کا قیام اور معاشرے کی درستگی کا اس سے غیر معمولی تعلق ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ العبد: محمد مصعب عفی عنہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۶ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - وقار علی غفرلہٗ

(۵۴۷/ص، ۸۷/ص، ۱۴۳۸ھ)

عورت پر گھریلو کام کی ذمے داری کس حد تک ہے؟

سوال: کیا بیوی کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کا کام کرے؟ جیسے: اُسے وقت پر کھانا دینا، اُس کے کپڑے دھونا، اُس کو صبح اٹھ کر ناشتہ دینا وغیرہ؟ میں نے سنا ہے یہ سب عورت (بیوی) کے فرائض میں شامل نہیں، کیا یہ درست ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللّٰہ التوفیق: اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو الگ الگ ذمے داریاں اور حقوق عطا کیے ہیں؛ البتہ مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت دی ہے، جس طرح مرد پر عورت کا نان ونفقہ وغیرہ فرض کیا ہے، اسی طرح عورت پر شوہر کی فرماں برداری اور رضا جوئی بھی لازم کی ہے، اسی کے ساتھ دونوں پر حسنِ معاشرت بھی لازم ہے، اس حسنِ معاشرت کا تقاضا ہے کہ زوجین اپنے کام مل بانٹ کر کیا کریں، اگر چہ عورت پر یہ سب کام فرض نہیں ہیں، پھر بھی اس کا اخلاقی فریضہ تو

ہے ہی کہ جب شوہر باہر کے کام انجام دے رہا ہے، تو وہ گھر کے اندرونی کام کرے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مابین؛ اسی طرح تقسیمِ کار فرمایا تھا کہ گھر کے باہر کے کام حضرت علی کے ذمے، اور اندرونی کام؛ کھانا پکانا، پانی بھرنا، صاف صفائی کرنا حضرت فاطمہ کے ذمے کیے تھے۔

حَكم النَّبيُّ – صلّى الله عليه وسلّم – بين عليٍّ بن أبي طالب وبين زوجته فاطمة – رضي اللّه عنها – حين اشتكيا إليه الخدمة، فحكم على عليٍّ بالخدمة الظَّاهرة، وحَكمَ على فاطِمة بالخدمة الباطنة – خدمة البيت – و قال ابنُ حبيب: الخدمةُ الباطنة: العجينُ، والطَّبخ، والفرش، وكنس البيت، واستقاء الماء، وعمل البيت كلّه. (من معين الشمائل، ص: ٧٤)

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارا کام عورت کے ذمے ڈال کر اُس سے نوکرانی کی طرح کام لیا جائے، اور اُس کا بالکل تعاون نہ کیا جائے؛ بل کہ اس سلسلے میں اللہ کے رسول ہمارے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

عن الأسود قال: سألتُ عائشة: ما كان النَّبي – صلّى الله عليه وسلّم – يصنعُ في بيته، قالت: كان في مِهنة أهله؛ تعني خدمة أهله. (بخاري شريف، رقم الحديث: ٦٧٦)

اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں اُس کی خاندانی حیثیت کا بھی لحاظ کیا جائے، یعنی: اگر وہ اپنے گھر میں گھر کے کام خود کرتی تھی، تو اُسے سسرال میں بھی انکار نہیں کرنا چاہیے، اور اگر اس کے گھر میں خادمائیں وغیرہ تھیں، اور وہ گھر کے کام خود نہیں کرتی تھی، تو شوہر کو بھی دباو ڈال کر کام نہیں کروانا چاہیے، اور اس کو اُس کی جانب سے تبرع اور احسان سمجھا جائے، فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

امتنعت المرأة من الطَّحن والخبز، إن كانت ممَّن لاتَخدِم أو كان بها علَّةٌ فعليه أن يأتيَها بطعامٍ مُهيَّأ؛ وإلاَّ فإن كانت ممَّن تخدمُ نفسها و تقدرُ على ذلك لايجب عليه.
(الدر مع الرد: ٥/ ٢٩٠) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۳۰/۱/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ – محمد مصعب عفی عنہ

(۱۷/تتمہ/د، ۱۲۰/د، ۱۴۳۸ھ)

ہندو پڑوسی کے انتم سنسکار میں شریک ہونا یا عیادت وتعزیت کے لیے جانا کیسا ہے؟

سوال: ہم یہ بات جاننا چاہتے ہیں کہ اگر میرا پڑوسی ہندو بھائی مرتا ہے، تو کیا اُس کے ساتھ انتم سنسکار میں جا سکتے ہیں؟ یا گھر اُس کے جا کر تھوڑی دیر تک بیٹھ سکتے ہیں؟ اُن کی دل جوئی کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ جب کہ اسلام کا سب سے بڑا عمل؛ عالی اخلاق ہونا ہے، اس کا جواب حوالے کے ساتھ دیں۔ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: کسی مصلحت یا ضرورت سے غیر مسلموں سے ملنا جلنا، اُن کے دکھ درد میں شریک ہونا، اور انسانیت کے ناطے اُن کا تعاون کرنا؛ خاص کر جب کہ پڑوسی ہوں شرعاً جائز ہے؛ البتہ اُن کے مذہبی معاملات اور مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں؛ لہٰذا اگر کوئی کافر بیمار ہوگیا، یا اس کے یہاں کسی کا انتقال ہوگیا، تو اُس کی عیادت اور تعزیت کرنا تو جائز ہے؛ مگر میت اور جنازے کو لے کر چلنا، اور اُن کے دیگر مذہبی رسومات میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ (فتاوی رحیمیہ: ۱۳۵/۷) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　　۱۴۳۸/۵/۳ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۸۷/ل، ۶۹۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

غیر مسلموں کو ان کے تہوار پر مبارک باد دینا کیسا ہے؟

سوال: محترم مفتی صاحب! کیا غیر مسلم پہچان والوں کو اُن کے تہواروں کے موقع پر، یا دوسرے مواقع پر ایسا کہنا یا میسج کرنا کہ ''میری نیک تمنّائیں تمھارے ساتھ ہیں'' اور نیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایمان نصیب فرمائے؛ درست ہے؟ یہ لوگ ہماری عید کے مواقع پر بڑے اہتمام سے مبارک بادیاں دیتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق: ہندوؤں کے یہاں چوں کہ وحدتِ ادیان کا نظریہ پایا جاتا ہے؛ اس لیے وہ لوگ اسلامی تہواروں کے موقع پر مسلمانوں کو خوب دل کھول کر مبارک بادی دیتے ہیں؛ لیکن مذہبِ اسلام میں؛ صرف اسلام ہی حق اور صحیح مذہب ہے، باقی سب مذاہب باطل ہیں؛ اس لیے مسلمان کے لیے کوئی ایسا کام جائز نہیں، جس سے غیروں کی کسی مذہبی چیز کی تعظیم وتکریم یا اُس کی تعریف وغیرہ لازم آتی ہو؛ بل کہ اس طرح کی چیزوں میں کفر کا اندیشہ ہوتا ہے؛ اس لیے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ہولی یا دیوالی کے موقع پر غیر مسلموں کو مبارک بادی دیں، اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے؛ البتہ اگر سخت مجبوری کی صورت ہو، مثلاً: کوئی ایسا کاروباری ساتھی، یا ماتحت ملازم، یا کمپنی کا مالک ہے کہ اگر اس موقع پر اُس سے مسرت کا اظہار نہ کیا جائے، تو اُس کی جانب سے ضرر کا اندیشہ ہے، یا ملک میں مذہب کی بنیاد پر منافرت پھیلانے والوں کو مزید منافرت پھیلانے کا موقع ملے گا، تو ایسی مجبوری میں مجمل الفاظ کہنے کی گنجایش ہوگی، مثلاً: یوں کہہ دے کہ ''میری نیک تمنائیں تمھارے ساتھ ہیں''، اور نیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایمان نصیب فرمائیں، تہوار وغیرہ کی تعظیم یا تعریف وغیرہ ہرگز مقصود نہ ہو، تو شرعاً ان شاء اللہ اس کی گنجایش ہوگی۔

اجتمَع المجُوس يوم النّيرُوز فقَال مُسلمٌ: ''خوب سيرت نهاوند'' يكفر. (الفتاوى البزازية على هامش الهندية: ٦/٣٣٣، ط: مكتبة زكريا، ديوبند) **وما يُهدي المجُوس يوم النِّيرُوز من أطعمتهم إلى الأشراف، ومن كان لهُم معرفةٌ لا يحِلُّ أخذُ ذلك على وجه المُوافقةِ معهُم، وإن أخَذه لا على ذلك الوجه لا بأس به، والاحترازُ عنه أسلمُ.** (المصدر السابق) فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ ۱۴۳۸/۲/۱۱ھ = ۲۰۱۶/۱۱/۱۲ء، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۱۶/ن، ۱۳۱/ن، ۱۴۳۸ھ)

زنا بالجبر سے بچنے کے لیے عورت کا خودکشی کرنا کیسا ہے؟

سوال: جب مسلمانوں کے ساتھ ظلم وستم ہو رہا ہو، مردوں کو مارا جا رہا ہو، اور عورتوں کو

بے عزت کیا جا رہا ہو، تو ایسے وقت میں اپنی عزت بچانے کے لیے؛ ایک پاک دامن عورت خودکشی کر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟ جب اُس کے ساتھ زبردستی زنا کی کوشش کی جا رہی ہو، اور ظالم غالب ہو؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰه العصمة والتوفيق:حامدا ومصلياً ومسلماً: اسلام میں خودکشی قطعاً حرام ہے، ایسی نازک صورتِ حال میں بھی عورت کے لیے خودکشی کرنے کی اجازت نہیں ہے، عورت اپنی بساط کے مطابق مزاحمت کرے، اور اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کرے، اور اگر پھر بھی اُسے مجبور کردیا جائے، تو گناہ نہ ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

عن أبي هُريرة رضي اللّٰه عنه قال: قال رسُولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: من قتَل نفسَه بحديدةٍ فحديدتُه في يده يتوجَّأ بها في بطنه في نار جهنَّم خالدًا مُخلَّدًا فيها أبدًا، ومن شرب سمًّا فقتَل نفسَه فهُو يتحسَّاه في نار جهنَّم خالدًا مُخلَّدًا فيها أبدًا، (الصحيح لمسلم: ۱/ ۷۲، ط: اتحاد، ديوبند) **ذكر شيخُ الإسلام في شرحه في باب الإكراه على الزِّنا أنَّها إن أكرهت على أن تمكن من نفسها فمكّنت فإنَّها تأثمُ، وإن لم تمكّن هي من الزّنا وزني بها لاإثم عليها، وذكر أيضًا في الإكراه إذا أكرهت على الزِّنا فمكّنت من نفسها فلا إثم عليها.** (الفتاوى الهندية: ۵/ ۵۸، كتاب الإكراه، الباب الثاني، ط: زكريا جديد) **فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم**

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۲۴/ ۱۱/ ۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۷/ ۸/ ۲۰۱۷ء، یوم الخمیس

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۲۸۵/ھ، ۱۳۵۶/ھ، ۱۴۳۸ھ)

ڈاکوؤں کے ذریعے گولی سے قتل کیا گیا شخص شہید ہے یا نہیں؟

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام مسئلۂ ذیل کے بارے میں کہ ایک آدمی کے گھر میں کچھ ڈاکوؤں نے گھس کر مکان مالک کو گولی مار کر قتل کردیا، واضح ہو کہ مکان مالک کا جائے حادثہ پر ہی انتقال ہوگیا، وہ کچھ بھی اپنی زندگی سے نفع حاصل نہ کر سکے، حتی کہ علاج ومعالجے کی بھی مہلت نہ ملی، اور یہ بات بھی واضح ہو کہ ڈاکو مال لوٹنے آئے تھے، اُنھوں نے گھر کی چابی بھی مانگی تھی۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا ان کو شہیدِ کامل کی طرح بغیر غسل کرائے؛ اُسی کپڑے اور خون کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھا کر دفن کر دیا جائے، یا غسل دے دیا جائے؟ اگر غسل دیا جائے؛ جیسا کہ کتاب المسائل (۱۰۹/۲) پر ہے، تو کیا غسل دینے والے گناہ گار ہوں گے؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: صورتِ مسئولہ میں مقتول شخص شہیدِ حقیقی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ عاقل، بالغ ہو، اور جنبی نہ ہو، تو اسے اُسی خون اور کپڑوں میں کفنا کر، بغیر غسل دیے نماز پڑھ کر دفنا دیا جائے۔

ولو نَزل عليه اللُّصُوص ليلاً في المصر، فقتل بسلاح أو غيره أو قتله قُطَّاعُ الطَّريق خارج المصر بسلاح أو غيره فهُو شهيدٌ؛ لأن القتيل لم يخلف في هذه المواضع بدلاً هُو مالٌ. (شامي: ٢/ ١٦٢)

تاہم غسل نہ دینا واجب اور ضروری نہیں؛ اس لیے اگر غسل دے دیا گیا، تو غسل دینے والے گناہ گار نہ ہوں گے۔

وبالجُملة: فإنَّا لا نقُول بحُرمة غُسل الشَّهيد، وإنَّما نفينا وجُوبه، و قد دلَّ على عدم الوجُوب ...... غايةُ ما فيه أنَّه يجُوز غُسله، ولا دلالة فيه على الوجُوب ولا على الأولويَّة. (آثار السنن: ٨/ ٣٧٥) فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۳۰ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۴۹۳/ل، ۶۹۳/ل، ۱۴۳۸ھ)

مجبوراً جنات کو قتل کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیانِ شرع متین مسئلۂ ذیل کے بارے میں: مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص عامل ہے، اور وہ جنات کا قتل کرتا ہے، جو جنات کہ کسی کو پریشان کرتے ہیں، معلوم یہ کرنا ہے کہ یہ عمل جائز ہے یا نہیں؟ والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: بالکل ابتدا ہی میں جنات کو قتل کر دینا یا جلا دینا تو صحیح نہیں؛ البتہ اگر جن کسی تدبیر سے پیچھا نہ چھوڑے، تو بہ مجبوری اس کی اجازت ہوگی۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۴/۳۰ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۷۷۰/ل،۸۴۲/ل، ۱۴۳۸ھ)

کیا ریکٹ سے مچھروں کو مارنا درست ہے؟

سوال: کیا ریکٹ سے مچھروں کو مارنا درست ہے، اس سے مچھر جل کر مر جاتا ہے، جب کہ اسلام میں کسی زندہ؛ خواہ وہ جوں ہی کیوں نہ ہو جلانا منع ہے، اس ضمن میں مفتیانِ کرام کیا کہتے ہیں؟ بہ راہِ کرم راہ نمائی فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: بعض اہل فتویٰ اکابر کے قول کے مطابق گنجایش ہے؛ بہ شرطے کہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو، اور بہتر یہ ہے کہ بجائے ریکٹ کے؛ آل آؤٹ وغیرہ جیسی چیز جلا کر رکھ دی جائے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　۱۴۳۸/۱۱/۲۳ھ الموافق: ۲۰۱۷/۸/۱۶ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۱۲۷۷/ھ،۱۳۷۳/ھ، ۱۴۳۸ھ)

پتنگے وغیرہ سے حفاظت کے لیے فلائی کلر کٹ (fly killer kit) استعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال: جنگل میں مسجد ہونے کی وجہ سے لائٹ کے کیڑے، پتنگے بہت ستا رہے ہیں؛ اس وجہ سے ہم کالونی میں رہنے والوں نے یہ سوچا ہے کہ کیوں نہ ہم ریسٹورینٹ میں لگانے والی

ٹیوب لائٹ؛ جس کو فلائی کلر کٹ (مکھیوں، کیڑوں کو مارنے والی کٹ) کہا جاتا ہے، اُس کو لگالیں، آپ سے جاننے کی گزارش ہے کہ وہ کٹ ہم لگاسکتے ہیں یا نہیں؟ کیوں کہ کیڑوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور نماز میں بہت دقت ہورہی ہے، مہربانی کرکے جواب ضرور دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: اگر فلائی کلر کٹ کا استعمال؛ کیڑوں کو بھگانے کے لیے ہوتا ہے، تو اس میں حرج نہیں، اس کو لگا سکتے ہیں، اور اگر کیڑوں کو بجلی اور کرنٹ کے ذریعے جلا کر مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

و يُكره إحراقُ جرادٍ وقُمَّلٍ وعقربٍ، وفي الشَّامية: ومثلُ القُمَّل البرغُوث ومثلُ العَقرب الحيَّةُ. (شامي) فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقار علی غفرلہٗ دار الافتاء دارالعلوم دیوبند ۲۰/ذی الحجہ/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری

(۱۳۸۴ارم، ۱۳۹۷ارم، ۱۴۳۸ھ)

کیا کھٹمل مارنے کا کوئی مسنون طریقہ ہے؟

سوال: ہمارے گھر میں کھٹمل بہت زیادہ ہوگئے ہیں، جس کی وجہ سے رات میں آرام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے، اس مخلوق کو نکالنا ہے، تو ہمارے نبی کا کیا طریقہ تھا؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وبالله التوفيق والعصمة: حامداً ومصلّياً ومسلّماً: اس سلسلے میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی طریقہ منقول ہونا مستحضر نہیں؛ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوں کہ آگ کے ذریعے قتل کرنے کو منع فرمایا ہے؛ اس لیے ابتداءً اُن کو جلانا، یا کھولتا ہوا پانی ڈال دینا مکروہ ہوگا، اس کے علاوہ کھٹمل کو مارنے یا نکالنے کے لیے کوئی اور تدبیر؛ دوا وغیرہ کا استعمال کر سکتے ہیں، اور اگر یہ چیزیں مفید نہ ہوں، تو گرم پانی اُن پر ڈالنا درست ہوگا۔

قال في الهندية: وإحراقُ القُمَّل والعقرب بالنَّار مكرُوهٌ، وطرحُ القُمَّل حيًّا مُباحٌ؛ لكن يُكره من طريق الأدب، كذا في الظهيريَّة. (الفتاوى الهندية: ٥/ ٣٦١)

وفي الدُّر المختار: وحرقُهم ما نصُّه؛ لكن جواز التَّحريق والتَّغريق مُقيَّدٌ، كما في الشَّرح السِّير بما إذا لم يتمكنُوا من الظفر بهم بدُون ذلك بلا مشقَّةٍ عظيمةٍ، فإن تمكنُوا فلا يجُوز. فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱۹ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۲۱۷/ل، ۲۵۹/ل، ۱۴۳۸ھ)

یک ساں سول کوڈ قرآن وحدیث کی روشنی میں

سوال: میں وکیل ہوں، اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں پریکٹس کررہا ہوں، بنگلور اور دہلی میں میری آفس ہے، میں یونیفارم سول کوڈ کو چیلنج کرتے ہوئے پی آئی ایل (public interest litigation) دائر کرنا چاہتا ہوں، بہ راہِ کرم حکومت کا یونیفارم سول کوڈ کو نافذ کرنے کے خلاف لڑنے کے لیے عرضی میں قرآن واحادیث کے حوالے یک جا کرنے میں راہ نمائی فرمائیں، کام یابی کے لیے دعا کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: ہر مسلمان؛ کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد اس بات کا مکلّف ہے کہ اس کے تمام اقوال وافعال شریعت کے مطابق ہوں، عقائد بھی درست ہوں، معاملات بھی اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہوں، عبادات بھی ظاہر و باطن کے اعتبار سے حکمِ شرع کے مطابق ہوں، غرض یہ کہ اُس کی پوری زندگی شریعتِ اسلامیہ کی آئینہ دار ہو، پھر اسلام کا اپنا ایک مستقل نظامِ حیات اور قانون ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبہ جات کے لیے واضح ہدایات موجود ہیں، اور جس طرح اسلام نے عقائد اور عبادات میں راہ نمائی فرمائی ہے، اسی طرح معاملات، معاشرت اور عائلی مسائل کے بارے میں بھی تفصیلی ہدایات دی ہیں:

احکام نکاح کے لیے: (سورۂ بقرہ: ۲۲۱، سورۂ نساء: ۳، ۲۲ - ۲۵، سورۂ مائدہ: ۵)، احکام طلاق کے لیے: (سورۂ بقرہ: ۲۲۴-۲۳۲، اور ۲۳۶ - ۲۳۷، نیز سورۂ طلاق مکمل)، احکام وراثت کے لیے: (سورۂ نساء: ۱۰ - ۱۲، اور ۱۷۶)، احکام وصیت کے لیے: (سورۂ بقرہ: ۱۸۰ - ۱۸۲، اور سورۂ الانعام: ۱۰۶ - ۱۰۷) ملاحظہ ہو، اور ان آیات کی مکمل ومفصل تشریح؛ تفسیر معارف القرآن، مولفہ مفتی محمد شفیع عثمانی صاحبؒ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

پھر عائلی مسائل میں اسلام کے بیان کردہ احکام پر عمل کی قرآن پاک میں اس حد تک تاکید کی گئی ہے کہ اُنھیں حدود سے تعبیر کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو: (سورۂ بقرہ: ۲۲۹، سورۂ نساء: ۱۲، اور سورۂ طلاق: ۱) اور ان حدود کو قائم نہ رکھنے والوں کو ظالم کہا گیا ہے۔ (سورۂ بقرہ: ۲۲۹، اور سورۂ طلاق: ۱) اور ظالموں پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔ (سورۂ اعراف: ۴۴، اور سورۂ ہود: ۱۸) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، وصیت، میراث وغیرہ) کو ماننا، اور حسبِ موقع اس پر عمل کرنا؛ ہر مسلمان کے لیے فرض درجے کی چیز ہے، اب ان اسلامی قوانین کی جگہ پر اگر مسلمانوں کو دوسرے رسم و رواج کا پابند کیا جائے، یا اسلامی پرسنل لا کے اندر تبدیلی کی بات کی جائے، تو مذہبی آزادی کو چھیننے اور اسلامی قوانین میں مداخلت کرنے کے مرادف ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۲/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد مصعب عفی عنہ

(۲۸/ تتمہ/ د، ۱۶۹/ د، ۱۴۳۸ھ)

موبائل کالز ریکارڈ کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلۂ ذیل کے بارے میں:

موبائل میں آنے اور جانے والی کالز کو ریکارڈ کرنا کیسا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ التوفیق والعصمة: حامداً ومصلّیا ومسلّما: آپس میں جو بات چیت ہوتی ہے، وہ امانت ہے؛ اس لیے بلا اجازت آنے اور جانے والی کال کو ریکارڈ کرنا درست نہیں؛ **لأن المَجالس بالأمانة،** اور کال کو ریکارڈ کر کے اس کو عام کرنا صریح خیانت ہے، خاص طور پر جب کہ بات ایسی ہو جو پوشیدہ رکھنے کی ہو، اور بات کرنے والا مخاطب کو امین سمجھ کر اُس سے اپنی دل کی بات کہہ رہا ہو۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۲۰/۴/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۲۱/ ل، ۵۸۷/ ل، ۱۴۳۸ھ)

’’عفصہ ارم‘‘ اور’’عایزہ ارم‘‘ نام رکھنا کیسا ہے؟

سوال: میرے بھائی کی دو جڑواں لڑکیاں ہیں، ایک لڑکی کا نام’’عفصہ ارم‘‘ ہے، اور دوسری لڑکی کا نام’’عایزہ ارم‘‘ ہے، کیا یہ نام رکھ سکتے ہیں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: **حامداً ومصلّیا ومسلّما:** اسلامی ہدایات کے مطابق اچھے اور بامعنی نام رکھنے چاہییں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگ قیامت کے دن اپنے اور اپنے باپ کے ناموں سے پکارے جاؤ گے؛ اس لیے اچھے نام رکھا کرو۔ (ابوداؤد: ۶۳۳/۲)

’’عفصہ‘‘ اور’’عایزہ‘‘ کوئی اچھے معنی والے نام نہیں ہیں؛ اس لیے بہتر ہے کہ ان دونوں ناموں کو بدل دیا جائے،’’عفصہ‘‘ کی جگہ’’حفصہ‘‘ اور’’عایزہ‘‘ کی جگہ’’عائشہ‘‘ رکھ لیا جائے۔

علاوہ ازیں ناموں کے ساتھ’’ ارم‘‘ لگانا مناسب نہیں؛ اس لیے کہ قومِ ارم پر نافرمانی کی وجہ سے اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا، قرآن میں اس کا ذکر ہے۔

ويسنُّ تحسينُه، ويسنُّ تغييرُ الإسم القَبيح إلى الحسن، فقد أخرج أبو داؤد في سُننه عن أبي الدَّرداء رضي اللّٰه عنه قال: قال رسُولُ اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم: إنَّكم تدعون يوم القيامة بأسمائكم، وأسماءِ آبائكم فأحسِنُوا أسماءَ كم، وأخرج مسلمٌ في صحيحه عن ابن عُمر رضي اللّٰه عنهما: أن ابنةً لعُمر رضي اللّٰه عنه كانت يُقَال لها: عاصية، فسمَّاها رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم جميلة. (الموسوعة الفقهية: ۳۳۷/۱۱)

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۲۲ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۹۲/ل، ۳۸۴/ل، ۱۴۳۸ھ)

انگریزی زبان سیکھنے اور بچوں کو اسکول وکالج بھیجنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء ومفتیانِ دین اس مسئلے کے بارے میں:

(۱) انگریزی زبان کا سیکھنا۔ **(۲)** اور اپنے بچے کو اسکول کالج میں بھیجنا، اور عصری تعلیم دینا از روئے شریعت کیسا ہے؟ برائے کرم جواب عنایت فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما:الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: **(۱)** بہ حیثیت زبان اور ذریعۂ معاش انگریزی سیکھنا شرعاً جائز اور مباح ہے۔

(۲) ایک مسلمان باپ کی اولین ذمے داری ہے کہ اپنی اولاد کے لیے قرآنِ کریم کی صحیح اور باقاعدہ تعلیم کا بندوبست کرے، اسی طرح ضروریاتِ دین اور بہ قدرِضرورت احکامِ شرعیہ سے اولاد کو واقف کرانے کا نظم کرے؛ تاکہ ابتداءً ہی بچوں کے دلوں میں اسلام کا ایک نقش جم جائے، جو اُس کے لیے آیندہ راہِ راست پر قائم رہنے میں مددگار بنے، اس کے بعد بچوں کو عصری تعلیم اور دنیوی علوم وفنون حاصل کرنے کے لیے اسکول کالج بھیجنے میں کوئی حرج نہیں ہے، گنجایش ہے؛ لیکن بچوں کی نگرانی رکھنا بہ ہرحال ضروری ہے؛ تاکہ کالج اور یونیورسٹیوں کے دین بےزار ماحول کے زہریلے اثرات سے بچّے محفوظ رہ سکیں، اور یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ لڑکیوں کو؛ مخلوط تعلیم والے اداروں میں تعلیم دلانے کی بہ ہرحال اجازت نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۳/۱۲ھ، دوشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی – محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۲۲۳/س، ۲۶۵/س، ۱۴۳۸ھ)

انگلش ٹوائلٹ استعمال کرنے کا حکم

سوال: کیا انگلش باتھ روم/ٹوائلٹ استعمال کرنا صحیح ہے؟ یا اُس کے استعمال میں ناپاکی کا خطرہ رہتا ہے؟ اُس کو استعمال کریں یا نہ کریں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب بعون ملهم الصواب: انگلش باتھ روم یا ٹوائلٹ کا استعمال منع نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ حصولِ طہارت کا یقین ہو جانا چاہیے، اور بول و براز کے وقت قبلے کا استقبال یا استدبار نہیں ہونا چاہیے، اگر انگلش ٹوائلٹ کے استعمال میں ناپاکی کا خطرہ رہتا ہے، تو استعمال سے احتراز کریں،

اور بہ حالتِ مجبوری اس طریقے پر استعمال کریں کہ ناپاک چھینٹیں نہ پڑیں، اور پوری احتیاط کے باوجود اگر ناپاکی کپڑے یا بدن میں لگ جائے، تو اُسے بعد میں دھولیں۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ: وقارعلی غفرلۂ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۹/ربیع الاول/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - محمود حسن غفرلۂ بلند شہری

(۳۱۰/م، ۳۳۱/م، ۱۴۳۸ھ)

کیا واٹس ایپ یا فیس بک پر بھی سلام کا جواب دینا واجب ہے؟

سوال: بعض مرتبہ لوگ واٹس ایپ (whats app) اور فیس بک (face book) میں سلام لکھ کر بھیجتے ہیں، یا ایسا فوٹو بھیجتے ہیں، جس میں سلام لکھا ہوتا ہے، کیا اس سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے؟ اسی طریقے سے کبھی آواز ریکارڈ کر کے سلام بھیجتے ہیں، کیا اس کا جواب دینا واجب ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: اگر کوئی شخص ''واٹس ایپ'' یا ''فیس بک'' کے توسط سے؛ صوتی پیغام یا تحریر یا غیر جان دار کی تصویر کی شکل میں سلام لکھ کر اپنے کسی دوست یا شناسا کو ابتداءً بھیجے، تو مرسل الیہ پر اُس کا جواب دینا واجب ہے۔

ویجبُ ردُّ جواب کتاب السَّلام کردِّ السَّلام ......؛ لأن الکتاب من الغائب بمنزلة الخطاب من الحَاضر. مجتبی، والنَّاسُ عنه غافلُون إلخ. (درمختار مع الشامي: ۹/ ۵۹٤، ط: زکریا) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلۂ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۳ھ، پنج شنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلۂ

(۲۵/تتمہ/س، ۶۹۲/س، ۱۴۳۸ھ)

ختنے کا ثبوت کب سے ہے؟ اور کیا صحابۂ کرام ختنہ کرایا کرتے تھے؟

سوال: کیا صحابہ؛ اسلام لانے کے بعد ختنہ (مسلمانی) کراتے تھے؟ یا اُس وقت حکم نہیں تھا؟ برائے مہربانی راہ بری فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: عربوں میں ختنے کا رواج پہلے ہی سے تھا، اور یہ ایک پسندیدہ عمل سمجھا جاتا تھا، جو لوگ ختنہ نہیں کراتے تھے، اُنھیں اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، اُن پر طعن کی جاتی تھی، اور یہ سلسلہ غالباً حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام سے چلا آرہا تھا؛ کیوں کہ عربوں میں دینِ ابراہیمی کے اثرات تھے، اور کتبِ حدیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ مروی ہے کہ اُنھوں نے حکمِ خداوندی کے مطابق اسّی (۸۰) سال اور ایک روایت کے مطابق ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں اپنی ختنہ کی۔

ويُعَدُّ الخِتانُ من العَادات الجاهليَّة القديمة .... وقد كان الجاهليُّون يسمُّون من لم يختَتن أقلف وأغلف وأغرل ويعيبُونه ويعدُّونه ناقصًا. (المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: ۸/ ۲۴۴، ط: دار الساقي)

عن أبي هُريرة رضي اللّٰه عنه قال: اختتن إبراهيم صلّى اللّٰه عليه وسلّم؛ وهُو ابنُ عشرين ومائة، ثُمَّ عاشَ بعد ذلك ثمانين سنةً. (الأدب المفرد، باب الختان للكبير، رقم الحديث: ۱۲۵۰)

اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ کوئی آدمی اسلام لاتا (اور وہ غیر مختون ہوتا) تو اُسے ختنہ کرانے کا حکم دیا جاتا؛ اگر چہ وہ سن رسیدہ ہی کیوں نہ ہو۔

عن ابن شِهاب قال: كان الرَّجُل إذا أسلم أُمِرَ بالاختتان وإن كان كبيرًا. (الأدب المفرد، باب الختان للكبير: ۱/ ۷۱۱، ط: الرياض) **فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴/۷/۱۴۳۸ھ، چہارشنبہ

الجواب صحیح: زین الاسلام قاسمی - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۸۲۲/تتمہ/س، ۲۱۵/س، ۱۴۳۸ھ)

تعویذ کا ثبوت کن احادیث سے ہے؟

سوال: تعویذ کس حدیث سے ثابت ہے؟ حوالے کے ساتھ کوئی حدیث بتا دیں؛ کیوں کہ میں نے صحیح بخاری میں بے شمار حدیثیں دیکھی ہیں، جو تعویذ کے خلاف ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: مسلم شریف میں ہے: **عن عَوف بن مالك الأشجَعي قال: كُنَّا نرقي في الجاهليَّة، فقُلنا: يا رسُول اللّٰه! كيف ترىٰ في ذلك؟ فقال: اعرضُوا عليَّ رقاكُم لا بأس بالرُّقي ما لم يكن شركٌ.**

(مسلم، رقم الحديث: ۲۲۰۰، باب: لا بأس بالرقي ما لم يكن فيه شرك)

وقد أخرج أبُوداؤد عن عَمرو بن شُعيبٍ عن أبيه عن جدِّه أن رسُول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم كان يعلِّمُهم من الفزع كلمات: أعُوذ بكلمات اللّٰه التَّامَّة من غضَبه وشَرِّ عباده، ومن هَمزات الشَّياطين و أن يحضُرون، وكان عبد اللّٰه بن عُمر يعلِّمُهن مَن عَقَل من بنِيه، ومن لم يعقل كتبه فأعلقه عليه. (أبوداؤد، رقم الحديث: ۲۸۹۳، باب: كيف الرقي)

مذکورہ بالا دونوں احادیث، نیز صحابیِ رسول کا عمل؛ اسی طرح دیگر بہت سی روایات کی روشنی میں حکم شرعی یہ ہے کہ اگر تعویذ مباح ومسنون ادعیہ، اسمائے الٰہی، آیاتِ قرآنیہ پر مشتمل ہو، نیز لغتِ مفہومہ میں لکھی ہوئی ہو، اور اُسے موثر بالذات نہ سمجھا جائے، تو تعویذ استعمال کرنا، اور گلے وغیرہ میں باندھنا، لٹکانا بلاشبہ جائز ہے، جن حدیثوں سے عدمِ جواز معلوم ہوتا ہے، اُس سے مراد ایسی تعویذ ہے جو کفر وشرک پر مشتمل ہو، یا موثر بالذات سمجھ کر استعمال کی جائے، اور جو ایسا نہ ہو، اُس کا استعمال بلاشبہ جائز ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا مسلم شریف کی روایت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول: **لا بَأس بالرُّقي ما لم يكن فيه شركٌ** سے واضح کردیا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۴/۱۳ھ، پنج شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - وقار علی غفرلہٗ

(۴۱۰/تتمہ/س، ۴۴۷/س، ۱۴۳۸ھ)

سفلی عمل والے سے جھاڑ پھونک کروانا کیسا ہے؟

سوال: السلام علیکم! ہندو اوجھا بھگتا سے یا سفلی عمل والے سے جھاڑ پھونک کروانا کیسا ہے؟

الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمۃ: حامداً ومصلّیا ومسلّما: غیر مسلم؛ سفلی عمل والے سے جھاڑ پھونک کرانا جائز نہیں؛ البتہ سخت مجبوری واضطرار کی صورت میں بعض مفتیان

نے اس شرط کے ساتھ گنجایش دی ہے کہ خود عمل کرنے والا شرکیہ عمل نہ کرے۔

کتبہ: فخر الاسلام عفی عنہ نائب مفتی دارالعلوم دیوبند ۶/۷/۱۴۳۸ھ

الجواب صحیح: وقار علی غفرلہٗ-محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۹۴۳/ل، ۹۷۰/ل، ۱۴۳۸ھ)

قنوتِ نازلہ کب اور کن حالات میں پڑھی جائے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین مسئلہ ذیل کے بارے میں:

(۱) قنوتِ نازلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ قنوتِ نازلہ کن حالات میں مشروع ہے؟

(۲) قنوتِ نازلہ کب سے کب (کتنے دن) تک پڑھی جائے گی؟

(۳) کیا ہندوستان میں نوٹ بندی کی پریشانیوں کی وجہ سے قنوتِ نازلہ پڑھنا مشروع ہے؟

(۴) دیگر ممالک: شام، فلسطین وغیرہ کے مسلمانوں کو ظلم وجور، جبر وتشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہے، ناحق اُن کا خون بہایا جارہا ہے، تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایسے نازک ترین دور میں قنوتِ نازلہ پڑھنا کیسا ہے؟ مشروع ہے، یا مسنون بھی؟ مدلل ومفصل جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور اور عندالناس ممنون ومشکور ہوں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: (۱) ہول ناک پریشانیوں اور غیر معمولی مصائب کے وقت؛ قنوتِ نازلہ مشروع ہے۔

(۲) جب تک حالات کی ہول ناکی رہے، اُس وقت تک پڑھیں اور پھر ترک کردیں۔

(۳) نوٹ بندی میں قنوتِ نازلہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۴) ہندوستان کے مسلمان اتنے متاثر نظر نہیں آتے کہ شام، فلسطین وغیرہ کے حالات کی وجہ سے اُن کے کلیجے منہ کو آتے ہوں۔

اعلاء السنن میں ہے:

إنّ القُنوتَ في الفَجر لایشرعُ لمُطلَق الحَرب عندنا، وإنَّما یشرعُ لبلیَّةٍ شدیدةٍ تبلُغ بها القُلوبُ الحَناجِر واللّٰهُ أعلَمُ، و لولا ذٰلك للزِم الصَّحابة القائلین بالقُنوت النَّازلة

أن يقنتوا أبداً ولايتركوه يوماً؛ لعدم خُلوِّ المُسلمين عن نازِلةٍ ما غالباً، لاسيّما في زمن الخُلفاءِ الأربعة. اهـ. (٦/١١٤-١١٥، ط: المكتبة الأشرفية، ديوبند)

اور جب ہندوستان کے مسلمانوں پر ایسا تاثر نہیں ہے، تو اُن کو قنوتِ نازلہ کا حکم بھی نہیں؛ البتہ شام، فلسطین ودیگر ممالک میں جو کچھ حالاتِ ناگفتہ بہ ہول ناک پیش آرہے ہیں، اُن کے متعلق اپنی اپنی دعاؤں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ دعا کرتے رہنا چاہیے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۱/۴/۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۰/۱/۲۰۱۷ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۷۰/ھ، ۴۹۲/ھ، ۱۴۳۸ھ)

آج کل مروجہ جلسوں میں پیش آنے والی خرافات کا شرعی حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دارالعلوم دیوبند اس بارے میں کہ آج کل مسلم معاشرے میں جلسوں کی کثرت ہوگئی ہے، ہر محلّے میں جلسے ہونے لگے ہیں، جس میں اصلاحی باتوں سے زیادہ خرافات درآئی ہیں، مثلاً:

(۱) منتظمین کا غریب عوام کے خون پسینے سے حاصل کی ہوئی آمدنی کو حاصل کرنا، جس میں اکثر وبیش تر لوگ؛ بادلِ ناخواستہ اور اپنی عزت بچانے کی خاطر چندہ دیتے ہیں، اور منتظمین اُس رقم کو اپنی آمدنی سمجھ کر جس طرح چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں، ایسا بھی واقعہ ہوا ہے کہ خود ہم نے محلّے کے ذمے دار کے کہنے پر رات ودن ایک کر کے غریبوں کے گھروں میں جاکر؛ اُن کی خوشامد کر کے اور اُنھیں ترغیب دے کر بہ مشکل دس ہزار روپے کا چندہ کیا؛ مگر منتظمِ اعلیٰ نے ایک "شاعر اسلام" کو محض ایک نعت اور ایک نظم پڑھنے پر بہ طور ہدیہ دس ہزار روپے دے دیے، اعتراض کرنے پر اُن کا جواب تھا: "الحمد للہ اس بار چندہ بہت زیادہ ہوا ہے"، چھوٹے سے چھوٹے جلسے میں دو تین لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں، کیا یہ فضول خرچی نہیں ہے؟ اسی طرح جلسے کے دوران مخصوص لوگوں کا نام لے کر مخصوص رقم کا سوال کرنا، اور اُن کا اپنی عزت بچانے کی خاطر چندہ دے دینا، دستار بندی کے جلسوں میں خاص بچوں کی پگڑی کے لیے کہہ کر چندہ حاصل کرنا، اور اُن پیسوں کو دوسرے مد میں خرچ کرنا، صرف جلسہ کرنے کے لیے چندہ کرنا، اور بچی ہوئی رقم کو مدرسے میں لگانا وغیرہ، کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

(۲) مرد وعورت کا اختلاط، بے پردگی، خواتین کے حصّے میں اسکرین کا انتظام کرنا؛ تاکہ خواتین بھی مقرر صاحب کی شکل وصورت کو دیکھ سکیں، لاؤڈاسپیکر کا ضرورت سے زیادہ تعداد میں استعمال کرنا، اور ضرورت سے زیادہ آواز کو تیز کرنا، جس سے غیر مسلموں، بوڑھوں، مریضوں، حاملہ خواتین، بچوں اور جلسے میں غیر شریک حضرات کو تکلیف ہونا، اُن کی نیندیں اُچٹ جانا، اسی شور وہنگامہ کے ساتھ رات بھر جلسہ کرنا، اس تعلق سے ملکی قانون کی خلاف ورزی کرنا، کیا اس طرح دوسرے لوگوں کو تکلیف دینا، اور قانون کی خلاف ورزی کرنا صحیح ہے؟

(۳) مسلک کے نام پر طعن وتشنیع، علمائے کرام کی تعریف، توصیف میں مبالغہ آرائی، مقررین کو یا شاعر کو داد دینا، نعرہ لگانا، ابتدا میں بچوں کی حمد ونعت وغیرہ؛ پھر مقامی علمائے کرام کا بیان کرنا، اور اخیر میں جب عوام تھک چکے ہوتے ہیں، اور رات کے اوقات میں اونگھنا شروع کر دیتے ہیں، اس وقت بڑے عالم کا بیان رکھنا کہ اگر پہلے اُن کو موقع دے دیا جائے، تو عوام ان کا بیان سننے کے بعد گھروں کو روانہ ہو جائے گی، مقررین کا اپنے بیان میں بے سروپا باتیں، حکایات وکرامات، قصّے کہانیاں سنا کر جلسے کو دل چسپ اور چٹ پٹا بنانا صحیح ہے؟

(۴) مقررین کا آمد ورفت کے علاوہ؛ ہدیے کے نام پیسہ مقرر کرنا، آمد ورفت کے لیے جہاز سے سفر کرنا، اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں قیام کرنا، عمدہ قسم کی گاڑیوں میں چلنا پھرنا، حالاں کہ یہ مقرر صاحب جب اپنے ذاتی کام کے لیے سفر کرتے ہیں، تو چالو اور زیادہ سے زیادہ سلیپر کلاس میں کرتے ہیں، کیا مقررین کا یہ رویہ صحیح ہے؟

(۵) اس طرح کے جلسے کم وبیش ہر علاقے میں ہونے لگے ہیں، مدارس میں بھی دستار بندی کے نام پر بڑے جلسے ہوتے ہیں، جس میں بچوں کی تعلیم کا حرج، ضیاع اوقات، اور اچھی خاصی رقم بھی صرف ہوتی ہے، بعض ایسے مدارس بھی ہیں جن میں مہینوں پہلے بچوں کو جلسے کی تیاری میں لگا دیا جاتا ہے، جلسے میں پیش کرنے کے لیے تلاوت، حمد، نعت اور تقریر وغیرہ کی تیاری کرنے کے علاوہ؛ لوگوں کے پاس جا کر چندہ کرنا، مائک لے کر بستی بستی اعلان کرنا، حتی کہ اشتہار چسپاں کرنا، پنڈال سجانا بھی ان بچوں کی ذمے داری ہوتی ہے؛ چوں کہ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو چھوڑ کر؛ ان چیزوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، کیا یہ بچوں کے ساتھ استحصال نہیں ہے؟ کیا یہ قوم کی امانت میں خیانت نہیں ہے؟

(۶) ان جلسوں کے انعقاد میں علاقے، خاندان، مدرسے کے اعتبار سے اس طرح کا مقابلہ بھی ہوتا ہے کہ کن لوگوں نے کس مقرر کو بلایا تھا، اور کس کے جلسے میں کتنے لوگ آئے تھے، کس جلسے میں اخراجات کتنے ہوئے وغیرہ، اور ہر کوئی دوسرے سے بڑھ کر کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛ چناں چہ محض مجمع کو بڑھانے کے لیے دوسرے علاقوں سے لوگوں کو بلایا جاتا ہے، مثلاً: جو لوگ اپنی روزی روٹی کے لیے ممبئی، دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں رہتے ہیں، اُنھیں اس موقع پر بلا لیا جاتا ہے، اس میں دیوبندی اور بریلوی مسلک کے اعتبار سے بھی مقابلہ ہوتا ہے، بعض دفعہ تو گالم گلوچ اور لعن طعن پر بھی مقابلہ ہونے لگتا ہے۔

(۷) اس پسِ منظر میں سوال یہ ہے کہ کیا قرآن وسنت اور صحابۂ کرام کے زمانے میں اس طرح کے جلسوں کا ثبوت ملتا ہے؟ اگر ہاں، تو اس کی طرف نشان دہی کر دی جائے، اور اگر نہیں، تو اس طرح کا جلسہ منعقد کرنا کیسا ہے؟

(۸) ایسے جلسوں میں چندہ دینا کیسا ہے؟ اس طرح کی دستار بندی کرنا کیسا ہے؟

(۹) مقررین کا مذکورہ طرزِ عمل؛ قرآن وسنت کے مطابق صحیح ہے؟

(۱۰) نیز یہ بھی بتائیں؛ جلسہ کس طرح منعقد کرنا چاہیے؟ بہ راہِ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت کیا جائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق: **حامداً ومصلیاً ومسلماً**: (۱) چندہ جمع کرنے، نیز خرچ کرنے میں حدودِ شرعیہ کو ملحوظ رکھنا واجب ہے، سیدھا سادہ اپنا نظام بتلا کر ترغیب دینے میں تو کچھ حرج نہیں؛ مگر چندہ کرنے میں ایسا انداز اختیار کرنا کہ معطیین خوش دلی سے دینے کے بجائے بادلِ ناخواستہ، عزت بچانے کی خاطر دیں، تو جائز نہیں؛ بل کہ اصحابِ جلسہ وذمے داران، اور چندہ کرنے والے یہ اندیشہ محسوس کریں کہ دینے والے؛ دل کی کراہیت یا ریاء وغیرہ سے دیتے ہیں، تو ایسے لوگوں کا چندہ لینے سے صاف معذرت کر دیا کریں، جس مد کے لیے چندہ کیا جائے، اُسی مد میں خرچ کرنا ذمے داران کی بڑی ذمے داری ہے، خلافِ منشائے معطیین وخلافِ شریعتِ مطہرہ خرچ کرنا جائز نہیں، ''مفاسد چندہ'' اور ''امداد الفتاویٰ'' میں بھی اس سے متعلق عمدہ کلام ہے۔

(۲) مردوں اور عورتوں کا اختلاط، نیز مقرر کو دکھلانے کی خاطر اسکرین لگانا؛ تاکہ عورتیں مقرر اور اسٹیج کے مناظر کو دیکھ سکیں؛ ناجائز ہے، ضرورت سے زائد مقدار میں آواز پھیلانا، یا اتنی تیز آواز رکھنا کہ جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو؛ جائز نہیں، ملکی قانون کی خلاف ورزی کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۳) یہ امور واجب الاصلاح ہیں؛ کیوں کہ ان میں حدود سے تجاوز ہے، باقی صحیح واقعات اور سچی کرامات کے بیان میں حرج نہیں۔

(۴) جن صاحب کو تقریر کے لیے بلایا جائے، اُن کے حالات لکھ کر معلوم کرلیا کریں، اگر بجائے چندے کی رقم سے انتظام کرنے کے؛ ایک دو اصحابِ خیر حضرات آمد ورفت کا حسبِ حالات؛ مناسب انتظام کردیا کریں، تو بہتر ہوگا، اور رات بھر یا اکثر حصۂ رات میں جلسہ کرنے کی وجہ سے نمازِ فجر کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو، تو بھی اتنا لمبا جلسہ کرنا جائز نہیں۔

(۵) اگر انتظاماتِ جلسہ میں لگنے لگانے سے تعلیم وتربیت کا نقصان اور بچوں کا استحصال ہے، تو یہ صورت اختیار کرنا جائز نہیں۔

(۶) یہ امور محتاجِ اصلاح ہیں۔

(۷) قرآن وسنت اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین؛ بل کہ متبعِ سنت سلف صالحین کے یہاں ان جیسے جلسوں کا ثبوت نہیں ملتا۔

(۸) اگر انتظامات صحیح کرلیں، تو چندہ اور دستار بندی سب درست ہیں۔

(۹) نمبر: ۴ کے تحت لکھ دیا گیا۔

(۱۰) اسراف، تبذیر بالکل نہ ہو، تصویر کشی اور اسکرین لگانے سے کلیۃً اجتناب کیا جائے، آواز کا پھیلاو بہ قدرِ ضرورت رکھا جائے، جلسے کا پورا نظام تحریر کر کے مقامی مفتیان حضرات سے حکم شرعی اور ضروری ہدایات حاصل کرلیں، اور پورا نظامِ جلسہ اسی کے مطابق انجام دیں، علمائے صالحین، متقین حضرات میں سے ایک دو حضرات کو بلا کر؛ بیان کرا دیا جائے، مسلمانوں کو دینی فائدہ پہنچے، اللہ پاک راضی ہو، تمام امور میں اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۲۹ھ الموافق: ۲۰۱۷/۳/۲۹ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۸۵۵/ھ، ۸۷۰/ھ، ۱۴۳۸ھ)

لاؤڈ اسپیکر لگا کر دیر رات تک دینی اجلاس منعقد کرنا کیسا ہے؟

سوال: حضرات مفتیانِ کرام! ہم اہلِ قصبہ؛ مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات قرآن وحدیث کی روشنی میں جاننا چاہتے ہیں، امید ہے ہماری راہ نمائی فرمائیں گے۔

(۱) بعد نمازِ عشاء تقریباً ہر روز کہیں نہ کہیں محفلِ وعظ کا اہتمام ہوتا ہے، تقریباً رات دس بجے تک بچے نعت اور نظمیں پڑھتے ہیں، پھر واعظ دس بجے کے بعد اپنا پروگرام شروع کرتے ہیں، جو کہ گیارہ یا بارہ بجے رات تک یہ پروگرام لاؤڈ اسپیکر پر چلتا ہے، اور دوسرے محلے تک اس کی آواز جاتی ہے، یہ عمل کہاں تک صحیح ہے؟ **(۲)** سیرتِ صحابہ یا سیرت النبی کے موضوع پر سال بھر میں مختلف محلوں میں جلسوں کا انعقاد ہوتا ہے، جو کہ عشاء کے بعد کسی بھی شارع عام کو بند کر کے رات کے ایک یا دو بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، اور لاؤڈ اسپیکر بلند آواز کے لگائے جاتے ہیں، جن کی آواز دوسرے محلوں تک جاتی ہے، اس کے بارے میں بھی ہماری راہ نمائی فرمائیں کہ یہ عمل کہاں تک صحیح ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً ومصلّیا ومسلّما: الجواب وباللّٰہ التوفیق والعصمة: **(۱-۲)** لوگوں تک دین کی باتیں پہنچانے؛ نیز اُنھیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام وغیرہم کی پاکیزہ زندگی، اور اُن کے عبرت آموز واقعات سے واقف کرانے کے لیے وعظ ونصیحت کی محفلیں اور دینی اجتماعات منعقد کرنا ایک مستحسن عمل ہے، اور اس کے لیے دن کے بہ نسبت؛ رات کا وقت زیادہ موزوں ہے؛ کیوں کہ دن کے وقت لوگ امورِ معاش میں مشغول ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اجتماعات میں شرکت کرنا اُن کے لیے مشکل ہوتا ہے؛ البتہ رات کو لوگوں کے پاس فارغ وقت ہوتا ہے؛ اس لیے زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے ہیں؛ لیکن منتظمینِ اجتماع پر دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

(الف) یہ اجتماعات دیر رات تک نہ چلائے جائیں؛ تاکہ قرب وجوار کے لوگوں کو شور وشغب کی وجہ سے سونے میں خلل نہ ہو، نیز شرکت کرنے والوں کے لیے نمازِ فجر میں شامل ہونا آسان ہو؛ کیوں کہ دیر رات تک اجتماعات کے بعد صبح کو نماز میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بالعموم کم ہو جاتی ہے، اور ظاہر ہے کہ ایک مباح ومستحسن کام بھی جب ناجائز اور گناہ کے کام کا سبب بن جائے، تو وہ مباح ومستحسن کام بھی شرعاً مذموم بن جاتا ہے۔

(ب) لاؤڈ اسپیکر کی آواز بہت تیز نہ کی جائے، صرف بہ قدرِ ضرورت اُس کی آواز رکھی جائے، آواز اتنی تیز کرنا کہ محلّے کے لوگوں؛ بالخصوص خواتین اور مریضوں کے لیے عبادت کرنا، اور سونا مشکل ہوجائے؛ شرعاً جائز نہیں ہے۔ فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب

کتبہ: محمد اسد اللہ غفرلہٗ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۸/۹ھ، شنبہ

الجواب صحیح: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری - محمد نعمان سیتاپوری غفرلہٗ

(۹۸۸/تتمہ/س، ۹۳۸/س، ۱۴۳۸ھ)

اجازت لے کر کسی دوسرے کے دستخط کرنا کیسا ہے؟

سوال: کسی مرد یا عورت کی اجازت سے اُس کے نام کے دستخط کر سکتے ہیں، جیسے: مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے دستخط کی مہم چل رہی ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: حامدا ومصلیاً ومسلماً: نہیں کر سکتے، اصل ہی کے دستخط کرانے چاہییں۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۶/۱۳ھ الموافق: ۲۰۱۷/۳/۱۳ء، یوم الاثنین

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۶۸۱/ھ، ۲/۱۷/ھ، ۱۴۳۸ھ)

لائبریری سے بہ غرضِ استفادہ کتاب لینے والے پر کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے؟

سوال: ایک خیر خواہی ادارہ - جس کی لائبریری؛ نئی و پرانی دینی کتب کے ایک بڑے ذخیرے پر مشتمل ہے - اشاعتِ علم وافادۂ عام کے تحت عاریۃً کتابیں جاری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، شرعی رو سے کتابیں لے جانے والے کی ذمے داریاں ترغیبی وترہیبی وفقہی اعتبار سے کیا ہوں گی؟ اس کی تفصیل سے آگاہی دیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق:حامدا ومصلیاً ومسلماً: جتنی مدت کے لیے کتاب لے جائیں، اُس مدت کے پورا ہونے پر بلا تاخیر کتاب کو واپس کریں، کتاب کی حفاظت میں کوتاہی اور لاپرواہی ہرگز نہ برتیں، کتاب سے جس طرح فائدہ حاصل کیا جاتا ہے، اُس کو ملحوظ رکھ کر فائدہ اٹھائیں، ادارے کے ذمے داران کی صراحۃً اجازت کے بغیر جلد یا اندرونِ کتاب میں کچھ نہ لکھیں، ادارے کی کتاب کو خراب یا قصداً ضائع کرنے سے دنیا وآخرت میں وبال وعذاب کا سخت اندیشہ ہے، نیز حفاظت میں کوتاہی کرنے پر ضائع یا خراب ہو جائے، تو موجبِ ضمان بھی ہے۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلندشہری دارالعلوم دیوبند ۹/۴/۱۴۳۸ھ الموافق: ۸/۱/۲۰۱۷ء، یوم الاحد

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ- محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۵۴۹/ھ/۴۴۴/ھ، ۱۴۳۸ھ)

طالب علم کے لیے صحیح طریقۂ تادیب کیا ہونا چاہیے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے دیوبند ومفتیانِ کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے یہاں ایک مدرس ہیں، ہم اُن کو پوری تنخواہ دیتے ہیں؛ مہینہ مکمل ہونے کے بعد، اور اُن مدرس کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی بچہ اُن کی بات نہیں مانتا، یا اسباق میں پابندی نہیں کرتا، یا سبق نہیں سناتا، یا غیر حاضری کرتا ہے، یا ان میں سے کوئی بھی صورت اختیار کرتا ہے، تو اس طالب علم کے ساتھ بات چیت نہیں کرتے، اور ترکِ کلامی شروع کر دیتے ہیں، اور پورا سال گذر جاتا ہے؛ اُس طالب علم کے ساتھ بات چیت نہیں کرتے، نہ اُس کا سبق سنتے، اور اس پر تعلیمی اعتبار سے کوئی بھی نظر نہیں رکھتے، آیا ان استاذ صاحب کا اس مہینے میں پوری تنخواہ حاصل کرنا کیسا ہے؟ اس طالب علم کے ساتھ اَن جان کی طرح معاملہ کرتے ہیں، اور اُس کا پورا سال بربادی کی نظر ہو جاتا ہے، واضح رہے کہ اس سوال کی تمام صورتیں واضح انداز میں تفصیل کے ساتھ رقم فرمادیں، بہت ممنون رہوں گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باسمہ تعالیٰ: الجواب وباللہ التوفیق: استاذ کی حیثیت ایک مربی اور مصلح کی ہے،

وہ طالب علم کی علمی اور اخلاقی تربیت کے لیے تادیب کا کوئی مناسب طریقہ اپنا سکتا ہے؛ لیکن اس کے لیے کچھ شرطیں ہیں، مثلاً: اس طرح کی تادیب شرعاً ممنوع نہ ہو، اس سے مقصود تربیت ہو، غصہ یا جذبۂ انتقام کی تسکین نہ ہو، طالبِ علم کے لیے یہ طریقۂ تادیب؛ تعلیمی نقصان کا باعث نہ ہو، اسی طرح مدرسے کے ضابطے اور عرف کے لحاظ سے استاذ اس طرح کی تادیب کا مجاز بھی ہو؛ لیکن یہ بات بھی قابلِ لحاظ رہے کہ تادیب کا کوئی متعین طریقہ نہیں ہے، یہ استاذ کی صواب دید اور طالب علم کے تحمل پر موقوف ہے؛ پس صورتِ مسئولہ میں استاذ کا طالب علم سے اتنی لمبی مدت تک بات نہ کرنا، اور اس کا سبق وغیرہ نہ سننا، یہ تو سراسر طالب علم کے لیے نقصان دہ ہے، اس کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے، جب کہ ایک مسلمان کے ساتھ تین دن سے زیادہ ترکِ کلام سے منع کیا گیا ہے، اور طالب علم کا تو تین دن میں بھی بہت نقصان ہے، اور رہا تنخواہ کا مسئلہ؛ تو چوں کہ استاذ صاحب اس طالب علم کے علاوہ دوسرے طلبہ کو بھی تعلیم دے رہے ہیں، اور اپنا متعینہ وقت مدرسے میں لگا رہے ہیں؛ لہٰذا ان کے لیے پوری تنخواہ لینا جائز ہے؛ البتہ تادیب کے سلسلے میں اُن کو متوجہ کردیا جائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الاحقر: زین الاسلام قاسمی الٰہ آبادی مفتی دارالعلوم دیوبند ۱۴۳۸/۲/۱۶ھ

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ- محمد مصعب عفی عنہ

(۱۴۷/د، ۲۲۶/د، ۱۴۳۸ھ)

رفاہی کاموں کے ذریعے لوگوں کو دین کی طرف مائل کرنا کیسا ہے؟

سوال: میرا سوال یہ ہے کہ رفاہی کاموں کے ذریعے دین کی طرف مائل کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ اسلام کا خاصہ ہے، یا کسی اور مذہب کا خاصہ ہے؟ اس عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمۃ والتوفیق: **حامداً ومصلیاً ومسلماً:** رفاہی کاموں کو کرکے دین کی طرف مائل کرنا؛ اصالۃً کوئی شرعی حکم نہیں ہے، اگر مسلمان اپنے عقائد واعمال درست رکھیں، دین میں پختگی پیدا کریں، دوسروں کی جان، مال، عزت، آبرو کی حفاظت؛ اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی حفاظت کی طرح کریں، حسنِ سلوک، حسنِ اخلاق اور ادائے حقوق کو شیوہ بنائیں، شریعتِ مطہرہ کے احکام کو مضبوطی سے پکڑلیں، آپس میں تشتت وافتراق سے پوری طرح اجتناب کرتے رہیں،

غیر مسلموں کے ساتھ اچھا برتاو برتیں، ایسے مسلمانوں کا وجود ہی خود ایک مستقل دعوتِ اسلام ہے۔
فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند ۱۱/۴/۱۴۳۸ھ الموافق: ۱۰/۱/۲۰۱۷ء، یوم الثلثاء

الجواب صحیح: فخر الاسلام عفی عنہ - محمد اسد اللہ غفرلہٗ

(۳۸۱/ھ، ۴۷۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)

کیرم بورڈ، لوڈو وغیرہ کھیلنے کا حکم

سوال: کیا کیرم بورڈ کھیلنا جائز ہے؟ اسی طرح فرش پر لکیر کھینچ کر ڈبے ڈبے بنا کر؛ بعض املی کی گٹھلی کو ایک جانب اُس کی رگڑ کر سفید کر کے کھیلتے ہیں، کاغذات وغیرہ میں نقشہ بنا کر کھیلتے ہیں، کیا یہ کھیلنا جائز ہے؟

نوٹ: کیرم بورڈ بغیر کسی پیسوں کی شرط کے؛ دل جوئی وتفریحاً کھیلتے ہیں، اور لوڈو کا نقشہ بنا کر نمبرات اُس میں ڈالتے ہیں، اور نمبر جس جانب پڑے گا، اُتنے عدد اس کالم میں آگے بڑھاتے ہیں۔

بعض لوگ نہ کھیلنے کی علت یہ بتاتے ہیں کہ اس میں غفلت ہے کہ آدمی اللہ کے ذکر سے غافل ہوجاتا ہے، کیا یہ علت درست ہے؟ اور اگر مان بھی لیا جائے؛ کوئی اگر پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہوئے، اور کھیلتے ہوئے بھی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے، اللہ کو یاد کرتے ہوئے کھیلے، تو یہ کیسا ہے؟

پہلے سوال میں پوچھنا تین سوال ہیں:

(۱) کیرم بورڈ اور نقشہ بنا کر زمین یا کاغذ پر کھیلنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) یہ جو علت بیان کی جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟

(۳) مذکورہ علت میں اس طرح حیلہ کر کے کہ کھیلتے ہوئے اللہ کا ذکر کر کے کھیلنا، یہ حیلہ کرنا جائز ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب وباللّٰہ العصمة والتوفیق: حامداً ومصلیاً ومسلماً: (۱-۳) کیرم بورڈ اور لوڈو جیسے کھیلوں میں کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں؛ البتہ تضییع اوقات اور نماز وذکر اللہ وغیرہ

اعمالِ صالحہ سے غفلت ولاپرواہی کا؛ کھلاڑیوں اور اُن کے دیکھنے والوں میں پیدا ہونا؛ جزوِ لاینفک درجے میں عامۃً ہوتی ہے، نیز اس طرح کے کھیل عموماً فساق، فجار میں ہی رائج ہیں، اور اُن کی مشابہت کے اختیار کرنے سے بھی نصوص میں ممانعت وارد ہے؛ اس لیے بالخصوص مسلمان نوجوانوں کو ان کھیلوں سے اجتناب ہی چاہیے، کھیلتے کھیلتے ذکراللہ کریں گے، اور دینی اعمال میں کوئی غفلت پیش نہ آئے گی وغیرہ امور؛ نفس وشیطان کی طرف سے مکروہ دھوکے میں مبتلا کرنے کی شکل ہے، یہ کوئی صحیح اور جائز حیلے کا الہام نہیں ہے، اور کھیل کہ جس میں واقعۃً جسمانی یا ذہنی ورزش مقصود ہو، ہار جیت اُس میں نہ ہو، مفاسدِ مروجہ سے بالکل خالی ہو، تو بہ قدرِ ضرورت اس کو اختیار کر لینے میں اگرچہ گنجایش بھی ہے؛ مگر سلامتی ایمان واعمالِ صالحہ کی ان سے بھی احتراز ہی میں ہے۔

جسمانی ورزش کے بے غبار طریقے بھی ہیں، جیسے: ڈنڈ بیٹھک لگالینا، تیز رفتاری سے چل کر تفریح کر لینا وغیرہ، تکملہ فتح الملہم (۴/۴۳۶) وغیرہ میں مدلل بحث ہے، اس کو ملاحظہ فرمالیں۔

فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد: محمود حسن غفرلہٗ بلند شہری دارالعلوم دیوبند　　۱۰/۵/۱۴۳۸ھ الموافق: ۸/۲/۲۰۱۷ء، یوم الاربعاء

الجواب صحیح: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ - فخر الاسلام عفی عنہ

(۵۶۲/ھ، ۶۳۹/ھ، ۱۴۳۸ھ)
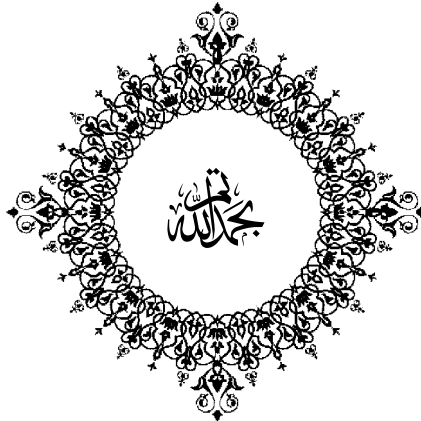
MAKTABA DARUL-ULOOM

DEOBAND-247554 (U.P.)INDIA